فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون

امداد الفتاویٰ کا تکملہ جو سنہ ۱۳۴۰ھ کے بعد کے تقریباً سوا دو ہزار
فتاویٰ پر مشتمل ہے،

تالیف

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی ؒ و حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب گمتھلوی ؒ

زیر نگرانی و رہنمائی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ناشر

زکریا بکڈپو دیوبند ضلع سہارنپور

نام کتاب :- امداد الاحکام، جلد دوم

تالیف :- حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تبویب :- مولانا محمود اشرف عثمانی مولانا رفیع اللہ عثمانی

ترتیب و تقدیم :- مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب صدر دار العلوم کراچی

زیر ہدایت :- ذوالفقار علی

ناشر :- زکریا بکڈپو دیوبند، سہارنپور

فون نمبر :- ۰۱۳۳۶-۲۳۲۲۳

فیکس :- ۰۱۳۳۶-۲۲۹۲۲

طباعت :- اشرفی آفسیٹ پریس دیوبند

## فصل فی شروط الصلوٰۃ و ارکانہا و واجباتہا و سننہا و آدابہا







## فصل فی الامامۃ والجماعۃ

جلد دوم تمام شد



# کتاب الصلوٰۃ

## فصل فی المواقیت

**صبح صادق اور صبح کاذب کی علامت**

**سوال** (۱) ..................

علاماتِ مشہورہ صبح کاذب وصادق کی یعنی بیاض مستطیل ومستطیر معلوم ہیں دریافت طلب یہ امر ہے کہ موسم موجودہ زمانہ سرما میں بیاض مستطیل صبح کاذب کی کس وقت ظاہر ہو کر غائب ہوتی ہے، اور ابتداء بیاض مستطیل صبح صادق کی کتنے بجے پر ظاہر ہوتی ہے، گھڑیال کے حساب اور انداز سے ارشاد فرماویں، زید وعمر وعلاماتِ مذکورہ کی شناخت سے عاجز ہیں بلکہ اکثر مسلمان اس جانب کے بے علمی کی وجہ سے صبح صادق میں سحری کیا کرتے ہیں، آپ ہی کے فیصلہ پر اتفاق چاہتے ہیں؟

**الجواب**: قال فی شرح الجغمنی وقد عرف بالتجربة ان اول الصبح و آخر الشفق انما یکون اذا کان انحطاط الشمس ثمانیة عشر جزءًا اھ قال المحشی ھذا ھو المشہور ووقع فی بعض کتب ابی ریحان انہ سبعة عشر جزءًا وقیل انہ تسعة عشر جزءًا وھذا فی ابتداء الصبح الکاذب واما فی ابتداء الصبح الصادق فقد قیل ان انحطاط الشمس حینئذ خمسة عشر جزءًا اھ (ص ۱۲۷) وذکر فی رد المحتار ان التفاوت بین الفجرین وکذا بین الشفقین الاحمر والابیض انما ھو بثلث درج اھ وفی احیاء العلوم باب النوافل ویعرف (ای الفجر الصادق) بالقمر لیلتین من الشہر فان القمر یطلع مع الفجر لیلة ست وعشرین ویطلع الصبح مع غروب القمر لیلة اثنی عشر من الشہر ھذا ھو الغالب ویتطرق علیہ تفاوت فی بعض البروج اھ۔ ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع آفتاب سے ۱۸ درجہ پہلے ہوتی ہے، جس کی مقدار گھنٹوں کے حساب سے ایک گھنٹہ ۱۲ منٹ ہوتی ہے، اور صبح کاذب وصادق میں تین درجہ کا تفاوت ہے، یعنی صبح کاذب صبح صادق سے ۱۲ منٹ پہلے ہوتی ہے، لیکن احتیاط یہ ہے کہ سحری طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ترک کر دی جائے، اور صبح صادق کے پہچاننے کی ترکیب یہ ہے کہ ہر مہینہ

میں دورات چاند کے طلوع وغروب کو دیکھ لیا جائے، اور وہ دو راتیں بارہویں اور چھبیسویں راتیں ہیں، بارہویں شب میں چاند کے غروب ہوتے ہی صبح صادق ہو جاتی ہے، اور چھبیسویں شب میں صبح صادق کے ساتھ ساتھ چاند طلوع ہوتا ہے، ان دو راتوں کے تجربہ سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ طلوع فجر اور طلوع شمس میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے، لیکن ہمارا عمل اس پر ہے کہ آفتاب کے طلوع ہونے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سحری ترک کر دیتے ہیں، واللہ اعلم،

یہاں آجکل ریلوے ٹائم سے ۵ بجکر ۵۰ منٹ پر صبح ہو جاتی ہے، لیکن ملک برار کے طلوع وغروب یہاں کے طلوع وغروب سے متفاوت ہے، اس لئے وہاں اس پر عمل نہیں ہو سکتا،

**عصر کے وقت کی ابتداء کی تحقیق**

**سوال** (۲) امر ضروری یہ ہے کہ عصر کے وقت شروع ہونے کے متعلق علماء دین و شرع متین کیا فرماتے ہیں، آیا امام صاحبؒ کے قول کی بناء پر وقت مثلین سایہ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، بر بناء قول صاحبینؒ کے مثل سایہ پر، ان دونوں اقوال میں حنفیوں کا فتویٰ جس پر ہو تحریر فرمایا جائے، اگر احناف کا عمل امام صاحب کے قول مثلین پر ہے تو حنفی جناب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی مثل والی حدیث کا کیا جواب دیتے ہیں، کارڈ میں جگہ ہونے کی صورت میں اگر مسئلہ مذکور کی قدرے دلیل بھی ارقام فرمادیں تو نہایت ممنونِ احسان ہوں گا اور تابعدار کی تشفیِ خاطر کا باعث

جناب مولانا سخاوت علی صاحب مہاجر مدنی جونپوری مرحوم مغفور اپنے رسالہ مسمّٰی بعرف الاوقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ حنفیوں کا عمل در آمد صاحبین کے قول مثل سایہ پر ہونا چاہئے، اس لئے کہ امام صاحب آخر زمانہ میں اس قول کی طرف رجوع ہوئے ہیں، آخر یہ کہاں تک صحیح ہے، واقع میں یہ صحیح ہے کہ امام صاحب آخر وقت میں صاحبین کے قول کیطرف رجوع ہو گئے تھے یا نہیں؟ مولانا موصوف کی تحریر تابعدار کے لئے کافی طور پر تسلی بخش اس لئے نہیں ہوئی کہ مولانا کے عقائد اور میرے عقائد میں فرق ہے، یعنی بندہ تقلید کا قائل ہے اور مولانا اس کے خلاف تھے، محض خادم کو اس مسئلہ کے متعلق حنفیوں کی یہاں کی تحقیق مقصود ہے۔

**الجواب**: قال فی مراقی الفلاح ووقت الظهر من زوال الشمس الی وقت العصر وفیه روایتان عن الامام فی روایة الی قبیل ان یصیر ظل کل شیٔ مثلیه سوی فیٔ الزوال لتعارض الآثار وهو الصحیح وعلیه جل المشائخ والمتون اھ قال المحشی الطحطاوی قوله لتعارض الآثار بیانه ان قوله صلی الله علیه وسلم فی



۲

الحدیث المتفق علیه ابردوا بالظهر فان شدة الحر من فیح جهنم یقتضی تاخیر الظهر عن المثل لان اشد الحر فی دیارهم وقت المثل وحدیث امامة جبریل فی الیوم الاول یقتضی انتهاء وقت الظهر بخروج المثل لانه صلی به صلی الله علیه وسلم العصر فی اول المثل الثانی فحصل التعارض بینهما فلا یخرج وقت الظهر بالشك وتمامه فی المطولات اھ ص ۹۱۱، قلت وفی حدیث امامة جبریل اضطراب ایضا کما بینته فی الجزء الثانی من احیاء السنن قال و قوله وهو الصحیح صححه جمهور اهل المذهب وقول الطحاوی وبقولهما ناخذ یدل علی انه المذهب وفی البرهان قولهما هو الاظهر فقد اختلف الترجیح اھ قال فی مراقی الفلاح والروایة الثانیة اشار الیهما بقوله او مثله مرة واحدة سوی ظل الاستواء واختار الثانی الطحاوی وهو قول الصاحبین ابی یوسف و محمد لامامة جبریل العصر فیه ولکن علمت ان اکثر المشائخ علی اشتراط بلوغ الظل مثلیه والاخذ به احوط لبراءة الذمة بیقین اذ تقدیم الصلوٰة عن وقتها لا یصح وتصح اذا خرج وقتها فکیف والوقت باق اتفاقا،

ان عبارات سے چند امور مستفاد ہوئے (۱) امام صاحبؒ سے بھی ایک روایت مثلِ واحد کی ہے، (۲) حنفیہ نے دونوں روایتوں کی تصحیح کی ہے، ترجیح میں اختلاف ہے (۳) لیکن احتیاطاً جمہور مشائخ حنفیہ کا عمل مثلین کی روایت پر ہے، (بلکہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر کسی مسجد میں عصر کی نماز مثل واحد پر ہوتی ہے، اور مثلین کے انتظار سے فوت جماعت لازم آتا ہو تو افضل بلکہ لازم یہ ہے کہ مثلین کا انتظار کرے اور تنہا نماز پڑھے، وهذا نصه، قوله وعلیه عمل الناس الیوم ای فی کثیر من البلاد والاحسن ما فی السراج عن شیخ الاسلام ان الاحتیاط ان لا یؤخر الظهر الی المثل وان لا یصلی العصر حتی یبلغ المثلین لیکون مؤدیا للصلوتین فی وقتهما بالاجماع،

وانظر هل اذا لزم من تاخیر العصر الی المثلین فوت الجماعة یکون الاولی التاخیر ام لا والظاهر الاول بل یلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام تأمل، ثم رأیت فی آخر شرح المنیه ناقلا عن بعض الفتاوی انه لو کان امام محلته یصلی العشاء قبل غیاب الشفق الابیض فالافضل ان یصلیها

وحل کا بعد البیاض اھ ص ۲، ۳ ج ۱) ان عبارات میں حدیث جبرئیل کا جواب بھی مذکور ہے، اور ہم کو امام صاحب کا آخر عمر میں صاحبین کے قول کی طرف رجوع کرنا ثابت نہیں ہوا، مولانا سخاوت علی صاحب نے کسی کتاب کا حوالہ لکھا ہو تو بتلایا جاوے، ورنہ محض ان کا لکھدینا کافی نہیں شامی نے شفق احمر کے مسئلہ میں لکھا ہے کہ امامؒ نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، پھر بعد میں اس کو بھی رد کر دیا ہے، ص ۳، ۳ ج ۱، مثلین کے مسئلہ میں امام کا رجوع ثابت نہیں،

۳ر شوال سنہ ۴۰ھ

**سایۂ اصلی اور مثلین کا بیان**

**سوال** (۳) عصر کے وقت اکثر کتابوں میں یہی دیکھا گیا ہے کہ سوائے سایۂ اصلی کے دو سایہ ہو جاوے تب عصر کا وقت ہوتا ہے، تو ٹھیک اول وقت کا معلوم کرنے کے لئے آسان طریقہ کیا ہے؟ کیونکہ سایۂ اصلی ہمیشہ کم زیادہ ہوا کرتا ہے، اور روزانہ اصلی سایہ اور عصر کے وقت کا ناپنا بہت ہی دقت و پریشانی ہے، اس لئے دریافت طلب ہے کہ لکڑی سے سایہ ناپا نہ جاوے، اور ٹھیک اول وقت بھی معلوم ہو جاوے، جس طرح دوپہر کو آفتاب ڈھل گیا، ظہر کا وقت ہوا آفتاب غروب ہوا، مغرب کا وقت ہوا، اسی طرح کوئی آسان طریقہ بتلادیں، کیونکہ کئی مرتبہ تجربہ کیا گیا ہے تو اذان بے وقت ہوتی ہے، کبھی جماعت بھی ہوتی ہے، آزمائش سے ٹھیک وقت نہیں ہوتا، ۱؎ سوائے اصلی سایہ کے دو سایہ کا ہونا یہ قید کا ہونا بارہ ماہ کے لئے ہے یا صرف ایام دھوپ کے لئے ہے بدلیل تحریر فرمادیں، ۲؎ اگر یہ قید بارہ ماہ کے لئے ہے تو ایام بارش میں کس طرح سے معلوم کیا جاوے، اور گھڑی کا شریعت میں اعتبار نہیں کیا گیا ہے، ۳؎ ابر کے دنوں میں سوائے اصلی سایہ کے دو سایہ کا ہونا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، تو وہ دلیل کس کتاب میں ہے تحریر فرمادیں، ۴؎ ابر میں عصر کی نماز دیر کر کے پڑھنے کا حکم ہے تو کیا حد ہے جو اس حد سے ہم دیر کر کے نماز پڑھیں، حد معلوم کرنے کی پہچان خوب خلاصہ تحریر فرمادیں معہ دلیل کے،

**الجواب**: سایہ اصلی اور دو مثل کی پہچان کا طریقہ کسی عالم کی زبانی سمجھ لیں تحریر سے سمجھ میں نہ آئے گا، آسان بات یہ ہے کہ جب دن بہت چھوٹا ہو اس وقت عصر کی نماز غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے پڑھ لیا کریں، اور جب دن بہت بڑا ہو تو غروب سے ۱½ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے عصر پڑھا کریں، اور درمیانی دنوں میں ایک گھنٹہ پہلے غروب سے پڑھا کریں، اس طریقہ پر عصر ہمیشہ دو مثل کے بعد ہوا کریگی، دو مثل کے بعد عصر پڑھنے کا حکم ہر زمانہ میں ہے خواہ ابر ہو یا نہ ہو،



**سایۂ اصلی کے متعلق فتویٰ کس پر ہے**

**سوال** (۴) سایہ اصلی کے متعلق فتویٰ کس پر ہے، جواب بدلیل تحریر فرمادیں؟

**الجواب**: فتویٰ اس پر ہے کہ ظہر کی نماز ایک مثل سے پہلے پڑھے اور عصر کی نماز دو مثل کے بعد پڑھے، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ بامر سیدی حکیم الامت دام مجدہم، رشعبان سنہ ۴۱ھ

**جہاں چھ ماہ کا دن ہوتا ہو اور چھ ماہ کی رات ہو وہاں نماز کس طرح ادا کی جائے**

**سوال** (۵) میں سیاح گو پہلے سے ہوں اور یہاں لوگ تعطیل میں عموماً ادھر ادھر سیر کرنے چلے جاتے ہیں، میں احتیاطاً ایک مسئلہ دریافت کرتا ہوں، شاید کبھی وہاں بھی چلا جاؤں، وہ یہ ہے کہ انگلستان کے اوپر چند ایسی جگہ ہیں جہاں ۶ ماہ سورج رہتا ہے اور ۶ ماہ نہیں رہتا، مجھے خود بھی تحقیق نہیں، نہ معلوم کہ سورج ڈوبتا بھی ہے یا نہیں، اتنا ضرور معلوم ہے کہ موسم گرما میں لوگ کالے پردے لگا کر مکانات میں رات بناتے ہیں، ورنہ تو پوری موسم گرما اتنی روشنی رہتی ہے کہ سونا مشکل ہوتا ہے، موسم سرما میں اتنا اندھیرا رہتا ہے کہ ہمیشہ روشنی سے کام لیا جاتا ہے، وہاں نماز کی کیا صورت ہو، موسم سرما میں تو وہاں جانا مشکل ہے کیونکہ بے انتہا سردی رہتی ہے، یہانتک کہ موسم گرما میں بھی برف جمی رہتی ہے، اگر کبھی گیا تو موسم گرما میں جانا ہوگا، جبکہ سورج غروب نہیں ہوتا،

**الجواب**: قال فی الدر وفاقد وقتهما کبلغار مکلف بهما فیقدر لهما ولا ینوی القضاء لفقد وقت الاداء به افتی البرهان الکبیر واختاره الکمال وتبعه ابن الشحنه فی الغازة فصححه اه ملخصاً، قال الشامی فی بیان الدلیل علیه وما روی انه صلی الله علیه وسلم ذکر الدجال قلنا ما لبثه فی الارض قال اربعون یوما یوم کسنة ویوم کشهر ویوم کجمعة وسائر ایامه کایامکم قلنا یا رسول الله فذلك الیوم الذی کسنة اتکفینا فیه صلوة یوم قال لا اقدروا له رواه مسلم اھ ص ۳۷۶ ج ۱ وقال فی ص ۳۷۸ ج ۱ والحاصل انهما قولان مصححان ویتأید القول بالوجوب بانه قال به امام مجتهد وهو الامام الشافعی کما نقله فی الحلیة عن المتولی عنه اھ جن مقامات میں ۶ ماہ دن اور ۶ ماہ رات ہوتی ہے وہاں وقت کا اندازہ کر کے ہر چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازیں الگ الگ فصل کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے مختار قول یہی ہے، واللہ اعلم، ۱۰ر شعبان سنہ ۴۱ھ

**لندن میں نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کے متعلق ایک سوال،**

**سوال** (۶) گرمیوں میں لندن میں سورج ۹ ۳/۴ بجے غروب ہوتا ہے، تو گویا اس وقت مغرب کی نماز ادا کی عشاء کا وقت مغرب کے ۱ ۱/۲ گھنٹہ کے بعد ہوتا ہے تو اس کے لئے ۱۱ ۱/۴ بجے تک انتظار کرنا پڑتا ہے، اس سے پہلے سو نہیں سکتے، اس صورت میں کیا ہو، کیونکہ نماز پڑھنے کے بعد کہیں ۱۱ ۳/۴ بجے سونے جا سکتے ہیں اور پھر ۱۲ بجے کے بعد نیند آتی ہے، ویسے تو عموماً اتنی دیر تک پڑھتا رہتا ہوں لیکن پھر صبح کا وقت ضائع ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر جلد نہیں اُٹھ سکتا، ان دنوں میں فجر کی نماز کا وقت قریب ۲ ۱/۲ بجے ہوتا ہے، کیونکہ سورج ۳ بجے نکلتا ہے، میرا ہندوستان میں ۵ بجے یا ۶ بجے اٹھنا دشوار تھا ۳ بجے کون اٹھائے گا، اگر میرا کالج ۱ بجے شروع ہوا کرتا تو میں ۲ ۱/۲ بجے تک پڑھتا رہا کرتا، اس صورت میں عشاء اور فجر دونوں مل جائیں، اور پھر ۳ بجے سے ۱ بجے تک سوتا، لیکن یہ بھی مشکل ہے، غرض ان تمام باتوں سے ضرور مطلع کیجئے گا کہ میں کیا کروں؟

**الجواب:** اس صورت میں جبکہ غروب کے بعد ۵ گھنٹہ رات ہوتی ہے، لندن والوں پر مغرب و عشاء و فجر تینوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھنی واجب ہیں، اس صورت پر سائل نے جو اشکال کیا ہے کہ عشاء پڑھ کر ۱۲ بجے سونا ملے گا تو ۲ ۱/۲ بجے جاگنا دشوار ہوگا اس کے متعلق چند باتیں معروض ہیں، (۱) دن میں کوئی وقت فرصت کا نکال کر جس میں بہتر وقت دوپہر کا ہے خوب سو لیا کریں، (۲) الارم کی گھڑی کو صبح کے وقت پر لگا کر سویا کریں آنکھ ضرور کھل جائے گی (۳) عشاء کی نماز غروب کے ایک گھنٹہ بعد معاً پڑھ لیا کریں، صاحبین کے مذہب پر شفقِ احمر کے غائب ہو جانے سے عشاء کا وقت ہو جاتا ہے، اور شفقِ احمر غروب کے بعد ایک گھنٹہ میں غائب ہو جاتی ہے، اور سہولت کے لئے فتویٰ قول صاحبین پر دیا گیا ہے گو احتیاط بعد شفقِ بیاض کے پڑھنے میں ہے، مگر ضرورت کے وقت قول صاحبین پر عمل کر لینا بھی جائز ہے، پس غروب سے ایک گھنٹہ بعد نمازِ عشاء پڑھ کر فوراً سو رہا کریں، اس طرح سائل کو ۱۱ بجے سونا مل جائے گا، واللہ اعلم، ۱۰ / شعبان سنہ ۴۱ھ

**نصف شب کے بعد عشاء کی نماز ادا کرنے کا حکم!!**

**سوال** (۷) مجموع الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ نصف شب کے بعد اگر کوئی عشاء کی نماز پڑھے تو اس کا اعادہ صبح کو واجب ہے، اور حضرت والا بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں کہ مغرب کے بعد سرخی مٹ جانے کے بعد سے



صبح صادق تک عشاء کا وقت باقی رہتا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتی، اگر اتفاقاً کبھی نصف شب کے بعد عشاء پڑھی جائے تو صبح کو پھر اعادہ کرنا ضرور ہوگا یا نہیں؟

**الجواب:** بعد نصف شب کے عشاء کی نماز درست تو ہے اور وہ ادا صحیح ہو جاتی ہے مگر بلا عذر اتنی تاخیر کرنا مکروہ ہے، باقی اعادہ کا واجب ہونا یہ غلط ہے، کیونکہ اعادہ اس جگہ واجب ہوتا ہے جہاں صلوٰۃ معادہ صلوٰۃ اولیٰ سے اکمل ہو سکتی ہو اور یہاں صلوٰۃ معادہ بعد الفجر صلوٰۃ اولیٰ سے انقص ہوگی، کیونکہ اُولیٰ ادا ہے اور ثانیہ قضاء، و شتان بینہما، اس تاخیر سے استغفار کرنا چاہئے اگر بلا عذر ہو اور عذر سے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، واللہ اعلم،

**غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء پڑھنے کا حکم،**

**سوال** (۸) حضور اقدس نے امداد الفتاویٰ جلد اول میں وقت عشاء غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد تحریر فرمایا ہے بادی النظر میں شبہ سا ہوتا ہے، خوب سمجھ میں نہیں آتا، اس فرمان واجب الاذعان کے موافق اگر کوئی شخص غروبِ آفتاب سے گھنٹہ یا سوا گھنٹہ کے بعد مغرب پڑھے تو درست ہونا چاہئے، مگر مشاہدہ نہیں مانتا، براہ کرم ذرا مکرر تفصیل فرما دی جاوے، غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ کی مدت بہت زیادہ سی معلوم ہوتی ہے،

**الجواب:** اس کا مطلب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عشاء کی نماز غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ گذرنے پر پڑھنا چاہئے، عشاء اس سے پہلے نہ پڑھے، یہ مطلب نہیں کہ مغرب کی نماز اتنی دیر تک درست ہے، چنانچہ عبارتِ سوال کو دیکھ کر کہ سائل نماز عشاء پڑھنے کے لئے وقتِ عشاء دریافت کر رہا ہے، (ص ۶۴) یہ مطلب ظاہر ہے جو ہم نے بیان کیا،

**نماز عیدین کا مستحب وقت کونسا ہے**

**سوال** (۹) ۱۔ نمازِ عیدین کا مستحب وقت بحساب گھنٹہ و منٹ کے طلوع سے کس قدر بعد شروع ہوتا ہے اور کتنی دیر رہتا ہے؟

۲۔ نماز عیدین میں وقت مستحب کی پابندی شرعاً اَولیٰ ہے یا کثرت نمازیوں کی امید پر وقت مستحب سے تجاوز اور تاخیر اَولیٰ ہے؟

۳۔ وقت مستحب پر اس طرح عامل ہونے میں کہ اس سے تجاوز ہی نہ ہو فرضیت کے مرتبہ میں قرار دینا ہے یا نہیں؟

۴۔ نماز عیدین کا وقت بحساب فی گھنٹہ و منٹ کے کس وقت مکروہ ہوتا ہے؟

**الجواب:** طلوع آفتاب سے دس منٹ کے بعد وقت شروع ہو جاتا ہے اور نصف النہار

تک رہتا ہے، یعنی نصف النہار سے پہلے پہلے قال فی الدر ووقتہا من الارتفاع قدر رمح فلا تصح قبلہ الی الزوال باسقاط الغایۃ فلو زالت الشمس فی اثناءھا فسدت اھ قال الشامی قولہ قدر رمح ھو اثنا عشر شبراً والمراد بہ وقت حل النافلۃ اھ (ص ۸۰۷ ج ۱) قلت وجربنا ارتفاعہا عن الافق ربل شیئاً زائداً علیہ فی عشر دقائق واللہ اعلم

۲، جماعات میں عموماً نمازیوں کی کثرت کا لحاظ اولیٰ ہے، پس وقت مذکور کے اندر اندر کوئی ایسا وقت نماز کا معین کیا جائے جس میں نمازیوں کی غالب تعداد شریک ہو جائے، مگر اس کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دیہات والوں کی رعایت سے نماز میں اتنی زیادہ دیر نہ کی جائے جس سے شہر والوں کو تکلیف ہونے لگے، کیونکہ دیہات والوں پر جماعت عید واجب نہیں، محض ثواب اور مستحب ہی، پس اہلِ استحباب کی رعایت سے اہلِ وجوب کو تنگی اور پریشانی میں ڈالنا مکروہ ہے،

نیز بقر عید کی نماز عید الفطر کی نماز سے سویرے پڑھنا چاہئے، کیونکہ شہر والے بعد نماز کے قربانی کرتے ہیں تو نماز کی تاخیر سے اُن کو قربانی میں تاخیر ہوگی، جس سے تکلیف ہوتی ہے، قال فی رد المحتار ینب تعجیل الاضحیٰ لتعجیل الاضاحی وتاخیر الفطر لیؤدی الفطرۃ کما فی البحر (ص ۸۰۷ ج ۱)

۳، سوال سوم سمجھ میں نہیں آیا، معلوم نہیں سائل وقت مستحب کس کو سمجھے ہوئے ہیں اور اس پر جو لوگ پابندی کرتے ہیں، اُن کے پاس اس پابندی کی کوئی وجہ ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ کسی مصلحت کی وجہ سے پابندی ہو، اس لئے مبہم سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا،

۴، عیدین کے متعلق وقت کراہت بلندیِ آفتاب سے پہلے اور زوالِ آفتاب کا وقت ہے کما مر، ۵ ر ذی الحجہ ۴۳ھ،

**جمعہ کے دن ٹھیک دوپہر کو نماز تسبیح پڑھنے کا حکم**

**سوال (۱۰)** مسئلہ یہ ہے کہ میں سہارنپور گیا تھا وہاں جا کر دیکھا تو جمعہ مسجد میں جمعہ کے وقت ٹھیک دوپہر بارہ بجے صلوٰۃ التسبیح پڑھنے لگے، میں نے کہا کہ زوال کے وقت سجدہ کرنا حرام ہے، انھوں نے کہا کہ جمعہ کو جائز ہے تم دریافت کرو، آپ فرمادیں کہ یہ کہاں تک درست ہے؟

**الجواب:** امام ابو یوسف رح کے نزدیک جمعہ کے دن ٹھیک دوپہر کو نماز پڑھنا جائز



ہے، اور بعض علماء نے اُن کے قول پر فتویٰ بھی دیا ہے، لیکن ہمارے اور اکثر محقق فقہاء و علماء کے نزدیک امام صاحب رح کے قول پر فتویٰ ہے، کہ جمعہ کے دن بھی مثل اور دنوں کے اس وقت نماز جائز نہیں، جیسا کہ شامی اور بدائع میں مصرح ہے، بوجہ طوالت کارڈ میں عبارت نہیں لکھی گئی،

**نوٹ:** ٹھیک دوپہر ریلوے کے بارہ بجے نہیں ہوتا، بلکہ کچھ منٹ بعد ہوتا ہے، اور ہر موسم میں کچھ فرق ہوتا رہتا ہے، کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ ۶ ر ربیع الثانی ۴۵ھ

**آخر عصر میں اسی روز کی عصر ادا کرنا،**

**سوال (۱۱)** کتاب علم الفقہ میں لکھا ہے کہ نماز اسی دن کی عصر کی مکروہ وقت یعنی قریب غروب آفتاب پڑھنا کراہتِ تحریمیہ کے ساتھ ہے، جس کا باطل کر کے اچھے وقت ادا کرنا واجب ہے، کیا یہ صحیح ہے، اور قابلِ عمل ہے، اکثر لوگ بوجہ عدیم الفرصتی اپنے پیشہ کے مکروہ وقت میں نماز ادا کرتے ہیں تو کیا انکو اعادہ کر لینا چاہئے؟

**الجواب:** یہ تو صحیح ہے کہ اُس وقت عصر کی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اور اس قدر دیر کرنا سخت گناہ ہے، لیکن اس عصر کو اس وقت توڑ دینا اور اس کو دوبارہ پڑھنا جو علم الفقہ میں لکھا ہے صحیح نہیں، غالباً مؤلف سلمہ نے شامی سے لیا ہے، اُس میں اس موقع پر عبارت شبہ میں ڈالنے والی ہے، مؤلف کا ذہن اس طرف گیا، لیکن شامی نے طحطاوی کا حوالہ دیا ہے، اس میں دیکھا تو صاف موجود ہے کہ عصر کو اسی وقت پڑھے، نہ قطع کرے اور نہ دوبارہ پڑھنا واجب ہے، کیونکہ شامی میں ہے الاصلوٰۃ جنازۃ حضرت فیہا وسجدۃ تلیت آیتہا فیہا وعصر یومہ والنفل والنذر المقیدین بہا وقضاء ما شرع بہ فیہا ثم افسدہ فتنعقد ھذہ الستۃ بلا کراھۃ اصلا فی الاولیٰ منہا مع الکراھۃ التنزیہ فی الثانیۃ و التحریمیۃ فی الثالثۃ وکذا فی البواقی لکن مع وجوب القطع والقضاء فی وقت غیر مکروہ (ص ۳۸۷ ج ۱) اس میں مع وجوب الخ فقط بواقی کے ساتھ ہے، ثالثہ کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے جیسا کہ مؤلف علم الفقہ نے خیال کیا ہے، چنانچہ طحطاوی میں ہے فیجب القطع والقضاء فی غیر النوعین الاعصر یومہ فانہ لایجوز قطعہ الخ کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ ر شعبان ۴۸ھ

**وقت عشاء و فجر کے بارے میں**

**سوال (۱۲)** آیا جناب کے علم میں گھڑی کے حساب سے کچھ وقت مقرر ہے کہ آجکل رمضان میں غروب شمس سے کتنی دیر کے بعد وقت عشاء کا شروع ہو جاتا ہے اور مختلف فیہ کب سے اور متفق علیہ کب سے اور ایسے ہی صبح صادق سے طلوع شمس تک

کتنا وقت ہے؟

**الجواب**: ہر موسم میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے، مابین غروب و وقتِ عشاء، اور مابین فجر و طلوع بھی، اور ہر زمانہ میں جو قدرے تفاوت ہوتا ہے وہ مظاہر حق سے یا اسلامی جنتری سے جو سہارنپور میں ملتی ہو معلوم کریں، کتبہ احقر عبد الکریم ۱۵ / رمضان ۱۳۴۸ھ

**جمعہ کے دن زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم**

سوال (۱۳) ............ زوال کے وقت نماز پڑھنے کے متعلق جمعہ کے دن درمختار میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ نقل کیا ہے، مگر علامہ شامیؒ نے اس کو مخدوش کر دیا ہے، لیکن خود کوئی فیصلہ نہیں کیا، اب قولِ فیصل کیا ہے؟

**الجواب**: علامہ شامی نے صاف طور پر ترجیح دی ہے قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کو، اور فتح القدیر نے جو قول ابو یوسف کو ظاہراً ترجیح دی ہے اس کے متعلق لکھا ہے لکن لم یعول علیہ فی شرح المنیة والامداد علی ان ہذا لیس من المواضع التی یحمل فیہا المطلق علی المقید کما یعلم من الاصول وایضا فان حدیث النہی صحیح رواہ مسلم وغیرہ فیقدم بصحتہ واتفاق الائمة علی العمل بہ وکونہ حاظرا الخ اور اخیر میں اپنی تائید کے لئے تحریر فرماتے ہیں، ورأیت فی البدائع ایضا ما نصہ وما ورد من النہی الا بمکة شاذ لا یقبل فی معارضة المشہور وکذا روایة استثناء یوم الجمعة غریب فلا یجوز تخصیص المشہور بہ اھ، وللہ الحمد اس سے صاف واضح ہے کہ راجح قول امام صاحبؒ کا ہے، اور جمعہ کو بھی دیگر ایام کی طرح استواء کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے، ۳ / ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

**صلوٰۃ خمسہ کے اوقاتِ مستحبہ**

سوال (۱۴) (۱) نماز فجر کا وقت مستحب طلوعِ آفتاب سے کس قدر قبل ہے؟ (۲) نماز ظہر کا وقت مستحب نصف النہار سے کس قدر بعد ہے؟ (۳) نماز عصر کا وقت مستحب غروبِ آفتاب سے کس قدر قبل ہے؟ (۴) نماز مغرب کے وقت غروب سے کس قدر بعد تک رہتا ہے؟ (۵) نماز عشاء کا وقت مستحب ثلث لیل ہے یا سدس لیل، اور تعیین لیل غروب آفتاب تا صبح صادق سے کیا جاوے گا یا غروب آفتاب تا طلوعِ آفتاب سے؟

**الجواب**: نماز فجر میں اسفار مستحب ہے، یعنی روشنی پھیلنے سے پہلے شروع نہ کی جاوے، وھو المختار کما فی الدر المختار وھو ظاہر الروایة کما فی البحر عن العنایة خلافا



للطحاوی فانہ قال ان کان من عزمہ تطویل القراءة فالافضل ان یبدأ بالتغلیس ویختم بالاسفار وان لم یکن من عزمہ تطویل القراءة فالاسفار ای الابتداء فی الاسفار افضل من التغلیس، ووجہ المختار ان فیہ تکثیر الجماعة کما قالہ شمس الائمة فی المبسوط، اور روشنی پھیلنے کا وقت احقر نے جو تجربہ کیا تو طلوع فجر و طلوع شمس کے نصف پر ہے، اور طلوعین میں کم از کم فاصلہ ایک گھنٹہ بیس منٹ ہوتا ہے، اور زائد سے زائد ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ، پس اسفار کا وقت بعض ایام میں طلوع شمس سے ۴۰ منٹ پیشتر ہوگا، اور بعض ایام میں تقریباً ۵۰ منٹ، جیسا کہ اسلامی جنتری سہارنپور سے واضح ہے، یہ تو نماز فجر کے وقت مستحب کی ابتداء ہے، اور انتہاء کے متعلق شامی میں ہے وحد الاسفار ان یمکنہ اعادة الطہارة ولو من حدث اکبر کما فی النہر والقہستانی واعادة الصلوة علی الحالة الاولیٰ قبل طلوع الشمس (ای بحیث یرتل اربعین آیة الی ستین) اور اس کا تخمینہ آدھا گھنٹہ کیا گیا ہے، پس وقت مستحب کا انتہائی حصہ یہ ہے کہ جب نماز شروع کی جاوے اس وقت کم از کم نصف گھنٹہ طلوع آفتاب[ع] میں باقی ہو،

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ وقتِ مستحب کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا وقت معین نہیں ہے، جس میں ذرا سی کمی بیشی سے یہ فضیلت فوت ہو جاوے، بلکہ بعض ایام میں طلوع آفتاب سے ۴۰ منٹ پہلے شروع کرنا بھی وقت مستحب کی حد میں داخل ہے، اور بعض میں ۵۰ منٹ قبل طلوع بھی، اور علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وقت فجر کا کوئی حصہ مکروہ نہیں، پس اگر کوئی اسفار سے قبل نماز پڑھے یا زیادہ تاخیر کر دے تو اس پر ملامت نہیں،

(۲) نصف النہار استواء شمس کا وقت ہے، اس سے دو منٹ بعد زوال شروع ہوتا ہے اور نصف النہار سے پانچ منٹ بعد دلوک شمس محسوس ہو جاتا ہے، پس وقتِ ظہر کی ابتداء نصف النہار سے ۵ منٹ بعد ہے، مگر نماز پڑھنے میں یہ تفصیل ہے کہ نماز ظہر سردی میں جلدی پڑھنا مستحب ہے، اور گرمی میں دیر سے پڑھنا اور تعجیل و تاخیر کی حد یہ ہے کہ نصف اول میں پڑھنا

---

ل ثم رأیت فی البحر عن السراج الوہاج وحد الاسفار ان یصلی فی النصف الثانی والحمد للہ علی ذلک ۱۲ منہ

عہ سہارنپور دیوبند وغیرہ میں اسی پر عمل ہے، کہ نماز شروع کرنے کے وقت ۳۰ منٹ سے کم باقی نہیں ہوتے، اور ۴۰ - ۴۵ سے زیادہ نہیں ہوتے، ۱۲ منہ

تعجیل ہے اور نصف ثانی پڑھنا تاخیر ہے، کما نقلہ صاحب البحر عن الاسرار (ص ۲۴۸) اور ظہر کا وقت متفق علیہ ہے ایک مثل تک ہی، پس سردی میں تو ایک مثل کے نصف اول میں پڑھنا چاہئے، اور گرمی میں نصف ثانی میں، اور ہمارے دیار میں جو معمول ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے چنانچہ سردی میں دھوپ گھڑی سے تقریباً تین بجے تک ایک مثل ہے، اور دھوپ گھڑی کے حساب سے ڈیڑھ بجے سے پیشتر جماعت ہو جکتی ہے، جو یقیناً نصف اول ہے، اور گرمی میں پونے چار تک ایک مثل ہے، اور نماز دو بجے کے بعد پڑھنے کا معمول ہے، جو یقیناً نصف ثانی ہے، اور درمیانی زمانہ میں، تھوڑا تھوڑا تفاوت ہوتا رہتا ہے، کما لا یخفی،

(۳) وقتِ عصر کی ابتدا، اور وقت ظہر کی انتہا میں اختلاف ہے، صاحبین کے نزدیک ایک مثل پر ظہر کا وقت ختم ہو کر عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور امام صاحب کے نزدیک مشہور روایت کی بنا پر دو مثل پر وقتِ ظہر ختم ہوتا ہے، اور وقتِ عصر شروع ہوتا ہے، اور ایک روایت امام صاحب سے یہ بھی ہے کہ وقتِ ظہر تو ایک مثل پر ختم ہو جاتا ہے، مگر وقتِ عصر دو مثل پر شروع ہوتا ہے، اکثر مشائخ نے احتیاط کی وجہ سے اسی قول کو لیا ہے، اور ہمارے اکابر کا عمل بھی اسی پر ہے، اور جب وقتِ عصر کی ابتدا میں اختلاف ہے تو وقتِ مستحب کے شروع ہونے میں بھی اختلاف ہوگا، یعنی صاحبین کے نزدیک ایک مثل سے غروب آفتاب تک جس قدر وقت ہے اس کے نصف اخیر میں نماز پڑھنا مستحب ہے، اور امام صاحب کے قول پر دو مثل سے غروب تک جتنا وقت ہے اس کے نصف اخیر میں، اور ہمارے دیار میں جس وقت نماز پڑھنے کا معمول ہے وہ صاحبین کے نزدیک وقت عصر کا نصف اخیر ہے، اور امام صاحب کے نزدیک نصف اول یعنی قولِ امام کی رعایت اس معمول میں نہیں ہے، حالانکہ ظہر میں اس کی رعایت کی گئی ہے، کما مر فی الحاشیۃ آنفاً، سو اس کی وجہ سننے یا دیکھنے میں تو

---

لہ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس معمول میں دونوں قول کی رعایت ہے، یعنی ایامِ تعجیل میں ایسے وقت نماز ہوتی ہے، جو مثلین کا بھی نصف اول ہے اور ایک مثل کا بھی، اور ایامِ تاخیر میں ایسے وقت نماز ہوتی ہے جو ایک مثل کا بھی نصف ثانی ہے اور مثلین کا بھی نصف ثانی ہے، اور چونکہ ایک مثل کے بعد وقت مختلف فیہ ہے، اور جو اس وقت کو ظہر کا وقت کہتے ہیں وہ بھی مکروہ کہتے ہیں، اس واسطے ایک مثل سے پہلے پہلے ظہر پڑھی جاتی ہے،



نہیں آئی، مگر غالب خیال یہ ہے کہ تاخیرِ ظہر میں تو ابراد مقصود ہے، اس کے واسطے قولِ امام کی رعایت ضروری ہے، اور تاخیرِ عصر کا جو مقصود ہے یعنی نوافل کے لئے گنجائش دینا وہ ایسے وقت پڑھنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے جو قول صاحبین کی بنا پر نصف اخیر ہو، اور امام صاحب کے قول پر اول وقت ہو، واللہ اعلم بالصواب،

اور وقتِ مستحب کی انتہا اصفرارِ شمس تک ہے، یعنی دھوپ زرد ہو جانے تک تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور اس کا تخمینہ کبھی احقر نے تو کیا نہیں مگر مولانا یحییٰ صاحب کاندھلوی نے حضرت گنگوہی کا قول نقل کیا تھا، کہ غروب سے صرف دس منٹ پہلے دھوپ زرد ہوتی ہے، خود بھی اس کا تجربہ کر لیا جاوے،

(۴) غروب کے بعد معمولی دیر کا تو مضائقہ نہیں، لیکن تیقنِ غروب کے بعد فوراً اذان کہنا چاہئے، اور اذان و اقامت میں تھوڑا سا وقفہ بھی مامور بہ ہے جس کی مقدار تین آیتوں کا پڑھنا ہے، اور اگر اس سے زیادہ دیر کی تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اشتباکِ نجوم تک تاخیر کرنا تو مکروہ تحریمی ہے، اور اتنی دیر کرنا کہ ایک آدھ ستارہ ظاہر ہو جاوے مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر ستارہ تو کوئی ظاہر نہ ہوا ہو مگر اتنی دیر ہو گئی کہ اطمینان سے دو رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں، تو اکثر فقہاء اس قدر تاخیر کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں، کصاحب الدرر و فتح القدیر و غیرہما، ولیکن شرح منیہ اور حلیہ سے شامی نے نقل کیا ہے کہ مکروہ نہیں بلکہ مباح ہے، یعنی مستحب تو یہی ہے کہ دو رکعت کی مقدار دیر نہ کرے، لیکن اگر کسی نے دیر کی تو ظہور النجم تک کراہت نہیں، مباح ہے، خلاصہ یہ کہ اس میں اختلاف ہے کہ وقت مکروہ تنزیہی کب سے شروع ہوتا ہے، بعض کے نزدیک دو رکعت مقدار وقت گذرنے پر اور بعض کے نزدیک ظہور النجم سے، والثانی اقرب واوسع و ظاہر ما فی رد المحتار یدل ان العلامۃ الشامی مال الیہ، اور یہ سب گفتگو جب ہے جبکہ کوئی عذر نہ ہو، اور اگر عذر ہو تو پھر تاخیر میں کراہت نہیں، ومن الاعذار السفر و کونہ علی اکل کما فی الدر، پس رمضان میں افطار کی وجہ سے دیر ہونا مضائقہ نہیں، اور وقتِ مغرب کی انتہا مختلف فیہ ہے، امام صاحب کے نزدیک تو شفقِ ابیض غائب ہونے پر ختم ہوتا ہے، اور غروبِ آفتاب و شفقِ ابیض کے درمیان اتنا وقت ہوتا ہے جتنا کہ طلوعِ فجرِ صادق و طلوعِ آفتاب میں، اور صاحبین کے نزدیک شفقِ احمر تک وقتِ مغرب ہے، اس کا صحیح حساب معلوم نہیں ہے، کہ شفقِ ابیض سے کتنی دیر پیشتر غائب ہوتی ہے، کسی ریاضی داں سے دریافت کر لیا جاوے،

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

(۵) شرعًا رات غروبِ آفتاب سے طلوعِ فجر صادق تک ہے، اور مستحب یہ ہے کہ عشاء میں ثلثِ لیل تک تاخیر کی جاوے، اور ثلث سے نصف تک مباح ہے، اور نصف کے بعد مکروہ تحریمی ہے، لیکن جب ثلث تک تاخیر کرنے میں تقلیلِ جماعت کا اندیشہ ہو جیسا کہ آجکل یہ اندیشہ سب جگہ ہے، تو پھر جلدی پڑھ لینا بہتر ہے، واللہ اعلم، ۱۸ر شوال ۱۳۵۱ھ

**غروبِ آفتاب اور غروبِ شفق ابیض میں تفاوت کی تحقیق**

**سوال** (۱۵) قابلِ گذارش یہ ہے کہ مولوی عبدالکریم کا جواب ملا، میں نے چاہا تھا کہ ان کے ارشاد کے مطابق بتادوں، اور ببرکت آں قبلۂ دوجہاں بناؤں گا، مشکل یہ پیش آئی کہ اہلِ ہندسہ نے ابیض واحمر کی تفریق نہیں کی، صرف ۱۸ درجہ انعکاسِ سورج رکھے ہیں، میں نے اس سے پہلے بھی چار سال ہوئے کوشش کی تھی، اور اب پھر کوشش کی، مجھے خیال یہ آیا کہ اہلِ ہندسہ نے مشاہدات کر کے اصول بنائے ہیں میں خود کیوں نہ تجربہ کروں و مشاہدہ کروں، اور ٹھیک پتہ لگاؤں، چنانچہ ببرکت آں قبلہ میں نے مولوی شمشیر علی، ممتاز علی، حافظ بشیر احمد صاحبان کو ساتھ لے کر روزانہ غروب سے ۸ بجے تک بیٹھنا اور مشاہدہ کرنا شروع کیا، اور نظر سے جو فرق پیدا ہو سکتا تھا اس کا حساب کیا،

جو جو شفق کی شکلیں آسمان پر پیدا ہوتی ہیں ان کے مسودے اور چلتے ہوئے سرسری نقشے بنا کر پیش کر رہا ہوں:۔

صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ غروب کے ساتھ ہی ساتھ کوئی سرخی نہیں رہتی، اس کے بعد تقریبًا ۱۰ منٹ کے بعد نہایت تیزی کے ساتھ چوتھائی افق پر سرخی چھا جاتی ہے، پھر یہ سرخی طول میں گھٹتی جاتی ہے، اور اونچائی میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، اور اس کے اوپر خفیف سیاہ ڈورا آجاتا ہے، پھر یہ سرخی سمٹتی ہے، اور ایک جگہ آجاتی ہے، اور اس کے اوپر سفیدی پھیلنا شروع ہوتی ہے، اوپر سفیدی ہوتی ہے، اور نیچے سرخی کم کم، پھر یہ سرخی غائب ہوجاتی ہے، اس کے غائب ہوتے ہی دو ایک منٹ تک سناٹا ہوجاتا ہے، بعض دفعہ تو نہایت بھیانک نظر آتا ہے، اور ڈرسا لگتا ہے، اب سفیدی کا دور دورہ ہوجاتا ہے، اور مقامِ غروب سے سورج سے شمالاً وجنوبًا سفیدی پھیل جاتی ہے جو دودھ کی طرح سفید ہوتی ہے، پھر یہ سفیدی طول میں گھٹتی ہے، مگر چوڑائی میں زیادہ اور صاف ہوتی ہے،



اسکے بعد طول اور گھٹتا ہے، مگر اب اوپر ایک چھوٹی سی محراب پیدا ہوجاتی ہے، اور بعدہ سفیدی خوب روشن ہوجاتی ہے، چوڑان میں زیادہ ہوتی ہے، اور اس جگہ جہاں سورج ڈوبا تھا محراب پیدا ہوتی ہے، اور وہ سفیدی جو طول میں مقامِ غروب سے شمالاً وجنوبًا پھیلی تھی، دھیرے دھیرے غائب ہوجاتی ہے، اور صرف محراب جو ایک لمبی ستون کی طرح ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے، یہی وہ وقت ہے جس کو ہندسہ والے غروبِ شفق بتاتے ہیں، اور اس کے اختتام پر کل حضرات نے اپنی اپنی جنتریوں میں غروبِ شفق ابیض بتایا ہے،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طولاً از شمال تا جنوب شفق نہ ابیض رہا نہ احمر، مگر یہ محرابی ستون اس ابیض کے سمٹنے سے ہی تو پیدا ہوتا ہے، اس کو کیوں چھوڑ دیا جائے، یہ اگر شفقِ ابیض کا حصہ نہیں تو کیا ہے، یہ حصہ بہت دیر میں تقریبًا ۳۵ منٹ میں موسم اعتدال میں غائب ہوجاتا ہے، خادم نے جو مشاہدہ کیا اور بار بار دیکھا ہے اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ابیض کا حصہ ہے، مگر انھوں نے اس کو اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے نمودار تمام آسمان پر محیط صورت ختم ہوگئی، صرف مقامِ غروبِ آفتاب پر ایک ستون رہ گیا جس کا تمام افق پر کوئی اثر نہیں، جس طرح ریاضی میں اوسط میں کرتے ہیں یا کسرات کو چھوڑ جاتے ہیں، اگر اس ستون کو خارج کر دیا جاوے تب تو ہندسی اعداد ٹھیک ہیں، اور اگر اس کو شامل کیا جائے تو ۲۵ منٹ بعد غروب ابیض ہوگا،

اب بندگانِ عالی بتائیں کہ خادم اس کو اسی طرح ترک اور نظر انداز کردے جس طرح جدید انگریزی ہندسہ نے نظر انداز کیا ہے، یا شامل کیا جائے گا تو ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوگا، میری اوّل کی جنتریاں سب قابلِ ترمیم ہیں،

**الجواب**، گذارش آنکہ آپ کی تحریر میں غور کیا، نیز حضرت والا سے اس باب میں مراجعت کی، بالآخر یہ طے ہوا کہ غروبِ آفتاب اور غروبِ شفق ابیض میں اتنا ہی تفاوت ہوتا ہے جتنا کہ صبح کاذب اور طلوعِ آفتاب میں ہوتا ہے، یعنی ۱۸ درجے، اور جتنا تفاوت صبح کاذب وصادق میں ہوتا ہے اتنا ہی تفاوت شفق احمر وابیض کے غروب میں ہوتا ہے یعنی ۳ درجے، کتابوں میں بھی یہی ملا، چنانچہ جزء اول شرح چغمینی میں اور جزء دوم ردالمحتار میں مصرح ہے، اور مقتضائے قیاس بھی یہی ہے، پس اصل سوال کا جواب تو ہوچکا، یعنی

بیاض مستطیر کے غروب پر شفق کا غروب مانا گیا ہے، اور وہ سفیدی جو بشکل ستون ۸ اور جو کے بعد آپ نے مشاہدہ کی ہے، نظر انداز کرنے کے قابل ہے جیسا کہ سب جنتریوں میں کی گئی ہے، باقی رہا یہ سوال کہ باوجود بعد شمس عن الافق اس بیاض مستطیر کے رہنے کی کیا وجہ ہے، سو یہ علم ہیئت کی بحث سے خارج ہے، ممکن ہے کہ علم طبعیات میں اس کی کوئی وجہ مل جاوے، تلاش کی ضرورت نہیں سمجھی، کہ اس پر کوئی حکم شرعی مرتب نہیں، فقط احقر عبدالکریم عفی عنہ مورخہ ۲ رذی الحجہ ۱۳۵۱ھ،

چونکہ یہ جواب میری مشارکت اور مشاورت سے لکھا گیا ہے اس لئے میں اس میں متفق ہوں اور اس کی مزید تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ فجر سے قبل بیاض مستطیل بالیقین عشاء کا وقت ہے، اقرب الی القیاس یہ ہے کہ اسی طرح بیاض مستطیل بعد غروب بھی عشاء کا وقت ہو، واللہ اعلم، البتہ اگر کوئی نقل صحیح اس قیاس کے معارض ہوتی... تو یہ قیاس مؤثر نہ ہوتا، اور ایسی نقل مفقود ہے، اور گو یہ دلیل قطعی نہ ہو لیکن مقنع ضرور ہے کما لایخفی، اشرف علی ۲ رذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

## فصل فی الاذان والاقامۃ

**اذان کے جواب میں اللہ اکبر کے بجائے جل جلالہ کہنا**

سوال (۱) اذان سننے کے وقت سامع کو اللہ اکبر کے ساتھ جواب دینا افضل اور بہتر اور مرجح ہے، یا جل جلالہ، اور اگر جل جلالہ کہنا جائز ہے تو کوئی اس بارہ میں حدیث وارد ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب: قال فی الحصن واذا سمع المؤذن فلیقل کما یقول (ع ی) وبعد الحیعلۃ لاحول ولاقوۃ الا باللہ (ص ۸۰) اس سے معلوم ہوا کہ اذان میں اللہ اکبر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا ہی افضل ہے، لورود الامر فیہ واقلہ السنیۃ اوالاستحباب، ہاں اللہ اکبر کے بعد جل جلالہ بڑھادے تو اچھا ہے، لکونہ زیادۃ فی الثناء، باقی حدیث میں کہیں ہم کو ثابت نہیں ہوا، اور اگر اللہ اکبر نہ کہے بلکہ صرف جل جلالہ کہے تو جواز میں تو شک نہیں، لکون التکبیر فی الاذان اقل تاکدا منہ فی افتتاح الصلوٰۃ فلما جاز فیہ عند الحنفیۃ ان یقول اللہ اجل، او اعظم او الرحمن اکبر او ما یؤدی معنی التعظیم ففی الاذان اولیٰ، لیکن خلاف سنت ضرور ہے،

**بچے کے کان میں سراً اذان دینی چاہئے یا جہراً؟**

سوال (۲) مولود کے کان میں جو اذان دی جاتی ہے اسکی کیفیت کیا ہے، نماز کی اذانوں کی طرح جیسا قبلہ رُخ اور کان میں ہاتھ دینا



بلند آواز سے دینا اور مرد ہونا وغیرہ شرطیں یہاں بھی ملحوظ ہیں یا نہیں، زید کہتا ہے کچھ شرط نہیں بلکہ بچہ کو گود میں لیکر بچہ کو سنوا دینے سے کافی ہے، نہ جہر کی ضرورت ہے اور نہ قبلہ رُخ کی، آیا یہ کہنا صحیح ہے یا غلط؟

الجواب: زید کا قول صحیح ہے، کیونکہ اس اذان سے اعلام مقصود نہیں صرف تبرک مقصود ہے لہذا نہ جہر مفرط چاہئے نہ استقبالِ قبلہ کی ضرورت ہے، اور استقبال کے افضل ہونے میں شک بھی نہیں، کیونکہ مطلق ذکر میں استقبال افضل ہے، فکذا ہذا اگر لزوم کی کوئی دلیل نہیں، واللہ اعلم، ۹ رشعبان ۱۳۴۲ھ

**اذان اور اقامت میں جزم اور ہر کلمہ پر وقف کا مسنون ہونا،**

سوال (۵) اذان واقامت میں حی علی الصلوٰۃ وحی علی الصلوٰۃ اگر پہلے میں وصل کرکے حی علی الصلوٰۃ یعنی تاء کو ظاہر کیا اور ثانی حی علی الصلوٰۃ پر وقف کیا تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

الجواب: اذان واقامت میں جزم مسنون ہے، پس حی علی الصلوٰۃ وحی علی الفلاح کی تاء وحاء کو حرکت نہ دینا چاہئے بلکہ ہر کلمہ اذان پر وقف اور اقامت میں نیت وقف کرنا چاہئے کما فی مراقی الفلاح ویسکن کلمات الاذان والاقامۃ فی الاذان حقیقۃ وینوی الوقف فی الاقامۃ (لانہ لم یقف حقیقۃ لان المطلوب فیہ الحدر ۱۲ طحطاوی) لقولہ علیہ السلام الاذان جزم والاقامۃ جزم والتکبیر جزم ای لا افتتاح الصلوٰۃ اھ (ص ۱۱۱)

**مسجد کی چھت پر اذان کہنا سنت ہے یا واجب، اور بلندی پر اذان کہنے سے بے پردگی ہو تو کیا حکم ہے؟**

سوال (۶) ........................ در مختار اردو میں تحریر ہے کہ اذان بلند جگہ پر کہنی چاہئے جو اس کے خلاف کرے گا وہ گنا ہگار ہوگا، یہاں اس پر عمل ہونے سے کوئی کہتا ہے مکانوں کی بے پردگی ہوتی ہے، بے پردگی کے انتظام کے لئے کہا جاتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ قدیم سے جہاں اذان ہوتی آئی ہے وہاں ہونی چاہئے کیا پہلے دنیا میں مولوی نہیں تھے، اب نئی نئی باتیں کہاں سے نکل آئیں، اکثر اس مسجد میں علماء وں کی آمد ورفت رہی ہے، کبھی کسی صاحب نے اعتراض نہیں کیا، ایسی صورت میں بموجب شرع شریف کیا کرنا چاہئے، آیا چھت مسجد یا غسلخانہ کی چھت پر یا سقاوہ کی چھت پر یا نالیوں پر جو کہ فرش مسجد سے کسی قدر اونچی ہیں، اذان کہی جاوے، امید کہ پیمائش کی تعداد

حضور فرما کر اطلاع بخشیں، تاکہ شر رفع ہو،

**الجواب**؛ قال فی الدر وهو سنة للرجال فی مکان عال مؤکدة اھ (ص ۳۹۸ ج ۱)

قال الشامی فی القنیة ویسن الاذان فی موضع عال والاقامة علی الارض وفی اذان المغرب اختلاف المشائخ والظاهر انه یسن المکان العالی فی المغرب ایضا کما سیأتی وفی السراج وینبغی ان یؤذن فی موضع یکون اسمع للجیران ویرفع صوته ولا یجهد نفسه اھ وفی الشامیة ایضاً قال ابن سعد بالسند الی ام زید بن ثابت کان بیتی اطول بیت حول المسجد فکان بلال یؤذن فوقه من اول ما اذن الی ان بنی رسول الله صلی الله علیه وسلم مسجده فکان یؤذن بعد علی ظهر المسجد وقد رفع له شئ فوق ظهره اھ (ص ۴۰۲ ج ۱)

قلت هذا اثر حسن کما ذکرته فی الاعلاء معزیا الی ابی داؤد (ص ۱۱۰ ج ۲)

وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح ویکره ان یؤذن فی المسجد کما فی القهستانی عن النظم فان لم یکن ثمه مکان مرتفع للاذان یؤذن فی فناء المسجد اھ (ص ۱۱۴) عربی درمختار میں ہے لکھا ہے کہ اذان بلند مکان میں کہنا سنت ہے، اس میں یہ نہیں لکھا کہ جو اس کے خلاف کرے گا وہ گنہگار ہوگا، ہاں اس کے بعد مطلق اذان کے متعلق کہا ہے کہ اذان سنتِ مؤکدہ ہے کالواجب فی لحوق الاثم، لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر فرض نماز کے لئے اذان بالکل نہ دی جائے تو گناہ ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ بلند جگہ میں اذان نہ دی جائے گی تو گناہ ہوگا، خوب سمجھ لو، بہرحال اس میں شک نہیں کہ اذان کا بلند جگہ میں ہونا مسنون ہے، مگر بلند جگہ میں ہونا سنتِ مؤکدہ نہیں، بلکہ سنن زوائد سے ہے، جس کا کرنا موجبِ ثواب ہے، اور ترک سے گناہ نہیں، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال مؤذنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی چھت پر اذان دیا کرتے تھے، اور وہاں کوئی بلند جگہ اذان کے لئے اُن کے واسطے بنادی گئی تھی، لیکن ہر جگہ کے لئے یکساں بلندی نہیں مقرر ہوسکتی، بلکہ اس کا معیار اہلِ محلہ کو آواز پہونچنے پر ہے، پس جتنی بلندی سے محلّہ کے اکثر گھروں میں آواز بسہولت پہونچ جائے اُتنی بلند جگہ پر اذان دی جائے بشرطیکہ اتنی بلندی سے مسلمانوں کے گھروں کی بے پردگی نہ ہوتی ہو، اور بے پردگی ہوتی ہو تو ایسی بلند جگہ اختیار کی جائے جہاں بے پردگی نہ ہوتی ہو اور اس کا انتظام نہ ہوسکے تو پھر اذانِ مسجد کے حصۂ زیریں



۳

میں حدِ مسجد سے باہر نالی وغیرہ پر دی جائے، اور سنتِ ارتفاع کی رعایت میں محرم کا ارتکاب نہ کیا جائے، واللہ اعلم، ۱۸ ؍ صفر ۳۵ھ

**جمعہ کے روز اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں،**

**سوال (۷)** کوئی کہتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی کی اجابت اور مناجات مکروہ تحریمی ہے، کوئی کہتا ہے مکروہ تنزیہی ہے، کوئی کہتا ہے بدعت ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ مستحب ہے، لہٰذا عرض پرداز ہوں کہ کونسی بات صحیح ہے، معہ ادلّہ تحریر فرماویں گے،

**الجواب**؛ جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا مختلف فیہ ہے، صاحبین کے نزدیک جائز ہے، اور امام صاحبؒ کے قول میں مختلف روایات ہیں، ایک روایت سے کراہت معلوم ہوتی ہے اور ایک روایت سے جواز معلوم ہوتا ہے، اور طحطاوی نے اس کا اصح ہونا نقل کیا ہے، اور امام صاحبؒ سے جو یہ قول مشہور ہے کہ خروجِ امام قاطعِ صلوٰۃ وکلام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خروجِ امام قاطعِ کلام الناس ہے، اور قاطع سائر الکلام خطبہ کا شروع ہوجانا ہے، پس ابتداءِ خطبہ سے پہلے کلام دینی یعنی تسبیح وجوابِ اذان جائز ہے، وبه وردت الاحادیث ناطقة کما ذکرته فی اعلاء السنن فعن ابی هریرة مرفوعاً خروج الامام یوم الجمعة للصلوة یقطع الصلوة وکلامه یقطع الکلام اخرجه البیهقی وسنده حسن وعن ثعلبة ابن مالك القرظی انه اخبره (ای ابن شهاب) انهم کانوا فی زمن عمر ابن الخطاب یصلون الجمعة حتی یخرج عمر فاذا خرج وجلس علی المنبر واذن المؤذنون قال ثعلبة جلسنا نتحدث فاذا سکت المؤذنون وقام عمر یخطب انصتنا فلم یتکلم منا احد اخرجه مالك فی الموطاء وسنده صحیح وثعلبة مختلف فی صحبته، قال صاحب التهذیب له صحبة اھ وقال الطحطاوی فی حاشیته علی مراقی الفلاح وفی البحر عن العنایة والنهایة اختلف المشائخ علی قول الامام فی الکلام قبل الخطبة فقیل انه یکره ما کان من جنس کلام الناس اما التسبیح ونحوه فلا وقیل ذلك مکروه (ایضاً) والاول اصح ومن ثمه قال فی البرهان و خروجه قاطع للکلام ای کلام الناس عند الامام فعلم بهذا انه لا اختلاف بینهم فی جواز غیر الدنیوی علی الاصح ویحمل لفظة الکلام فی الاثر علی الدنیوی ویشهد له ما اخرجه البخاری ان معاویة رضی الله عنه اجاب المؤذن بین یدیه

فلما ان قضی التاذین قال یا ایها الناس انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علیٰ هذا المجلس حین اذن المؤذن یقول ما سمعتم من مقالتی اھ (ص ۳۰۱) والبسط فی الاعلاء (ص ۵۹ و ۶۰ و ۶۱ ج ۲) ۷ رجب ۱۳۴۵ھ

**مرضِ طاعون میں اذان دینا مشروع ہے یا نہیں؟**

**سوال (۶)** ........ مرض طاعون میں جو اکثر آدمی مسجدوں میں اذانیں دیتے ہیں، یہ شرع کے خلاف ہے یا موافق ہے، ایک مولوی صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کے بابت فرماتے ہیں کہ ان کا تو فتویٰ ہے اذانوں کا، کیا یہ بات صحیح ہے اور ان کا فتویٰ ہے؟ جواب فرماویں،

**الجواب:** قال الشامی عن حاشیة البحر للخیر الرملی رأیت فی کتب الشافعیة انه قد یسن الاذان لغیر الصلوٰۃ کما فی اذان المولود والمهموم والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان او بهیمة وعند مزدحم الجیش وعند الحریق و عند تغول الغیلان ای عند تمرد الجن لخبر صحیح فیه اقول ولا بعد فیه عندنا اھ ای لان ما صح فیه الخبر بلا معارض فهو مذهب للمجتهد وان لم ینص علیه اھ (ص ۳۹۹ ج ۱) بعض علماء نے تغول غیلان کی حدیث سے طاعون کے لئے اذان کو مشروع کہا ہے، مگر ہم کو اس میں کلام ہے، ہمارے نزدیک تغولِ غیلان سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسی صورت نمودار ہو جس میں جنات کا سامنے موجود ہونا اور غلبہ و تمرد کرنا محسوس ہو، جیساکہ رات کو سفر کرتے ہوئے بعض دفعہ جنگلوں میں جنات کی آوازیں یا ڈراونی شکلیں نظر آیا کرتی ہیں، اس وقت اذان دینا مشروع ہے، اور طاعون میں جنات کا وجود اور غلبہ محسوس نہیں ہوتا، بلکہ محض سمعًا و نقلاً معلوم ہوا ہے، واللہ اعلم، قلت ویؤید قول الشیخ فی القاموس ومجمع البحار من تفسیر التغول بالتلون بصور شتی وایضا فان فی الاذان فی هذہ الحالة تشویشا وتغلیطا وایضًا فیه تهویل للناس فانهم اذا سمعوا الاذانات بکثرۃ یفزعون ویتوهمون ان الوباء شدیدۃ فی البلد حتی سقط حمل بعض الحول بذلک قاله الشیخ لا یقال ان لم یعتقد سنیة هذا الاذان مستدلا بالحدیث المذکور لکونه محمولا علی ظهور الجن بل اذن بنیة الرقیة ینبغی ان یجوز قلنا ان العوام تعتقدہ من الامور الشرعیة الدینیة کما هو شاهد من احوالهم ومن لم یعرف حال اهل زمانه فهو جاهل فافهم، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ۲۱ شوال ۱۳۴۳ھ، نعم التحقیق بقبول حقیق، کتبہ اشرف علی، ۲۳ شوال ۱۳۴۳ھ،



**مسجد میں تلاوت کرنے والے کو جوابِ اذان افضل ہے یا تلاوت؟**

**سوال (۷)** تالی القرآن فی المسجد کو خواہ عامی ہو یا عالم جوابُ الاذان افضل ہے یا مشغولیِ تلاوت؟

**الجواب:** جوابِ اذان افضل ہے، فی الدر المختار (ویجب[عـہ]) وجوبا وقال الحلوانی ندبا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولو جنبا لا حائضا و نفساء وسامع خطبته وفی صلوٰۃ جنازۃ وجماع ومستراج واکل وتعلیم علم وتعلمه بخلاف قران وقال الشامی تحت قوله بخلاف قران لانه لا یفوت جوهرہ ولعله لان تکرار القرأۃ انما هو للاجر فلا یفوت بالاجابة بخلاف التعلم فعلی هذا لو یقرأ تعلیما او تعلما لا یقطع سامحانی (ص ۱۱ ۴ ج ۱) وقال الشامی ایضا ص ۴۱۴ ج ۱ (ولو بمسجد لا) ای لا یجب قطعها بالمعنی الذی ذکرناہ آنفا فلا ینافی ما قدمه من ان اجابة اللسان مندوبة عند الحلوانی وفی الصفحة المذکورۃ ایضا بعد نقل حدیث عن الطحاوی فهذہ قرینة صارفة للامر عن الوجوب وبه تأید ما صرح به جماعة من اصحابنا من عدم وجوب الاجابة باللسان وانها مستحبة وهذا ظاهر فی ترجیح قول الحلوانی وعلیه مشی فی الخانیة والفیض الخ، ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ

**تحقیق وقتِ قیامِ امام و قوم برائے نماز،**

**سوال (۸)** ........................................ زید و بکر دو عالم سنی المذہب آپس میں مختلف ہوگئے ہیں دونوں کے دلائل لکھے جاتے ہیں جو حق و انصاف ہو اس کو تحریر فرمائیں، واحکم بینهما بالحق، زید کا قول ہے کہ تکبیر ہوتے وقت امام و مقتدی کو بیٹھے رہنا اور حی علی الفلاح سن کر کھڑے ہونا مستحب ہے، اور شروع تکبیر سے کھڑے رہنا مکروہ ہے (عالمگیری وغیرہ کتب فقہیہ)

بکر کا قول ہے کہ یہ مسئلہ عام نہیں بلکہ خاص اس صورت میں ہے جبکہ امام و مقتدی محراب کے قریب ہوں، اور اگر محراب سے دور ہوں تو جب امام محراب کی طرف چلے اور جس صف کے پاس پہونچے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں، اور اگر آگے سے آیا تو امام پر نظر پڑتے ہی سب کھڑے ہو جائیں، جیساکہ البحر الرائق، درمختار، مجمع الانہر، مراقی الفلاح، عالمگیری،

[عـہ] هکذا فی الاصل والصحیح یجیب ۱۲ منہ

وغیرہ وغیرہ میں کمال تشریح سے مذکور ہے، عبارت بحرالرائق ودرمختار یہ ہے ان کان الامام بقرب المحراب والا فیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظھر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرھم علیہ الخ اور بکر یہ بھی کہتا ہے کہ شروع تکبیر سے کھڑے رہنا مکروہ بھی نہیں، علامہ طحطاوی حنفی حاشیہ درمختار میں فرماتے ہیں الظاھر انہ احتراز عن التاخیر لا التقدیم حتی لو قام اول الاقامۃ لاباس، اور شروع سے کھڑے رہنا کیونکر مکروہ کہا جا سکتا ہے جبکہ عموماً صحابہ کرام شروع سے کھڑے رہا کرتے تھے، چنانچہ بخاری ومسلم کی متعدد حدیثوں سے ایک حدیث بخاری یہ ہے اقیمت الصلوٰۃ فسوی الناس صفوفھم فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتقدم، فتح الباری میں بروایت ابن شہاب ہے ان الناس کانوا ساعۃ یقول المؤذن اللہ اکبر یقومون الی الصلوٰۃ فلا یاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقامہ حتی تعتدل الصفوف،

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اللہ اکبر... سننے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے، اور حضور م تشریف لانے کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑے ہو جاتے، چنانچہ لفظ بخاری فَخَرَجَ اور فَتَقَدَّمَ سے ظاہر ہے، اور فقہائے کرام نے جو حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر کھڑے ہونے کو لکھا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شروع سے نہ کھڑا ہوا ہو تو اب اس لفظ پر کھڑے ہو جانا اسے مستحب ہے، جیسا کہ علامہ طحطاوی حنفی نے تصریح کر دی، الظاھر انہ احتراز عن التاخیر لا التقدیم، غرض حیّ علی الفلاح تک بیٹھنا شرعاً مطلوب ومندوب نہیں ہے، اسی وجہ سے محققین فقہاء نے قیام عند حی الفلاح کو مندوب لکھا ہے؛ کسی نے قعود الی حی علی الفلاح کو مندوب نہیں لکھا، اور حدیث وفقہ میں اسی صورت سے مطابقت ہو سکتی ہے،

بکر کہتا ہے کہ اگر لاکھوں صحابہ کرام رضہ سے کسی صحابی نے کبھی حیّ علی الفلاح تک قعود کیا ہو تو بے شک قعود کرنا بہتر ہوگا، ورنہ صرف جائز یا مباح کہا جائے گا، اور شروع سے کھڑے رہنے کو ہرگز مکروہ نہ کہا جائے گا، اگرچہ عالمگیری میں مکروہ لکھا ہے، مگر بے دلیل ہے، لہذا قابلِ تسلیم نہیں، دیکھو اسی عالمگیری میں صیام ستہ شوال کو بروایت حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مکروہ لکھا ہے، حالانکہ بے دلیل ہے، دوسرے فقہاء نے اس مسئلہ عالمگیری کو تسلیم نہ فرمایا اور عام طور پر صیام ستہ کو مستحب ومندوب لکھا ہے، اور فقہ



میں بہت ایسے مسائل ہیں کہ کسی نے مکروہ لکھدیا، مگر محققینِ فقہاء کے نزدیک اس کی کوئی دلیل نہ ملی، لہذا اس کی کراہت تسلیم نہ فرمائی، شامی وبحر وغیرہ میں کثرت سے اس قسم کی عبارت ملتی ہے لا یلزم منہ الکراھۃ اذ لابد لہا من دلیل، اگر تھوڑی دیر کیلئے ظاہر عبارات حضرات فقہاء کرام سے حی علی الفلاح تک بیٹھنے کو مستحب سمجھ لیا جائے جب بھی شروع سے کھڑے رہنا فقہاء کے طور پر مکروہ نہ ہوگا، کیونکہ ترکِ مستحب سے کراہت نہیں لازم آتی ہے، بحرالرائق جلد ا میں ہے لا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھۃ اذ لابد لہا من دلیل خاص، غرض اصول وضوابط فقہیہ حنفیہ سے شروع سے کھڑے ہونے کی کراہت نہیں ثابت ہو سکتی،

بکر نے اس کے متعلق ایک رسالہ مدلل ومفصل لکھا ہے، جس کا نام "الکلام المحکم فی قیام الامام والموتم" ہے، لہذا آپ دونوں میں غور فرما کر جو حق ہو اس کو تحریر فرمائیں، خلاصہ قول بکر یہ کہ شروع سے نہ قیام مکروہ نہ قعود مستحب بلکہ اگر بیٹھا رہا تو حی علی الفلاح سن کر کھڑے ہونا مستحب ہے،

دوسرا مسئلہ ؛ بکر کا معمول ہے کہ وضو اور سنتوں سے فارغ ہو کر مسجد میں ایسے وقت آتا ہے کہ لوگ وضو اور سنتوں سے فارغ رہتے ہیں یا قریب فارغ ہونے کے رہتے ہیں، تو آنے کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور اس کو سنتِ کریمہ جانتا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتقدم اور مسلم میں فاتی نقام مقامہ سے ثابت ہے، اور اس کے بعد تکبیر شروع ہوتی ہے تو بکر اپنے مقتدیوں سے کہتا ہے کہ اس صورت میں سب مقتدیوں کو کھڑے ہو جانا چاہئے، جیسا کہ عبارات فقہیہ مذکورہ سے ثابت ہے والا فیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام، ونیز حدیث صحیح لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ، سے بھی مقتدیوں کا قیام کرنا سنت ہے، زید کہتا ہے کہ اس امام کو بھی آکر مصلے پر بیٹھ جانا چاہئے اور حیّ علی الفلاح پر کھڑے ہونا چاہئے، بکر کہتا ہے کہ اس وقت بیٹھنے کے لئے کسی فقیہ نے تصریح نہ کی، لہذا قابلِ تسلیم نہیں، بلکہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فتاویٰ رضویہ جلد دوم صفحہ ۵۰۸ میں ایسے امام کے لئے فرمایا "اسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں مصلے پر جائے اور حیّ علی الفلاح یا ختم تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے"، اور صفحہ ۴۰۲ میں فرماتے ہیں "پھر جب امام آئے اور تکبیر شروع ہو، اس وقت دو صورتیں ہیں، اگر امام صفوں

کی طرف سے داخل مسجد ہو تو جس صف سے گذرتا جائے وہی صف کھڑی ہوتی جائے، اور اگر سامنے سے آئے تو اسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجائیں۔

لہذا بکر کا یہ معمول فقہ حنفی اور فتاوی رضویہ کی تصریح کے موافق کیسا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بکر جب مسجد میں آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مصلی کم ہیں یا زیادہ تر لوگ وضو اور سنتوں میں مصروف ہیں تو قرب محراب میں بیٹھ جاتا ہے، اور لوگوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا ہے اور اس انتظار کو بھی سنتِ نبوی جانتا ہے، جب فارغ ہوجاتے ہیں تو تکبیر شروع کرادیتا ہے، اور ظاہر الفاظ فقہیہ کے خیال اور مقامی علماء کے موافقت کے لحاظ سے تکبیر ہوتے وقت بیٹھا رہتا ہے، اور حی علی الفلاح سنکر کھڑا ہوجاتا ہے، اور اس بیٹھے رہنے کو دلائل مذکورہ کی رُد سے صرف جائز و مباح جانتا ہے، پس بکر کا یہ عمل اور خیال کیسا ہے۔

**تیسرا مسئلہ:** یہ ہے کہ زید بعد خطبہ جمعہ بھی جلوس کرتا ہے، اور حی علی الفلاح پر کھڑا ہوتا ہے، بکر کہتا ہے کہ اس وقت کے لئے کسی فقیہ نے جلوس کی تصریح نہ فرمائی، لہذا خطبہ کے بعد بیٹھنا نہ چاہیے، بلکہ خطبہ سے فارغ ہوکر مصلی پر کھڑا ہوجائے، چنانچہ حضرت فاضل بریلوی کے فتاوی رضویہ ج ۲ ص ۵۰۸ میں ہے، "بعد خطبہ اسے اختیار ہے کہیں منقول نہیں کہ خطبہ فرماکر تکبیر ہوتے تک جلوس فرماتے ہیں، یہ حکم قوم کے لئے ہے"۔

**چوتھا مسئلہ:** زید باوجود مستحب جاننے کے اس مسئلہ میں تشدد کرتا ہے، اور شروع سے کھڑے رہنے والے کو بار بار تاکید کرکے بٹھاتا ہے، بکر کہتا ہے کہ امر مستحب کے لئے یہ تشدد زیبا نہیں، اور نہ مستحب کی یہ شان ہے،

**پانچواں مسئلہ** یہ ہے جس میں زید و بکر دونوں حیران ہیں کہ فقہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوجائیں وہاں امام و مقتدی دونوں کے واسطے لکھا ہے مگر حضرت فاضل بریلوی فتاوی رضویہ جلد دوم صفحہ ۵۰۹ میں لکھتے ہیں "یہ حکم قوم کے لئے ہے"، پھر صفحہ ۵۱۱ میں ہے "امام کے لئے اس میں خاص کوئی حکم نہیں مقتدیوں کو حکم ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں" الخ پھر صفحہ ۵۱۳ میں ہے "مقتدیوں کو حکم یہ ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں"۔

پس حضرت فاضل بریلوی کی یہ تخصیص قوم کی بظاہر عموماً کتب فقہیہ ونیز بہار شریعت کے تصریحات کے خلاف ہے، اور اس سے زیادہ حیرت یہ کہ بہارِ شریعت کے آخر میں حضرت فاضل بریلوی ممدوح کی تصدیق موجود ہے، پس حضرات علماء کرام اسکی تحقیق



فرمائیں کہ کون صحیح ہے، بلا دلیل و حوالہ کتاب کوئی جواب نہ ہو، قال البکر ما کنت قاطعاً امراً حتی افتونی فی امری،

## تفصیل الجواب و تحقیق الصواب

اقول وباللہ التوفیق وھو الھادی وھو خیر رفیق،

قال العلامة البدر العینی فی شرحه علی البخاری تحت حدیث "لا تقوموا حتی ترونی" ما نصه قد اختلف السلف متی یقوم الناس الی الصلوٰۃ فذھب مالك والجمھور الی انه لیس لقیامھم حد ولکن استحب عامتھم القیام اذا اخذ المؤذن فی الاقامة وکان انس رضی اللہ تعالیٰ عنه یقوم اذا قال المؤذن "قد قامت الصلوٰۃ" وکبر الامام (رواہ ابن المنذر وغیرہ وکذا رواہ سعید بن منصور من طریق ابی اسحٰق عن اصحاب عبد اللہ قاله الحافظ فی الفتح ص ۱۰۰ ج ۲ فھو حسن او صحیح علی قاعدته) وحکاہ ابن ابی شیبة عن سوید بن غفلة وقیس بن ابی حازم وحماد وعن سعید بن المسیب وعمر بن عبد العزیز اذا قال المؤذن اللہ اکبر وجب القیام واذا قال حی علی الصلوٰۃ اعتدلت الصفوف واذا قال لا الٰه الا اللہ کبر الامام (ذکرہ الحافظ فی الفتح ایضاً فھو حسن او صحیح علی قاعدته) وذھبت عامة العلماء الی انه لا یکبر حتی یفرغ المؤذن من الاقامة وفی المصنف کرہ ھشام یعنی ابن عروۃ ان یقوم حتی یقول المؤذن قد قامت الصلوٰۃ وعن یحیی بن وثاب اذا فرغ المؤذن کبر، وکان ابرٰھیم یقول اذا قامت الصلوٰۃ کبر ومذھب الشافعی وطائفة انه یستحب ان لا یقوم حتی یفرغ المؤذن من الاقامة وھو قول ابی یوسف وعن مالك رحمه اللہ السنة فی الشروع فی الصلوٰۃ بعد الاقامة وبدایة استواء الصف وقال احمد اذا قال المؤذن قد قامت الصلوٰۃ یقوم وقال زفر اذا قال المؤذن قد قامت الصلوٰۃ مرة قاموا واذا قال ثانیاً افتتحوا وقال ابو حنیفة ومحمد یقومون فی الصف اذا قال حی علی الصلوٰۃ فاذا قال قد قامت الصلوٰۃ کبر الامام لانه امین الشرع وقد اخبر بقیامھا فیجب تصدیقه واذا لم یکن الامام فی المسجد فذھب الجمھور الی انھم لا یقومون حتی یروہ اھ (ص ۶۷۶ ج ۲) قلت وفی قوله واذا لم یکن الامام فی المسجد الخ اشارة الی ان الاختلاف المذکور سابقاً فی وقت القیام انما ھو فیما اذا کان الامام فی المسجد

وقال الحافظ فی الفتح اما حدیث ابی هریرۃ (الذی اخرجه البخاری) بلفظ اقیمت
الصلوٰۃ فسوی الناس صفوفهم فخرج النبی صلی الله علیه وسلم ولفظه فی مستخرج
ابی نعیم فصف الناس صفوفهم ثم خرج علینا ولفظه عند مسلم اقیمت الصلوٰۃ
فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان یخرج الینا النبی صلی الله علیه وسلم فیجمع
بینه وبین حدیث ابی قتادۃ (لا تقوموا حتی ترونی) بان ذلک ربما وقع
لبیان الجواز وبان صنیعهم فی حدیث ابی هریرۃ رض کان سبب النهی عن
ذلک فی حدیث ابی قتادۃ وانهم کانوا یقومون ساعة تقام الصلوٰۃ ولو لم یخرج
النبی صلی الله علیه وسلم فنهاهم عن ذلک لاحتمال ان یقع له شغل یبطئ
فیه عن الخروج فیشق علیهم انتظاره اه (ص ۱۰۰ ج ۲) قلت وقد روی مسلم
عن جابر بن سمرۃ ان بلالا کان لا یقیم حتی یخرج النبی صلی الله علیه وسلم
فاذا خرج اقام الصلوٰۃ حین یراه اه (ص ۲۲۱ ج ۱) ولعل فیه حکایة عن فعل
بلال بعد النهی المذکور فی حدیث ابی قتادہ، وروی البزار عن عبد الله
ابن ابی اوفی مرفوعاً قال کان بلال اذا قال قد قامت الصلوٰۃ نهض رسول الله
صلی الله علیه وسلم بالتکبیر وفیه الحجاج بن فروخ ضعفه الهیثمی فی
مجمع الزوائد (ص ۱۸۲ ج ۱) وذکره ابن حبان فی الثقات کما فی اللسان (ص ۱۷۹ ج ۲)
فهو حسن الحدیث وقد تقدم عن انس انه کان یقوم اذا قال المؤذن قد قامت
الصلوٰۃ رواه ابن المنذر وغیره وسکت عنه الحافظ فی الفتح فهو حسن او صحیح
وهو محمول علی ما اذا کان الامام فی المسجد بقرب المحراب والمراد بالقیام القیام
بحقیقة الصلوٰۃ وهو بالتکبیر للاحرام کما یشعر به لفظ البزار نهض بالتکبیر
واما القیام من الجلوس فلا بد ان یتقدمه بشیء فثبت انه صلی الله علیه وسلم
کان یقوم فی مصلاه عند قول المؤذن قد قامت الصلوٰۃ قبله بشیء وکذا فعله
انس فما رواه عبد الرزاق من ابن جریج عن ابن شهاب ان الناس کانوا
ساعة یقول المؤذن الله اکبر یقومون الی الصلوٰۃ فلا یاتی النبی صلی الله علیه
وسلم مقامه حتی تعتدل الصفوف کما فی فتح الباری (ص ۱۰۰ ج ۲) یحمل
القیام فیه علی القیام من مکان الجلوس لا القیام فی الصف فکانوا یقومون



فی الصف عند قول المؤذن قد قامت الصلوٰۃ قبله بشیء کیلا تتضاد الآثار وان کان
الظاهر منه القیام فی الصف کما لا یخفی، وبالجملة فحاصل الاحادیث ان الامام
اذا کان فی المسجد بقرب المحراب فلا ینبغی للناس والامام ان یقوموا قبل الشروع
فی الاقامة بل بعده اما ساعة یقول المؤذن الله اکبر او عند قوله قد قامت الصلوٰۃ
قبله بشیء وان کان خارجا منه فلا یقوموا حتی یروه فاذا رأوه مقبلا الی المحراب
قاموا ومقتضاه ان الامام اذا دخل المسجد وقد شرع المؤذن فی الاقامة
لا یجلس فیه منتظرا قول المؤذن حی علی الصلوٰۃ او قد قامت الصلوٰۃ بل یستمر
ذاهبا الی المصلی لانه یبعد ان یؤمر الناس بالقیام لرؤیة الامام ویؤمر هو بالجلوس
کلا، واما ما قاله الفقهاء من کراهة السمود فمعناه انتظار الناس الامام قیاما
قبل رؤیتهم ایاه مقبلا الی المحراب وهو معنی قول علی مالی اریکم سامدین
یؤیده ما رواه ابو داؤد عن کهمس باسناد رجاله موثقون انه قال قمنا الی
الصلوٰۃ بمنیٰ والامام لم یخرج فقعد بعضنا فقال لی شیخ من اهل الکوفة ما
یقعدک قلت ابن بریدۃ قال هذا السمود اه (ص ۲۱۳ ج ۱) فالسمود ان ینتظروا
الامام قیاما قبل خروجه وقبل رؤیتهم ایاه مقبلا علیهم وقال الحافظ الحجة
ابن قدامة الحنبلی فی المغنی یستحب ان یقوم الی الصلوٰۃ عند قول المؤذن
قد قامت الصلوٰۃ وبهذا قال مالک قال ابن المنذر علی هذا اهل الحرمین
وقال الشافعی یقوم اذا فرغ المؤذن من الاقامة وکان عمر بن عبد العزیز و
محمد بن کعب وسالم وابو قلابة والزهری وعطاء یقومون فی اول بدوۃ
من الاقامة (قلت وعلیه العمل الیوم فی الدیار والامصار بلا انکار ۱۲) و
قال ابو حنیفة یقوم اذا قال حی علی الصلوٰۃ فاذا قال قد قامت الصلوٰۃ کبر و
کان اصحاب عبد الله یکبرون اذا قال المؤذن قد قامت الصلوٰۃ وبه قال
سوید بن غفلة والنخعی ولا یستحب عندنا ان یکبر الا بعد فراغه من
الاقامة وهو قول الحسن ویحیی بن وثاب واسحٰق وابی یوسف والشافعی
وعلیه جل الائمة فی الامصار، واذا ثبت هذا فانما یقوم المامومون اذا کان
الامام فی المسجد او قریبا منه وان لم یکن فی مقامه فان اقیمت والامام

فی غیر المسجد ولم یعلموا قربہ لم یقوموا لما روی ابو قتادۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی متفق علیہ وللبخاری[عہ] قد خرجت وخرج علیٌّ والناس ینظرونہ قیاماً للصلوٰۃ فقال مالی اراکم سامدین اھ ملخصاً (ص ۵۰۰ و ۵۰۸ ج ۱) وقال فی الدر فی آداب الصلوٰۃ والقیام لامام ومؤتم حین قیل حی[عہ] علی الفلاح خلافاً لزفر فعندہ عند حی الصلوٰۃ ان کان الامام بقرب المحراب والا وان لم یکن بقرب المحراب بان کان فی موضع آخر من المسجد او خارجہ ودخل من خلف ۱۲ شامی) فیقوم کل صف ینتہی الیہ الامام علی الاظہر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرہم علیہ اھ (ص ۴۹۹ ج ۱) وقال محمد فی الآثار اخبرنا ابو حنیفۃ عن طلحۃ بن مصرف عن ابراہیم انہ قال اذا قال المؤذن حی علی الفلاح فینبغی للقوم ان یقوموا للصلوٰۃ فاذا قال قد قامت الصلوٰۃ کبر الامام اخرجہ محمد فی الآثار ثم قال وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ فان کف الامام حتی فرغ المؤذن من الاقامۃ ثم کبر فلا بأس ایضاً کل ذلک حسن اھ قلت وقول ابراہیم حجۃ عندنا لکونہ لسان ابن مسعودؓ واصحابہ وقد تقدم فی قول الحافظ ابن قدامۃ ان اصحاب عبد اللہ کانوا یکبرون عند قول المؤذن قد قامت الصلوٰۃ والظاہر انہم اخذوا ذلک عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ وقد ظہر من قول محمد ان الشروع عند قولہ قد قامت الصلوٰۃ لیس من الواجبات بل من الآداب فقط فلو شرع بعد الاقامۃ کان حسنا ایضا قلت وکذلک القیام عند قولہ حی علی الصلوٰۃ من الآداب ایضا کما یشعر بہ صنیع الفقہاء فانہم لم یذکروہ فی السنن ولا فی الواجبات بل ذکروہ فی الآداب فقط فلو قاموا عند بدء الاقامۃ فلا باس بہ وکان ذلک حسنا ولذا قال الطحطاوی فی حاشیۃ الدر تحت قولہ والقیام لامام ومؤتم

---

عہ تلہ لیس لفظ قد خرجت عند البخاری بل ھو عند مسلم وغیرہ فلعلہ من زلۃ القلم ۱۲ منہ

عہ وفی بعض الروایات عکس ھذا فعند الثلاثۃ عند حی علی الصلوٰۃ وعند زفرؒ عند حی علی الفلاح والصحیح عن زفرؒ ان یقوم عند قد قامت الصلوٰۃ ۱۲ منہ



حین قیل حی علی الفلاح الخ ما نصہ الظاہر انہ احتراز عن التاخیر لا التقدیم حتی لو قام اول الاقامۃ لا بأس وحرر اھ (ص ۲۳۱ ج ۱) ولکنہ قال فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح تحت قول الماتن ومن الادب القیام (ای قیام القوم والامام ان کان حاضراً بقرب المحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حی علی الفلاح لانہ امر بہ فیجاب وان لم یکن (الامام) حاضراً یقوم کل صف ینتہی الیہ الامام فی الاظہر اھ ما نصہ واذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ ودخل رجل المسجد فانہ یقعد ولا ینتظر قائماً فانہ مکروہ کما فی المضمرات قہستانی ویفہم منہ کراہۃ القیام ابتداء الاقامۃ والناس عنہ غافلون اھ (ص ۱۶۱) ویمکن التطبیق بین قولیہ ان قولہ فی حاشیۃ الدر محمول علی ما اذا کان الامام حاضراً فی بدء الاقامۃ فلا بأس بالقیام من ابتداء الاقامۃ وقولہ فی حاشیۃ المراقی محمول علی ما اذا لم یکن الامام حاضراً وقت الاقامۃ فلا ینبغی القیام الآن یأتی الامام ویشعر بہ لفظ المفصل ولا ینتظر قائماً ومعناً فاللہ اعلم ان لا ینتظر الامام قائماً فافہم، واما حکم الاقامۃ لصلوٰۃ الجمعۃ فللمأمومین ان یقوموا عند قولہ حی علی الفلاح او حی علی الصلوٰۃ ولو قاموا عند بدء الاقامۃ فلا بأس بہ وذلک حسن ایضا کما مر وللامام ما ذکرہ فی الدر ویؤذن ثانیا بین یدیہ ای الخطیب اذا جلس علی المنبر فاذا اتم اقیمت اھ قال الشامی اقیمت بحیث یتصل اول الاقامۃ بآخر الخطبۃ وتنتہی الاقامۃ بقیام الخطیب فی مقام الصلوٰۃ اھ (ص ۸۶۰ ج ۱) ومفادہ ان الخطیب یستمر قائماً عند الاقامۃ ولا یجلس منتظراً قول المؤذن حی علی الصلوٰۃ وھذا الظاہر وعلیہ العمل فی دیار الاسلام واللہ اعلم۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہ ہے کہ اگر امام وقت اقامت کے مسجد میں قریب محراب کے بیٹھا ہوا ہو، تو فقہاء حنفیہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ شروع تکبیر پر قیام نہ کریں نہ امام نہ قوم بلکہ حی علی الصلوٰۃ یا حی علی الفلاح یا قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑے ہوں (علی اختلاف الاقوال بین الائمۃ وزفر کما مر) اور اگر شروع اقامت ہی پر کھڑے ہو جائیں تو یہ بھی بہتر ہے اور مباح ہے، اور بہت سے تابعین کا اس پر عمل تھا، پس اس کو مکروہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کراہت پر کوئی دلیل نہیں، اور بعض عبارات فقہیہ میں جو اس کو مکروہ لکھا ہے، اس کا محل یہ ہے کہ اگر شروع اقامت میں امام حاضر نہ ہو تو اس کے انتظار میں

قیام مکروہ ہے، اور اگر امام موجود ہو اور وہ شروع اقامت ہی پر کھڑا ہو گیا ہو تو مقتدیوں کو بھی کھڑا ہو جانا چاہئے، اور یہ مکروہ نہیں، نہ امام کے لئے نہ مقتدیوں کے لئے، گو اولیٰ یہ تھا کہ سب کے سب حیّ علی الصلوٰۃ پر کھڑے ہوتے،

اور اگر امام وقت اقامت کے مسجد میں اور قرب محراب میں موجود نہ ہو تو جب تک امام کو آتا ہوا نہ دیکھیں سب لوگ بیٹھیں رہیں، خواہ اقامت پوری ہی ہو جائے، غرض اس وقت امام کو بدون دیکھے کھڑا ہونا مکروہ ہے، وھو داخل فی السمود وھو الذی نھی عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث ابی قتادۃ اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتیٰ ترونی،

اور اگر امام اقامت سے پہلے مصلّے پر پہونچ جائے تو اس صورت میں مقتدیوں کو اقامت شروع ہونے کے بعد حیّ علی الصلوٰۃ یا قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا چاہئے، اور شروع اقامت پر کھڑے ہو جائیں، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اقامت سے پہلے کھڑے نہ ہوں،

اور بکر کا یہ فعل کہ وہ اقامت سے پہلے مصلّے پر پہونچ جاتا ہے پھر تکبیر شروع ہوتی ہے سنت کے موافق نہیں، حضورؐ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپؐ حجرہ سے نکلتے بلالؓ اسی وقت تکبیر شروع کر دیتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ختم اقامت یا وسط اقامت میں مصلّے پر پہونچتے تھے، غرض اقامت شروع ہونے سے پہلے امام اور قوم دونوں کو مصلّے پر کھڑا نہ ہونا چاہئے کہ اس کا ثبوت فعل سلف اور آثار مرفوعہ وغیرہ سے نہیں ملتا،

اور جمعہ کی نماز میں مقتدیوں کو تو حیّ علی الصلوٰۃ یا شروع اقامت پر کھڑا ہونا چاہئے، اور امام مؤذن کو یہ تعلیم کرے کہ وہ اقامت خطبہ ختم ہونے کے قریب اس طرح شروع کر دیا کرے کہ امام خطبہ ختم کر کے جب مصلّے پر پہونچے تو اقامت ختم ہو جائے، یہ مستحب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام کو خطبہ ختم کر کے بیٹھنا مستحب نہیں، اور اگر مؤذن ختم خطبہ سے پہلے اقامت شروع نہ کرے جب بھی اس وقت امام کے لئے جلوس ثابت نہیں بلکہ وہ کھڑا ہی رہے، خواہ منبر پر، اور ختم اقامت کے قریب مصلّے پر پہنچے، یا خطبہ ختم کر کے مصلّٰی پر ہی کھڑا ہو جائے، یہاں تک سائل کے سوال اول و دوم و سوم کا جواب ہو گیا، چوتھے مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ زید کا یہ فعل کہ وہ مقتدیوں کو شروع تکبیر پر کھڑے ہونے سے منع کرتا اور بٹھلاتا ہے تشدد غیر مرضی اور غلو فی الدین ہے، کیونکہ حیّ علی الفلاح پر کھڑا ہونا محض ادب ہے، اور شروع اقامت پر کھڑا ہونا بھی سلف سے ثابت ہے، اس سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں،



پانچویں مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ فتاویٰ رضویہ میں قیام علیٰ حیّ علی الصلوٰۃ کو امام کے ساتھ خاص کرنا نصوص فقہیہ کے خلاف ہے، بلکہ یہ حکم سب کے لئے ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ حکم سنت ہے یا محض ادب، سو عبارات فقہاء میں اس کی تصریح ہے کہ محض ادب ہے، اور شروع اقامت سے ہی سب کھڑے ہو جائیں تو جائز ہے اور یہ بھی حسن ہے، مگر خواہ شروع اقامت پر کھڑے ہونے کا حکم ہو یا حیّ علی الصلوٰۃ پر، دونوں حکم امام اور مقتدی سب کے لئے ہیں، پس فتاویٰ رضویہ کی یہ تقیید و تخصیص صحیح نہیں، اور اس کا قول بلا دلیل قابل تسلیم نہیں، واللہ اعلم، ۲۳ محرم ۴۶ھ

**جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا جائز ہے مگر دعاء کرنا جائز نہیں،**

**سوال (۹)** جمعہ میں اذان ثانی کا جواب دینا اور اذان کی دعاء پڑھنا از روئے مذہب حنفیہ جائز ہے یا نہیں، حضرت مولانا عبد الحی صاحب مرحوم لکھنوی نے سعایہ فی کشف شرح الوقایہ میں اس کے متعلق بہت بحث کی ہے، اور آخر میں اپنی رائے سے یہ لکھا ہے کہ جواب دینا جائز ہے، لہذا آپ سے امید کرتا ہوں کہ اس کے متعلق کافی بحث کریں گے، بندہ اب تک جواب نہیں دیتا اور نہ دعاء پڑھتا ہے، لیکن سعایہ کے دیکھنے سے اب شبہ پڑ گیا ہے،

**الجواب**، جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا تو جائز ہے، کیونکہ وہ قبل از خطبہ ہے، مگر اذان کے بعد دعاء پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ خطبہ کا وقت ہے، وکلام الامام یقطع سائر انواع الکلام والبسط فی اعلاء السنن (ص ۶۰ ج ۲) ۲۷ شعبان ۴۶ھ

**استفتاء متعلق ادائیگی کلمات اذان و اقامت**

**سوال (۱۰)** اذان اور اقامت میں اگر اللہ اکبر کی راء کو اللہ سے ملا دیا جائے، اور اسی طرح اور کلمات کو ساکن نہ کرتے ہوئے اُن کے اعراب کو ظاہر کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں، میرے ناقص خیال سے جائز ہونا چاہئے،؟

**الجواب**، اذان اور اقامت کے کلمات میں سکون و وقف مطلوب ہے، حرکت کا اظہار نہیں چاہئے، وفی الامداد ویجزم الراء فی التکبیر ای یسکنھا قال الزیلعی یعنی علی الوقف لکن فی الاذان حقیقۃ وفی الاقامۃ ینوی الوقف اھ ای للحدر (شامی ج ۱ ص ۳۶۰) واللہ اعلم، ۲۷ شعبان ۴۶ھ

**رفع طاعون کے لئے اذانیں دینا مشروع ہے یا نہیں؟**

**سوال (۱۱)** طاعون کے مرض کے وقت اکثر عوام میں اذانوں کا رواج ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

**الجواب**، حدیث میں تغول غیلان کے وقت اذان کو مندوب فرمایا ہے، اور طاعون

میں وخز اعدائنا من الجن ثابت ہے، اس لئے بعض نے کہا ہے کہ رفعِ طاعون کے لئے بکثرت اذانیں دینے کا مضائقہ نہیں، مگر صورت یہ ہونی چاہئے کہ اوقاتِ اذان ہی میں اور ایام سے کچھ زیادہ آدمیوں نے اذان پڑھ دی، اور یہ صورت متعارف ہے کہ غیر اوقات اذان وصلوٰۃ میں بکثرت اذان دی جاتی ہے اس میں تشویش علی الناس ہے، اس لئے قابلِ ترک ہے اور بعض کے نزدیک اس وخز کو تغول پر قیاس کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ تغول میں ظہور ہوتا ہے جس کا کوئی وقت نہیں، اس لئے فوراً اذان کی ضرورت ہوتی ہے، اور وخز میں کوئی خاص وقت ظہور کا نہیں، اس لئے وقتی اذانیں بھی برکت کے لئے کافی ہیں، مستقل اذان کی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا یہ بدعت ہوئی جس کا ترک واجب ہے، یہ دونوں قول ہیں، اور اقوی دلیل سے ثانی ہے، لہٰذا اسی پر عمل کرنا چاہئے، واللہ اعلم، ۲۴ ر شوال ۲۶ھ

اذانِ جمعہ کیلئے نقارہ بجانا اور اس کے متعلق چند سوالات

**سوال** (۱۲)............ آجکل دیہاتوں میں یہ قاعدہ ہے اختیار کیا ہے کہ ہر ایک مسجد میں ایک ایک نقارہ رکھا ہوا ہے، اس واسطے کہ جمعہ کے روز اس کو واسطے اعلان نمازِ جمعہ کے بجایا جاوے، کیونکہ اکثر لوگ دیہاتوں کے باہر کھیتوں میں دور دور ہوتے ہیں، اذان کی آواز وہاں تک نہیں پہونچ سکتی ہے، اس وجہ سے مسجدوں میں نقارے رکھے گئے ہیں، اس واسطے وہ نقارہ جمعہ کے روز اور روزہ افطاری کے وقت اور سحری کے وقت بجایا جاتا ہے، اور مسجد کے روپے سے وہ نقارہ بنایا گیا ہے، سو اس طرح یہ نقارہ بجانا اعلان کے واسطے اور مسجد کے روپے سے اس کو بنانا جائز ہے کہ نہیں اور اس کو جائز جاننا کیسا ہے؟

دوسرے بیماریِ طاعون کے واسطے اس نقارے پر ایک دعاء لکھ کر اس کو بجایا جاتا ہے، اس واسطے کہ اس کی آواز جہاں تک جائے گی بیماری طاعون ہو جائے گی، اس طرح بجانا اور اس کو جائز جاننا کیسا ہے، اور نقارہ کو مسجد کے اندر رکھنا اور بجانا کیسا ہے، خلاصہ جواب باصواب مع حوالۂ کتب احادیث کے مرحمت فرما دیں، بینوا وتوجروا، فقط،

**الجواب**: افطار اور سحری کے لئے تو نقارہ بجانا جائز ہے، لیکن اذانِ جمعہ کی اطلاع کے لئے جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں نقارہ سے اذان کا کام لینا لازم آئے گا، اور یہ حدیث کے خلاف ہے، فانہ صلی اللہ علیہ وسلم اہتم اوّلاً بان یضرب الناقوس



او البوق فترکہ حذرا عن التشبہ بالکفار فلا یجوز لنا احداث ما ترکہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاعلام الصلوٰۃ، دوسرے دیہات والوں کے ذمہ جمعہ کی نماز فرض نہیں تو ان کو اطلاع کی ضرورت ہی کیا ہے جو شخص بدون اطلاع کے آسکے پڑھ لے ورنہ خیر،

اور مسجد کے روپیہ سے نقارہ بنانا اس کی دو صورتیں ہیں ایک کہ لوگوں نے مسجد میں ایسی غرض سے روپیہ دیا ہو کہ اس سے نقارہ بنایا جائے، یہ صورت تو جائز ہے، ایک یہ کہ جو روپیہ مصارف مسجد کے لئے جمع تھا اس سے نقارہ بنایا جائے، یہ جائز نہیں، فقد صرح فی الخلاصہ انہ لایجوز لقیم المسجد ان یشتری جنازۃ او تختا لغسل الاموات من مال المسجد،

اور طاعون کے زمانہ میں نقارہ پر دعاء لکھ کر بجانا بھی جائز نہیں، لفساد عقیدۃ العوام فیہ، اور نقارہ کو مسجد کے اندر یا مسجد کی چھت پر رکھ کر بجانا بھی جائز نہیں، بلکہ جن مواقع میں بجانا جائز ہے اس وقت مسجد سے باہر رکھکر بجایا جائے اور نقارہ مسجد کو مسجد میں رکھنا اس شرط سے جائز ہے کہ اس کے رکھنے سے نمازیوں کو تنگی نہ ہوتی ہو، ورنہ باہر رکھا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم ۲ر شوال ۱۳۴۶ھ

اذان میں تثویب کی کیا صورت ہے، اور تثویب کے معنی،

**سوال** (۱۳) اذان میں تثویب کی کیا صورت ہے، اور تثویب کے کیا معنی ہیں؟

**الجواب**: اذان میں تثویب مسنون تو یہ ہے کہ اذان فجر میں الصلوٰۃ خیر من النوم اضافہ کیا جائے، اور تثویب مبتدع ایک تو اذان میں ہے کہ حی علی خیر العمل اضافہ کیا جائے جیسا روافض کرتے ہیں، اور ایک مابین الاذان والاقامۃ ہے کہ مؤذن تھوڑی دیر میں ... الصلوٰۃ جامعۃ یا الصلوٰۃ الصلوٰۃ رحمکم اللہ پکارتا ہے، یہ دونوں بدعت ومکروہ ہیں، والاول اشد ابتداعاً وکراہۃً

جو شخص مسجد میں ہو اس کو جواب اذان دینا واجب ہے یا نہیں

**سوال** (۱۴) مسجد کے اندر جواب اذان دینا واجب ہے یا نہیں، کیونکہ کتاب القول المتین میں لکھا ہے کہ جواب دینا ضروری نہیں ہے، اگر جواب دے تو صواب ہے،

**الجواب**: بیشک اس صورت میں جواب دینا ضروری نہیں، البتہ مستحب ہے، لہٰذا بلاوجہ ترک کرنا بہتر نہیں، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفا عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ر شعبان ۴۶ھ

**ایک شخص کا دو مسجدوں میں اذان دینا**

**سوال (۱۵)** ........ ایک مسجد محلۂ ہنود میں ہے، نہ وہاں پر مسافر کا گذر ہوتاہے نہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسجد ہے، اور ایک شخص دوسری مسجد کا امام نماز کے بعد اس لئے آذان پڑھ دیتا ہے کہ یہ مسجد ویران نہ ہو، اور ہنود اس میں بُری حرکت نہ کرنے پائیں،

**الجواب:** دو مسجدوں میں اذان کہنا ہے تو مکروہ، مگر چونکہ کسی مسجد میں آذان کا ترک ہوجانا موجب اندیشہ ہے، اس واسطے اس میں قواعد سے گنجائش ہوسکتی ہے، مگر کوئی جزئیہ نہیں ملا، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۶ر شوال ۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ

**اذان سے متعلق چند سوالوں پر مشتمل ایک استفتاء،**

**سوال (۱۶)** مخدوم مبادکہ اذان نماز پنجگانہ در مسجد دادن و شباں گاہ چراغ روشن کردن اگر جماعت نباشد وچوں گاہی گردد وگاہے نگردد، پس حکم وارد واذان محض بر جماعت مسنون است یا برائے مسجد نیز شرط است وچوں گاہے ترک گردد چہ لازم آید، وبعض مؤذنان ایں اطراف گاہ بگاہ بدعوت رود وآنجا نماز باجماعت خواند پیش از انجا آمدہ اذان دادہ بکار خویش مشغول شود، پس اذان دریں صورت مسنون است یانہ، جملہ صور مفصلاً تحریر فرمودہ ممنون سازند،

**الجواب:** اذان در ہر مسجد سنت مؤکدہ مثل واجب ہست خواہ جماعت باشد یا شخصے تنہا نماز گذارد ولیکن اگر از محلہ ثانیہ آواز رسیدہ باشد آں کفایت کند واذان کسے راکہ نماز دریں مسجد گزارد واذان شخصیکہ نماز بمسجد دیگر خواندہ است کراہت دارد وہمچنیں بعد اذان بمسجد دیگر رفتن ممنوع ست کما قال الشامی (ص ۳۵۷ ج ۱) تحت قول الدر (للفرائض الخمس) دخلت الجمعة بحر وشمل حالة السفر والحضر والانفراد والجماعة قال فی مواهب الرحمن ونور الایضاح ولو منفرداً اداءً او قضاءً سفراً او حضراً اھ وفیہ ایضا تحت (قوله كالواجب) قال فی النهر ولم أر حكم البلدة الواحدة اذا اتسعت اطرافها كمصر والظاهر ان اهل كل محلة سمعوا الاذان ولو من محلة اخرى يسقط عنهم لا ان لم يسمعوا اھ وایضاً فیہ (ص ۳۷۳ ج ۱) تحت قوله (ويكره له ان يؤذن فی مسجدين) لان[1] الاذان للمكتوبة وهو فی

[1] قلت علم من التعليل ان التاذين مكروه لمن قد صلى سواء اذن فی مسجد آخر اولا فافهم ۱۲ منہ



المسجد الثانی يصلی النافلة فلا ينبغی ان يدعو الناس الی المكتوبة وهو لا يساعدهم فيها اھ بدائع وفیہ ایضاً (ص ۶۶۸ ج ۱ وكره) تحريما للنهی (خروج من لم يصل من مسجد اذن فيه) ولیکن چراغ روشن کردن پس حکم آں نیافتم کہ سنت است یا مستحب آرے ایں قدر معلوم است کہ ایں فعل از زمانہ قدیم متوارث است ونیز آنکہ دریں امر نیز جماعت را دخل نیست بلکہ بہر حال روشن کردن مساوی ہست خواہ دراں مسجد جماعت باشد خواہ منفرداً نماز خواندہ شود، البتہ مسجدیکہ آمدن کسے دراں احتمال ندارد، چنانکہ بعض مساجد درخرابہ ہا باشد دریں چنیں مسجد چراغ روشن کردن ندانم چہ حکم دارد، واللہ اعلم، ۲ر ج ۱۳۵۰ھ

**اذان کے بعد گھنٹہ وغیرہ بجاکر لوگوں کو نماز کے لئے بلانا مکروہ اور بدعت ہے**

**سوال (۱۷)** ........ ہمارے اس دیہات میں بعض نے ایسے رواج کرلیا کہ ہر نماز یا بعض نماز جیسے فجر وعصر وجمعہ کی اذان کے آگے یا پیچھے گھنٹے بجاتے ہیں، یا ٹین پر مارتے ہیں، تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کا ہونا ...... یا جماعت شروع ہونا معلوم ہو تاکہ جلد مسجد کی طرف روانہ ہوں نماز کے باجماعت ادا کے لئے، بعض نے مسجد کے ساتھ ہی گھنٹہ لٹکایا اور ٹین کو لٹکایا، ان سے جب اس کی علت پوچھی گئی تو جواب دیا کہ گھنٹے وٹین کی آواز بہت بلند ہے لوگ بہت دور سے سنتے ہیں کہ جہاں اذان کی آواز نہیں پہونچ سکتی، بعض کہتے ہیں کہ فجر میں نیند سے بیداری کے لئے ایسا کیا جاتا ہے، غرضیکہ کسی صورت سے یہ نامشروع فعل جائز ہوسکتا ہے یا نہیں، نادان کا یہ خیال ہے کہ ایسا فعل قطعاً حرام ہوگا، کیونکہ اس سے اذان مسنونہ بالکل بیکار ہوجاتی ہے، اس کی کوئی حاجت ہی نہیں رہتی، اس پر اعتماد کر کے لوگ بھی گھنٹے کی آواز کی طرف تاک لگائے رہتے ہیں، حالانکہ اذان کو ایسے بیکار چھوڑنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے، اور اس سے تشابہ بالکفار بھی لازم آتا ہے،

**الجواب:** صورت مسئولہ سوال مکروہ ہے اور بدعت، اس لئے اس سے احتراز لازم ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اعلانِ نماز کے لئے طریق اعلان نماز کی فکر ہوئی تو حضورؐ نے ان سب طریقوں کو ناپسند فرمایا اور الہام ووحی کے بعد اذان کو اختیار فرمایا، اب اذان کے ساتھ دوسرے طریقے اعلان کے لئے اختیار کرنا بدعت ہے، وایضاً

ففی الجرس للعبادۃ مثل الصلوٰۃ تشبہا بالہنود، البتہ اگر اذان سے پہلے گھنٹہ اس واسطے بجایا جائے، تاکہ بستی والوں کو وقت کی اطلاع ہو جائے اور مؤذن وقت کو معلوم کر کے اذان دے، تو اس میں گنجائش ہے، لکون الجرس لغیر الصلوٰۃ من بیان الاوقات وفیہ سعۃ واللہ اعلم۔

۱۵ ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ

# فصل فی احکام المسجد وآدابہ

مسجد میں سونے کا حکم

**سوال** (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ علی العموم مسجد میں سونا جائز ہے چنانچہ اس سونے کے دلائل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہمیشہ مسجد میں سونا ثابت کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسجد میں سونے سے بے ادبی تو ضرور ہوتی ہے، اور بعض منکرات بھی سونے والے سے وقوع میں آتے ہیں، گو بوجہ سو جانے کے کیوں نہ ہو، غالباً اسی وجہ سے بعض مولوی مسافر باوجود ملنے مکان کے اپنا رہنا سہنا اور خورونوش مسجد ہی میں اختیار کرتے ہیں، منع کرنے پر یہ کہتے ہیں کہ دروازے پر جانے سے زقزق بقبق میں پڑنا ہوگا، حالانکہ مسجد میں جہالت کی باتوں کی پوری داد دی جاتی ہے، بہرحال مسجد میں سونا حنفیہ کے نزدیک کیسا ہے؟

**الجواب**: مسجد میں سونا معتکف اور اس مسافر کے سوا جس کو مکان نہ ملتا ہو باقی لوگوں کے لئے مکروہ ہے، قال فی الدر واکل ونوم الا لمعتکف وغریب، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فعل ضرورت پر محمول ہے قال الحافظ فی الفتح وروی عن ابن عباس کراہیتہ الا لمن یرید الصلوٰۃ وعن ابن مسعود مطلقا وعن مالک التفصیل بین من لہ مسکن فیکرہ وبین من لا مسکن لہ فیباح اھ

مسجد میں ورزش کرنے کا حکم

**سوال** (۲) مسجد میں ورزش کرنی یعنی ڈنڈ مونگدر اور کوئی ایسی ہی چیز یعنی تلوار وغیرہ کا چلانا جو واقعی ورزش ہے مسجد کے اندر جائز ہے یا نہیں، بعض لوگ زنگیوں کے کھیلنے کو مسجد میں ثابت کر رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رض کا دکھلانا یہ بھی حدیث سے ثبوت کو پہونچ رہا ہے، تو کیا اب بھی اس معنی کر کے مسجد کے اندر ایسے فعل کرنا جائز ہے، اور اگر ہیں تو آداب مسجد کے کیا معنی ہیں؟

**الجواب**: مسجد میں ڈنڈ اور مگدر سے ورزش کرنا مکروہ ہے، لما ورد فی صحیح مسلم من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم للاعرابی الذی بال فی المسجد ان ہذہ المساجد لا تصلح



لشیٔ من ہذا البول ولا القذر انما ہی لذکر اللہ تعالیٰ والصلوٰۃ وقراءۃ القرآن اھ (فتح الباری، ج ۱ ص ۲۷۸) وفیہ ایضا وظاہر الحصر من سیاق مسلم فی حدیث انس انہ لا یجوز فی المسجد شیٔ غیر ما ذکر من الصلوٰۃ والقرآن والذکر لکن الاجماع علی ان مفہوم الحصر منہ غیر معمول بہ ولا ریب ان فعل غیر المذکورات وما فی معناہا خلاف الاولیٰ، واللہ اعلم اھ (ص ۲۸۰ ج ۱)

رہا حبشہ والوں کا مسجد میں نیزوں سے کھیلنا تو اس سے اگر مسجد میں ڈنڈ مگدر کو جائز کیا جائے تو رقص کا بھی مسجد میں جائز ہونا لازم آئے گا، کیونکہ اسی قصہ میں یہ بھی وارد ہے کہ ایک حبشی عورت اُچھل کود رہی تھی اور اس کے گرد بچے تماشا دیکھ رہے تھے، ففی روایۃ النسائی من طریق یزید بن رومان عنہا سمعت لغطا وصوت وصبیان فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذا حبشیۃ تزفن ای ترقص والصبیان حولہا اھ (فتح الباری ج ۳ ص ۳۷۰) پس اس حدیث سے استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسجد میں رقص کو کسی نے جائز نہیں کہا، اور نہ یہ اعدوا لہم ما استطعتم کی فرد ہے، پس ظاہر یہ ہے کہ یہ رقص[ع] اور لعب مسجد سے باہر تھا، اور کچھ تماشا دیکھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں گے، اس لئے راوی نے مجازاً یہ کہدیا کہ مسجد میں نیزوں سے کھیل رہے تھے، یعنی مسجد کے قریب،

دوسری بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کھیلنے والوں کو دھمکایا تھا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر ان کو چھوڑ دو، یہ بنو ارفدہ ہیں، یعنی یہ لوگ کھیل کے عادی ہیں، خصوصاً ایام عید میں (اور وہ دن عید ہی کا تھا) اھ،

محب طبری نے اس پر لکھا ہے کہ اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بعضی وہ باتیں معاف ہیں جو دوسروں کے لئے معاف نہیں ہیں، اور چونکہ اصل یہی ہے کہ مسجد کو لہو ولعب سے بچایا جائے اس لئے مورد نص پر مقتصر رہے گا اھ زاد فی روایۃ الزہری عن عروۃ فزجرہم عمر فقال النبی صلی اللہ علیہ دعہم یا عمر وزاد ابو عوانۃ فانہم بنو ارفدۃ قال المحب الطبری فیہ تنبیہ علی انہ یغتفر لہم ما لا یغتفر لغیرہم

---

[ع] بظاہر یہ کودنے والی نابالغ اور ناسمجھ لڑکی تھی جیسا کہ سیاق سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے حضور نے بچوں کا کھیل سمجھ کر اس کو منع نہ کیا ہوگا، یا وہ ایسی ہی بادلی ہوگی وہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا ۱۲ منہ

لان الاصل فی المساجد تنزیھھا عن اللعب فیقتصر علی ما ورد فیه النص انتھیٰ (فتح الباری ص ۲۰، ج ۳) ملخصًا، علاوہ ازیں قاعدہ یہ ہے کہ جب قول اور فعل اور تقریر میں تعارض ہوتا ہے قول کو ترجیح ہوتی ہے، کیونکہ فعل اور تقریر میں خصوصیات کا احتمال ہو سکتا ہے، اور یہ واقعہ حدیث قولی کے خلاف ہے جو پہلے بروایت مسلم گذر چکی ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسجدیں تو صرف قراءت قرآن اور صلوٰۃ اور ذکر کے واسطے بنائی گئی ہیں، دوسری حدیث ابن ماجہ میں ہے جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشرائکم وبیعکم وخصوماتکم ورفع اصواتکم واقامۃ حدودکم وسل سیوفکم الخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنی مسجدوں کو بچوں سے اور پاگلوں سے بچاؤ نیز بیع وشراء سے اور جھگڑے وخصومت سے اور آواز بلند کرنے سے اور حدود قائم کرنے سے اور تلوار سونتنے سے" الخ اور یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کے طرق متعدد ہیں، جیسا کہ محدث سخاوی نے مقاصد حسنہ (ص ۸۴) میں بیان فرمایا ہے، اور حدیث ضعیف تعدد طرق سے قابل احتجاج ہو جاتی ہے، نیز مسلم کی حدیث مذکور بھی اس کے لئے شاہد صحیح ہے، پس بوقت تعارض یہ حدیث قولی اس واقعہ فعلی سے مقدم ہوگی، (کما ہو مقرر فی الاصول) لہٰذا ڈنڈ و مگدر وغیرہ کی ورزش مسجد میں مکروہ ہے، ۲۴ر جمادی الاولیٰ سنہ)

**سوال (۳)** | مسجد میں گھنٹہ لگانا جائز ہے

آجکل اکثر مسجدوں میں بڑی گھڑی آویزاں کیجاتی ہے، نمازوں کے وقتوں کے پہچاننے کے لئے اس میں سے بجنے کے وقت جو آواز نکلتی ہے یہ ممنوع تو نہیں ہے؟ کیونکہ بعض لوگ اس قول مع کل جرس شیطان کی وجہ سے مسجد میں ایسی گھڑی کا رکھنا منع کرتے ہیں، تو کیا یہ باجا ہو سکتا ہے یا نہیں، اور مسجد میں اس معنی کر کے گھڑی رکھنا چاہئے یا نہیں، اور یہ قول صحابی ہے یا احادیث رسول ؟

**الجواب**: مع کل جرس شیطان، یہ حدیث نبوی ہے، ابو داؤد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقطعًا مروی ہے (کذا فی الترغیب ص ۵۰۵) قال فی مجمع البحار جرس بفتحتین وھو ما یعلق بعنق الدابۃ او برجل البازی والصبیان وکذا الجلاجل جرس کی ممانعت حدیث میں دو جگہ وارد ہے، ایک عورتوں کے زیوروں میں کیونکہ اس سے مردوں کو آواز پہنچتی ہے، اور ان کے قلوب مائل ہوتے ہیں، دوسرے سفر میں جانوروں کی گردنوں میں یا گاڑی وغیرہ میں جو گھنٹہ یا گھنٹی ہوتی ہے اس کو منع کیا گیا ہے، جس کی علت



غالبًا کفار کا تشبہ ہے کہ وہ اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے ایسا کرتے تھے، مسلمانوں کو ایسا نہ چاہئے، پس گھڑی میں جو گھنٹہ بجتا ہے وہ جرس ممنوع میں داخل نہیں، فقہاء نے سحری وغیرہ میں لوگوں کے جگانے کے لئے نقارہ کو جائز لکھا ہے، کیونکہ مقصود وقت کا بتلانا ہے لہو ولعب مقصود نہیں، یہی مصلحت اس گھنٹہ میں ہے، لہٰذا اس میں کراہت نہیں، ۲۴ر جمادی الاولیٰ

**سوال (۴)** | مسجد کی دوسری منزل میں نماز پڑھنا بلا کراہت صحیح ہے،

.................................................. اول ایک مسجد ایک منزلہ تھی، پھر اس کو دو منزلہ بنایا گیا اس طرح سے ایک سمت تو پہلی ہی بنیاد رہی اور تین سمت سے بنیاد بڑھائی گئی، اور پوری مسجد پر دوسری منزل بنا دی گئی ہے، جس میں نیچے صحن بالکل نہیں رہا، چونکہ ایسی حالت میں نیچے کے درجہ میں گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے بعض مواسم میں اوپر کی منزل میں نماز پڑھی جاتی ہے، بعض علماء سے معلوم ہوا کہ سقف مسجد پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، جب سے سخت تردد ہے کہ دوسری منزل میں اگر نماز پڑھی جاوے تو اس کراہت کا ارتکاب لازم آتا ہے، اور اگر نیچے کی منزل میں پڑھی جاوے تو بعض موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے، حتیٰ کہ ایک روز امام صاحب کو بوجہ شدت گرمی غش آگیا تھا، علاوہ اس کے ایسا کرنے میں غالب گمان یہ ہے کہ اس موسم میں اس میں کوئی نماز پڑھے گا، اور مسجد معطل ہو جاوے گی، تو ایسی حالت میں موسم گرما میں اوپر کی منزل میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں، بینوا توجروا؟

**الجواب**: قال فی الدر وکرہ تحریما الوطأ فوقه والبول والتغوط لانه مسجد الی عنان السماء اھ وفی الفتاوی الشامیة قوله الوطأ فوقه ای الجماع خزائن اما الوطأ فوقه بالقدم فغیر مکروہ الا فی الکعبة لغیر عذر لقولھم بکراھة الصلوٰۃ فوقھا ثم رأیت القھستانی نقل عن المفید کراھة الصعود علی سطح المسجد اھ ویلزمه کراھة الصلوٰۃ ایضا فوقه فلیتأمل قوله لانه مسجد علة لکراھة ما ذکر فوقه قال الزیلعی ولھذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیه اذا لم یتقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیه ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیه اھ (ص ۶۸۶ ج ۱) وفی رد المحتار (ج ۳ ص ۵۰۳) قوله او جعل فوقه بیتا الخ ظاھرہ انه لا فرق بین ان یکون البیت للمسجد اولا الا انه یؤخذ من التعلیل ان محل عدم کونه مسجدا فیما اذا لم یکن وقفا علی مصالح المسجد وبه صرح

فی الاسعاف فقال واذا کان السرداب او العلو لمصالح المسجد او کانا وقفا علیه صار مسجدا اھ شرنبلالیه، قال فی البحر وحاصله ان شرط کونه مسجدا ان یکون سفله وعلوه مسجدا لینقطع حق العبد عنه اھ قال فی الدر (ص مذکور) فرع، لو بنی فوقه بیتا للامام لایضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع اھ قلت لعل هذا المنع مختص بما اذا بنی بیتا فوقه للسکنی کما هو ظاهر و اما اذا بنی للصلوٰۃ وتوسیع المسجد فلا یمنع مطلقا ۱۲ ظفر، قال فی رد المحتار و فی جامع الفتاوی لهم تحویل المسجد الی مکان اٰخر ان ترکوه بحیث لا یصلی فیه اھ (ص ۲، ۵، ج ۳) قلت کان لهم تحویل المسجد الی مکان اٰخر فلان یحولوا الصلوٰۃ فی بعض المواسم من تحته الی فوق اولی بالجواز واما کراهة الوطأ بالاقدام فوق المسجد فانه مختص بما اذا کان لغیر عذر واذا کان عن عذر فلا کراهة فی الصلوٰۃ فوقه ایضا، والله اعلم،

عباراتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ صورتِ مذکورہ میں مسجد کی اوپر والی منزل میں نماز بلا کراہت جائز ہے، مسجد کی چھت پر نماز کا مکروہ ہونا اس صورت کے ساتھ مختص ہے، جبکہ چھت پر اہلِ محلہ نماز کے لئے جگہ نہ بنادیں اور اس کو چھت ہی قرار دیں اور جب اس پر نماز کے لئے دوسری منزل بنادی گئی، تو اب یہ سقف کے حکم میں نہیں، بلکہ دوسری منزل کی چھت کو سقف قرار دیا جاوے گا، والله اعلم، ۷ار شوال ۱۳۴۰ھ

**سوال** (۵) مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں، خواہ دیواروں پر چونہ پھیرا گیا ہو یا مٹی سے لپائی ہوئی ہو،

مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا مکروہ ہے

**الجواب**: مسجد کی دیوار پر تیمم کرنا مکروہ ہے، کیونکہ مالِ وقف کو غیر مصرف میں صرف کرنا ہے، لیکن اگر تیمم کرلیا تو درست ہوجائے گا، بشرطیکہ جس چونہ یا مٹی سے مسجد کی لپائی کی گئی ہے وہ چونہ اور مٹی پاک ہو، اس میں ناپاکی نہ ملی ہو، ۲۷ر شوال ۱۳۴۰ھ

**سوال** (۶) ....................

طوائف کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز کا حکم

....... ایک مسجد زمانۂ قدیم کی بنی ہوئی ہے، اور اس وقت کے مسلمانان اس کی مرمت کرتے ہیں اور اس میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، مگر یہ مسجد کسی (طائفہ (رنڈی)) کی بنوائی ہوئی ہے، تو بعض لوگ منع کرتے ہیں، اور بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں، آیا ایسی مسجد



میں نماز درست ہے جو اور مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہے اس مسجد میں ملے گی یا نہیں، واسطے تحقیق مسئلہ یہ استفتاء خدمتِ والا میں ارسال کرکے امیدوار ہوں کہ بحوالۂ کتبِ معتبرہ بیان فرمادیں،

**الجواب**: زانیہ کی بنائی ہوئی مسجد حکماً مسجد ہوگئی، حتیٰ کہ ورثہ کا حق اس سے منقطع ہوگیا اور اس میں کسی کا تصرف خلافِ وقف ناجائز ہوگیا، نہ اس کو ڈھا سکتے ہیں نہ اُس کو بیع کرکے دوسری مسجد میں اس کی قیمت لگا سکتے ہیں، لیکن اس میں نماز پڑھنے سے ثواب کامل نہ ملیگا گو فرض ذمہ سے ساقط ہوجائے گا، قال فی الدر وشرطه شرط سائر التبرعات کحریة وتکلیف وفی رد المحتار افاد ان الواقف لابد ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد الی آن قال وصح وقف ما شراه فاسدا بعد القبض اھ ص ۵۵۵ ج ۳، وفی الحدیث ان الله طیب لا یقبل الا الطیب،

مولانا رفیع الدین دہلویؒ در بعضے تحریرات خود می نویسند، معلوم است کہ در زمین مغصوبہ پیش حنفیہ نماز ساقط از ذمہ می شود، پس در مسجدِ فاحشہ نماز خواہد شد لیکن نقصانِ ثواب برائے مصلّی و محرومیِ ثواب برائے زانیہ مقرر است، فی الحدیث لا یصل الی الله الا الطیب اھ از فتاویٰ مولانا عبدالحی مع الخلاصۃ ص ۲۲۹ ج ۱، پس بہتر یہ ہے کہ ایسی مسجد کا دروازہ اینٹوں سے بند کرکے صورتِ مسجد پر چھوڑ دیا جائے اور اس میں نماز نہ پڑھی جائے، والله اعلم ۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ،

**سوال** (۷) مسجد میں دنیاوی معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کی شرع شریف نے اجازت دی ہے؟

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے

**الجواب**: قال فی الدر ویکره الکلام المباح وقیده فی الظهیریة بان یجلس لاجله لکن فی النهر الاطلاق اوجه اھ ص ۶۹۲ ج ۱، مسجد میں دنیوی باتیں مکروہ ہیں، ۸ر شعبان ۱۳۴۱ھ

**سوال** (۸) جس مدرس کو تنخواہ مدرسہ سے ملتی ہے اور بچوں سے مشاہرہ نہیں ملتا تو وہ تعلیم کا کام مسجد میں کرسکتا ہے یا ناجائز ہے؟

حکم تعلیم مدرس در مسجد

**الجواب**: ایسے مدرس کو بھی تعلیم کا کام مسجد میں مکروہ ہے، البتہ اعتکاف کی نیت کرکے بیٹھا کرے تو درست ہے، اور اعتکاف تھوڑی دیر کا بھی ہوسکتا ہے، ۴ر ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

**سوال** (۹) ....................

اس مسجد کا حکم جس کا قبلہ قدرے منحرف ہو

..... واضح ہو کہ ہمارے گاؤں میں ایک مسجد شریف غریب لوگوں نے تیار کی ہے، مگر بناء کے وقت ستارۂ قطب کا دھیان نہیں کیا گیا اور مسجد شریف اچھی طرح سے تیار رہی ہے، جس میں عرصۂ دو ماہ سے سنت جماعت ہو رہی ہے، اب معلوم ہوا کہ مسجد شریف قطب ستارہ پر تمام پوری سیدھی نہیں، اس طرح کہ جب مسجد شریف کے جنوبی کونہ سے دیوار سے متصل ہو کر قطب ستارہ پر نظر کی جاتی ہے تو دیکھنے میں نہیں آتا ہے، اور جب مشرق کی طرف تین وال بڑھ جاتا ہے تو شمالی مشرقی کونہ میں پورا ٹھیک تمام نظر آتا ہے، اور بغیر ستارہ قطب کے جب بین المغربین کا حساب کیا جاتا ہے تو مسجد شریف پوری تمام نظر آتی ہے، لیکن اور مسجدوں سے مبدّل نظر آتی ہے، اب بتلا دیجئے کہ ملکِ سندھ و ہندوستان میں ستارۂ قطب معتبر ہے یا بین المغربین، اور اس مسجد شریف کے لئے کیا حکم ہے، اگر گرا دینے کا حکم ہے تو پھر تیار ہونا ممکن نہیں، کیونکہ اس مسجد شریف کے جماعتی بالکل مسکین لوگ ہیں، اور جماعت کی تعداد بالکل کم ہے؟

**الجواب**: اصل اعتبار تو محاریب قدیمہ کا ہے جن کا صحیح ہونا عام طور پر معلوم ہے، باقی ہندوستان میں نماز کی صحت کے لئے بین المغربین ہونا بھی کافی ہے، اور قطب ستارہ کا اعتبار بھی صحیح ہے، محاریب قدیمہ غالباً اسی پر بنائی گئی ہیں، پس اس مسجد کا قبلہ اگر بین المغربین ہو تو نماز درست ہو جائے گی، مگر بہتر یہ ہے کہ مساجد قدیمہ سے جس قدر انحراف اس کے قبلہ کا ہو امام اور مقتدی صف بندی کے وقت اس قدر انحراف کر لیا کریں، مسجد کے گرانے کی کوئی ضرورت نہیں، قال فی رد المحتار ففی القهستانی ولا باس بالانحراف انحرافا لا تزول به المقابلة بالكلية بان يبقى شئ من سطح الوجه مسامتا للكعبة اھ الی ان قال وسیأتی فی المتن فی مفسدات الصلوٰة انها تفسد بتحويل صدره عن القبلة بغير عذر فعلم ان الانحراف اليسير لا يضر وهو الذی يبقى معه الوجه او شئ من جوانبه مسامتا لعين الكعبة او هوائها بان يخرج الخط من الوجه او من بعض جوانبه ويمر على الكعبة او هوائها مستقيما ولا يلزم ان يكون الخط الخارج على استقامة خارجا من جبهة المصلی بل منها او من جوانبها كما دل عليه قول الدر من جبين المصلی فان الجبين طرف الجبهة وهما جبينان وعلى ما قررناه يحمل ما فی الفتح والبحر عن الفتاوى، من ان



الانحراف المفسد ان یجاوز المشارق الی المغارب اھ قلت ولا یخفی ان المصلی اذا قام بین المغربین یخرج الخط من بعض جوانب وجهه مارا على الكعبة او هوائها، وفی الدر وهو فی القرى والامصار محاريب الصحابة والتابعين اھ (قلت وفی حكمها محاريب من بعدهم من السلف التی اجمع المسلمون على استقامة قبلتها) وفی المفاوز البحار النجوم كالقطب اھ قال الشامی هو اقوى الادلة وهو نجم صغير فی بنات نعش الصغرى بين الفرقدين والجدی الخ (ص ۴۳۶ الی ۴۴۷ ج ۱) واللہ اعلم، ۲۴ شعبان سنہ ۴۲ھ

**سوال (۱۰)** مسجد کے اندر نماز پڑھنا اور مسجد کے صحن یا چھت پر نماز پڑھنا برابر ہے یا ثواب میں فرق آتا ہے؟

..................... (۱) مسجد اور صحن کی بزرگی ایک درجہ میں مانی جاتی ہے یا علیحدہ (۲) مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب کی زیادتی اور صحن میں امام کھڑے ہو کر نماز پڑھانے سے ثواب کی کمی، کیا ثواب میں بہ لحاظ مسجد و صحن کے دو درجے ہیں یا ایک ہی درجہ ہے، حرارت کے دنوں میں امام اور مقتدیان کا صحن میں نماز پڑھنا ہوتا ہے، بینوا توجروا؟

**الجواب**: جہاں تک زمین مسجد کے لئے یعنی نماز پڑھنے کے لئے وقف کی گئی ہے وہ سب فضیلت میں برابر ہے، اور جب مسجد میں صف بندی ہو جائے اور جگہ نہ رہے تو جو لوگ خارج مسجد کھڑے ہو کر نماز میں شامل ہوتے ہیں ان کو بھی مثل مسجد والوں کے ثواب ملتا ہے غرض اندرونِ مسجد و صحنِ مسجد میں کوئی فرق نہیں، ہاں سقفِ مسجد و داخلِ مسجد میں فقہاء نے فرق بیان کیا ہے، کہ سقف میں وہ ثواب نہیں جو داخلِ مسجد میں ہے، گو حکمِ اعتکاف میں وہ بھی مسجد ہی ہے، واللہ اعلم، ۲۵ شعبان سنہ ۴۳ھ

**سوال (۱۱)** مسجد کے اندر جوتے رکھنے، اخبار پڑھنے اور دنیوی باتیں کرنے کا حکم

حامداً و مصلیاً، (۱) مسجد کے احاطہ کے اندر جوتہ چھوڑنا (۲) خلافت کے رسالے اور اخبار اور اشتہار جنگ کے پڑھتے ہیں، (۳) مسجد یا صحن میں بیٹھ کر دنیا کی اور تجارت کی باتیں کرنا پنچایتیں کرنا یہ جائز ہوگا یا نہ؟ اور مسجد میں باتیں کرنے والوں کے لئے کیا وعید آئی ہے، بینوا توجروا؟

**الجواب**: جوتہ میں اگر نجاست نہ لگی ہو تو مسجد کے اندر رکھ دینا جائز ہے، اور اگر چوری کا خوف نہ ہو تو مسجد سے باہر رکھنا اولیٰ ہے، اور اگر ناپاکی لگی ہو تو بدون اس کے دور کئے ہوئے

جوتہ کو مسجد میں رکھنا جائز نہیں، ۲و۲ یہ سب کام مسجد کے اندر مکروہ ہیں، باہر ہونی چاہئیں البتہ اگر پنچایت شریعت کے موافق ہو اور لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس کا مسجد میں کرنا مضائقہ نہیں، ورنہ ناجائز ہے، وعید کوئی خاص منقول نہیں، یہی بہت بڑی وعید ہے کہ یہ کام گناہ ہے، واللہ اعلم، ۲۵ ر شعبان ۴۲ھ

محلہ کی مسجد میں پنج وقتہ نماز کی فضیلت،

**سوال** (۱۲) کیا محلہ کی مسجد میں نماز کا ثواب جامع مسجد سے بھی زیادہ ہے؟ اور یہ زیادتی کا حکم پنجوقتی نماز کے لئے ہے یا جمعہ اور عیدین بھی اس میں شامل ہیں؟

**الجواب**: پنجوقتہ نماز محلہ کی مسجد میں افضل ہے، اس کو چھوڑ کر قصداً جامع مسجد میں نہ جائے، البتہ کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہو اور وہاں نماز کا وقت آجائے تو اس حالت میں جامع مسجد ہی میں نماز پڑھ لے اور اس وقت اس کا ثواب مسجدِ محلہ سے زیادہ ہوگا، اور جمعہ کی نماز جامع مسجد ہی میں افضل ہے، اور عیدین کی جنگل میں افضل ہے؛

نمازی کے سامنے سے گذرنے میں مسجد کبیر و صغیر کی تحقیق،

**سوال** (۱۳) شامی وغیرہ کتابوں میں مسجد کبیر کی تعریف میں اربعین یا ستین ذراع ببارۃ مرور امام المصلی مذکور ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ پیمائش بابۃ مرور امام المصلی طول کی ہے یا عرض کی، یا ہر ایک کی یا چاروں طرف کی مجموعہ پیمائش مراد ہے؟ مدلل جواب عطا فرمائیے؟

**الجواب**: مراد طول میں ستین یا اربعین ذراع ہونا ہے، کیونکہ مدار اس پر ہے کہ مسجد اتنی بڑی ہو کہ جس میں اگر مصلی کے سامنے دور سے گذرے تو بُعد کافی ہو جائے، جس سے تشویش مصلی کو لاحق نہ ہو، اور اس امر میں مقدارِ طول کو دخل ہے نہ کہ عرض کو، نیز شامی میں کہا ہے؛ فانہ رای المسجد الصغیر کبقعۃ واحدۃ منہا یجعل جمیع مابین یدی المصلی الی حائط القبلۃ مکانا واحدًا بخلاف المسجد الکبیر والصحراء فانہ لو جعل کذلک لزم الحرج علی المارۃ فاقتصر علی موضع السجود اھ (ص ۶۶۳ ج ۱) ظاہر ہے کہ حرج علی المار میں مقدار طول ہی کو دخل ہے، نہ عرض کو، نیز جعل جمیع ما بین یدی المصلی الی حائط القبلہ بھی اس کو مفید ہے، پس یہ مقدارِ طول جانب قبلہ کی ہے، اور عرض اس کے مناسب ہوگا، واللہ اعلم ۸ ر ذیقعدہ ۴۳ھ

جس مسجد کا رُخ قبلے سے مائل و منحرف ہو اسمیں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

**سوال** (۱۴) ........



....... ایک مسجد ایسی بنی ہوئی ہے کہ جس کا رُخ مائل بجانب شمال قبلے سے اس قدر ہٹا ہوا ہے، آیا اس قدر کجی سے نماز ہوتی ہے یا نہیں، حکم شرع کیا ہے، درصورت نہ ہونے نماز کے اور باوجود مالی استطاعت کے مسجد مذکور کو از سرِ نو تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں، یا قبلہ ہی کی دیوار توڑ کر اس کو درست قبلہ رُخ کر دیا جائے، اگر از سرِ نو تعمیر نہ کرائی جائے اور نہ دیوار توڑ کر اس کو قبلہ رُخ کیا جائے، تو ایسی حالت میں اجنبی شخص کو دھوکہ کھانے اور خلاف قبلہ رُخ پر نماز پڑھنے کا اندیشہ ہے، ایسے خطرے کی حالت میں اگر از سرِ نو مسجد مذکور کو تعمیر کرایا جائے تو درست ہے یا نہیں، اور سوا بارہ فٹ کجی ہے، یہ بھی تحقیق سے معلوم ہوا ہے، جواب سے مشرف فرمائیے، صورت ہکذا:-

مغرب

صحیح قبلہ

شمال دیوار قبلہ نما صحیح جنوب

موجودہ دیوار قبلہ

مشرق

**الجواب**: قال فی الشامیۃ قد علمت انہ لو فرض شخص مستقبلا من بلدۃ لعین الکعبۃ حقیقۃ بان یفرض الخط الخارج من جبینہ واقعًا علی الکعبۃ فہذا مسامت لہا تحقیقا ولو انہ انتقل الی جہت یمینہ اوشمالہ بفراسخ کثیرۃ وفرضنا خطا مارا علی الکعبۃ من المشرق الی المغرب وکان الخط الخارج من جبین المصلی یصل علی استقامتہ الی ہذا الخط المار علی الکعبۃ فانہ بہذا الانتقال لا تزول المقابلۃ بالکلیۃ لان وجہ الانسان مقوس فمہما تاخر یمینًا اوشمالًا عن عین الکعبۃ یبقی شیء من جوانب وجہہ مقابلا لہا الی ان قال بل المفہوم مما قدمناہ عن المعراج والدرر من التقیید بحصول زاویتین قائمتین عند انتقال المستقبل یمینا اویسارا انہ لا یصح لو کانت احدیہما حادۃ والاخری منفرجۃ بہذہ الصورۃ

خط کعبہ

مصلی

ثم قال لکن وقع فی کلامہم مایدل علی ان الانحراف لا یضر ففی القہستانی ولا بأس بالانحراف انحرافًا لا تزول بہ المقابلۃ بالکلیۃ بان یبقی شیء من سطح الوجہ مسامتا للکعبۃ اھ وسیأتی فی المتن فی مفسدات الصلوٰۃ انہا تفسد بتحویل صدرہ عن القبلۃ بلاعذر

فعلم ان الانحراف اليسير لايضر وهو الذی يبقى معه الوجه اوشئ من جوانبه
مسامتا لعين الكعبة اولهوائها بان يخرج الخط من الوجه اومن بعض جوانبه
ويمر على الكعبة اوهوائها مستقيما ولا يلزم ان يكون الخط الخارج على استقامة
خارجا من جبهة المصلى بل منها اومن جوانبها كما دل عليه قول الدرمن جبين
المصلى فان الجبين طرف الجبهة وهما جبينان وعلى ماقررنا يحمل مافى الفتح
والبحر عن الفتاوى من ان الانحراف المفسد ان يجاوز المشارق الى المغارب اھ
(ص ۴۴۶ ج ۱) عبارات مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نمازی کی پیشانی سے یا جوانب
چہرہ کے کسی جز سے بھی ایسا خط نکلے جو خطِ کعبہ سے زاویہ قائمہ پر تقاطع کرے تو اتنے
انحراف سے نماز ہوجائے گی، اب اس کو خود دیکھ لیا جائے کہ صورتِ مذکورہ میں موجودہ دیوار
قبلہ کی طرف رُخ کرکے کھڑے ہونے سے چہرے کی کسی جانب سے بھی ایسا خط نکل سکتا ہے
جو خطِ کعبہ سے زاویۂ قائمہ پر تقاطع کرتا ہو، اگر ایسا خط نکل سکتا ہے، تو اس قدر انحراف
مفسدِ صلوٰۃ نہیں، اور نہیں نکلتا تو نماز نہ ہوگی، باقی بہرصورت بہتر یہ ہے کہ اگر ممکن ہو
تو ساری مسجد کو منہدم نہ کیا جائے بلکہ دیوارِ قبلہ کو توڑ کر صحیح طور پر قبلہ رُخ کردیا جائے اور
اگر ایسا ممکن نہ ہو تو تصحیح قبلہ کے لئے جبکہ رُخ میں انحراف بیّن ہو پوری عمارت کا از سرِ نو بھی
بنا دینا جائز ہے، بشرطیکہ مسلمانوں کو اس کی استطاعت ہو، ورنہ سہل صورت یہ ہے
کہ فرشِ مسجد میں قبلہ کے صحیح رُخ پر پختہ مسالے سے خط کھینچ دیا جائے، اور صفیں اسی خط
کے موافق بچھائی جائیں، اس سے آنے والوں کو بھی دھوکا نہ ہوگا، وہ خطوط کو دیکھ کر
قبلہ کا رُخ معلوم کرلیں گے، واللہ اعلم، ۱۱ ر ذیقعدہ ۴۳ھ

مسجد کا چراغ حجرہ میں جلانا درست نہیں،

**سوال (۱۵)** .............. مسجد میں جو
تیل چراغ روشن کرنے کو لوگ دے جاتے ہیں، اس تیل سے سحر میں
اور نماز فجر کے وقت چراغ روشن کرنا جائز ہے یا نہیں، اور لوگوں کی طرف سے اس کی صریح
اجازت ہونے نہ ہونے میں اور ان کو اس کا علم ہونے نہ ہونے کی حالت میں کچھ فرق ہے
یا نہیں، نیز مسجد کے حجرہ میں مسجد کا تیل جلانا جائز ہے یا نہیں اور اگر کوئی تیل دینے والا
از خود یا دریافت کرنے پر حجرہ اور مسجد دونوں میں جلانے کی اجازت دیدے تو کیا حکم ہے
اور بعض مرتبہ کسی بچہ وغیرہ کی معرفت تیل بھیجدیتے ہیں وہ اگر مسجد اور حجرہ دونوں جگہ



جگہ جلانے کی اجازت دے تو معتبر ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا،

**الجواب:** قال فی العالمگیریة ولا يحمل الرجل سراج المسجد الى
بيته ويحمل من بيته الى المسجد ولا باس ان يترك سراج المسجد فى
المسجد الى ثلث الليل ولا يترك اكثر من ذلك الا اذا شرط الواقف ذلك
اوكان ذلك معتادا فى ذلك الموضع كذا فى فتاوى قاضى خان اھ (ص ۷۰ ج ۱)
اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا چراغ یا تیل حجرہ میں جلانا جائز نہیں، البتہ اگر تیل دینے والا
صراحۃً اس کی اجازت دیدے تو اجازت دینے والے کے تیل میں سے مؤذن کو بقدر
ضرورت حجرہ میں تیل جلانا جائز ہے، اور جو اجازت نہ دے اس کے تیل میں سے جلانا جائز
نہیں، پس مؤذن کو اجازت والا تیل اور بے اجازت والا الگ الگ برتن میں رکھنا چاہئے
اور نابالغ بچہ کی اجازت معتبر نہیں،
اور مسجد کا چراغ تہائی رات سے زیادہ مسجد میں روشن نہ کرنا چاہئے، کہ یہ جائز نہیں
البتہ اگر تیل والا اجازت دیدے تو اس کے تیل میں سے سحر کے وقت روشن کرنا جائز ہے
یا کسی موضع میں دستورِ عام ہو کہ سحر میں چراغ روشن کیا جاتا ہو تو وہاں بدون اجازت لئے بھی
سحر میں روشن کرنا جائز ہوگا، اور نماز صبح کے وقت جاڑوں میں چراغ روشن کرنا عام دستور
ہے، اس لئے صبح کے وقت جاڑوں میں تو مطلقاً اس کی اجازت ہے اور گرمیوں میں اجازت
لینا چاہئے، یا عام عرف کو دیکھ کر عمل کرنا چاہئے، واللہ اعلم، غرہ صفر ۴۴ھ

مسجد میں نماز کی فضیلت وارد اس وقت ہے جبکہ مسجد وقف ہو،

**سوال (۱۶)** ۱- حدیث میں جو مسجد محلہ کا ثواب پچیس
رکعت کا وارد ہے اب وہ زمینِ وقف کا حکم ہے یا مطلق
نماز کے لئے بنانے سے بھی یہ حکم ہوگا، اور کسی نے نماز کے واسطے مکان بنا دیا اور نماز پڑھنے
لگے مگر زبانی وقف نہیں کیا، اب لوگوں کے نماز پڑھنے پر بھی وقف کا حکم دیا جاویگا یا نہیں؟
(۲) نماز جماعت سے پڑھنے کا ستائیس درجہ تنہا سے ملتا ہے، یہ حکم گھر پر جماعت کا بھی
ہے یا مسجد کا، اور جب مسجد کا حکم پچیس کا ثواب ہے، اور جماعت کا ستائیس کا ہے، اب
اس قاعدہ سے جب مسجد اور جماعت دونوں ہوں گے تو ۲۵ اور ۲۷ کے ضرب دینے کا ثواب
ہونا چاہئے، یہ قاعدہ ٹھیک ہے یا نہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں،

**الجواب:** (۱ و ۲) مسجد وہی ہے جو وقف ہو، جو وقف نہ ہو وہ مسجد نہیں ہے اس

میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب تو ملے گا، مگر مسجد کا ثواب نہ ملے گا، اور بدون وقف کئے فقط مکان میں نماز کی اجازت دینے سے مسجد نہیں ہوتی، اور بغیر مسجد کے بھی اگر جماعت ہو تو ستائیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے، اور مسجد کا ثواب اس کے علاوہ ہے، واللہ اعلم

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ،

**مسجد میں اخراجِ ریح اور ایسے شخص کی اقتداء کا حکم**

## سوال (۱۷) ......

مسئلہ اول: مسجد میں قصداً آواز سے حدث کرنا، یعنی آواز سے گوز مارنا، یہ گناہ صغیرہ ہے یا کہ کبیرہ، (۲) قصداً بلکہ اصراراً آواز سے حدث کرنے والے کو اگر امام مسجد کیا جاوے تو اس کی اقتداء کیسی! اور جو نماز مکروہ تحریمی ہو اس کا اعادہ ضروری یا غیر ضروری؟ (۳) صفتِ مذکورہ پر حدث کرنے اور مُردوں کو غسل دینے والے یعنی غسال پیشہ ہر دونوں کی اقتداء میں کراہیت کا حکم، لوگوں کے مکروہ جاننے پر موقوف ہے، یا کہ عقل سلیمہ کے نزدیک ہر دو شارع علیہ السلام کی مسند قائم کرنے کے قابل نہیں، اُن کی اقتداء میں کراہت کراہت تحریمی ہے یا کہ تنزیہی؟

**الجواب**: مسجد میں ریح خارج کرنا منع ہے، کما فی العالمگیریۃ (ص ۲۱۵ ج ۲) وفی اللآلی واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم قالوا لا یفسو و یخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح کذا فی التمرتاشی وهکذا فی الشامی (ص ۶۵۸ ج ۱) ونصه ولا البول والفصد فیه ولو فی اناء الخ وکذا لا یخرج فیه الریح من الدبر اھ ثم ذکر مثل کلام العالمگیریۃ، اگر یہ فعل خارج مسجد ہو تو خوارم مروت سے یقیناً ہے، بلکہ زور سے اخراجِ ریح تو خارج مسجد بھی ناجائز ہے، لقوله تعالیٰ وتاتون فی نادیکم المنکر وفسرته عائشۃ رض بالفراط فی المجلس ذکره الامام ابن جریر الطبری فی تفسیره بسنده (ص ۹۳ ج ۲۰) ولا یقال قد ورد فی بعض الروایات تفسیره بالخذف ای کانوا یخذفون اهل الطریق ویسخرون بهم کما ذکره الطبری ایضاً (ص مذکور) قلت لا منافاۃ بینهما فکانوا یفعلون کلا الامرین واما تفسیره باتیان بعضهم بعضاً فی المجالس فلم یرد الا عن مجاهد ولم یرفعه فلا یقدح فی تفسیر الصحابۃ فان رفعه



اقرب واللہ تعالیٰ اعلم، پس اس فعل کا عمداً آواز کے ساتھ کرنا شرعاً منکر ہے جو کہ حرمت تحریمیہ کو مستلزم ہے، (لکون ثبوت منکریته بالخبر الظنی) اور مسجد میں کرنا تو اشد کراہت کو مستلزم ہے، واما اختلاف السلف فیه فانما هو فیما اذا اضطر سراً لا فیما اذا اضطر بالتصویت عمداً، پس شخص اگر اس حرکت سے باز نہ آوے اور توبہ نہ کرے تو وہ امام بنانے کے قابل نہیں، اور عزل میں فتنہ نہ ہو تو اس کو امامت سے الگ کر دینا چاہئے،

(۳) صفتِ مذکورہ پر حدث کرنے والا تو فاسق ہے اس لئے امام بنانے کے قابل نہیں، اور مُردوں کو غسل دینے والا اگر لوگ اس کی امامت سے کراہت کرتے ہوں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے راضی نہ ہوں تو اس کو بھی امام نہ بنایا جاوے، بشرطیکہ مقتدیوں میں اس کی برابر یا اس سے زیادہ احکام صلوٰۃ کا جاننے والا اور قرآن صحیح پڑھنے والا دوسرا موجود ہو، ورنہ غسال ہی کی امامت اولیٰ ہے، واللہ اعلم، ۲۲ رجب ۱۳۴۲ھ

**مسجد بنانا فرض ہے یا واجب**

## سوال (۱۸)

مسجد کا بنوانا فرض ہے یا واجب ہے یا سنت ہے یا مستحب ہے، جواب مرحمت فرمائیں؟

**الجواب**: ہر شہر و قصبہ و گاؤں میں مسجد کیلئے بقدر ضرورت زمین وقف کرنا تو وہاں کے مسلمانوں پر واجب علی الکفایہ ہے، باقی عمارت بنوانا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے قال فی الدر ومن نذر نذراً مطلقاً من جنسه واجب وهو عبادۃ مقصودۃ ووجد الشرط لزم الناذر الوفاء به کصوم وصلوٰۃ وصدقۃ ووقف واعتکاف واعتاق رقبۃ وحج ولو ماشیاً فانها عبادات مقصودۃ ومن جنسها واجب لوجوب العتق فی الکفارۃ الی ان قال ووقف مسجد للمسلمین واجب علی الامام من بیت المال ای فی کل بلدۃ علی الظاهر ط ۱۲ شامی) والا فعلی المسلمین ای وان لم یفعل الامام فعلی المسلمین ۱۲ شامی) (ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۳) وفی حاشیته علی البحر بعد نقل کلام البدائع فی عدم صحۃ النذر ببناء المسجد لکونها قربۃ غیر مقصودۃ ما نصه فهذا صریح فی ان الشرط کون المنذور نفسه عبادۃ مقصودۃ لا ما کان من جنسه ویدل علیه انهم صححوا النذر بالوقف لان من جنسه واجباً هو وقف المسجد للمسلمین وقد علمت ان بناء المسجد غیر مقصود اھ (ص ۲۹۶ ج ۴) قلت دل علی ان بناء المسجد لیس من جنسه واجباً، واللہ اعلم،

هندو مسجد کے قریب گانا یا سنگ کرتن کرتے ہوئے گذریں تو اس سے مسجد کی ہتک حرمت ہوگی یا نہیں؛ اور مسلمانوں کو شرعاً اس سے روکنے کا حق ہے یا نہیں!

## سوال (۱۹)

......... اگر ہندو لوگ کوئی مسجد کے قریب سے گانا بجانا کرتے ہوئے یا سنگ کرتن کرتے ہوئے جاویں تو اس میں مسجد کی ہتک حرمت ہوگی یا نہیں؟ ہتک حرمت اور عبادت میں وہ مخل ہونے کی جہت سے مسلمانوں کو شرعاً حق ممانعت و مناہی کی ہے یا نہیں؟ اور اس کو بند کرنے کے لئے مسلمانوں کو بہ دل و جان کوشاں ہونا چاہئے یا نہیں؟

**الجواب:** قال تعالیٰ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ه وقد فسر المكاء بالتصفير ونفخ البوق ونحوه والتصدية بالتصفيق كما في الدر المنثور وتفسير ابن جرير في تفسير هذه الآية، قلت وفيه دلالة على بغض الله ومقته امثال تلك الافعال عند المساجد واشعار بان بها تنتهك حرمة المساجد ففرع عليه بقوله فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون، وفسر بما حصل لهم من الخزي و النكال ببدر، ولا يخفى ان كل ما يبغضه الله ويمقته لا يقره مؤمن ابداً وان سكوته عنه وتقريره فاعله عليه معصية كبيرة فيجب عليه انكاره ما امكن وادناه ان ينكر بقلبه ان لم يستطع تغييره بلسانه ولا بيده واعلاه ان يغيره بيده ان كان يستطيع ذلك وشرط الاستطاعة ان لا يترتب عليه فتنة اشد منه والكل ظاهر لمن نظر في قواعد الشرع، هذا وقد ذكر الشيخ ابن تيمية في شروط عمر رضي الله عنه مع اهل الذمة ولا نظهر الصليب على كنائسنا ولا نظهر صليبا ولا كتابا في شئ من طرق المسلمين ولا اسواقهم ولا نضرب بنواقيسنا في كنائسنا الا ضربا خفيفا ولا نرفع اصواتنا مع موتانا ولا نظهر النيران معهم في شئ من طرق المسلمين ولا نرفع اصواتنا في الصلوٰة ولا القراءة فيما يحضره المسلمون اه، (ص ۵۸) قال رواه حرب باسناد جيد وهذه الشروط اشهر شئ في كتب الفقه والعلم وهي مجمعة عليها في الجملة بين العلماء اه قلت



۵

فظهر بذلك ان كل ذلك من علامات غلبة الكفر وذلة اهل الاسلام فلذا شرط عليهم تركه كله فما كان المسلمون يقدرون على استيفاء من هذه الشروط تحت قوانين الحكومة يلزمهم استيفاءه منهم، والله اعلم،

اس میں شک نہیں کہ کفار کا مساجدِ مسلمین کے سامنے گانا بجانا اور رسوم کفر و شرک بجالانا موجب ہتک و حرمت مسجد ہے، اور اسی وجہ سے اب تک مختلف مواقع میں حکومتِ وقت نے ہندوؤں کو مسجد کے سامنے ان افعال سے منع کیا ہے، کیونکہ ان سے مسلمانوں کو ایذاء ہوتی ہے اور مساجد کی ہتک حرمت ہوتی ہے، اور مسلمانوں نے کبھی اس کو آج تک گوارا نہیں کیا، اور جب یہ افعال مسجد کے سامنے ہتکِ حرمتِ مسجد کا سبب ہیں تو مسلمانوں کو یہ بھی حق ہے کہ ہندوؤں کو مساجد کے سامنے ان افعال کے کرنے سے روکیں؛ مگر روکنے کی وہ صورت اختیار کرنا چاہئے جس میں اس سے بڑھ کر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اور جس صورت میں اس سے بھی زیادہ فتنہ کا خطرہ ہو وہ صورت اختیار نہ کی جائے، پس مسلمانوں کو صرف یہ صورت اختیار کرنا چاہئے کہ حکومتِ وقت سے درخواست کریں، کہ ہندوؤں کا مساجد کے سامنے گانا بجانا اور اپنے رسوم کفر و شرک بجالانا ہماری مسجدوں کی ہتک حرمت کا سبب ہے، اس لئے ان کو مسجدوں کے سامنے ایسے افعال کرنے سے روک دیا جائے، گورنمنٹ سے ایسی درخواست کرنے میں پوری کوشش بدل و جان کرنا چاہئے، اور اس میں جس قدر سعی کی جائے گی باعثِ ثواب عظیم ہوگی، (لما فيه من اعلاء كلمة الله) اور جب حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو یہ حق مل جاوے جیسا کہ ابتداءً حکومت سے اس وقت تک گورنمنٹ نے مسلمانوں کو یہ حق دے رکھا تھا تو اس کے بعد اگر کسی جگہ ہندو اس کے خلاف عمل کریں وہاں ان کے روکنے کی صرف یہ تدبیر کریں کہ حکومت ہی سے استغاثہ کریں تاکہ حکومت اپنے قاعدہ کے موافق ہندوؤں کو اس ناجائز و ناشائستہ حرکت سے خود روک دے، مسلمانوں کو بلا واسطہ ہندوؤں سے تعرض و مزاحمت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس میں مساجد کی زیادہ ہتک حرمت کا قوی اندیشہ ہے، کیونکہ جب اُن سے بلا واسطہ مزاحمت کی جائے گی تو وہ مقابلہ کریں گے، اور مقابلہ میں آکر مسجد کی زیادہ ہتک حرمت کریں گے، مثلاً اس پر ڈھیلے پتھر پھینکنے لگیں یا مسجد ہی کو معاذ اللہ منہدم کر دیں گے، چنانچہ بعض مواقع میں ایسا سُنا بھی گیا ہے، پس یہ صورت جائز نہیں،

اور اگر کسی جگہ کے ناواقف مسلمانوں نے یہ صورت اختیار کی ہو اور اس میں اپنی جان دیدی ہو ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، وہ ہر شخص کی نیت و عذر کو خود جانتے ہیں، باقی شرعاً مسلمانوں کے لئے اس وقت صرف پہلے طریقہ سے کوشش کرنا جائز ہے، کہ گورنمنٹ سے درخواست کریں، دوسرے طریقہ سے کوشش جائز نہیں، کہ خود مقابلہ کے لئے آمادہ ہوجائیں کہ اس میں زیادہ ہتک حرمت اور زیادہ مفاسد و فتن کا خطرہ ہے، اور اگر خدانخواستہ گورنمنٹ مسلمانوں کی اس درخواست کو قبول نہ کرے تو اس وقت مسلمانوں کو صبر کرنا چاہئے اور خدا تعالیٰ سے دعاء کرنا چاہئے کہ وہ مساجد کی ہتک حرمت کو دور کرنے کی کوئی سبیل پیدا کردیں، اس وقت مسلمانوں کو صرف دل سے ہندوؤں کو اس فعل پر نفرت و کراہت کرنا کافی ہے، مقابلہ کسی کا نہ کریں، نہ حکومت کا نہ رعایا کا، لیکن حکومت کے ایک بار اس درخواست کے رد کرنے پر کوشش کو ترک نہ کریں بلکہ موقع بموقع بار بار حکومت سے اس حق کے عطا کی درخواست کرتے رہیں، انشاء اللہ حکومت ضرور توجہ کرے گی، واللہ اعلم، ۱۸ ذیقعدہ سنہ ۴۴ھ

مسجد میں کھڑکیاں کھولنے کا حکم

**سوال** (۲۰) مسجد کی مغربی دیوار پر کھڑکیاں بنانا جس میں ہوا کی آمد و رفت ہو از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: جائز ہے مگر کنیسہ و گرجا کے طرز پر نہ ہو بلکہ مسجدوں کے طرز پر ہوں، واللہ اعلم، ۱۵ محرم سنہ ۴۵ھ

مسجد میں نمازیوں کے لئے پانی کا گھڑا رکھنا

**سوال** (۲۱) مسجد کے اندر یا باہر فرش پر نمازیوں کے لئے پانی کا گھڑا رکھنا کیسا ہے،

**الجواب**: اس میں فی نفسہٖ تو کوئی حرج نہیں، اگر وہاں کوئی خرابی ہو تو اس کو ظاہر کیا جاوے، کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

بضرورت مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا مباح ہے،

**سوال** (۲۲) مسجد میں گفتگو دنیوی کرنا کس درجہ کا گناہ ہے؟

**الجواب**: دنیوی کلام بضرورت ہو تو مسجد میں جائز ہے، بشرطیکہ مسجد میں اسی غرض سے نہ آیا ہو، بلاضرورت مکروہ ہے، اس پر حدیث شریف میں سخت وعید وارد ہے، ۲۵ رجب سنہ ۴۵ھ

محلہ کی مسجد چھوڑ کر دور کی مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم

**سوال** (۲۳) واضح ہو کہ میرے محلہ میں



دو مساجد ہیں، قریب کی مسجد میں نماز مسنون طریقہ سے نہیں ہوتی، امام مختصر سی سورتیں پڑھتا ہے جس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی، وہ ایک بوڑھے آدمی کا جو بالکل تندرست ہے خیال کرتا ہے اور زیادہ پڑھے تو وہ بوڑھا آدمی جنگ پر آمادہ ہوجاتا ہے، اس واسطے لمبی رکعت نہیں ہوتی، دور کی مسجد میں جو بہت دور نہیں ہے ایک نیک بخت آدمی امام ہیں، اور وہاں نماز عمدہ اور مسنون طریقہ پر ہوتی ہے، پس درخواست ہے کہ ارشاد فرمادیں کہ کیا نماز دور کی مسجد میں ہوجاتی ہے، اور پچیس نمازوں کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

دیگر اس قریب والی مسجد میں لڑائی جھگڑے کا بھی اندیشہ رہتا ہے، ایک مولوی صاحب نے مجھ کو منع کیا تھا کہ دور نماز کے لئے نہ جایا کرو، اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ کیا دور کی مسجد میں نماز پڑھنے سے کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا؟ اور آپ دور والی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں، یا نہیں، مفصل جواب سے مشرف فرماویں؟

**الجواب**: اصل یہ ہے کہ مسجد محلہ جو اپنے گھر سے اقرب ہو اس کا حق زیادہ ہے اس کو چھوڑ کر دور کی مسجد میں جانا بلاوجہ معتد بہ جائز نہیں، پس اگر مسجد قریب کا امام فاسق اور غلط خواں نہیں ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ لمبی سورتیں نہیں پڑھتا مسجد قریب کا ترک جائز نہیں، اور اندیشۂ فساد جو لکھا ہے تو سائل فساد کی بات میں شرکت نہ کرے، ہاں اگر بدون اس کی شرکت کے بھی کوئی خواہ مخواہ اس سے فساد کرتا ہو تو اس عذر کی وجہ سے مسجد بعید میں جانا جائز ہے، قال الشامی تحت قول الدر ولو فاتته (الجماعة) ندب طلبها فی مسجد اٰخر الا المسجد الحرام اھ ما نصه واعترض الشرنبلالی بان هذا ینافی وجوب الجماعة واجاب ح بان الوجوب عند عدم الحرج وفی تتبعها فی الاماکن القاصیة حرج لا یخفی مع ما فی مجاوزة مسجد حیة من مخالفة قوله صلی الله علیه وسلم لا صلاة لجار المسجد الا فی المسجد اھ (ص ۱۲۵۰۶)

۱۵ رمضان المبارک سنہ ۴۵ھ،

مسجد میں افطار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

**سوال** (۲۴) مسجد میں روزہ افطار کرنا اس خیال سے کہ اگر گھر افطار کرکے مسجد میں گئے تو جماعت کا کچھ حصہ نہیں ملے گا، افطار سے مطلب یہ ہے کہ افطار میں کھانا وغیرہ اچھی طرح سے کھا لیا جاوے، ورنہ یہ ممکن ہے کہ اگر ایک گھونٹ پانی یا صرف چھوارا وغیرہ کھا کر چلے تو اول رکعت میں بخوبی شامل ہوسکتا ہے، اور مسجد اول

یہ دشوار ہے کہ وہ اذان وتکبیر میں اس قدر وقفہ کریں کہ گھر کے افطار کرنے والے جماعت کی اوّل رکعت میں شامل ہوجاویں، تو ایسی صورت میں مسجد میں افطار کا کیا حکم ہے؟

**الجواب**: ایسی حالت میں افطار مسجد میں کیا جاوے، مگر مسجد کی حد کے اندر نہ کھائیں بلکہ باہر کھائیں، اور باہر کوئی جگہ مناسب نہ ہو تو مسجد ہی میں کھالیں اور کھانے سے کچھ دیر پہلے اعتکاف کی نیت کرکے مسجد میں آجایا کریں، امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف قدر قلیل زمان کا بھی صحیح ہے، قال فی الدر وکرہ اکل ونوم الا لمعتکف الخ قال الشامی قولہ اکل ونوم الخ اذا اراد ذلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر مانوی او یصلی ثم یفعل ماشاء فتاوی ہندیۃ (ص ۶۹۱/۱) واللہ اعلم
غرہ رمضان المبارک ۴۵ھ

ایضاً ایضاً ایضاً | **سوال** (۲۵) رمضان شریف میں اہل محلہ کا بخوف ترک جماعت نماز مغرب مسجد محلہ میں جمع ہوکر شربت وغیرہ قلیل اشیاء سے روزہ افطار کرنا بلاکراہت جائز ہوگا یا نہیں؟

**الجواب**: مسجد میں اکل وشرب مکروہ ہے، مگر ضرورت کے وقت بلاکراہت جائز ہے، کالمسافر یباح لہ النوم فیہ، اور ترک جماعت کا اندیشہ بھی عذر ہے، اس لئے اگر مسجد سے باہر کوئی جگہ ایسی نہ ہو جہاں افطار کرسکیں تو مسجد ہی میں افطار کرلینا جائز ہے بشرطیکہ مسجد کو ملوث نہ کیا جائے، قال علی القاری فی وجہ تاخیر عمر وعثمان الافطار عن الصلوٰۃ انہما کانا فی المسجد وکانا غیر معتکفین ورأیا الاکل والشرب بغیر المعتکف مکروہین (فی المسجد) لکن اطلاق احادیث التعجیل ظاہر فی استثناء حال الافطار (ص ۵۱۳ ج ۲) کوئی کپڑا وغیرہ ایسا بچھالیا جائے جس سے مسجد کی حفاظت رہے، اور بہتر یہ ہے کہ اس وقت افطار سے کچھ پہلے اعتکاف کی نیت کرکے مسجد میں داخل ہو، اور امام محمدؒ کے نزدیک اعتکاف ساعت بھی درست ہے، وبہ یفتیٰ، پھر یہ کراہت کلیۃً مرتفع ہوجاوے گی، واللہ اعلم۔ ۱۷ رمضان ۴۵ھ

قربانی میں مسجد کی چٹائی استعمال کرنا درست نہیں، | **سوال** (۲۶) قربانی کے گوشت کی وجہ سے ہر سال کے لئے ایک بوریا نیا خرید کیا جاتا ہے، اور اس کا استعمال اس طرح پر ہوتا ہے کہ محلہ کی مسجد کے پرانے اور بوسیدہ بوریئے گوشت کے کام میں لائے جاتے ہیں، اور



نئے بوریئے مسجد میں ڈال دیئے جاتے ہیں، بعض لوگ اس عمل کو بھی ناجائز بتاتے ہیں، امید ہے کہ جناب والا دونوں باتوں کے شرعی حکم سے مشرف فرمائیں گے؟

**الجواب**: قربانی کے لئے مسجد کا پرانا بوریا جس طرح عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے استعمال کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کی صورت یہ ہونا چاہیئے کہ پرانے بوریئے کو متولی یا مہتمم مسجد سے نئے بوریئے کے عوض خرید لیا جاوے، خریدنے کے بعد وہ پرانا بوریہ تمہاری ملک ہوجائے گا، اور ملک مسجد سے نکل جائے گا اور قبل اشتراء کے وہ ملک مسجد میں ہے، اور ملک مسجد کو اپنے ذاتی تصرفات میں لانا جائز نہیں، واللہ اعلم، ۲۱ ذی الحجہ ۴۵ھ

عیدگاہ کا مسقف کرنا کیسا ہے | **سوال** (۲۷) زید میگوید کہ دریں ملک بنگال عیدگاہ را مسقف ساختن بشرف جواز برسد زیرا کہ باراں بکثرت می بارد واحیاناً بابادصورت اتصال می گردد، لہٰذا مراداے نماز عید در عیدگاہ صورتے نمی بندد وحصار عیدگاہ از جائے مسقف دور می باشد وبدون تمکین صرف بسقفے درمیدان عیدگاہ حکم مکان ندارد، وبکر می گوید کہ عیدگاہ را مسقف کردن جائز نباشد، زیرا کہ برائے نماز عید خروج الی الجبانہ سنت است وعیدگاہ بوجہ سقف وحصار مکانے می گردد وخروج الی المکان خلاف سنت است فلاجرم جائے عیدگاہ را مسقف ندیدہ ام ونشنیدہ ام واگر باراں وغیرہ گاہے مانع گردد تا برائے نماز عید مساجد موجود است،

**الجواب**: قول بکر کہ عیدگاہ بوجہ سقف وحصار مکان می گردد وخروج الی المکان خلاف سنت است، صحیح نیست، قال فی البحر عن المغرب والخروج الی الجبانۃ سنۃ لصلاۃ العید وان کان یسعہم المسجد الجامع وفی المغرب الجبانۃ المصلی العام فی الصحراء اھ وفی مجمع البحار الجبان والجبانۃ الصحراء وتسمی بہما المقابر لانہا تکون فی الصحراء اھ (ص ۱۷۲ ج ۱) قلت وکذا یسمی بہا مصلی العید لانہا تکون فی الصحراء لاان مصلی العید ہی الصحراء بعینہا کما یشعر بما قلنا قول المغرب، پس دریں صورت خروج الی الجبانۃ یعنی خروج الی المصلی العام فی الصحراء متحقق است زیرا کہ خروج بسوئے مکانیکہ در صحراء ہست مستلزم خروج بسوئے صحراء ہم باشد قال فی البحر وفی الخلاصۃ ولا یخرج المنبر الی الجبانۃ یوم العید واختلف المشائخ فی بناء المنبر فی الجبانۃ قال بعضہم یکرہ وقال

بعضهم لایکره فی نسخة الامام خواهر زاده هذا احسن فی زماننا وعن ابی حنیفة انه لابأس به (ص ۱۵۹ ج ۲) قلت والمراد بناء المنبر مع مایتعلق به من الحصار وغیرها فان بناء المنبر وحده فی الصحراء لایتصور عادة و لم یکن ذلك متعارفا، پس بناءً بر قول خواہر زادہ کہ بناءِ منبر را بزمانہ خود حسن گفتہ تسقیف عیدگاہ ہم درجائے کہ بکثرت باراں نماز عید بدون سقف متعذر باشد جائز خواہد شد کہ در ترکِ تسقیف ترکِ سنت خروج الی الجبانۃ دواماً لازم می آید، پس قولِ زید نزد ما قوی است، واللہ اعلم، ۸ محرم ۱۳۴۶ھ

مسجد میں کھانا کھانا اور کھلانا مکروہ ہے

**سوال (۲۸)** ...... دیارِ بنگالہ میں یہ دستور ہے کہ بروز جمعہ شیرینی پکا کے یا کبوتر یا مرغ وغیرہ ذبح کرکے بہات سالن تیار کرکے مسجد میں لے جاتے ہیں، بعد نماز تمام مصلی کو قطارِ صلوٰۃ میں مسجد کے اندر ہی اندر تقسیم کردیتے ہیں، اور بوقت نذر اکثر یہ کہتے ہیں اگر یہ کام ہوجاوے تو مسجد میں کبوتر وغیرہ کو ذبح کرکے شیرینی مع نیاز دوں گا، یا فقط شیرینی بھیج دوں گا، یا بلا تعلیق مثلاً کھیت وزراعت کا نیا دھان وپھل مل جاوے مسجد کی نیت سے پکا کر بھیج دیتے ہیں، اگر کہا جاوے مصلیوں کو بلا کر گھر میں کھلادو تو ہرگز نہیں مانتے، پس ان صُوَرِ مذکورہ نیاز ونذر جو کہ تعلق مسجد کو ضروری جانتے ہیں کیا حکم ہوگا، کیا واقعی نذر یا رسومِ جاہلانہ ہے اور اطعمہ مذکورہ کا کھانا فقیر وغنی کو کیسا ہوگا، اور بعض یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے نام پر مسجد میں دوں گا، تفصیلاً حوالۂ کتب سے تسکین بخشیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمادیں، اکثر لوگ خاص وعام ...... فتنہ وفساد میں مبتلا ہیں، حضور والا کے جواب باصواب پر امیدِ ہدایت ہے، اگر طرزِ سوال میں کوئی غلط ہو تصحیح فرمادیں عین عنایت ہے، تاکہ مجمع علماء میں پیش کیا جاوے،

**الجواب**، مسجد میں کھانا کھانا اور کھلانا مکروہ ہے، اور اگر اس کا التزام کرلیا جاوے تو سختی کے ساتھ منع کرنا لازم ہے، واللہ اعلم، ۶ شوال ۱۳۴۶ھ

جنازہ مسجد سے باہر ہو امام اور مقتدی سب مسجد کے اندر ہوں تو یہ صورت بھی جنازہ کی مکروہ ہے یا نہیں؟

**سوال (۲۹)** ہمارے یہاں بڑی جامع مسجد ہے اس میں اکثر ہر جمعہ کے روز نماز کے بعد کوئی جنازہ آجاتا ہے تو اس جنازہ کو مسجد کے باہر رکھ لیتے ہیں اور مسجد کے قبلہ کی طرف والے دیوار میں ایک بڑی کھڑکی ہے، وہ کھول کر اس کے سامنے جنازہ باہر مسجد سے رکھکر امام



جمعہ مع جماعت مسجد میں نماز جنازہ پڑھا لیتا ہے، پس سوال یہ ہے کہ ہر چند فقہاء نے اس صورت میں بھی مکروہ کو راجح لکھا ہے لیکن جمعہ وعید کے وقت ازدحام وکثرتِ جماعت کی حالت میں بھی جواز بے کراہت کی گنجائش ہوسکتی ہے یا کہ نہ، کیونکہ اس وقت میں اتنے آدمی نمازِ جنازہ کے لئے مسجد سے باہر کہاں سما سکتے ہیں؟

**الجواب**، صورتِ مسئولہ میں درمختار میں تو کراہت ہی کو مختار کہا ہے، مگر شامی نے بعض جزئیاتِ فقہیہ سے اس میں توسع لکھا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، قال الشامی اما اذا عللنا بخوف تلویث المسجد فلایکره اذا کان المیت خارج المسجد وحده او مع بعض القوم اه‍ ح قال فی شرح المنیة والیه مال فی المبسوط والمحیط وعلیه العمل وهو المختار اه قلت بل ذکر فی غایة البیان والعنایة انه لاکراهة فیها بالاتفاق لکن رده فی البحر ثم اعلم ان التعلیل الاول ای قوله ان المسجد انما بنی للمکتوبة وتوابعها فیه خفاء اذ لاشك ان الصلوٰة علی الجنازة دعاء وذکر وهما مما بنی له المسجد والا لزم المنع عن الدعاء فیه لنحو الاستسقاء والکسوف مع ان الوارد فی ذلك ما رواه مسلم ان رجلا نشد فی المسجد ضالة فقال صلی الله علیه وسلم لاوجدت انما بنیت المساجد لما بنیت له فلیتأمل اه (ص ۹۲۴) قال الشیخ ولکن مراد الفقهاء ان الدعاء لمثل هذا لم ینقل عن السلف فی المسجد فکانت مما لم تبن له المساجد، ثم قال فاضل المذهب ماذکره فی الدر نعم لما اختلفت اقوال الفقهاء فیه ففیه وسعة فلاینبغی التشدد فی الانکار والاصرار علی الاحتراز عنه والصلر، والله اعلم، ۱۵ شوال ۱۳۴۶ھ

جو لوگ کثرتِ جماعت کے سبب خارج مسجد امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں انکو مسجد کا ثواب ملیگا یا نہیں؟

**سوال (۳۰)** .................. جس وقت کثرتِ جماعت سے مسجد بھر جائے تو بعض کو مسجد میں جگہ نہیں ملتی تو آیا ان بعض کو مسجد کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

**الجواب**، اتصالِ صفوف واتحادِ مکان کی وجہ سے خارج مسجد بحکم مسجد ہوجاتا ہے، اسی لئے اقتداء بداخل مسجد صحیح ہے، ورنہ اقتداء ہی صحیح نہ ہوتی،

فان اختلاف المکان یمنع الاقتداء قال الشامی نقلاً عن البحر الخ لو کان علی سطح بجنب المسجد متصل به لیس بینهما طریق فاقتدیٰ به (ای بمن فی جوف المسجد) صح اقتداءه عندنا لانه اذا کان متصلا به صار تبعا لسطح المسجد وسطح المسجد له حکم المسجد فهو کاقتدائه فی جوف المسجد اذا کان لایشتبه علیه حال الامام اھ (ص ۶۱۴ ج ۱) خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اقتداء بداخل المسجد صحیح ہے وہاں تک کی تمام زمین نماز جماعت کے وقت حکماً مسجد ہے اور سب کو ثواب مسجد کا ملے گا، یہ اور بات ہے کہ حقیقی مسجد اور حکمی کا مسجد کا فرق ہو جیسا کہ مسجدِ نبوی میں جہاں تک بھی مسجد بڑھ جائے، ثواب موعود حدیث ملے گا، گو افضل تحری مسجدِ قدیم ہے، اور قواعد شرع بھی اسی کو مقتضی ہیں، کیونکہ نمازی جس قدر بھی نماز کو آتے ہیں سب کی نیت مسجد ہی میں نماز پڑھنے کی ہوتی ہے، مجبوری ضیق ہی کی وجہ سے وہ باہر کھڑے ہوتے ہیں، پھر اُن کو مسجد کا ثواب کیوں نہ ملے، وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات ای ثوابها، واللہ تعالیٰ اعلم ، ۲۶ر شوال ۴۶ھ

قرب وجوار میں متعدد مسجدیں ہوں تو مسجدِ محلہ میں نماز افضل ہے یا سب کا حکم برابر ہے

## سوال (۳۱)

.................... زید کے مکان کے قریب تین مساجد بتفصیل ذیل ہیں :- (۱) مسجدِ فاطمہ مکانِ زید سے ۸۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک نہیں ہے، ایک مقام پر راستہ میں کیچڑ بھی رہا کرتی ہے، مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت وقت معینہ پر ہوتی ہے، لیکن امام کا تعین نہیں ہے، (۲) مسجد سجان، مکان زید سے ۱۲۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک نہیں ہے،... گلی میں ایک مقام پر حوض بھی ہے، مسجد میں پنج وقتہ نماز بھی ہوتی ہے، لیکن امام کا تعین نہیں ہے، (۳) مسجد فیض، مکانِ زید سے ۱۲۳ قدم کے فاصلہ پر ہے، راستہ میں پختہ سڑک بھی ہے، سڑک پر لالٹین کی کافی روشنی رہتی ہے، مسجد میں پنجوقتہ نماز باجماعت وقت معینہ پر ہوتی ہے، امام کا تعین ہے، زید اپنی ہمراہ لالٹین رکھنے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن بہ لحاظ سہولت نماز عشاء و فجر اسی مسجد میں ادا کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مسجد ۱ و ۲ کو شب میں جاتے ہوئے حشرات ارض کا خطرہ دل میں پیدا ہوتا ہے، استفتاء یہ ہے کہ زید کو ہر سہ مسجد متذکرہ بالا میں سے کس مسجد میں



بالالتزام نماز پنجوقتہ ادا کرنی چاہیے، بینوا توجروا؟

**الجواب**، ان مسجدوں میں جو مسجد سائل کے محلہ کی مسجد ہو وہ افضل ہے، اس میں اس کو بالالتزام نماز پڑھنا چاہیے، اور اگر یہ سب اسی کے محلہ کی مسجدیں ہیں تو ان سب میں جو سب سے پہلے کی اور قدیم مسجد ہو وہ افضل ہے، اگر قدم میں بھی سب برابر ہوں یا اقدم معلوم نہ ہو تو جو سب سے زیادہ قریب ہے وہ افضل ہے، ہذا ما علمته من کلام الدر والشامی (ص ۶۸۹، ۶۹۰ ج ۱) واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ر جمادی الثانی ۴۷ھ

مذہب حنفی میں راجح اور صحیح یہ ہے کہ مسجد جماعت میں نماز جنازہ مطلقاً مکروہ ہے

## سوال (۳۲)

تبلیغی کانفرنس صوبۂ متحدہ آگرہ اودھ امسال خورجہ میں منعقد ہوئی ہے، جس کے صدر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند قرار پائے ہیں، حضرت مولانا جمعہ کے دن خورجہ تشریف لے آئے، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ایک جنازہ کی نماز جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر اور مصلی باہر مسجد مولانا نے نماز پڑھائی، جس وقت کہ جنازہ مسجد کے اندر رکھا گیا تو عبد اللہ خان گنج والوں نے مولانا سے عرض کیا کہ مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس پر مولانا نے فرمایا کہ نہیں جائز ہے، آپ نماز پڑھ لیں، میں بعد نماز آپ کا اطمینان کر دوں گا، مگر عبد اللہ خاں بھائی نے نماز نہیں پڑھی، اور عرض کیا کہ تمام حضرات دیوبند سے کہ جو آج قبروں میں بھی آرام فرمارہے ہیں اور موجودہ بھی ہیں یہی سنتے رہے ہیں کہ مسجد کے اندر جنازہ کی نماز مکروہ ہے، چونکہ مجمع ہزار پانچ سو آدمیوں کا تھا بڑی قیل و قال ہوئی، بعد نماز ایک اور صاحب نے عرض کیا کہ مولانا اس مسئلہ کو حل فرماتے جائیے گا، کہ جنازہ مسجد کے اندر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں ورنہ احتمال ہے کہ خورجہ والوں کے سر پھوٹنے لگیں، اس پر مولانا نے فرمایا کہ شوافع کے یہاں بالکل درست ہے اور احناف کے یہاں جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے، ایک جواز کی طرف اور دوسرا عدم جواز کی طرف اور مکہ میں یہی ہوتا ہے اور مدینہ میں مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ مولانا ہم رواج اور رسم دریافت نہیں کرتے ہیں، حدیث شریف میں کیا حکم ہے، مولانا نے حدیث شریف پڑھ دی، اس کے بعد لوگوں نے مولوی صاحب اور قاری صاحب سے دریافت کیا، دونوں صاحبوں نے اس صورت کو متفق علیہ مکروہ تحریمی بتایا، اور اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو اور مصلیان داخل فی المسجد

تو اس صورت کو احناف کے یہاں مختلف فیہ کہا، مگر راجح یہی ہے کہ اس صورت میں نماز درست ہے، بالآخر مولانا حسین احمد صاحب کے سامنے ایک استفتاء پیش کیا گیا ہے، جس میں صورت کا حکم از روئے فقہ حنفی دریافت کیا ہے، مولانا نے فرمایا کہ اگر طحطاوی یا مراقی الفلاح ہو تو میں ابھی دکھا دوں، اس پر عرض کیا گیا کہ یہاں یہ دونوں کتابیں نہیں ہیں، جب بندہ کو علم ہوا کہ مولانا مراقی الفلاح مانگتے ہیں تب میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ مراقی الفلاح میں نے جناب کو مکہ سے لاکر پیش کی ہے، آپ مکان سے اس کو لا دیں، تو مولوی صاحب مکان گئے، مگر تساہل کی وجہ سے کتاب نہ لا سکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب مولانا سے بالمشافہ گفتگو کرنے میں گریز کرتے تھے، بہر حال مولانا اس استفتاء کو دیوبند لے گئے ہیں، مگر ہفتہ ہوا کہ جواب نہیں آیا، دیکھئے کیا جواب مرحمت فرماتے ہیں، حضور والا صورتِ مسطورہ میں فقہِ حنفی میں کچھ گنجائش جواز کی ہے یا نہیں؟

**الجواب:** اس مسئلہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جو فرمایا ہے صحیح ہے، احناف کے علماء میں جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر بشرطیکہ مقتدی و امام سب باہر ہوں نماز پڑھنے میں بھی اختلاف ہے، بعض نے اس کو جائز کہا ہے، شرح مراقی الفلاح میں ہے، فلو کان المیت موضوعاً فی المسجد والناس خارجہ لا تکرہ وبالعکس تکرہ کما فی الجوہرۃ قال الطحطاوی (ص ۳۴۷) وفیہ ان المیت یشغل المسجد بقدر جنازتہ،

مگر علماءِ احناف کے اقوال مختلف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مذہب میں بھی اختلاف ہو بلکہ جب کسی مسئلہ میں اقوال مختلف ہوتے ہیں تو مذہب اُن میں سے ایک ہوتا ہے، اور مذہب وہ ہے جس کو اہل متون نے اختیار کیا ہو، پس مذہب حنفی میں راجح اور صحیح یہ ہے کہ مسجد جماعت میں نمازِ جنازہ بہر حال مکروہ ہے، خواہ جنازہ تنہا مسجد کے اندر ہو اور مقتدی اور امام باہر یا مقتدی و امام مسجد کے اندر ہو اور جنازہ باہر، یا امام اور جنازہ تنہا یا مع بعض قوم کے باہر ہو اور باقی مقتدی اندر، جیسا کہ درمختار اور شامی ص ۹۲۴ ج ۱ سے ظاہر ہے، البتہ چونکہ اس مسئلہ میں شوافع اور خود علماءِ حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، اس لئے مولانا حسین احمد صاحب کے فعل پر شدت کے ساتھ انکار کرنا بے جا تھا، اور مولانا کو بھی مناسب تھا کہ چونکہ منکر کا انکار بالکل غلط نہ تھا بلکہ مذہب مختار و صحیح کے موافق تھا اس لئے اس کے انکار کو عملاً تسلیم کر لیتے اور بعد میں قولاً اس کی اصلاح فرما دیتے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس میں صورت کی بھی



گنجائش ہے جس پر آپ نے انکار کیا تھا، اس لئے شدت کے ساتھ انکار مناسب نہ تھا،

واللہ اعلم، ۲۴؍ جمادی الثانی ۴۷ھ

**بعذر مسجد میں لالٹین جلانا کیسا ہے**

**سوال (۳۳)** ......... ہمارے گاؤں کی مسجد بستی سے باہر ہے، وہاں اور کوئی گھر نہیں ہے، اندھیرے میں عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آنا بغیر روشنی کے مشکل ہے، برسات میں راستہ میں سانپ پڑے رہتے ہیں، ایسی صورت میں مسجد کے اندر مٹی کے تیل کی لالٹین رکھنا جائز ہے یا نہیں، بارش کے دن میں تو مسجد کے اندر رکھنے کے سوا کوئی صورت نہیں ہے، ہاں اگر بارش نہ ہو تو مسجد کی دیوار سے باہر جو حصہ چھت کا ہے اس کی کڑی میں رکھنے کی صورت ہے، ایسی صورت میں جو حکم شرع ہو ارشاد فرما دیں،

**الجواب:** عذر کی صورت میں جائز ہے، اور یہ صورت عذر کی ہے فقد ورد فی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اکل من ھذہ الشجرۃ الخبیثۃ (البصل والثوم) فلا یقربن مسجدنا فاخذ رجل بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضعھا علی صدرہ وفیہ قرحۃ قد شد علیھا البصل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انک معذور کما قال ذکرہ الحافظ فی الفتح وعزاہ الی ابی داؤد کما ھو فی حفظی، ۱۵؍ ذی الحجہ ۴۷ھ

**مسجد ضرار کی تعریف**

**سوال (۳۴)** ......... مسجد ضرار کی تعریف کیا ہے اور اس کی بناء کیونکر ہوئی ہے؟

**الجواب:** مسجد ضرار جس کی قرآن میں مذمت ہے وہ ہے جس کی بناء سے مسجدیت مقصود نہ ہو اور جس کی بناء سے مسجدیت مقصود ہو وہ مسجد ہے، گو فساد نیت کی وجہ سے ثواب کم ہو،

واللہ اعلم، ۲۲؍ ذی الحجہ ۴۷ھ

**مسجد کا فرش اور ممبر عیدگاہ میں لیجانا درست ہے یا نہیں؟**

**سوال (۳۵)** مسجد کا منبر اور بچھونے عیدگاہ میں لیجانا درست ہے یا نہیں، جیسا کہ ہمارے اطراف کے بعض لوگ لیجایا کرتے ہیں، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ عند الضرورۃ منبر عیدگاہ میں لیجا سکتے ہیں، یہ بروئے کتاب درست ہے یا نہیں، جواب باصواب سے مطلع فرما دیں؟

**الجواب:** مسجد کا فرش عیدگاہ میں لیجانا جائز نہیں، ہاں ایک روایت میں منبر کا

لیجانا جائز ہے اور دوسری روایت میں مکروہ ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ منبر بھی نہ لیجائیں قال فی الدر ولابأس باخراج منبر الیہا ولکن فی الخلاصۃ لابأس ببنائہ دون اخراجہ اھ قال الشامی ومثلہ فی الخانیۃ فدل کلامہما علی انہ لاخلاف فی کراھۃ اخراجہ الیہا وانما الخلاف فی بنائہ فیہا ویمکن حمل الکراھۃ علی التنزیہیۃ وھی مرجع خلاف الاولی المفاد من کلمۃ لابأس غالبًا فلا مخالفۃ فافہم اھ (ص ۶۰۸ ج ۱) واللہ تعالیٰ اعلم واما حرمۃ اخراج حصر المسجد الی المصلی فلان اشیاء المسجد وقف علیہ ولا یجوز استعمال الوقف فی غیر ما وقف لہ وھذا ظاھر،　　۹ محرم ۱۳۴۸ھ

مسجد میں تمباکو کھانا اور نسوار لینا کیسا ہے؟

**سوال** (۳۶) تمباکو کی نسوار لینا اور تمباکو کھانا مسجد کے اندر کیسا ہے؟

**الجواب**: نسوار سونگھنا اور تمباکو کھانا مسجد کے اندر خلاف اَولیٰ ہے، جو کراہت تنزیہیہ سے خالی نہیں لمافیہ من الرائحۃ الکراھۃ التی امر بنظافۃ المساجد عنہا ولما فی الشموم من الصیاح الحاصل عند العطاس وقد امرنا بخفض الصوت فی المسجد ونہینا عن رفعہ فیہ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ صفر ۱۳۴۸ھ

مسجد میں اخراج ریح کا حکم

**سوال** (۳۷) ۱ مسجد میں حدث کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تب کیا حرام ہے یا مکروہ، اگر مکروہ ہے تو تحریمی ہے یا تنزیہی؟

۲ اگر جائز نہیں ہے تو جو طلبہ مسجد میں رہتے ہیں اور کتاب کا تکرار کرتے ہیں اور نیند کر جاتے ہیں، ان لوگوں کو کیا کرنا چاہئے، اس حالت میں معاف ہے کیا؟

**الجواب**: ۱ فی العالمگیریۃ (ص $\frac{۶۱۵}{ج۳}$) واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضہم بأسًا وبعضہم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیہ وھو الاصح کذا فی التمرتاشی، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اخراج ریح نہ چاہئے، اور ظاہر اس عبارت سے کراہت تحریمیہ ہے،

۲ وفی العالمگیریۃ ایضًا (ص ۲۱۵ ج ۶) ولابأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد فی الصحیح من المذھب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی خزانۃ الفتاوی، پس مسجد میں سونا خلافِ اَولیٰ ہے گو جائز ہے، اور جب سونا جائز ہے



تو حالتِ نوم میں خروجِ ریح سے گناہ نہ ہوگا، اور نیز نوم تو رافع تکلیف ہے، اس لئے نفس نوم اگر ممنوع تسلیم کیا جاوے تب بھی نوم میں حدث کرنے سے گناہ نہ ہوگا،

چھوٹی اور بڑی مسجد میں نمازی کے سامنے کتنے فاصلہ پر گذرنا درست ہے

**سوال** (۳۸) بڑی مسجد جس میں چھ سات صف یا زیادہ صفیں جماعت کی ہو جاویں، یا چھوٹی مسجد جس میں ایک اندر اور دو باہر صف ہوں یا جنگل میں نماز ادا کی جاوے تو نمازی کے آگے سے نکلنے والا کتنے فاصلہ میں ہر صورت میں گنہگار ہوگا؟

**الجواب**: بڑی مسجد اور جنگل میں تو نمازی سے اتنے فاصلہ پر گذرنا جائز ہے کہ جہاں تک سجدہ کی جگہ پر نظر رکھ کر نمازی کی نظر نہ پہونچے، لیکن چھوٹی مسجد میں اتنے فاصلہ پر سے گذرنا بھی جائز نہیں ہے، اور سوال میں جسکو بڑی مسجد لکھا ہے، وہ بڑی مسجد نہیں ہے بڑی مسجد وہ ہے جس کا عرض کم از کم چالیس ہاتھ ہو،

اس مسجد کا حکم جس کا رُخ بیس درجے تک منحرف ہو

**سوال** (۳۹) اسلامی ملکوں سے دور دراز ایک جزیرہ میں تاجر مسلمانوں کی ایک جماعت نے باہم چندہ سے ایک مسجد تعمیر کی، تعمیر کے منتظم نے غلطی سے مسجد کا رُخ قبلہ کی سمت سے تقریبًا بیس درجے پھرا ہوا رکھا (جیسا نقشہ سے معلوم ہوگا) تعمیر اسی شکل پر پوری ہوگئی، اس کے بعد جاننے والوں نے بتایا کہ مسجد میں قبلہ کا رُخ غلط ہے، پس کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ:۔

(۱) درصورتیکہ مسجد کا سرمایہ بھی اس قدر ہو کہ دوبارہ صحیح رُخ پر مسجد کو بنایا جا سکتا ہو نیز وہاں کے مسلمان بھی اس کے لئے تیار ہوں کہ دوبارہ چندہ کر کے مسجد کو قبلہ کے ٹھیک رُخ پر بنایا جاوے (ا) کیا مسجد کو اسی حال پر رکھا جاوے یا (ب) قبلہ کے رُخ کو درست کر کے دوبارہ بنایا جاوے؟

(۲) موجودہ تعمیر میں صرف صفوں کو صحیح رُخ پر بچھا کر صحیح رُخ پڑھی جاوے، یا صحیح سمت قبلہ جانتے ہوئے بھی اسی غلط رُخ پر نماز ادا کی جاوے، جان بوجھ کر غلط رُخ پر نماز پڑھنے والے کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر امام صحیح رُخ جانتے ہوئے اسی غلط رُخ پر نماز پڑھے اور جاننے والا مقتدی خود اپنا رُخ صحیح کر لے تو اس مقتدی اور اس کا نماز کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۴) تعمیر کا منتظم اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہوئے اگر مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے سے

روکے اور صفوں کو صحیح رُخ پر بچھا کر ٹھیک سمت پر نماز پڑھنے سے بھی منع کرے، تو ایسا شخص متولی و منتظم مسجد بنانے کے قابل ہے یا نہیں، اور اس کا حکم اس معاملہ میں ماننا چاہئے یا نہیں؟

(۵) اگر امام مسجد میں اس متولی و منتظم کو خوش کرنے کے لئے جان بوجھ کر اسی غلط رُخ پر نماز پڑھائے، اور بعض مقتدیوں کے منع کرنے بلکہ قطب نما و نقشہ آلات دکھا کر صحیح رُخ سمجھانے کے باوجود باز نہ آئے تو ایسا شخص امام بنانے کے قابل ہے یا نہیں، اگر اس کا اقتداء درست ہو تو اس وقت مقتدی کو امام کے غلط رخ پر کھڑا ہونا چاہئے یا صحیح پر، اور نقشہ یہ ہے:۔

الجواب: یہ سب سوالات اس واسطے پیدا ہوئے ہیں کہ اس فرق کو صحتِ صلوٰۃ کا منافی سمجھا گیا، حالانکہ اتنا فرق ہوتے ہوئے نماز بالکل درست ہے، پس اختلاف کی ضرورت نہیں، اُسی رُخ پر بلا شبہ نماز پڑھتے رہیں، اور اگر کبھی بالاتفاق درست کرنا چاہیں تب بھی مسجد کا سرمایہ اس میں نہ لگایا جاوے، لانہ لیس بضرورۃ، البتہ اگر مستقل چندہ کرلیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ مورخہ ۔ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

## فصل فی شروط الصلوٰۃ وارکانہا وواجباتہا وسننہا وآدابہا

**رفع سبابہ کے وقت نگاہ کہاں ہونی چاہئے؟**

**سوال (۱)** بندہ نماز میں قعدہ کے وقت نظر گود میں رکھتا ہے، تو کیا رفع سبابہ کے وقت نظر سبابہ کی طرف رکھنی چاہئے؟ اور کیا سلام پھیرنے تک نظر سبابہ کی طرف رکھنی چاہئے؟

**الجواب:** قعدہ کے وقت نظر گود ہی کی طرف رکھنی چاہئے، سبابہ کی طرف نظر کرنا میری نظر سے نہیں گذرا قال فی مراقی الفلاح ص ۱۶۱ ج ۱ ومنہا نظر المصلی سواء کان رجلاً او امراءۃ الی موضع سجودہ قائماً (الی ان قال) والی حجرہ جالساً اھ بعد میں ایک حدیث نظر سے گذری جس کو نسائی نے روایت کیا ہے عن عبد اللہ بن عمرؓ فی حدیث طویل وفیہ اشار باصبعہ التی تلی الابہام فی القبلۃ ورمی ببصرہ الیہا او نحوہا ثم قال ہکذا رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصنع



اھ وسکت عنہ، اس سے اشارہ کے وقت سبابہ کی طرف نظر کرنا ثابت ہے، مگر قرار ثابت نہیں، واللہ اعلم،

**التحیات سے قبل بسم اللہ پڑھنے کا حکم،**

**سوال (۲)** التحیات کے قبل بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر التحیات کو پڑھنا حدیث شریف سے جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** التحیات میں پوری بسم اللہ الرحمن الرحیم کسی حدیث میں ثابت نہیں البتہ بعض احادیث میں اس طرح وارد ہے بسم اللہ التحیات للہ والصلوات للہ والزاکیات للہ الخ باقی حنفیہ کے نزدیک سب سے افضل تشہد ابن مسعودؓ ہے جو کہ ان بلاد میں رائج ہے، اس پر زیادت کرنا خلاف اولیٰ ہے، باقی اگر بسم اللہ پڑھا وے تو نماز میں کچھ خلل نہ آوے گا، قال فی الدر ویقرأ تشہد ابن مسعود وجوباً کما بحثہ فی البحر ولکن کلام غیرہ یفید ندبہ وجزم شیخ الاسلام الجد بان الخلاف فی الافضلیۃ اھ ص ۵۲۲ ج ۱ واللہ اعلم، ۴ رجب ۱۳۴۱ھ

**تکبیر تحریمہ کہنے کے وقت قیام فرض ہے**

**سوال (۳)** ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں ہے اس نے تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کرلی، یعنی تکبیر تحریمہ کہہ کر قیام کچھ نہیں کیا، فوراً جھک گیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

**الجواب:** اگر تکبیر تحریمہ بحالتِ قیام کہی ہے یا بحالتِ انحناء کہی ہے، مگر وہ اقرب الی القیام تھا تو نماز درست ہے، اور اگر بحالتِ انحناء کہی اور اقرب الی الرکوع تھا تو نماز درست نہیں، غرض تکبیر تحریمہ کا بحالتِ قیام یا بحالت اقرب الی القیام ہونا فرض ہے، تکبیر تحریمہ کے بعد مزید قیام فرض نہیں، قال فی مراقی الفلاح والثانی من شروط صحۃ التحریمۃ الاتیان بالتحریمۃ قائماً او منحنیا قلیلا قبل وجود انحنائہ بما ہو اقرب للرکوع قال فی البرہان لو ادرک الامام راکعاً فحنی ظہرہ ثم کبر ان کان الی القیام اقرب صح الشروع ولو اراد بہ تکبیر الرکوع وتلغو نیتہ لان مدرک الامام فی الرکوع لا یحتاج الی تکبیر مرتین خلافاً لبعضہم وان کان الی الرکوع اقرب لا یصح الشروع اھ ص ۱۲۷، ۳ شعبان

**وضو میں کوئی عضو خشک رہ گیا اور نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟**

**سوال (۴)** زید نے وضو کیا جتنے مقام کا دھونا وضو میں فرض ہے تو فرض کے مقام پر ایک انگل خشک رہ گیا اور

خشک کا رہنا زید کو معلوم نہیں ہے، ویسے ہی نماز پڑھ لی تو زید کی نماز ہوگئی یا نہیں، اور بکر نے دیکھ لیا کہ زید کا فلاں مقام پر فرض کی جگہ پر ایک انگل خشک ہے تو بکر نے زید کو دو سبب سے نہیں بتلایا، ایک سبب یہ ہے کہ زید کو کوئی بھول، چوک بتلاتا ہے تو زید کو بُرا معلوم ہوتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ بکر سے زید کی نااتفاقی ہے، ایسی صورت میں بکر گنہگار ہوگا یا نہیں ہوگا، شرعاً حکم کیا ہے؟

الجواب: جب عضو مفروض خشک رہ گیا تو جس وقت زید کو معلوم ہوا اسی وقت نماز کا اعادہ واجب ہے، اگر اعادہ نہ کیا گنہگار ہوگا اور اگر کبھی معلوم نہ ہوا تو اگر اس نے وضو احتیاط کے ساتھ اعضاء کو خوب مل مل کر کی تھی، اور اپنی طرف سے کچھ کوتاہی نہیں کی تو امید ہے کہ اس نماز کے فساد سے اس کو عذاب نہ ہوگا، اور اگر بے احتیاطی ولاپروائی سے جلدی جلدی وضو کیا تھا تو اس نماز کے فساد کا اس کو گناہ ہوگا (۱) بکر نے اگر اس واسطے نہیں بتلایا کہ زید کو اس کی غلطی پر مطلع کرنے سے غصہ آتا اور وہ بُرا مانتا ہے تب تو صرف زید کو گناہ ہوا بکر کو نہیں ہوا، اور اگر زید اُس سے بُرا نہیں مانتا، لیکن بکر نے محض نااتفاقی کی وجہ سے نہیں بتلایا تو بکر کو بھی گناہ ہوگا،

| |
|---|
| عورت قیام کے وقت دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھے؟ |

**سوال (۵)** عورت نماز میں قیام کے وقت دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھے، اور کیا دونوں پاؤں کے ٹخنے بالکل ملادے؟

الجواب: قال فی رد المحتار وینبغی ان یکون بینھما مقدار اربع اصابع الید لانہ اقرب الی الخشوع ھکذا روی عن ابی نصر الدبوسی انہ کان یفعلہ کذا فی الکبری وما روی انھم الصقوا الکعاب بالکعاب ارید بہ الجماعۃ ای قام کل احد بجانب الآخر اھ (ص ۴۶۲ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بحالت قیام دونوں پیروں میں چار انگل کا فصل مناسب ہے، اور اسی حکم سے کسی جگہ عورتوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، پس اُن کے لئے بھی یہی مناسب ہے، ہاں رکوع وسجود کی کیفیت مرد وعورت کی مختلف ہے، واللہ اعلم، ۱۸/شوال سنہ ۴۱ھ

| |
|---|
| تشہد میں رفع سبابہ کا اثبات اور روایاتِ نفی کا جواب |

**سوال (۶)** ...... درمیان خلق مشہور است کہ در اشارت سبابہ روایات نہی واثبات ہر دو آمدہ لیکن چونکہ نہی را بر اثبات



۶

ترجیح باشد لہٰذا نہی اشارت را ترجیح شد و بعض خلق می گوید کہ چوں معارضۂ حل وحرمت بیاید ترجیح حرمت را باشد مثبتین اشارت را ازیں چہ جواب است،

دیگر آنکہ مانعین اشارت می گوید کہ لفظ علیہ الفتوٰی کہ از آکد الفاظ ترجیح است، بر نفی اشارت لفظ وعلیہ الفتوٰی بسیار در کتب مذکور است، چنانکہ در درمختار وغیرہ وبر اثبات اشارت لفظ وعلیہ الفتوٰی نیاوردہ لہٰذا نہی اشارت را ترجیح دادہ شود بر اثباتِ اشارت، عرض آنکہ در کتب در کدام کتاب معتمد علیہ بر اثبات اشارت لفظ وعلیہ الفتوٰی آوردہ یا نہ اگر آوردہ باشد عبارت کتاب نوشتہ شود واگر نہ جواب مانعینِ را نوشتہ شود؟

الجواب، امام محمد موطا میں بسند صحیح یہ حدیث نقل کرکے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جلس فی الصلوٰۃ وضع کفہ الیمنی علی فخذہ الیمنی وقبض اصابعہ کلھا واشار باصبعہ التی تلی الابھام ووضع کفہ الیسری علی فخذہ الیسریٰ اھ فرماتے ہیں قال محمد وبصنیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ اھ (ص ۱۰۶) ترجمہ:۔ کہا محمدؒ نے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فعل کو اختیار کرتے ہیں اور یہی قول ہے امام ابو حنیفہؒ کا، امام محمدؒ کا یہ قول ہزار علیہ الفتوٰی سے آکد ومؤکد ہے، لما فیہ من اسنادہ الاخذالی صنیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور مانعینِ اشارت کا یہ کہنا کہ اثبات اشارت پر لفظ فتوٰی نہیں ہے غلط ہے، درمختار میں ہے، بل فی متن درر البحار وشرحہ غرر الافکار المفتی بہ عندنا انہ یشیر باسطاً اصابعہ کلھا وفی الشرنبلالیۃ عن البرھان الصحیح انما یشیر بمسبحتہ وحدھا واحترز بالصحیح عما قیل لا یشیر لانہ خلاف الدرایۃ والروایۃ اھ وقال فی رد المحتار ناقلاً عن غرر الافکار والفتوی ان المفتی بہ عندنا خلافہ ای خلاف عدم الاشارۃ وھو الاشارۃ علی کیفیۃ عقد ثلثۃ وخمسین کما قال بہ الشافعی واحمد وفی المحیط انھا سنۃ یرفعھا عند النفی ویضعھا عند الاثبات وھو قول ابی حنیفۃ ومحمد وکثرت بہ الآثار والاخبار فالعمل بہ اولی اھ (ص ۵۳۰ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ عدم اشارہ کے مقابل اثبات اشارہ کے لئے

لفظ معتمد وصحیح ومفتی بہ وعلیہ الفتویٰ والعمل براولیٰ، بہت سے الفاظ کتب فقہ معتمد علیہا میں موجود ہیں، اور محمدؒ کی کتابوں میں اسی کی تصریح ہے، پس یہی مذہب حنفیہ کا ہے، اور احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے، اور کتب محمدؒ کے مقابلہ میں خلاصہ وغیرہ کی کوئی ہستی نہیں اور حرمت وحلت کا تعارض اور ترجیح حرمت کا قاعدہ وہاں ہے، جبکہ حرمت وحلت کا ورود کلام شارع میں ہو اور اس مسئلہ میں کسی حدیث سے ممانعت اشارہ کی ثابت نہیں ہوئی، باقی مصنفین کے کلام میں اگر حرمت وحلت کا تعارض ہے تو وہاں مطلقاً حرمت کو ترجیح نہ ہوگی، بلکہ جو قول روایت ودرایت کے زیادہ موافق ہوگا وہی راجح ہوگا، پس اشارہ موافق سنت ہے، یہی راجح ہے اور اہل سرحد وپنجاب جو اس سے روکتے اور انکار کرتے ہیں اُن پر خوفِ عذاب شدید ہے، واللہ اعلم، ۱۸ رمضان ۴۲ھ

عورتیں سجدہ کے وقت پاؤں کیسے رکھیں،

**سوال** (۷) نماز میں بحالتِ سجدہ عورتیں اپنے دونوں پاؤں مردوں کی طرح کھڑے رکھیں یا بچھادیں، جیساکہ قعدہ میں عورتوں کو داہنی طرف پاؤں نکال کر بچھانے کا حکم ہے، صرف قدم کے کھڑے رکھنے اور بچھانے میں شبہ ہے، کہ اس امر میں قعدہ اور سجدہ کا عورتوں کیلئے یکساں طریقہ ہے یا کچھ فرق ہے؟ باقی سجدہ میں شکم وفخذین وذراعین وغیرہ ملا کر پست ہو کر سجدہ کرنا عورتوں کو یہ تو معلوم ہے،.... کتابوں میں سجدہ کی حالت میں قدمین کو کھڑے رکھنے یا بچھانے کا حکم باوجود تجسس وتلاش کے معلوم نہیں ہوا، عورتوں کے لئے، مردوں اور عورتوں کے طریقہ نماز کا فرق جہاں کتابوں میں بتلایا ہے وہاں سجدہ کی حالت میں دوسرے فرق کو تو بتلایا ہے، مگر قدمین کو بچھا کر اور داہنی طرف کو نکال کر سجدہ کرنا عورتوں کے لئے نہیں بتلایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں قدمین کو سجدہ میں مثل مردوں کے کھڑے رکھیں، اور آجکل عموماً عورتیں قدمین کو بچھا کر اور داہنی طرف نکال کر مثل قعدہ کے سجدہ کرتی ہیں، اگر کسی کتاب میں یہ طریقہ بتصریح مرقوم ہو تو کتاب کا حوالہ تحریر فرمادیں۔

**الجواب**: از مولانا عبدالحی اللکھنوی سوال کردہ شد کہ بعض زنانِ ہند جواز قومہ بسجدہ می روند اول بتورک نشستہ پستر بہماں حالت تورک سجدہ می سازند وجمیع سجدات متورکانہ ادا می سازند ہر دو پارا بجانب راست کشیدہ، بعض علما نفی آں می کنند و می گویند کہ نسوانِ عرب چناں نمی کنند بلکہ در سجدہ پارا مثل مرداں قائم وانگشتاں را متوجہ بقبلہ می دارند وفعلِ نسوانِ ہند بلا دلیل است، فاجاب رحمہ اللہ فقہاء در کتب خود فروع



کثیرہ برائے نسواں ذکر کردہ اند کہ دراں شرکت مرداں نیست منجملہ آں ایں ہم است کہ در سجدہ نصب قدمین مثل مرداں نسازند در بحر الرائق می نویسد لاتنصب القدمین کما ذکرہ فی المجتبیٰ ودر جامع الرموز است والمرأۃ تخفض ای توقع الخفض المعہود فلا تنصب اصابع القدمین ولا تبدی الضبعین الخ پس نہ قائم کردن زنانِ ہند ہر دو پارا وقت سجدہ موافق اقوالِ فقہاء است اھ (ص ۷۷، ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو سجدہ میں قدمین کو مرد کی طرح کھڑا نہ کرنا چاہئے، رہا یہ کہ دائیں طرف نکال کر سجدہ کرے یا بدون اخراج کے سجدہ کرے تو ان دونوں میں جو صورت زیادہ موجبِ ستر ہو وہ افضل ہوگی، اور بظاہر[ع] دائیں طرف پیر نکال کر سجدہ کرنے میں ضم اللحم باللحم اور ستر زیادہ ہے فہو اولیٰ وان لم ارہ صریحاً ولکن ورد الامر بضم اللحم لہن فی حدیث مرسل وورد مراعاۃ الاستر لہن فی کلام الفقہاء، وہذا یؤید ما قلنا واللہ اعلم، ۸ رجب ۴۳ھ

اقامت کے وقت امام اور مقتدیوں کو کب کھڑا ہونا چاہئے؟

**سوال** (۸) امام اور مقتدیوں کو اقامت شروع ہوتے ہی کھڑا ہونا چاہئے یا درمیان میں صورتِ ثانی میں درمیان میں کس لفظ پر کھڑا ہونا چاہئے، اسی طرح امام کو تکبیر تحریمہ درمیانِ اقامت میں کہنی چاہئے، یا اقامت ختم ہونے کے بعد، بینوا توجروا؟

**الجواب**: اگر امام شروع اقامت کے وقت محراب کے قریب یا مسجد میں موجود ہو تو امام اور مقتدی دونوں کو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے، اور بعض کے نزدیک حی علی الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے، ابتداءِ اقامت ہی سے کھڑا ہو جانا جیسا کہ آجکل رائج ہے، مکروہ ہے، لیکن اگر امام اقامت سے پہلے محراب پر پہونچ جائے، تو مقتدیوں کو کھڑا ہو جانا چاہئے، گو اس صورت میں امام نے خلاف اولیٰ کا ارتکاب کیا، مگر امام کے کھڑے ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو نہ بیٹھنا چاہئے، پس ابتداءِ اقامت سے مقتدیوں کا کھڑا ہونا اس وقت مکروہ ہے جب کہ امام بوقتِ اقامت موجود نہ ہو، اور تکبیر تحریمہ شروع کرنا قد قامت الصلوٰۃ

---

ع اس پر بعد میں اتنا شبہ ہوا کہ پہلے تورک کرنے میں ایک فعل زائد یعنی قعدہ کی زیادت لازم آتی ہے، ویمکن ان یقال ان التورک قبل السجدۃ انما ہو لیکون السجدۃ من اولہا بضم اللحم باللحم بخلاف ما اذا سجد اولاً بدون التورک فیکون الضم المذکور حاصلاً بعدلا من اول لکن یشکل علیہ زیادۃ الفعل اشد فلا ینبغی لاجل رعایۃ الاستریۃ التی ہی مندوبۃ ۱۲ منہ

پر مستحب ہے، اقامت کہنے والا اقامت پوری کردے اور امام درمیان میں قد قامت الصلوٰۃ پر تحریمہ باندھ لے، اور امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ امام ختم اقامت ہونے کے بعد تحریمہ شروع کرے، اور بعض فقہاء نے اسی قول کو اعدل المذاہب اور اصح قرار دیا ہے، مگر حدیث سے امام صاحب کے قول کی تائید ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

قال فی نور الایضاح ومن الادب القیام ای قیام القوم والامام ان کان حاضرا بقرب المحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حیّ علی الفلاح (وقال الحسن وزفر عند حی علی الصلوٰۃ کما فی سکب الانہر عن ابن الکمال اھ طحطاوی) لانہ امر بہ فیجاب وان لم یکن ظاہرا یقوم کل صف حین ینتہی الیہ الامام فی الاظہر (کلما جاوز صفا قام ذلک الصف اھ وان دخل من قدامہم قاموا حین رأوہ اھ طحطاوی) ومن الادب شروع الامام الی احرامہ من قیل ای عند قول المقیم قد قامت الصلوٰۃ عندہما وقال ابو یوسف یشرع اذا فرغ من الاقامۃ ای بدون فصل وبہ قالت الائمۃ الثلاثۃ وھو اعدل المذاہب شرح المجمع وھو الاصح قہستانی عن الخلاصۃ وھو الحق نہر اھ طحطاوی) قلت وفی مجمع الزوائد (ص ۱۸۲ ج ۱) عن عبد اللہ بن ابی اوفیٰ قال کان بلال اذا قال قد قامت الصلوٰۃ نہض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتکبیر رواہ البزار وفیہ الحجاج بن فروخ وھو ضعیف اھ قلت ذکرہ ابن حبان فی الثقات کذا فی اللسان (ص ۱۷۹ ج ۱) وقولہ نہض بالتکبیر معناہ قام متلبسا بہ وقال الطحطاوی واذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ ودخل رجل المسجد فانہ یقعد ولا ینتظر قائما فانہ مکروہ قہستانی ویفہم منہ کراھۃ القیام ابتداء الاقامۃ والناس عنہ غافلون اھ قلت وھو محمول علی ما اذا لم یقم الامام عند ابتداء الاقامۃ والا فیقوم القوم عند قیام الامام لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوموا حتی ترونی اھ علق قیامہم علی رویۃ الامام فعلی قیامہ بالاولیٰ، واللہ اعلم، ۷ رجمادی الثانیہ ۴۰ھ

| حی علی الفلاح کہنے کے وقت امام کا کھڑا ہونا | **سوال (۹)** بعض پیش امام اقامت کہتے وقت مصلے سے جدا کھڑے رہتے ہیں، جب حی علی الفلاح پڑھا جاتا ہے |
|---|---|



اس وقت مصلے پر آکر کھڑے ہوتے اس کی بابت کیا مسئلہ ہے؟

**الجواب:** قال فی مراقی الفلاح ومن الادب قیام القوم والامام ان کان حاضرا بقرب المحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حی علی الفلاح الخ، اس سے معلوم ہوا کہ ادب نماز کا یہ ہے کہ اگر امام اقامت کے وقت موجود ہو تو امام اور تمام مقتدی حیّ علی الفلاح پر کھڑے ہوں اس سے پہلے بیٹھے رہیں، باقی اس سے پہلے مصلے سے الگ کھڑے رہنا اس کی کوئی اصل نہیں، واللہ اعلم، ۳ر رمضان ۴۰ھ

| اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں | **سوال (۱۰)** ........................ ..... ان امصار و بلاد میں یہ قاعدہ ہے کہ جب نماز کے واسطے اقامت |
|---|---|

شروع ہوتی ہے امام اپنے مصلے پر اور تمام مقتدی صف میں اپنی جگہ پر کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اس جگہ جامع مسجد سکندر آباد میں بھی ہمیشہ سے اسی طرح سے کھڑے ہوتے ہیں، حالانکہ شرح وقایہ جلد اول مطبع مجتبائی صفحہ ۱۰۶ پر ہے، ویقوم الامام والقوم عند حی علی الصلوٰۃ اور اس کے حاشیہ پر ہے، (وفیہ اشارۃ الی انہ رجل اذا دخل المسجد یکرہ لہ انتظار الصلوٰۃ قائما بل یجلس بموضع ثم یقوم عند حی علی الفلاح وبہ صرح فی جامع المضمرات، جامع المضمرات کے حوالے سے شروع میں کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے، فتاویٰ عالمگیری صفحہ ۴۴ جلد اول مطبع نولکشور میں ہے، ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فانہ یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلاثۃ وھو الصحیح (عالمگیری میں بالاتفاق اسی کو صحیح لکھا ہے) غایۃ الاوطار جلد اول مطبع نولکشور، ص ۲۲۱ میں ہے (والقیام للامام والمؤتم حین قیل حی علی الفلاح خلافا لزفر فعندہ حین حی علی الصلوٰۃ، ابن کمال شامی کا بھی حوالہ دیا ہے کہ اس میں بھی یہی طریقہ صحیح لکھا ہے، ان کتابوں میں یہ مسئلہ دیکھا کہ شروع میں کھڑا ہونے کو مکروہ لکھا ہے، اور عند حی علی الفلاح یا حی علی الصلوٰۃ کو مستحب و احسن لکھا ہے، طریقہ قدیم کو چھوڑ دیا اور مقتدیوں کو بتلا دیا کہ اس طریقہ کو مستحب لکھا ہے واجب فرض نہیں، پنجوقتہ نماز میں قریب بیس پچیس آدمی سب اس کے عادی ہوگئے کہ پہلے سے ایک صف میں برابر اٹھ جاتے ہیں اور وقت حی علی الصلوٰۃ کے کھڑے ہوجاتے ہیں، صف بھی سیدھی ہوتی ہے، جمعہ کے روز

زیادہ آدمی ہوتے ہیں، بیٹھنے میں ٹھیک انتظام نہیں ہوتا، اگر جمعہ کے روز اس مستحب طریقہ پر عمل کیا جائے تو جماعت سیدھی نہ ہوگی، اور جماعت کے سیدھی کرنے کا زیادہ اہتمام ہے، اور یہ فعل مستحب ہے، اس روز شروع سے کھڑے ہوکر جماعت سیدھی کرلیتے ہیں، عرصہ چار یا پانچ ماہ سے یہ عمل جاری ہے، اب کوئی باہر کے عالم آتے ہیں تو اس طریقہ کو بدعت و مکروہ بتلاتے ہیں، اب عرض یہ ہے کہ اگر یہ فعل متصل حی علی الصلوٰۃ یا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بدعت یا مکروہ ہو تو اس کو چھوڑ کر اسی طریقہ پر عمل کریں یعنی شروع سے کھڑے ہوجایا کریں، مگر برائے مہربانی بحوالہ کتب حنفی ارشاد ہو کہ شروع سے کھڑا ہونا مستحب ہے، حوالہ کتب ضرور ہو جو آجکل رسم و رواج ہے کہ شروع سے کھڑے ہوجاتے ہیں اس کو دخل نہ ہو، بلکہ بحوالہ کتب ہو، بینوا توجروا؟

**الجواب**: فی الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوموا حتی تروني، اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام کو مسجد میں آتا ہوا دیکھنے سے پہلے مقتدیوں کا کھڑا ہونا ممنوع ہے، اور یہی سمود ہے جس کو فقہاء نے انتظار قائما سے بیان فرمایا ہے اور امام جب مسجد میں آجائے اور مصلے پر پہونچ جائے تو اس وقت مقتدیوں کو کھڑا ہوجانا جائز ہے، خواہ مکبر نے تکبیر نہ کہی ہو یا حی علی الفلاح پر نہ پہونچا ہو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا اس وقت مستحب ہے جبکہ امام بھی حی علی الفلاح ہی پر کھڑا ہو، اور اگر وہ شروع تکبیر پر کھڑا ہوجائے تو مقتدیوں کو چاہئے کہ جس صف کے سامنے سے امام گذرے وہ کھڑے ہوجائیں، اور جب مصلے پر پہونچ جائے تو سب کھڑے ہوجائیں، قال فی الدر فی آداب الصلوٰۃ والقیام لامام ومؤتم حین قیل حی علی الفلاح خلافا لزفر، فعندہ عند حی علی الصلوٰۃ ان کان الامام بقرب المحراب والا رای وان لم یکن بقرب المحراب بان کان فی موضع اخر من المسجد او خارجہ ودخل من خلف ج ۱۲ شامی) فیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظھر وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرھم علیہ اھ (ص ۴۹۹ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونے کا استحباب ہر صورت میں نہیں بلکہ اس وقت ہے جب کہ امام مصلے پر کھڑا نہ ہو، بلکہ محراب کے قریب بیٹھا ہو، اور اگر وہ محراب کے قریب بیٹھا نہ ہو بلکہ مسجد کے کسی اور حصہ میں ہو یا مسجد سے باہر ہو



تو جس وقت وہ کھڑا ہو کر صفوف کے سامنے گذرے یہ صفوف والے اس کو دیکھ کر کھڑے ہوجائیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام و مقتدی کا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا آداب میں سے ہے واجبات و سنن میں سے نہیں، پس حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بدعت نہیں، اور اس سے پہلے بھی کھڑا ہونا بدعت نہیں، اگر امام کو مصلے کی طرف آتا ہوا دیکھ لیا جائے، البتہ اگر امام مصلے کی طرف نہ آتا ہو بلکہ بیٹھا ہوا ہو یا مسجد سے باہر کسی کام میں ہو تو اس صورت میں مقتدیوں کو حی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، لکونہ داخلاً فی السمود وھو الانتظار قائماً، واللہ اعلم، ۱۳ ر رجب ۴۵ھ،

| اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں |
|---|

**سوال** (۱۱) زید مدعی ہے کہ مصلین کو حی علی الصلوٰۃ پر اور امام کو قد قامت الصلوٰۃ پر ... قیام کرنے کی کوئی دلیل نہیں، عاجز نے مظاہر حق دکھائی تو کہا اس کے علاوہ اور دلیل لاؤ، تو تسلیم کروں گا، دلیل مظاہر بلاحوالہ کتب ہے، حدیث و فقہ کے دلائل بیان فرمائیے،

**الجواب**: عن عبد اللہ بن ابی اوفیٰ قال کان بلالؓ اذا قال قد قامت الصلوٰۃ نھض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتکبیر رواہ البزار، ضعفہ الھیثمی وذکرہ ابن حبان فی الثقات (مجمع الزوائد ص ۱۸۲ ج ۱ و لسان ص ۱۷۹ ج ۲) اس مرفوع حدیث سے معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد قامت الصلوٰۃ پر تکبیر شروع فرمادیا کرتے تھے، اور مقتدیوں کو امام کی تکبیر سے پہلے صف درست کرنے کے لئے اٹھنا چاہئے، تو حنفیہ کا قول ثابت ہوگیا، ۱۲ ر رمضان ۴۴ھ

| ایضاً ایضاً ایضاً |
|---|

**سوال** (۱۲) ......................... امام و مقتدی نماز سے پہلے اپنی جگہ پر صف میں بیٹھے رہیں اور مکبر اقامت میں حی علی الصلوٰۃ کہے تب امام و مقتدی کھڑے ہوجائیں، اور نماز کی نیت کرلیں، یہ مسئلہ مفتاح الجنۃ اردو مصنفہ جناب مولوی کرامت علی صاحب جونپوری مطبوعہ مطبع احمدی واقع شاہ باغ صفحہ ۳۸ و ۴۹ میں تحریر ہے، حالانکہ اس وقت تک محققین علماء کرام کا جو احناف میں سے ہیں اس پر عمل ہے، کہ شروع اقامت کے وقت امام و مقتدی کھڑے ہوکر صفوف کو ترتیب دیتے ہیں، اور کلمہ قد قامت الصلوٰۃ پر امام و مقتدی نماز کی نیت کرتے ہیں، ایک امام مسجد جو علم عربی سے بالکل ناواقف ہیں،

اس مسئلہ کو کتاب مذکور میں دیکھ کر خود بھی اقامت شروع ہونے سے پیشتر اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور مقتدیوں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کو مجبور کرتے ہیں، اس سے فتنہ و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کیا کتب حنفیہ اور احادیث صحیحہ سے امام اور مقتدیوں کا اقامت کے وقت بیٹھا رہنا ثابت ہے؟ اور اگر کتبِ حنفیہ اور احادیثِ صحیحہ سے اس کا ثبوت ہے تو علماء احناف کا عمل اس کے خلاف کیوں ہے؟ اور ہمیں کس مسئلہ پر عمل کرنا چاہئے؟ جواب بدلائل مرحمت فرمایا جاوے،

الجواب؛ شروع اقامت سے کھڑے ہوجانے کا جو معمول ہے وہی بہتر ہے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں، اور یہ مسئلہ جو مفتاح الجنۃ میں ہے کتبِ فقہ میں بھی اس کی اصل مذکور ہے، لیکن اول تو اس میں فقہاء نے تفصیل لکھی ہے، نامعلوم مفتاح الجنۃ میں وہ تفصیل بھی لی ہے یا نہیں، تفصیل یہ ہے کہ اگر امام وقتِ جماعت سے پیشتر ہی مصلّے کے قریب بیٹھا ہوا ہے تب تو حیّ علی الفلاح کہتے ہی سب کھڑے ہو جاویں، اور اگر امام جماعت کے وقت پر خارج مسجد سے آیا ہے تو جس صف سے امام گذرتا جاوے وہ صف کھڑی ہوتی جاوے، اور اگر امام صفوف کے سامنے[سے] سے داخل ہوا ہو تو سب صفوف امام کو دیکھتے ہی کھڑی ہوجاویں، یہ تین صورتیں تو درمختار، عالمگیری وغیرہ میں مصرح ہیں، اور ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ امام مسجد میں تو پہلے سے موجود ہے لیکن محراب سے فاصلہ پر ہے، سو اس صورت کا حکم بھی تفصیل بالا سے معلوم ہوگیا، کہ جن صفوں سے امام آگے ہے وہ صفیں امام کے اٹھتے ہی سب کھڑی ہوجاویں، اور جو صفوف امام سے آگے بیٹھی ہیں ان میں جس صف سے امام بڑھتا جاوے وہ کھڑی ہوتی جاوے، اس چوتھی صورت کو علامہ شامی نے درمختار ہی کی عبارت سے مستنبط فرمایا ہے، درمختار کی عبارت یہ ہے (والقیام) لامام ومؤتم (حین قیل حی علی الفلاح ان کان الامام بقرب المحراب والا فیقوم کل صف ینتہی الیہ الامام علی الاظہر) وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرہم علیہ، اور شامی نے (والا فیقوم) کے تحت میں لکھا ہے ای وان لم یکن الامام بقرب المحراب بان کان فی موضع آخر من المسجد اوخارجہ ودخل من خلف ۷ (ص ۵۰۰ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم

سے بعض حیّ علی الصلوٰۃ لکھتے ہیں، واللہ اعلم ۱۲ منہ

سے مثلاً حجرہ میں دریچہ ہو امام اس دریچہ سے آوے ۱۲ منہ



ہر حال میں نہیں ہے، بلکہ چار صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں ہے، و نیز یہ کسی نے نہیں کہا کہ امام صاحب ضرور خواہ مخواہ جاکر بیٹھا کریں بلکہ اس مسئلہ کا منشاء صرف یہ ہے کہ اگر اتفاقاً پیشتر سے امام محراب کے قریب بیٹھا ہو تو یہ حکم ہے، پس ان امام صاحب نے اس کا اہتمام جو شروع کیا ہے یہ ان کی زیادتی ہے، ایسا اہتمام ہرگز نہ چاہئے، دوسرے یہ کہ یہ سب آداب میں سے ہیں، اور ادب وہ ہے جو اکمالِ سنت کے واسطے مشروع ہوا ہو اور اس کے ترک پر ملامت و عتاب نہیں ہوسکتا، اگر کوئی کرے تو بہتر ہے ورنہ کچھ حرج نہیں ہے، کما صرح بہ فی الدر المختار وغیرہ من کتب الفقہ پس مقتدیوں کو مجبور کرنا بالکل بے جا ہے، تیسرے یہ بات غور طلب ہے کہ حیّ علی الفلاح کے وقت کھڑے ہونے کا جو آداب میں شمار کیا ہے تو اس کا مقابل کیا ہے، عام طور پر لوگ یہ سمجھے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ حیّ علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونا خلاف اولیٰ ہے، حالانکہ یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھا رہنا خلاف اولیٰ ہے، کیونکہ اقامت کے بعد فوراً نماز شروع کردینا مستحب ہے، اس واسطے اس کے ختم ہونے سے پیشتر کھڑا ہونا آداب میں رکھا گیا تاکہ اس سنتِ مستحبہ کی تکمیل ہوجاوے، پس اس بناء پر اگر اقامت کے شروع ہی سے کھڑے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، اور یہ جو حضرات نے کہا ہے کہ قیام عند الحیعلۃ کو اولیٰ کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پیشتر قیام خلاف اولیٰ ہو بلکہ حیعلہ کے بعد جلوس کو خلاف اولیٰ کہنا چاہئے، اس کی طرف مراقی الفلاح کے قول میں اشارہ ہے، کیونکہ اس میں یہ دلیل لکھی ہے، لانہ امر بہ فیجاب، اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود امر کی طرف مبادرت ہے، کما صرح بہ الطحطاوی بقولہ فیبادر الیہا بالقیام اور ظاہر ہے کہ مبادرت کا مقابل دیر لگانا ہے، بعد امر کے نہ کہ امر سے قبل مستعد ہونا، پس واضح ہوگیا کہ ہمارا معمول ہرگز خلاف اولیٰ نہیں ہے بلکہ ہم بدرجہ اولیٰ اس حکم مبادرت الی القیام پر عامل ہیں و نیز جتنا جلدی کھڑے ہوں گے اسی قدر اہتمام ہوگا تسویۂ صفوف کا، پس اسکی کوئی وجہ نہیں کہ قیام قبل الحیعلۃ کو خلاف اولیٰ کہا جاوے، اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ شرح مراقی الفلاح میں تصریح ہے؛ واذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ ودخل رجل المسجد فانہ یقعد ولا ینتظر قائما فانہ مکروہ کما فی المضمرات

سے مؤلف مفتاح الجنۃ نے یہی سمجھ کر اپنی طرف سے بڑھا دیا کہ امام و مقتدی سب اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں، ورنہ کتب فقہ میں اس جملہ کا کہیں پتہ نہیں ۱۲ منہ

قہستانی ویفہم منہ کراہۃ القیام ابتداء الاقامۃ والناس عنہ غافلون اھ، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ جزئیہ اگر تسلیم کیا جاوے تو مخصوص ہوگا اس صورت کے ساتھ جبکہ امام اور قوم بیٹھی ہو کہ اس وقت آنے والے کو سب کی موافقت کرنی چاہئے خلاف کرنا کراہت سے خالی نہیں، پس یفہم منہ سے جو تفریع کی گئی ہے وہ مخدوش ہے، ہذا ما عندی واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم،

اور دوسرا جزء جو سوال میں ضمناً مذکور ہے کہ کلمہ قد قامت الصلوٰۃ پر امام و مقتدی نماز کی نیت کرتے ہیں، ہمارے اکابر کا اس پر بھی عمل نہیں ہے بلکہ اقامت پوری ہونے کے بعد نماز شروع کرتے ہیں اور اسی کو بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ اس طرح مؤذن تکبیر تحریمہ میں شامل ہو جاتا ہے، اور اقامت کا جواب دینا جو مستحب ہے اس کا بھی موقع امام اور مقتدی سب کو ملتا ہے، اور طحطاوی نے اسی کو ترجیح دی ہے، لانہ قال تحت قول الشرنبلالیہ (و) من الادب (شروع الامام) الی احرامہ (منذ قیل) ای عند قول المقیم (قد قامت الصلوٰۃ) عندھما وقال ابو یوسف یشرع اذا فرغ من الاقامۃ الخ ای بدون فصل وبہ قالت الائمۃ الثلاثۃ وھو اعدل المذاہب شرح المجمع وھو الاصح قہستانی عن الخلاصۃ وھو الحق بحر (ص ۱۶۲) فقط واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۸ جمادی الثانی ۵۱ھ

| تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ لٹکا کر باندھے جائیں یا بغیر لٹکائے باندھے جائیں |
| --- |

سوال (۱۴)۔ ........................ نماز کی تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ لٹکا کر ناف کے نیچے باندھنا چاہئے یا ہاتھ بغیر لٹکائے باندھ لینا چاہئے، بعض عالم کہتے ہیں تکبیر تحریمہ کی اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ لٹکا دینا پھر ناف کے نیچے باندھ لینا بہتر ہے، بعض کہتے ہیں کہ بغیر ہاتھ لٹکائے باندھنا بہتر ہے، بعض کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کی اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ کر پھر باندھنا مکروہ ہے، ہاتھ نہ لٹکانا چاہئے، فقط اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ بدون چھوڑے ہوئے باندھنا چاہئے، بعض کہتے ہیں ہاتھ لٹکانا اور نہ لٹکانا دونوں قول صحیح ہیں، کسی حالت میں مکروہ نہیں چاہے لٹکائے یا نہ لٹکائے، دونوں قولوں میں کوئی افضل نہیں، دونوں برابر ہیں، اب بندہ عرض کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہ صاحبؒ کا راجح قول کون سا ہے، بینوا توجروا؟



الجواب: قال فی الدر ووضع الرجل یمینہ علی یسارہ تحت سرتہ کما فرغ من التکبیر بلا ارسال فی الاصح اھ قال الشامی ھو ظاہر الروایۃ وروی عن محمد فی النوادر انہ یرسلہا حالۃ الثناء فاذا فرغ منہ یضع بناء علی ان الوضع سنۃ القیام الذی لہ قرار فی ظاہر المذہب وسنۃ القراءۃ عند محمدؒ، حلیہ ص۵۰۰ ج۱

اس سے معلوم ہوا کہ ظاہر روایت اور امام ابو حنیفہؒ کا قول تو یہ ہے کہ تکبیر کہہ کے ہاتھوں کو بدون چھوڑے ہوئے باندھ لے، اور امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دے اور جب تک ثناء پڑھتا رہے اُس وقت تک ہاتھ چھوڑے رکھے، جب قرأت یعنی الحمد شروع کرے اس وقت باندھے، اور اصح قول اوّل ہے، باقی یہ قول کسی کا نہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھائے پھر چھوڑ دے پھر فوراً ہی باندھ لے کہ اس صورت میں یہ ارسال محض لغو ہے، واللہ اعلم، ۲۶ ذی الحجہ ۴۴ھ

| نماز میں تکبیرات کہنا واجب ہیں یا سنت؟ |
| --- |

سوال (۱۵) نماز میں تکبیرات کا کہنا سنت ہے یا واجب؟

الجواب: تکبیر تحریمہ تو فرض ہے اور باقی رکوع وسجدہ کی تکبیریں سنت ہیں، کما فی العالمگیریۃ (ج ۱ ص ۴۲) فرائض الصلوٰۃ وھی ست منہا التحریمۃ وفیہ ایضا (ص ۴۵) سننہا رفع الیدین للتحریمۃ الی ان قال وتکبیر الرکوع وتسبیحہ ثلاثا واخذ رکبتیہ بیدیہ وتفریج اصابعہ وتکبیر السجود والرفع، احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ، ۵ ذی الحجہ ۴۳ھ

| رکوع میں الصاق رجلین سنت ہے یا نہیں، |
| --- |

سوال (۱۶) باسمہ تعالیٰ: ایہا العلماء العاملون والفضلاء الکاملون ما تقولون فی الصاق رجل کعبیہ فی الرکوع والسجود یعنی ھو من سنن الصلوٰۃ ام لا وبای حدیث صحیح ثابت ھو، و من القائل بہ من الائمۃ المعتبرین وکثیر من علماء ھذا الزمان ینکرون سنیۃ ذلک ومنہم صاحب السعایۃ وغیرہ بینوا بالتحقیق وتوجروا علی الیقین ونحن نرید ان نطبع فتویکم،

الجواب: لم نجد حدیثا صریحا فی سنیۃ ھذا الالصاق فی الرکوع والسجود ولم یذکرہ من فقہائنا الا صاحب الدر وشارح المنیۃ ومن

تبعها وهم قليل ولم يتعرض له القدوری ولا صاحب الكنز والوقاية وغيرهم من اصحاب المتون المعتبرة الناقلين لظاهر الرواية وفی ترجيح الراجح لشيخنا قال العلامة عبد الحی اللكهنوی فی السعاية ان قدوة القائلين بسنية الالصاق من الحنفية هو الزاهدی وهو وان كان اماما جليلا فی الفقه لكنه مشهور بنقل الروايات الضعيفة صرح به ابن عابدين فی تنقيح الفتاوی الحامديه وفی الفوائد البهية انه كان معتزلی العقائد حنفی الفروع (النور ص ۱۶ متعلق شعبان سنہ ۴۲ھ) وكلام الطحاوی فی معانی الآثار يفيد ان الالصاق ليس مشروعا فی شیء من الاعضاء فی الركوع ولا فی السجود (للرجال) بل المشروع عكسه ای التجافی بينهما قال الطحاوی فی بحث التطبيق ثم التمسنا حكم ذلك من طريق النظر كيف هو فرأينا التطبيق فيه التقاء اليدين ورأينا وضع اليدين على الركبتين فيه تفريقهما فاردنا ان ننظر فی حكم اشكال ذلك فی الصلوٰة كيف هو فرأينا السنة جاءت عن النبی صلى الله عليه وسلم بالتجافی فی الركوع والسجود واجمع المسلمون على ذلك فكان ذلك من تفريق الاعضاء وكمن قام فی الصلوٰة امر ان يراوح بين قدميه فقد روی ذلك عن ابن مسعود وهو الذی روی التطبيق فلما رأينا تفريق الاعضاء فی هذا بعضها من بعض اولى من الالصاق بعضها ببعض واختلفوا فی الصاق (قدميهما) و تفريقهما فی الركوع كان النظر على ذلك ان يكون ما اختلفوا فيه من ذلك معطوفا على ما اجمعوا عليه منه فيكون كما كان التفريق فيما ذكرنا افضل يكون فی سائر الاعضاء كذلك ام (ص ۱۳۵ و ۱۳۶ ج ۱) وبعد ذلك فلا حاجة الى اقامة الدليل على سنية هذا الالصاق اذا ثبت ضعف نقله فی المذهب ونص الطحاوی على سنية التجافی بين الاعضاء فی الركوع والسجود جميعا والله تعالى اعلم،

مسئلہ رفع یدین

## سوال (۱۷)

............حدیث عدمِ رفع یدین بروایت براء بن عاذب ابوداؤد میں موجود ہے اس میں راوی یزید بن ابی زیاد میں علماء حدیث کو بہت کلام ہے، اور کہتے ہیں کہ ان کا حافظہ بوقت زیادتی لا یعود کے فاسد ہوگیا تھا، ابن حبان و بخاری و بیہقی و حاکم و دارقطنی وغیرہم نے ایسا ہی کہا ہے، اور حافظ عینیؒ نے بنایہ و عمدۃ القاری میں اس کا جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ یعقوب بن سفیان و ابن شاہین وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے، لہذا عرض ہے کہ سوائے حافظ عینی کے اور بھی کوئی مصنف معتمد انہی حفاظ کی توثیق یزید بن ابی زیاد کے بارے میں نقل کرتا ہے ہاں حافظ زیلعی نے تخریج ہدایہ میں ابوالحسن سے نقل کی ہے مگر نہیں معلوم کہ یہ ابوالحسن رجال جرح و تعدیل سے ہیں یا نہیں، امید کہ جواب باصواب سے تسلی فرما دیں گے،



**الجواب:** مسئلہ رفع یدین کے متعلق حضرت مولانا خلیل احمد مدفیوضہم نے "بذل المجهود فی حل ابی داؤد" جلد دوم میں بہت مبسوط تحریر فرمائی ہے کہ اس قدر جامع اور مبسوط تحریر اور جگہ نہیں مل سکتی، اس کے صفحہ ۔ پر جوہر نقی سے نقل کیا ہے ثم حكى البيهقی عن الدارمی انه قال وحقق قول بن عيينة ان الثوری وزهيرا وهشيما وغيرهم من اهل العلم لم يجيئوا بها (ای زيادة لم يعد) انما جاء بها من سمع منه باخرة قلت يعارض هذا قول ابن عدی فی الكامل رواه هشيم وشريك وجماعة معهما عن يزيد باسناده وقالوا فيه ثم لم يعد الخ پھر تحریر فرمایا ہے قلت قولهم ان زيادة لفظة ثم لا يعود مدرج من قول يزيد ابن زياد لقن فتلقن يبطله ما رواه عيسى بن عبد الرحمن والحكم بن عتيبة عند البيهقی والطحاوی وابی داؤد كلاهما ثقتان بل عيسى بن عبد الرحمن ثقة ثبت واما قولهم بان حديث عيسى والحكم رواه عنهما محمد بن عبد الرحمن بن ابی ليلى وهو ضعيف فالجواب عنه ان الحافظ قال فی التهذيب بعد نقل تضعيفه قال ابو حاتم عن احمد بن يونس ذكره زائدة فقال كان افقه اهل الدنيا وقال العجلی كان فقيها صاحب سنة صدوقا جائز الحديث وكان عالما بالقرآن وكان من احسن الناس كان جميلا نبيلا وقال يعقوب بن سفيان ثقة عدل فی حديثه بعض المقال لين الحديث عندهم الى ان قال فتأيد حديث يزيد بن زياد بحديث عيسى والحكم وتأيدت رواية محمد بن عبد الرحمن بحديث رواه جماعة من المحدثين عن يزيد بن ابی زياد ملخصا، كتبه الاحقر عبد الكريم عفی عنه، ۱ ر ج ۱ سنہ ۴۲ھ

رفع یدین در قنوتِ وتر

## سوال (۱۸)

............ایک غیر مقلد صاحب نے مذہبِ احناف پر اعتراض کیا، جس کی وجہ سے عوام میں فتنہ بپا ہے کہ وتر میں قبل دعاء قنوت جو رفع یدین و تکبیر مروّج ہے یہ حدیث سے ثابت نہیں، لہذا بدعتِ سیّئہ ہے، اور ہم نے ہر چند بموافق استطاعت کتب حدیث و فقہ

میں تتبع و تلاش کی، لیکن دربارہ رفع یدین اثر ابن مسعود و ابراہیم نخعی رح کچھ نہ ملا اور دربارہ تکبیر حدیث علی رض جس کو صاحب بدائع نے مرفوعاً نکالا ہے لیکن اس کی تخریج معلوم نہیں، لہذا اگر کوئی حدیث صحیح دربارہ رفع یدین و تکبیر ہو تو عبارت مع حوالہ کتاب و صفحات تحریر فرمادیں، اور کوئی حدیث صحیح نہ ہو تو عوام کے سمجھانے کی کوئی بہتر صورت تحریر فرمادیں امید کہ جلد جواب تحریر فرماکر عند اللہ ماجور ہوں گے، بینوا توجروا،

**الجواب**؛ فی حاشیۃ آثار السنن (ص ۱۰) قلت وقد ثبت رفع الیدین فی مطلق القنوت عن عمر بن الخطاب رض اخرج البخاری فی جزء رفع الیدین باسناد صحیح عن ابی عثمان قال کنا وعمر یؤم الناس ثم یقنت[عہ] بنا عند الرکوع یرفع یدیہ حتی یبدو کفاہ ویخرج ضبیعیہ وعنہ قال کان عمر یرفع یدیہ فی القنوت رواہ البخاری فی جزءہ باسناد حسن وقال البیہقی فی المعرفۃ وروی فی رفع الیدین فی قنوت الوتر عن ابن مسعود رض وابی ہریرۃ رض اھ وفیہ ایضا (ص ۱۹) وعن طارق بن شہاب قال صلیت خلف عمر رض صلوٰۃ الصبح فلما فرغ من القرأۃ فی الرکعۃ الثانیۃ کبر ثم قنت ثم کبر فرکع رواہ الطحاوی واسنادہ صحیح،

پس حضرت عمر رض سے مطلق قنوت میں رفع یدین صحیح سند سے ثابت ہوا، اور موقوف مالا یدرک بالرائی میں حکماً مرفوعاً ہوتا ہے اور نماز میں ہر رفع یدین میں تکبیر ہے، اس لئے تکبیر بھی ضمناً ثابت ہوگئی، اور دوسری روایت میں تکبیر کی تصریح ہے، باقی رہی یہ بات کہ وہ قنوت فجر کے بارہ میں ہے سو قنوت فجر و غیر فجر میں فرق ہونے کی دلیل کیا ہے، اور اثر ابن مسعود و نخعی کی آثار السنن میں تصریح کی ہے، وقال ابن قدامۃ فی المغنی روی عن عمر انہ کان اذا فرغ من القرأۃ فی الوتر کبر اھ وروی الطبرانی فی معجمہ الکبیر حدثنا علی ابو نعیم ثنا عبد السلام بن حرب عن لیث عن عبد الرحمن بن الاسود عن ابیہ ان عبد اللہ (ابن مسعود) کان یکبر حین یفرغ من القرأۃ ثم اذا فرغ من القنوت کبر و رکع اھ قال النیموی رجال اسنادہ کلہم ثقات الا لیثا وہو ابن ابی سلیم اھ (من التعلیق الحسن ص ۷، ج ۲) قلت لیث وثقہ ابن معین واخرج لہ مسلم واستشہد بہ البخاری فالحدیث حسن وفی آثار السنن (ص مذکور) عن الاسود عن عبد اللہ انہ کان یقرأ فی آخر رکعۃ

[عہ] یحمل قنوت الوتر وغیرہ ۱۲ منہ



من الوتر قل ہو اللہ ثم یرفع یدیہ فیقنت قبل الرکعۃ رواہ البخاری فی جزء رفع الیدین واسنادہ صحیح اھ،

پس عبد اللہ ابن مسعود رض سے وتر کی قنوت میں رفع یدین اور تکبیر کا ثبوت سند صحیح و حسن سے ہوگیا ہے، اور صحابی کا فعل و قول حجت ہے خصوصاً ابن مسعود و عمر رضی اللہ عنہما کا کہ ایک خلفائے راشدین میں سے ہے جن کے اقتداء کا ہم کو حکم ہے، اور دوسرے صحابی کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے رضیت لامتی مارضیہ ابن ام عبد وقال اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر، اب جو اس تکبیر و رفع کو بدعت کہتا ہے وہ خود مبتدع ضال ہے، اور حضرت علی رض کی روایت کے متعلق تحقیق نہ ہوسکی، فقط عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح　ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۳ ر شعبان المعظم ۴۲ھ

**جماعت میں اگر مقتدی سے کوئی فرض یا واجب فوت ہوجائے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟**

**سوال (۱۹)** درمیانِ نماز اگر مقتدی سے فرض یا واجب کا سہو ہوجائے تو کیا کرے، پھر سے نماز پڑھے امام سے الگ ہوکر یا نیت توڑ کر الگ ہوجائے، یا وقتِ سلام وہ مقتدی سجدۂ سہو کرے، جس طرح دفعیہ ہوتا ہو تو تحریر فرمائیے،

**الجواب**؛ اگر درمیان میں فرض فوت ہوجائے تب تو نیت توڑ کر اسی وقت از سر نو نیت باندھ کر امام کے ساتھ شاملِ جماعت ہوجائے، اور اگر واجب فوت ہوجائے تو کچھ نہ کرے، نہ نیت توڑے نہ سجدۂ سہو کرے، مقتدی کو ترکِ واجب سہواً معاف ہے اور عمداً ترک ہو تو بعد جماعت کے نماز کا اعادہ کرے،

**نماز میں نیت کرتے وقت بجائے عصر کے مغرب کی نیت کرلی تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟**

**سوال (۲۰)** نماز میں دل سے نیت کرنے وقت سہواً دل ہی میں بجائے وقت عصر کے وقت مغرب ذہن میں آگیا، اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نیت باندھ لی، پھر معاً خیال آیا کہ میں نے غلطی کی تو وہ نیت توڑ کر پھر سے نیت کرے، یا نماز پڑھ لے؟

**الجواب**؛ اس صورت میں نیت درست نہیں ہوئی، جب کہ نیت ہی میں غلطی ہو، پس دوبارہ صحیح نیت سے تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز شروع کرنا لازم ہے، واللہ تعالیٰ اعلم ۸ر محرم

**کوئلہ کی کان میں نماز پڑھنے کے متعلق ایک استفتاء،**

**سوال (۲۱)** .................... جس جگہ ہم لوگ رہتے ہیں وہاں پر کھاد ہے، کوئلہ کی زمین کے اندر

سے کوئلہ نکالا جاتا ہے، لہٰذا جو لوگ مسلمان غریب اس میں کام کرتے ہیں کوئلہ کاٹتے ہیں اور گاڑیوں میں بھرتے ہیں، وہاں پر پانی بھی ملتا ہے، مگر اندھیرا سخت، قیامت کا نمونہ ہے، وہاں پر لوگ نماز پڑھتے ہیں، لیکن مسئلہ پوچھتے ہیں، کیونکہ جس جگہ وہ لوگ کام کرتے ہیں، جگہ بہت خراب ہے، اور حالت یہ ہے کہ کپڑا جسم میں صرف فرض یعنی ستر ڈھانکنے کے لائق ہوتا ہے، بعض تو لنگوٹ باندھ کر کام کرتے ہیں، نیچے بھی پانی ہے، پانی کی جگہ سے کوئلہ ٹوکری میں بھر کے گاڑی میں لادتے ہیں، اس پر اوپر سے پانی مثال سوتوں کے ٹپکتا رہتا ہے، اور گرمی بھی بعض جگہ ایسی ہے کہ پسینہ کثیر ہر وقت جاری رہتا ہے، اسی حالت میں کوئلہ اٹھانا پڑتا ہے اور کان میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جماعت ہو جاوے اگر کوشش کی جاوے تو مع امام کے چار پانچ پڑھتے ہیں جماعت کے ساتھ، مگر اکثر جگہ گیلی پائی جاتی ہے وہاں پر نماز چھوڑ دینا چاہئے یا کہ نہیں، اور عورت و مرد دونوں مل کر کام کرتے ہیں، اور دونوں مسلمان ہیں، کس صورت سے نماز پڑھیں، کیا حکم فرماتے ہیں، اور یہاں پر کام کرنے کا وقت ۸ بجے صبح سے ۸ بجے رات تک ہے، اور دوسرے وقت ۸ بجے رات سے ۸ بجے صبح تک کام ہوتا ہے، دو وقتہ کام ہوتا ہے، یعنی یہ کارخانہ چوبیس گھنٹہ چالو رہتا ہے، اتوار کی رخصت ملتی ہے، جو شخص اس ہفتہ دن میں کام پر جاویگا وہ اگلے ہفتہ رات کو کام پر جاوے گا، اوّل تو وہاں رات اور دن دونوں کی ایک صورت ہے، گھڑی کے ذریعہ سے وقت معلوم ہوتا ہے، اور جس جگہ زمین کے اندر جاتے ہیں اس جگہ سے کام کرنے کی جگہ آدھ میل یا آدھ میل سے زیادہ دور جانا پڑتا ہے بلکہ بعض جگہ ایک میل سے زائد دور جانا پڑتا ہے، اوّل وقت کو معلوم کرنے کی قلت ہے، دوسرے پانی کی سخت تکلیف ہے، اور وہاں پر پانی بہتا رہتا ہے، نالی سے مگر اس میں لوگ شبہ اور کراہت کرتے ہیں، کیونکہ وہیں پر لوگ پاخانہ پیشاب کرتے ہیں، اور جگہ جگہ نالی کے سرے پر اکثر غلیظ پایا جاتا ہے، بہت سخت تکلیف ہے، اگر اوپر آ اٹھ کر نماز پڑھی جاوے تو وقت بہت سا برباد ہو جاتا ہے، اور جو کام ہم لوگ کر کے آتے ہیں وہ کوئی دوسرا لے لے گا، یعنی کوئلہ گرایا ہے، ہم گئے نماز پڑھنے تو دوسرے شخص نے آکر لے لیا، ہماری محنت ضائع گئی، اور ہم نماز ہی کے لئے تین دفعہ گئے وقت ختم ہو گیا، دوسرے کا وقت آ گیا، یعنی ۸ بجے، اب ہم کو کل پھر صبح ۸ بجے گاڑی ملے گی، اور ہم کوئلہ کاٹ کر لائیں گے، ہم لوگ کیا کریں، سخت مجبور ہیں، اب حضور بتلا دیں کہ یہ لوگ نماز



پڑھتے نہیں، اگر کہتے ہیں تو سو سو اعتراض کرتے ہیں، اور حیلہ و حجت کرتے ہیں، اور جو لوگ نماز کے شوقین ہیں وہ پانی کے ناپاک ہونے کے خیال سے اوپر سوکھی مٹی لیجاتے ہیں، اور تیمم کر کے نماز پڑھتے ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو سرداروں میں سے ہیں، حضور کیا حکم دیتے ہیں کہ ان پر تیمم جائز ہوگا یا کہ نہیں یا کہ اُس پانی سے وضو جائز ہوگا، اور جگہ گیلی ہونیکے متعلق کیا حکم ہوتا ہے یا ایسی جگہ نماز چھوڑ دینے کا حکم ہے یا اوپر آ کر قضا پڑھنی چاہئے، اس لئے ہم نے تفصیل وار لکھا ہے، آدمی جب کھاد سے اوپر اُٹھتا ہے تو ایک دم کالا بھوت ہو جاتا ہے، اور زمین کے نیچے ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے جا کر یہ سب کام ہوتا ہے، بعض جگہ کم ہے پانچ سو یا سات سو فٹ ہے جو حکم ہو وہی کیا جاوے؟

**الجواب:** جگہ کا گیلا ہونا نماز سے مانع نہیں، گیلی جگہ پر نماز درست ہو جاتی ہے، جب کہ زمین پر پیشانی جم جاوے، اور جو پانی اس جگہ نالی سے بہتا ہے وہ پاک ہے، جب تک پانی میں غلیظ و نجاست کی بُو وغیرہ ظاہر نہ ہو، پس جو لوگ کوئلہ کی کان میں کام کرتے ہیں، ان کو ایسی جگہ جہاں وہ کام کرتے ہیں نماز پڑھنا چاہئے، اور وقت کو اور قبلہ کے رُخ کو اندازے سے معلوم کرنا چاہئے، اور نماز کے وقت ستر کو اچھی طرح ڈھانک لینا چاہئے، پھر اگر سہولت ہو تو جماعت سے نماز پڑھیں، اور اگر دشواری ہو تو الگ الگ ہی پڑھ لیں اور جب تک بہتے ہوئے پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو اس وقت تک اس کو ناپاک سمجھنا غلط ہے، اور تیمم جائز نہیں بلکہ وضو کرنا واجب ہے، ہٰذا واللہ اعلم، ۲۷ رمضان ۴۷ھ

**مقتدی اگر قعدہ اخیرہ میں التحیات و درود و دعا ترک کر دے تو نماز واجب الاعادہ ہوگی یا نہیں؟**

**سوال (۲۲)** مقتدی نے آخر قعدہ میں التحیات اور درود شریف و دعا کچھ نہیں پڑھا اور امام کے ساتھ سلام پھیر دیا اس صورت میں نماز قابلِ اعادہ تو نہ ہوگی؟

**الجواب:** اگر سہواً تشہد نہیں پڑھا، تو اعادہ لازم نہیں، اور اگر عمداً ترک کیا ہے تو نماز تو اس صورت میں بھی ہو گئی، مگر اعادہ لازم ہے، تاکہ ترکِ واجب عمداً سے جو خلل آ گیا ہے وہ مرتفع ہو جاوے، ۱۳ رمضان المبارک ۴۷ھ

**میز وغیرہ پر ناپاک روغن اور پالش لگا گیا ہو اس پر بغیر کپڑا ڈالے نماز پڑھنا کیسا ہے؟**

**سوال (۲۳)** آجکل میز وغیرہ سب پر جو روغن ہوتا ہے اس پالش میں شراب کی آمیزش، مسموع ہے، دریں صورت بلا بسط ثوب اس پر نماز جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: ایسی میز پر بلا بسطِ ثوب نماز پڑھنا خلافِ احتیاط ہے، ۱۲ر رمضان سنہ ۴۷ھ

بحالتِ نماز بارش ہونے لگے تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے

**سوال** (۲۴) جماعت کے ساتھ صحن میں نماز ہو رہی ہو، ایسی حالت میں پانی برسنے لگے تو کیا کرنا چاہیئے؟

**الجواب**: پانی برسنا نماز سے تو مانع نہیں، نماز پڑھتا رہے، اور اطمینان سے پڑھتا رہے، اس کے بعد خدانے کپڑے دیئے ہوں تو گیلے اتار کر سوکھے پہن لے، اور کپڑے نہ ہوں تو انہی کو سکھا کر پڑھ لے، البتہ اگر کسی کو بارش میں نماز پڑھنے سے بیمار ہونے کا اندیشہ ہو وہ جلدی جلدی نماز پوری کرلے، اور اگر زیادہ خطرہ ہو تو نماز توڑ کر اندر چلا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۲ر صفر سنہ ۴۸ھ

کیا یہ صحیح ہے کہ جسکو ترجمۂ قرآن نہ آتا ہو اس کی نماز نہیں ہوتی، نہ اس کو تلاوت کا ثواب ملتا ہے؟

**سوال** (۲۵) بکر کہتا ہے کہ جس شخص کو ترجمۂ قرآن نہیں آتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی اور نہ اس کو تلاوتِ قرآن کا ثواب ملتا ہے، اس پر بعض لوگوں نے نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا چھوڑ دیا، اس کا جواب مدلل دیا جائے؟

**الجواب**: دلیل کا بیان کرنا خود اس شخص کے ذمہ ہے، کیونکہ وہی مدعی ہے، اور دعویٰ بلا دلیل مسموع نہیں، لہٰذا یہ قول غلط ہے، نیز ہم تبرعاً کہتے ہیں کہ اس شخص کا قول فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ کے خلاف ہے کیونکہ جو شخص قرآن پڑھنے پر قادر ہے اور ترجمہ سمجھنے پر قادر نہیں تو یہ آیت اس کو صرف قرأتِ قرآن کا مکلف بناتی ہے، اور اس سے اسکی نماز صحیح ہو جائیگی لاتیان المامور بہ، ترجمہ کی قید لگانا تیسیر کے خلاف ہے، دوسرے ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن نظمِ عربی کا نام ہے یا نظمِ عربی مع الترجمہ کا، شقِ ثانی باطل ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ صبیان و جہلاء تلاوتِ قرآن کے وقت قاریٔ قرآن نہ ہوں، بلکہ وہ قرآن کے سوا کچھ اور پڑھتے ہوں، اور یہ لغو ہے، پس شقِ اول متعین ہے، تو اس کے تحقق سے قرأتِ قرآن کا تحقق ہو گیا، اور یہی شرطِ صلوٰۃ و ثواب ہے، اس سے زیادہ شرطِ صلوٰۃ و ثواب نہیں،

سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے سر ٹیکے یا ناک......؟

**سوال** (۲۶) سجدہ میں جب جاتے ہیں تو پہلے سر ٹیکے یا ناک ٹیکے، اور جب اُٹھے تو پہلے سر اٹھاوے یا ناک اٹھاوے؟

**الجواب**: سجدے میں جاتے ہوئے پہلے سر رکھے پھر ناک اور اُٹھتے ہوئے کوئی ترتیب مذکور نہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں ساتھ ہی اٹھائے جائیں، قال فی الدر ثم



وجہہ مقدما انفہ لما مر ای لقربہ من الارض لما قال الشامی لکن فی البدائع ومنہا ای من السنن ان یضع جبہتہ ثم انفہ وقال بعضہم انفہ ثم جبہتہ و مقتضاہ اعتماد تقدیم الجبہۃ وان العکس قول البعض اہ قال فی الدر ویعکس نہوضہ قال الشامی وہل یرفع الانف قبل الجبہۃ ای علی القول بانہ یضعہ قبلہا قال فی الحلیۃ لم اقف علی صریح فیہ اہ (ص ۴۶۵ ج ۱) واللہ اعلم ۱۶ر رجب سنہ ۴۸ھ،

بدون عذر فرض، وتر اور سنتِ فجر بیٹھکر پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی،

**سوال** (۲۷) یہاں پر عورتوں کا دستور ہے کہ جب نماز پڑھتی ہیں تو پہلے کھڑی ہو کر ایک رکعت چاہے فرض ہوں یا سنت پڑھتی ہیں، باقی نماز بیٹھ کر پڑھتی ہیں اور یوں کہتی ہیں کہ ہمارے واسطے یوں ہی حکم ہے، آپ فرماویں کہ یہ نماز ہوتی ہے یا نہیں، اور حالانکہ تندرست ہیں اور کوئی تکلیف نہیں،

**الجواب**: فرض اور وتر سنت فجر میں بدونِ عذر بیٹھنا جائز نہیں، نماز درست نہ ہوگی، اور بقیہ سننِ مؤکدہ میں بلا عذر قعود مکروہ ہے، شامی (ص ۶۰۷ و ۲۸ و ۴۰۳ ج ۱) کھڑا ہو کر پڑھنا ضروری ہے، اور مرد عورت کا ایک ہی حکم ہے اور نفل میں ایسا کرنا جائز ہے کہ ایک رکعت کھڑی ہو کر پڑھی جائے باقی بیٹھ کر وہو الاصح، اور اس میں بھی مرد عورت برابر ہیں، مگر یہ صورت صاحبین کے نزدیک نوافل میں بھی جائز نہیں، ہاں یہ جائز ہے کہ نوافل کو اول سے اخیر تک بیٹھ کر پڑھے (شامی ص ۲۹، ج ۱) نیز نوافل میں یہ بھی اتفاقاً جائز ہے کہ دو رکعت قیاماً پڑھے اور دو رکعت جالساً، لان کل شفعۃ منہا صلوٰۃ علیحدۃ، (شامی ص مذکور) اسی طرح شروع میں بیٹھ کر پڑھنا پھر کھڑا ہونا بالاتفاق جائز ہے،

احقر عبد الکریم عفی عنہ، ۷ر ربیع الثانی سنہ ۴۵ھ

مسئلہ سمتِ قبلہ

**سوال** (۲۸) سوال یہ ہے کہ کلکتہ، پٹنہ، گیا اور الٰہ آباد سے مکہ معظمہ پچھم دکن کی طرف ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے میں قبلہ کی طرف رُخ کرنے کی یہ صورت ہوگی کہ ذرا سا دکن مڑتے ہوئے پچھم کے رُخ کھڑے ہوں، مگر ایک عالم صاحب ہیئت دان یہ فرماتے ہیں کہ ان شہروں میں پچھم سے ذرا اُتر کی طرف مڑتے ہوئے کھڑے ہونے سے مصلے قبلہ رُخ ہوگا، یہ فرمانا اُن کا صحیح ہے یا نہیں، اور نماز میں ان مذکورہ

جگہوں میں کس طرف کھڑا ہونا چاہئے، یا ٹھیک پچھم کی طرف؟ بینوا توجروا۔

**الجواب:** فی الدر وھو فی القریٰ والامصار محاریب الصحابۃ والتابعین وقال الشامی تحتہ فلا یجوز التحری معہا زیلعی بل علینا اتباعہم خانیۃ ولا یعتمد علی قول الفلکی العالم البصیر الثقۃ ان فیہا انحرافا خلافا للشافعیۃ فی جمیع ذلک کما بسطہ فی الفتاوی الخیریۃ الخ وقال الشامی ایضا بعدہ قلیلا والظاہر ان الخلاف فی عدم اعتبارھا ای النجوم انما ھو عند وجود المحاریب القدیمۃ اذ لا یجوز التحری معہا کما قدمناہ لئلا تلزم تخطئۃ السلف الصالح وجماھیر المسلمین بخلاف ما اذا کان فی المفازۃ الخ، ص ۴۴۲ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور مسلمین نے جس سمت پر مساجد بنائی ہیں ان کو غلط نہ کہنا چاہئے پس تدقیقات مذکورہ فی السوال سے احتراز لازم ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے قواعد کو صحیح گمان کرکے تھوڑا بہت تفاوت مساجد عامہ میں ثابت بھی کردے تو اس سے سمت کا غلط ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ قول در (وغیرہ) ای لغیر معاینہا (اصابۃ جہتہا) کے تحت میں شامی کے ملاحظہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے، اور دور والوں کو سوائے جہت کے اور کیا معلوم ہو سکتا ہے، عین کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے واسطے ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے، واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۷/ رجب ۴۵ھ

**نماز جنازہ کی وضو سے فرض پڑھنے کا حکم**

**سوال** (۲۹) نماز جنازہ کی وضو سے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

**الجواب:** جس وضو سے نماز جنازہ پڑھی جاوے اس سے فرض وغیرہ پڑھنے میں کچھ مضائقہ نہیں، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۴/۲/۴۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ

**چوتھی رکعت کو تیسری خیال کرکے کھڑے ہونے کے بعد یاد آیا تو کیا کرنا چاہئے؟**

**سوال** (۳۰) نماز میں درمیانی قعدہ سہواً رہ جاوے اور کھڑے ہوجانے کے بعد یا کھڑے ہوجانے کے قریب یاد آوے تو بیٹھنا نہیں چاہئے، بلکہ سجدہ سہو کرلینا چاہئے، لیکن آخری قعدہ (چوتھی رکعت کو تیسری رکعت خیال کرنے کے وقت کھڑا ہوجاوے اور کھڑے ہونے کے بعد یا کھڑے ہوجانے کے قریب یاد آوے کہ یہ چوتھی رکعت تھی تو بیٹھ جانا چاہئے یا بیٹھنا



نہیں چاہئے، بلکہ ایک رکعت اور پڑھ کر سجدۂ سہو کرنا چاہئے؟

**الجواب:** قعدۂ اخیرہ کو بھول کر کھڑے ہوجانے کی صورت میں بیٹھنا ضروری ہے، حتیٰ کہ اگر پانچویں رکعت کا رکوع بھی کرچکا ہو تب بھی بیٹھ جاوے اور بہرحال سجدہ سہو کرلے نماز ہوجاوے گی، البتہ اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرچکا ہو تو اب یہ نماز نفل ہوچکی، فرض دوبارہ پڑھنا پڑیں گے، ۱۵/ رمضان ۴۵ھ

**نماز میں شیطانی وساوس اور دنیاوی خیالات آنا،**

**سوال** (۳۱) اس کا کیا علاج ہے کہ نماز میں شیطانی وسوسہ نہ ہو، اور دنیاوی خیالات نہ ہوں؟

**الجواب:** جہاں تک ہوسکے قرأت اور تسبیح وغیرہ کی طرف دھیان رکھیں، رفتہ رفتہ عادت پختہ ہوجاوے گی، اور باوجود اس کوشش کے پھر بھی خود بخود دھیان اور طرف چلا جاوے تو کچھ حرج نہیں، فقط اتنا ضروری ہے کہ بالارادہ دوسری طرف خیال نہ کرے، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۷/ شوال ۴۵ھ الجواب صحیح، ظفر احمد، ۷/ شوال

**نماز کے بعد جو سر پر ہاتھ رکھا جاتا ہے اس وقت کچھ پڑھنا بھی چاہئے یا نہیں؟**

**سوال** (۳۲) بعد فرض نماز جو سر پر ہاتھ رکھتے ہیں کیا اس میں کچھ پڑھنا بھی چاہئے؟

**الجواب:** بسم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم، اللھم اذھب عنی الھم والحزن پڑھتے ہیں، ۷/ شوال ۴۵ھ

**عورت سجدہ میں پاؤں کس طرح رکھے**

**سوال** (۳۳) بہشتی زیور مدلل میں حصہ دوم کے صفحہ ۲۴ پر یہ عبارت سجدہ کے بیان میں لکھی گئی ہے، "ہاتھ پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف رکھے، مگر پاؤں کھڑے نہ کرے، بلکہ داہنی طرف نکال دے اور خوب سمٹ کر الخ" اور اس میں لفظ مگر سے نکال دے تک عبارت بڑھائی گئی ہے، اس عبارت کے بڑھ جانے سے احقر کے سمجھ میں یہ آیا ہے کہ سجدہ میں عورت اپنے دونوں پیروں کو مثل تورک کے داہنی طرف نکال دے اور اسی طور سے سجدہ کرے، مگر شامی میں ہے وذکر فی البحر انہا لا تنصب اصابع القدمین، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں کو تو عورت کھڑے رکھے اور انگلیوں کو زمین پر بچھائے رکھے اور اسی صورت میں انگلیوں کا قبلہ رُخ ہونا ممکن ہے ورنہ نہیں، اور عالمگیری میں ہے والمرأۃ لا تجافی فی رکوعہا وسجودہا وتقعد علی رجلیہا، فی السجدۃ تفترش بطنہا علی فخذیہا کذا فی الخلاصۃ، اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت سجدہ کرتے وقت مردوں کی طرح پاؤں پر بیٹھے تورک کے طور پر نہ بیٹھے، اور لیست سجدہ کرنے میں یہ فرق

کافی ہوگا کہ بازوؤں کو کروٹوں میں ملا کر دبائے رکھے، اور پیٹ کو رانوں پر جالیوے اور کلائیوں کو زمین پر بچھائے رکھے، اور پنڈلیوں کو بھی زمین پر بچھائے رکھے، بخلاف مردوں کے،

اور جامع الرموز میں لکھا ہے فلا تنتصب اصابع القدمین، پس ان عبارتوں میں اور مرقومہ بالا بہشتی زیور کی اس عبارت مزیدہ میں مخالفت معلوم ہوتی ہے، اور کسی طرح سمجھ نہیں سکا کہ دونوں پیر شمال کی طرف داہنی جانب کو باہر بھی نکلے ہوئے ہوں اور اُن کے اوپر بیٹھی ہوئی بھی، اور سجدہ کے وقت دونوں پاؤں داہنی طرف نکلے ہوئے بھی ہوں اور انگلیاں بچھی ہوئی قبلہ رُو بھی اور دونوں قدم بھی کھڑے ہوں، پس مکلف ملازمانِ قدسی صفات ہوں کہ کونسی صورت اختیار کی جائے، اس سے پیشتر تو احقر شامی اور جامع الرموز اور عالمگیریہ کے موافق بتلاتا تھا اور اب بوجہ نہ سمجھنے کے حیرانی پیدا ہوئی، پس امید ہے کہ تصریح فرمائی جائے کہ کونسی عبارت کی اتباع کروں؟

**الجواب**؛ فقہاء نے عورت کو انتصاب سے مستثنیٰ کرکے توجیہ اصابع الی القبلہ سے مستثنیٰ نہیں کیا، اور ترکِ انتصاب کے ساتھ توجیہ اصابع الی القبلہ کی وہی صورت ہے جو بہشتی زیور میں ہے، اس کے سوا سجدہ میں توجیہ اصابع الی القبلہ کی عورت کے لئے کوئی صورت نہیں، ظفر احمد عفا عنہ ، ۱۰ رشوال ۴۸ھ

**الجواب الثانی**؛ سوال میں جو تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے یہ تو ممکن نہیں ہے، کیونکہ تورک و عدمِ تورک میں تنافی ہے، پس لا تنتصب اصابع القدمین او وتقعد علی رجلیہا، اُن حضرات کی روایت ہے جو تورک کے قائل نہیں، اب فقط یہ سوال باقی رہا کہ توجیہ اصابع الی القبلہ دونوں روایت میں سے کس کی بناء پر ہے، سو احقر کے نزدیک عدم تورک کی حالت میں لا تنتصب الاصابع کی تصریح ہوتے ہوئے توجیہ اصابع ناممکن ہے اور جو صورت بیان کی گئی جب اس میں توجیہ اصابع ممکن ہی نہیں تو اس کو مستثنیات میں بیان کرنے کی حاجت ہی کیا ہے، کما لا یخفی، اور تورک کی صورت میں بھی گو بدقت کسی قدر پاؤں کو موڑ کر قبلہ کی طرف انگلیاں ہوسکتی ہیں، اور اسی بناء پر بہشتی زیور میں توجیہ اصابع الی القبلہ کو برقرار رکھا گیا ہے، لیکن احقر کے فہم ناقص میں اس صورت میں توجیہ اصابع مامور بہ نہیں ہے اور گو توجیہ اصابع سے عورت کو کہیں مستثنیٰ نہیں کیا، لیکن اس کے واسطے مستقل صورت سجدہ بیان کرنا اور اس صورت میں توجیہ اصابع کا محال یا متعذر ہونا



خود استثناء ہی ہے، واللہ اعلم، مراقی الفلاح میں ہے (و) یسن (افتراش) الرجل (رجلہ الیسریٰ ونصب الیمنیٰ) (و) توجیہ اصابعہا نحو القبلۃ کما ورد عن ابن عمر رضی اللہ عنہما (و) یسن (تورک المرأۃ) بان تجلس علی الیتہا وتضع الفخذ وتخرج رجلیہا من تحت ورکہا الیمنیٰ لانہ استرلہا وقال شارحہا (و توجیہ اصابعہا) ای باطن اصابع رجلہ الیمنیٰ نحو القبلۃ بقدر الاستطاعۃ فان توجیہ الخنصر لا یخلو عن عسر قہستانی، فقط، اس سے معلوم ہوا کہ قدر استطاعت توجیہ مسنون ہے، اور ظاہر ہے کہ مرد کو خنصر کی توجیہ میں اس قدر دقت نہیں جس قدر تورک کی حالت میں دقت ہوتی ہے، خلاصہ یہ کہ بوجہ دشواری عورت اس حکم سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے، لیکن فقہاء نے مستثنیات میں شمار نہیں کیا، اس واسطے اگر سہولت سے ہوسکے کر لیا جاوے ورنہ کاوش نہ کی جاوے، واللہ اعلم احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۰ ارشوال ۴۸ھ

**التنقیح علی الجواب الثانی**؛ مشاہدہ میں کلام ہے، احقر کا مشاہدہ یہ ہے کہ توجیہ اصابع الی القبلہ کی آسان صورت تورک ہی ہے، اس کو محال یا متعذر کہنا عجیب ہے، منشاء اس دشواری یا استحالہ کا یہ ہے کہ مجیب ثانی کے ذہن میں تورک مع ضم الرجلین کی صورت نہیں، وہ تورک مع تفریج الرجلین میں توجیہ اصابع کو دشوار دیکھ کر مطلقِ تورک میں اس کو دشوار سمجھ گئے ۱۲ ظفر احمد عفا عنہ

## ضمیمہ سوال مذکور؛

.............................................

........ خادم نے یہ سوال خدمتِ سامی میں پیش کیا تھا جس کا جواب جناب مولانا ومکرمنا مولوی ظفر احمد صاحب نے اور مولانا عبدالکریم صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو بعینہ نیاز نامۂ ہذا کے ساتھ ارسالِ خدمت گرامی ہے، ان صاحبوں نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اس سے بجائے تردد و شبہ رفع ہونے کے اور بھی بڑھ گیا، اسی حیرانی میں لفجوائے شفاء العی السوال پھر مکلف ہوں، موجبِ تردد یہ ہے کہ جناب مولانا ظفر احمد صاحب جو تحریر فرماتے ہیں کہ فقہاء نے عورت کو انتصاب سے الخ اس عبارت کا مطلب میں نے یہ سمجھا ہے کہ عورت کے لئے سجدہ میں پاؤں کا کھڑا کرنا فقہاء رحمہم اللہ نے مستثنیٰ فرمایا ہے، اور توجیہ اصابع للقدمین جائز بلکہ ضروری ہے اور اس کی یہ صورت ہے کہ قومہ سے جب سجدہ میں جائے

تو پاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کرے، اور جب میں خاکسار شامی کی عبارت انہا لاتنصب اصابع القدمین کو مولانا ظفر احمد صاحب کی عبارتِ جواب سے ملاتا ہوں تو شامی کی عبارت اس سے نہیں ملتی، کیونکہ شامی کی عبارت سے انتصاب القدمین کا استثناء ثابت نہیں ہوتا، بلکہ انتصاب اصابعِ القدمین کا استثناء معلوم ہوتا ہے، چنانچہ رسالہ مفتاح الصلوٰۃ کے صفحہ ۱۰۸ پر ہے، "ہشتم انگشتانِ پائے ایستادہ نہ کند" اور جامع الرموز کی عبارت فلا تنصب اصابع القدمین سے بھی فہم ناقص میں یہی سمجھا گیا ہے کہ عورت جب قومہ سے سجدہ میں جائے تو سیدھی سجدہ میں جائے پہلے زانو ٹیکے پھر ہاتھ ٹیکے، پھر پیشانی و ناک ٹیکے اور دونوں پاؤں کو علیٰ صدور القدمین کھڑے اور اصابع القدمین کو علیٰ بطونہا مفروش رکھے، اس صورت میں توجیہ الی القبلۃ بھی ہو گئی، بوجہ اتم،

الجواب: قدمین کی یہ حالت مرد و عورت میں یکساں ہو گئی، کیونکہ مرد بھی قدمین کو سجدہ میں اسی طرح رکھتا ہے، حالانکہ فقہاء کی عبارت قدمین کو حالت کو مرد و عورت کے حق میں متفاوت بتلاتی ہے، اب اس کے بعد یہ بتلائیے کہ اس کے مقابل مرد کے واسطے نصبِ اصابعِ قدمین کی کیا صورت ہو گی جس میں توجیہ الی القبلہ بھی ہو سکے؟

سوال: اور فرق مرد اور عورت کے سجدہ میں بھی ہو جاتا ہے، اور اس قدر فرق مع دیگر مستثنیات کے کافی ہے، کیونکہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے والمرأۃ تنخفض کی شرح یہی کی ہے، کہ عورت بازوؤں کو کروٹ سے ملا لیوے، اور کلائیوں کو زمین پر بچھائے، اور پیٹ کو زانو پر بچھائے، اور پنڈلیوں سے زانوؤں کو ملائے، اور پاؤں کی انگلیوں کو زمین پر بچھائے، یہ صورت تو تمام کتبِ فقہ میں پائی جاتی ہے، مگر جس صورت کو مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ توجیہ اصابع القدمین کی مع انتصاب القدمین کے استثناء کے سوائے صورتِ مسطورۂ بہشتی زیور کے اور کوئی صورت ہی نہیں، وہ یعنی بحالتِ سجدہ عورت دونوں پاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کرے تو اس صورت میں تو توجیہ اصابع القدمین الی القبلہ کہاں ہے، یہ تو عقلاً و نقلاً توجیہ اصابع الی الشمال ہے البتہ اسی صورت کو توجیہ اصابع الی القبلہ فرض کر لیا جائے تو یہ اور بات ہے،

الجواب: یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے مشاہدہ سے، تحریر سے کیونکر واضح کیا جائے، حاصل یہ ہے کہ رجلین کو داہنی طرف نکال کر اگر پیروں کو خوب ملایا جائے جیسا.......



عورتوں کو ضمِ رجلین کا حکم ہے تو توجیہ الی القبلۃ اصابع کی بہت آسان ہے، ہاں اگر ضم نہ کیا جائے بلکہ رجلین میں تفریج ہو تو توجیہ الی الشمال ہو گی،

سوال: اور اس صورت میں جو احقر کی سمجھ میں ان عباراتِ مرقومہ سے آئی ہے، حدیث امرت ان اسجد علی سبعۃ اعظم علی الجبہۃ والیدین والرکبتین واطراف القدمین، (متفق علیہ) سے بھی پوری پوری موافقت و مطابقت ہو جاتی ہے، اور اگر پاؤں کو داہنی طرف نکال کر سجدہ کیا تو سات اعضاء کے عوض کل پانچ اعضاء پر سجدہ ہو گا، تو اس لحاظ سے بھی وہ صورت اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے، نہ یہ صورت جس میں پانچ اعضاء پر سجدہ ہو،

الجواب: حدیث میں اطراف القدمین آیا ہے، جس سے وہ صورت بھی خارج نہیں جو بہشتی زیور میں مذکور ہے، کیونکہ ہر قدم کی کروٹ زمین سے ملی رہے گی، تو اطرافِ قدمین پر سجدہ ہو گیا، البتہ اطراف سے مراد اگر اصابع ہوں تو بے شک بہشتی زیور کے خلاف ہو گا، فلیحرر ولیتأمل،

سوال: اور یہ صورت جو قومہ سے چل کر عورت پہلے بیٹھ کر دونوں پاؤں کو داہنی طرف نکال کر بعد اس کے سجدہ کرے (اسی کی تمام عورتیں عادی ہیں جو غالباً تمام ہندوستان بھر کی عورتوں کا تعامل اسی طور پر) کسی فقیہ نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے، یا انتصاب القدمین کو کسی نے لکھا ہے یا فقط انتصاب اصابع القدمین سے انتصاب القدمین مراد لیا جاتا ہے، (عبارت زائدہ) احقر نے بہت دیکھا بھالا مگر اس فرقِ مرقومہ کے سوا اور فرق کسی نے نہیں لکھا ہے، عورت انتصاب اصابع الرجلین میں مستثنیٰ ہے نہ انتصاب قدمین میں، پس امید ہے کہ جواب شافی سے احقر کے تردد و پریشانی کو رفع فرما دیں گے،

الجواب، عباراتِ فقہاء میں تو لاتنصب اصابع القدمین ہی وارد ہے، مگر ترکِ نصب اصابع سے ترکِ نصب قدمین دو وجہ سے مراد لیا گیا ہے، ایک یہ کہ اس میں ستر زیادہ ہے، اور عورتوں کو اختیار استر کا امر ہے، دوسرا اس میں توجیہ اصابع الی القبلہ بھی ہے، اگر عورت نصبِ قدمین کرے تو اس میں ستر کی تقلیل ہے، پھر اس کے ساتھ اگر نصب اصابع نہ کرے بلکہ بقولِ سائل کے ان کو قبلہ رو بسط کرے تو فقہاء کا نصب اصابع رجلین میں عورت و مرد کو متفاوت بتلانا لغو ہو گا، کیونکہ یہی صورت مرد بھی کرتے ہیں، اس کو لاتنصب اصابع

القدمین کی تفسیر بنانا غلط ہی، بس صحیح تفسیر یہی سمجھ میں آئی کہ مراد یہ ہے کہ عورت پیروں کی انگلیوں کو زمین پر کھڑا نہ کرے، نہ قبلہ رو نہ ترکِ استقبال کے ساتھ بلکہ پیروں کو اس طرح بچھائے کہ اصابع قبلہ رُو ہوں، واللہ اعلم۔

سُوال؛ اور جناب مولانا عبدالکریم صاحب زاد مجدہٗ نے زیب رقم فرمایا ہے کہ سوال میں جو تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، الخ،

احقر نے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف یہ استفسار ہے کسی نے فقہاء متقدمین یا متاخرین سے یہ صورت (جو اس مزید فرمودہ عبارت سے مفہوم ہے، اور تمام ہند کی عورتیں قریب قریب اسی طرح کرتی بھی ہیں) لکھی بھی یا نہیں لکھی، اگر لکھی ہے تو کس نے اور اگر نہیں لکھی تو یہ استثناء انتصاب القدمین کی ان عبارات سوال کے مخالف ہے، کیونکہ ان عبارتوں میں وہ صورت معلوم ہوتی ہے، نہ یہ کہ پاؤں کو داہنی طرف نکالا جائے، احقر نے یہ لکھا ہے کہ سجدہ میں تورک کی صورت نہ بیٹھے، بلکہ خوب سمٹ کر سجدہ پست کرے مگر پاؤں کو کھڑا رکھے علی صدور القدمین، اور انگلیوں کو مفروش علی بطونہا موجہ الی القبلہ رکھے، اور جلسہ میں عورت اپنے دونوں پاؤں کے اوپر بیٹھے، اُن عبارتوں سے میں نے یہ سمجھ کر بہشتی زیور کی اس مزید عبارت کو ان عبارتوں کے خلاف سمجھ کر یہ سوال لکھا ہے تورک تو قعدوں میں ہی کیا جاتا ہے، سجدوں اور جلسوں میں نہیں کیا جاتا، اگر جلسہ اور حالتِ سجدے میں کسی نے لکھا ہے تو لکھئے، والسلام،

جوابؔ؛ یہ سوال حضرت علامہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کیا گیا ہے، انھوں نے زنانِ ہند کے اس طریقِ سجدہ کو اقوالِ فقہاء کے موافق بتلایا ہے، اسی کے موافق بہشتی زیور میں مسطور ہے، اور فقہاء کی عبارت سے جس طرح یہ مضمون سمجھا گیا تھا اوپر لکھ دیا گیا، دوسرے علماء سے بھی مراجعت کر لی جائے، فلعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً،

سُوال؛ ............... آنجناب نے جو فقیر کے جواب میں تحریر فرمایا ہے اس سے تسلّی وتشفی پھر بھی نہیں ہوئی، کیونکہ آنجناب تحریر فرماتے ہیں، اول عبارات فقہاء تو لا تنصب اصابع القدمین ہی وارد ہے، مگر نصب اصابع سے ترک نصب قدمین دو وجہ سے مراد لیا گیا ہے الخ فقیر کے نزدیک یہ بیان صحیح نہیں ہے، کیونکہ آنجناب فرماتے ہیں کہ اصابع سے قدم مراد ہے،



جواب؛ یعنی اس عبارت میں جو عورتوں کے متعلق ہے،

سوال؛ اور یہ خلاف ہے فقہاء کے، کیونکہ کبیری مطبوعہ فخر المطابع کے صفحہ ۲۰۸ پر ہے "المراد من وضع القدم وضع اصابعہا،

جواب؛ یہ عبارت مردوں کے متعلق ہے،

سوال؛ تو جبکہ وضعِ قدم سے وضعِ اصابع مراد مان لیں تو وہ تحریر سامی اس کے خلاف ہوگی، پس اسی کے موافق ومؤید ہے عبارت عالمگیریہ، پس انگلیاں کھڑی کرنا مردوں کا اور بچھانا عورتوں کا کافی ہے،

جواب؛ مردوں کا انگلیاں کھڑی کرنا آپ نے کہاں سے نکالا اور اس صورت میں مرد توجیہ اصابع الی القبلہ کیونکر کرے گا،

سوال؛ تفاوت مع دیگر امور متفاوتہ سجدہ کے یعنی کلائیاں زمین پر بچھی ہونا اور رانیں پنڈلیوں سے ملی ہوئی ہونا اور بازوؤں کا کروٹوں سے اور رانوں سے چسپاں رکھنا اور پیٹ کو زانو پر بچھانا اور دونوں پیروں کے اوپر بیٹھنا جلسہ میں اور سجدہ میں زانوؤں سے متصل کرنا، چنانچہ عالمگیری کی یہ عبارت جلسہ اور سجدہ کی ہیئت کو صاف بتلاتی ہے' والمرأۃ لا تجافی فی رکوعہا وسجودہا وتقعد علی رجلیہا وفی السجدۃ تفترش بطنہا علی فخذیہا کذا فی الخلاصۃ، اور اس کا ترجمہ مولوی امیر علی صاحب یوں کرتے ہیں، ترجمہ، عالمگیری جلد اول صفحہ ۱۰۱ عورت اپنے اعضاء کو رکوع اور سجود میں ملا ہوا رکھے، جدا جدا نہ کرے، اور سجدہ میں دونوں پاؤں پر بیٹھے، اور پیٹ کو زانو پر بچھاوے، الخ اس سے بھی صاف بیان ہو گیا کہ یہ فرق جو بندہ نے عرض کیا ہے کافی ہے، اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ سجدہ کے وقت اور جلسہ میں عورت متورک نہ ہوے، بلکہ پاؤں کے اوپر بیٹھے، اور مذکورہ ومرقومہ عبارت سے اصابع الرجلین کا نصب نہ کرنا لغو نہیں ہے، کیونکہ قدمین سے مراد اصابع ہے، کما حققہ فی عبارۃ الکبیری)

دوم اینکہ قدمین کی یہ حالت مرد وعورت میں الخ قدمین کو مرد بھی کھڑے رکھے اور عورت بھی کھڑے ہی رکھے، اور مرد انگلیوں کو کھڑی رکھے،

جواب؛ قبلہ رُخ کیونکر ہوں گی، وفی الحدیث المتفق علیہ عن ابی حمید انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یفتح اصابع رجلیہ اذا سجد ای یثنیہا ویعطفہا بکسر ہا للتوجہ الی القبلۃ، اور انگلیوں کا کھڑا کرنا اس کے خلاف ہے،

سوال: اور عورت انگلیوں کو مفروش رکھے اور قدمین بقولِ آنجناب ملائے رکھے، یہ فرق سجدہ کا ہوا اور جب جلسہ میں بیٹھے تو دونوں پیروں پر بیٹھے، جلسہ میں تورّک کرکے نہ بیٹھے اور مرد ایک پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھے، اور دوسرے کو کھڑا رکھے، بایںطور کہ اس کی انگلیاں مفروش درو بقبلہ ہوں، پس یہ تفاوت کافی ہے، اس کو عالمگیری کی عبارت مرقومہ میں غور فرمانے پر خوب سمجھ سکتے ہیں، فہم ناقص میں جو آیا ہے عرض کردیا ہے، مرد کے واسطے اصابع کو کھڑا رکھنا آیا ہے، اور اس کو یوں بتلایا ہے کبیری فخر المطابع المراد بوضع الاصابع توجیہا نحو القبلۃ لیکون الاعتماد علیہا، اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ انگلیوں کے سر زمین پر معتمد ہونا اس میں ... توجیہ بھی ہوجاتی ہے،

جواب: اگر اصابع کا سر زمین پر معتمد ہوا تو قبلہ رُو ہرگز نہ ہوں گی، اور اگر مرد نے انگلیوں کو دبا دیا اور دبا کر قبلہ رُو کیا تو یہی صورت آپ عورتوں کے لئے تجویز کر رہے ہیں، حالانکہ فقہاء کا یہ قول کہ والمرأۃ لاتنصب اصابع قدمیہا الخ بتلاتا ہے، کہ یہ حکم عورتوں کے لئے خاص ہے، مرد و عورت دونوں اس میں مشترک نہیں، پس نصب اصابع و ترکِ نصبِ اصابع کی ایسی صورت بتلایئے، جس میں مرد و عورت دونوں سجدہ میں پیروں کی انگلیوں کو قبلہ رُو بھی کریں پھر مرد نصب اصابع کریں اور عورتیں ترکِ نصب اصابع، آپ کی اس تطویل سے یہ اشکال حل نہیں ہوا،

سوال: کیونکہ کسی قدر دبانے سے ذرا سا انگلیوں کے سر رُو بقبلہ ہوجاتے ہیں، مگر اس میں تکلف ضرور ہے، سوم یہ بات مشاہدہ سے الخ یہ تحریر سے بھی سمجھ میں ..... آتی ہے، چنانچہ ان عباراتِ منقولہ میں غور کرنے سے صاف واضح ہوجاتا ہے داہنی طرف پیروں کا نکالنا اور ران کو ملانا اس کی کیا ضرورت ہے، جبکہ کسی نے اس کو لکھا ہی نہیں ہے،

جواب: اور آپ نے مردوں کے لئے جو صورت نصب اصابع کی لکھی ہے جس میں استقبالِ اصابع نہیں وہ کس نے لکھی ہے؟

سوال: اور وہ صورت جو لکھی ہوئی ہے وہ نہایت استر ہے، تو پھر اسی کا عامل ہونا لازم ہے، نہ اس صورت کا، یہ صورتِ تورّک تو قعدہ کی ہے نہ سجدہ کی، جس کے لئے یہ تکلف گوارا کیا جائے، اور یہ آسان بھی نہیں ہے، اور آسان بھی وہی شکل ہے جس کو فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، البتہ چونکہ اس صورتِ تورّک کی عورتیں عادی ہوچکی ہیں



ان کو آسان معلوم ہوتی ہوگی، مگر جبکہ اس صورت کو لکھا ہی نہیں تو پھر اس کو چھوڑ کر اصل صورت کو اختیار کرنا کرانا چاہئے، اور تعامل موجودہ مروجہ قابلِ اعتبار نہیں، بہت سی باتیں مذہب کے خلاف مروّج ہیں جن کے سنوارنے میں علماء رحمہم اللہ کو دشواریاں پیش آئی ہیں، چنانچہ مردوں کو قبروں میں چت لٹاتے ہیں، حالانکہ کروٹ پر لٹانا تمام کتب میں مسطور و مزبور ہے،

جواب: اس وعظ کی ضرورت نہیں، کلام اسی میں ہے کہ عورتوں کی یہ صورتِ سجدہ شرع کے موافق ہے یا نہیں؟

سوال، اسی طرح مسئلہ زیر بحث کا حال معلوم ہوتا ہے کہ خلاف قاعدہ مروّج ہوگیا ہے، گو کتبِ مذہب میں مصرّح ہے، چہارم حدیث من اطراف القدمین الخ اطراف القدمین سے مراد انگلیاں ہیں، نہ کہ قدمین کی کروٹیں، کیونکہ شامی اور عنایہ شرح ہدایہ والکبیری وغیرہا میں انگلیاں رکھنا ہی فرض بتلایا ہے، نہ کہ کروٹیں، تو کروٹیں مراد لینا اطراف القدمین سے کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، چنانچہ کبیری کی عبارت یہ ہے ثم المراد من وضع القدم وضع اصابعہا، قال الزاہدی ووضع رؤس القدمین حالۃ السجود فرض وفی مختصر الکرخی سجد ورفع اصابع رجلیہ عن الارض لاتجوز وکذا فی الخلاصۃ فی البزازی وضع القدم بوضع الاصابع وان وضع اصبعا واحدۃ او وضع ظہر القدم بلا اصابع ان وضع مع ذلک احدی قدمیہ صح والا فلا وفہم من ہذا ان المراد بوضع الاصابع توجیہہا نحو القبلۃ لیکون الاعتماد علیہا والا فہو وضع ظہر القدم وقد جعلہ غیر معتبر وہذا مما یجب التنبیہ لہ فان اکثر الناس عنہ غافلون،

جواب: یہ عبارت مردوں کے لئے متعلق ہے، ان کے واسطے اعتماد علی الاصابع میں کلام نہیں، مگر جب عورتوں اعتماد علی الاصابع سے منع کیا گیا ہے تو ان کو یہ عبارت عام نہیں، اور اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو صورت مردوں کے لئے نصب اصابع کی آپ نے اوپر لکھی ہے وہ غلط ہے کیونکہ وضع اصابع و نصب اصابع سے مراد توجیہ الی القبلہ ہے نہ مطلق وضع اور مطلق نصب

سوال: اس میں میں نے غور کرنے سے یہی سمجھا کہ اطراف سے مراد انگلیاں ہیں، اور باقی مسئلہ کی صورت بھی اس سے نکل آتی ہے، اور فتاویٰ سراجیہ (جو فتاویٰ قاضی خان کے حاشیہ

پر ہے) کے صفحہ ۲۵ پر ہے، المرأة فی سجودہا تنخفض ولا تنصب کانتصاب الرجل وتلزق بطنها علی فخذیها وتجلس للتشهد علی الیتها الیسری وتخرج رجلیها من الجانب الآخر، اس میں ظاہر طور سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ انتصاب القدمین عورت کو کرنا ہے مگر مرد کے مثل نہ کرے، بلکہ اس کے خلاف کرے، اور وہ انگلیوں کے بسط سے حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں انتصاب کی نفی نہیں کی بلکہ مماثلت کی نفی ہے، پس ان تمام عبارتوں سے تو وہ عبارت زائدہ بہشتی زیور کی صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور مولانا عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کوئی عبارت کسی کتاب کی نقل فرمائی ہو تو فبہا، ورنہ بلا نقل کے ان کا اجتہاد ہوگا، جو ان عبارتوں کے شامل کر خلاف بھی مانا جائے گا، اور فقیر کا اعتماد جو اپنے حضرت مرشدنا مد اللہ تعالیٰ ظلال فیضانہ الی یوم الدین پر ہے، وہ اور کسی پر نہیں ہے، واللہ علی ما اقول وکیل،

**الجواب**: مولانا عبد الحی صاحبؒ نے فقہاء کے کلام سے سمجھ کر لکھا ہے، اور وہ مسلم صاحب فتویٰ اور صاحب وسیع النظر ہیں، ان کا استنباط ہمارے آپ کے استنباط سے مقدم ہے، تفصیل کا شوق ہو تو ان کا فتویٰ ملاحظہ فرما لیا جائے،

**تتمہ**: عبارات فقہاء سے قطع نظر کر کے اب میں حدیث کی طرف توجہ کرتا ہوں، حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے واذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذیها (رواہ ابن ابی شیبۃ بسند حسن) اور عبد اللہ بن عمرؓ کی مرفوع حدیث میں ہے اذا سجدت المرأة الصقت بطنها علی فخذها وفی روایة بین فخذیها کاستر ما یکون، رواہ البیہقی، اور یزید بن ابی حبیبؒ کی مرسل روایت میں ہے قال للمرأتین اذا سجدتما فضما بعض اللحم الی الارض فان المرأة فی ذلک لیس کالرجل رواہ ابوداؤد فی مراسیلہ، والروایات کلها فی اعلاء السنن،

اس سے امور ذیل معلوم ہوئے (۱) عورت سجدہ میں احتفاز کرے، والاحتفاز التضام فی السجود (۲) عورت سجدہ میں پورے ستر کے ساتھ جتنا ممکن ہو پیٹ کو رانوں سے چپکا کر اب ہمارا خیال یہ ہے کہ پورے ستر کے ساتھ الصاق لبطن بالفخذین اور پورا التضام اعضاء اور زمین سے گوشت کو منضم کر دینا اسی صورت سے متحقق ہے جو بہشتی زیور میں ہے، اور جو صورت آپ نے تجویز کی ہے نہ اس میں پورا الصاق ہے نہ پورا ستر ہے، نہ زمین سے گوشت کا انضمام ہے، مجھے امید نہیں کہ اس تفصیل کے بعد بھی آپ میری بات مانیں گے، مگر اس کا اتنا اثر ہونا چاہیے کہ آپ عورتوں کے مروجہ سجود پر انکار نہ کریں، اور یہ سمجھ لیں کہ اس کی بھی گنجائش ہے،



ہاں اپنی مستورات کو آپ جو صورت چاہیں تعلیم کریں اس کا اختیار ہے، ۶ ذیقعدہ ۴۸ھ

سجدہ میں توجہ اصابع رجلین عورتوں کے لئے بھی مسنون ہے

**سوال (۳۵)** نماز میں حکم ہے کہ بحالت سجدہ اصابع رجلین متوجہ الی القبلہ ہونی چاہئیں، کیا عورتوں کے لئے بھی یہی حکم ہے، اگر نہیں ہے تو نساء کا استثناء کہاں مذکور ہے؟

**الجواب**: بحالت سجدہ توجیہ اصابع الی القبلہ عورتوں کے لئے بھی مسنون ہے، اور وہ اس کو سہولت کے ساتھ ادا کر سکتی ہیں مگر سستی کرتی ہیں، ۲۴ ذیقعدہ ۴۸ھ

# فصل فی الامامة والجماعة

جماعت ثانیہ کا حکم

**سوال (۱)** ہمارے اطراف میں اکثر جماعت کے ساتھ نماز پنج وقتی بعض جگہوں میں پڑھی جاتی ہے، اور بلا تنخواہ کے امام بھی امامت کے لئے نامزد رہتے ہیں، گو مؤذن کوئی ایک ہوا کرتے ہیں، تو آیا جماعت اولیٰ کے بعد ایسی جگہوں میں جماعت ثانیہ حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے تحریمی یا صرف مکروہ یا کچھ بھی نہیں؟

**الجواب**: قال فی الشامیة یکرہ تکرار الجماعة فی مسجد محلة باذان و اقامة الا اذا صلی بهما فیه اولا غیر اهله او اهله لکن بمخافتة الاذان ولو کرر اهله بدونهما او کان مسجد طریق جاز اجماعا کما فی مسجد لیس له امام ولا مؤذن ویصلی الناس فیه فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علیحدة کما فی امالی قاضی خان اه (ص ۵۷۷ ج ۱) وفیه (ص ۵۷۸ ج ۱) وقدمنا فی باب الاذان عن آخر شرح المنیة عن ابی یوسف انه اذا لم تکن الجماعة علی الهیئة الاولیٰ لا تکرہ والا تکرہ وهو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة انتهی وفی التاتارخانیة عن الولوالجیة وبه ناخذ اھ،

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ بصورت مذکورہ مسجد محلہ میں جس میں امام و مؤذن مقرر ہیں جماعت ثانیہ مکروہ ہے، مگر بتغییر ہیئت امام ابو یوسفؒ کے قول پر گنجائش ہے، لیکن ہمارے مشائخ نے انتظام عوام کے لئے اس پر فتویٰ نہیں دیا، بلکہ مسجد محلہ میں جہاں امام و مؤذن مقرر ہوں مطلقاً کراہت کا فتویٰ دیا ہے، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الثانی ۴۰ھ

۵ صفحہ ادحال عن مسجد ای مسجد محلة یؤذن فیه ویقام ۱۲ ظ عسه قلت وهو الذی یمیل الیه القلب لقوة دلیله فان علة

**جس کی بیوی بدکار اور فاسق ہو اس کی امامت کا حکم۔**

**سوال (۲)** ..........

ہندہ ایک عورت نا معلوم الاسم والنسب ہے (جو تحقیق کرنے سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ہندہ مفرورہ نامسلمان تھی) اوّل وہ ایک رافضی کے (بسبب خواہش نفسی) ساتھ فرار ہوئی اور کچھ عرصہ تک اس کے پاس رہی، پھر دوسرے رافضی کے پاس اس اوّل مرد کو زندہ چھوڑ کر ساتھ رہی، نکاح غالباً دونوں میں سے کسی سے ہوا ہو جس کا علم نہیں، بعد مرنے دوسرے شخص کے کچھ دنوں آزاد بدچلن رہی، اب ایک لڑکی ہے جس کو اپنے بطن سے بتلاتی ہے، اور لڑکی کا نکاح ایک رافضی مرد سے کر دیا ہے، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ خود بھی اس رافضی داماد سے ناجائز تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس رافضی داماد کی خوشی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے جس خاندان اہل سنت میں ہندہ نے نکاح کیا ہے اس کی عورت کو بھی اس سے ناجائز تعلق کرانا چاہتی ہے، جو واقعات سے ظاہر ہو چکا ہے، اور اگر اس کے داماد کی نگرانی کیجے تو کہتی ہے کہ میں شوہر کے ساتھ نہیں داماد رافضی کے ساتھ ... رہوں گی، اور اس کے لڑکے یعنی نواسہ کو پرورش کرتی ہے، اور متبنّٰی جانتی ہے، اب اہل سنت مرد سے نکاح کر لیا ہے، مگر شوہر و اس کے رشتہ داروں سے رافضیوں کو ترجیح دیتی ہے، اب اس نکاح کی وجہ سے ہندہ اپنے کو اہل سنت کہتی ہے، بلکہ اس تحقیق مذہب کے خیال سے اس نے ایک بزرگ اہل سنت سے بیعت کر کے دھوکہ میں ڈال دیا ہے، مگر چونکہ اس کے شوہر کی رشتہ داری رافضیوں میں پہلے سے ہوتی رہی ہے، اور بعض رشتہ دار اسکے شوہر کے مکانداہل رفض سے خوب واقف ہیں، جب اس سے تحقیق نام و مذہب و نسب چاہتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ اگر میں رافضی ہوں تو پیشاب پلاؤں گی، اور نام و نسب وغیرہ نہیں بتلاتی، بلکہ بعض وقت تحقیقِ حالات میں شوہر کے رشتہ دارانِ اہل سنت کو کافر بھی کہتی ہے تو ایسی عورت کو جو نام و نشان وغیرہ اپنے سابقہ حالات کچھ نہ بتلاتی ہو اور حالات بالا موجود ہوں اس کو اہلِ سنت سمجھیں یا کیا، اور اس سے مثل رافضیوں کے احتیاط کریں یا نہیں؟

**الجواب:** جب ہندہ نے رافضی مردوں سے ناجائز تعلق رکھا، اور اپنی بیٹی کو بھی رافضی سے بیاہا، اور خود بھی داماد سے ناجائز تعلق رکھتی ہے اس صورت میں بظاہر



ہندہ پر رافضی ہونے کا شبہ ہے اور بدکار و فاسق ہونے میں تو شبہ بھی نہیں، اگر ہندہ کے شوہر کو یہ سب حالات معلوم ہیں اور وہ پھر بھی اس پر تنبیہ نہیں کرتا نہ اس کو علیحدہ کرتا ہے تو وہ بھی فاسق و دیوث ہے، اہلِ سنت کو ایسے شخص کے گھر میں اپنی مستورات کو نہ بھیجنا چاہئے، اور مستورات اہلِ سنت کو ہندہ سے پوری طرح احتراز کرنا چاہئے، اور ہندہ کے شوہر کے پیچھے اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، ۲۷ ربیع الثانی سنہ ۴۶ھ

**بدچلن عورت کے خاوند کے پیچھے نماز کا حکم۔**

**سوال (۳)** ہندہ ایک عورت نا معلوم الاسم والنسب والمذہب ہے، اور جس نے اس خاندان میں نکاح کیا ہے، اس کے خاندان اور مردوں کو بھی اپنے ساتھ اپنی خواہش سے زانی بنایا اور اس کے داماد سے بھی جو رافضی ہے زنا کراتی ہے، اور اس رافضی کی رضامندی کے واسطے اس خاندان کے دوسری عورتوں کو بھی خراب کرانا چاہتی ہے جو واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ غیروں کے تعلق کو زیادہ پسند کرتی ہے، اور اگر اس کی نگرانی کی جاوے تو نگرانی کرنے والوں کو متہم کرتی ہے، اب ہندہ کے شوہر کا باپ چاہتا ہے کہ ایسی عورت جو خود بدچلن اور مخرب عزت خاندان ہو اس کے شوہر اور اس خاندان سے علیحدہ ہو جاوے، چونکہ ہندہ بہت چالاک اور جادو و تعویذ وغیرہ لغویات کرنے والے لوگوں سے واقف ہے اپنے شوہر کو ایسا مجبور کر دیا ہے کہ باوجود علم کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتا، کیا ایسی عورت کو شرعاً علیحدہ کرنا جائز ہے؟ اور اگر ایسی عورت کو علیحدہ کرانا جائز ہے تو کیا تدبیر کی جاوے، کوئی دعا یا اسم باری تعالیٰ یا جو کچھ مناسب ہو تعلیم فرمایا جاوے، اور اس کے شوہر کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** نماز جائز نہیں، اور اصلاح کی تدبیر یہ ہے کہ ساری برادری اس کا کھانا پینا اس کے یہاں آنا جانا ترک کر دیں، ۲۷ ربیع الثانی سنہ ۴۶ھ

**غلط قرآن پڑھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم۔**

**سوال (۴)** ایسے شخص کے پیچھے جس کی قرأت درست نہ ہو جان بوجھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اور بغیر جانے ہوئے نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

**الجواب:** اگر اس شخص کی قرأت ما یجوز بہا الصلوٰۃ ہے تب تو اقتداء کا مضائقہ نہیں، اور اگر ایسی غلط قراءۃ ہے کہ اس سے نماز صحیح نہیں ہوتی تو اقتداء صحیح نہیں، اور ہر حالت میں عمدہ قرآن پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا اور ایسے ہی شخص کو امام مقرر

کرنا چاہیے، کما فی الحدیث لیؤمکم اقرءکم۔ واللہ اعلم، ۶ رجمادی الاولی ۱۳۴۰ھ

محلہ کی مسجد میں اگر جماعت فوت ہوجائے تو کیا کرے

**سوال (۵)** اگر مسجد میں جماعت فوت ہوگئی ہو تو تنہا مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر ہے یا مکان پر؟ اور فضیلت مسجد میں نماز پڑھنے کی جو پچیس یا پانچسو یا ہزار یا پچاس ہزار یا لاکھ کا مسجدِ محلہ سے لے کر کعبہ تک کے بارہ میں آیا ہے تو یہ باعتبار جماعت کے یا تنہا اور یہ سب واجبات سے ہے یا مندوبات سے، بینوا توجروا۔

**الجواب:** قال فی الخلاصۃ (ص ۲۲۸ ج ۱) رجل فاتتہ الجماعۃ فی مسجدہ ان ذہب الی مسجد آخر لیصلی فیہ بالجماعۃ فہو حسن وان صلّٰی فی مسجد حیہ وحدہ فحسن وان دخل منزلہ فصلی باہلہ فحسن اھ، اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنی مسجد میں اگر جماعت فوت ہوجاوے تو دوسری مسجد میں جاکر جماعت سے نماز پڑھنا بہتر ہے، اور اگر تنہا اسی مسجدِ محلہ میں پڑھ لے یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اپنے گھر پر آکر اہل وعیال کے ساتھ جماعت کرکے پڑھے یہ بھی بہتر ہے، اور بظاہر سب سے بہتر صورت اُولیٰ ہے، اور اخیر کی دونوں صورتیں فضیلت میں برابر ہیں، کیونکہ تنہا مسجد میں پڑھنے سے جماعت کا ثواب نہ ہوگا، مگر مسجد کی فضیلت حاصل ہو جاویگی اور گھر پر جماعت کرنے سے مسجد کی فضیلت فوت ہو جاوے گی مگر جماعت کا ثواب مل جاویگا مگر میرے خیال میں تیسری صورت دوسری سے افضل ہے، کیونکہ جماعت کی فضیلت مسجد کی فضیلت سے زیادہ ہے، البتہ اگر مسجدِ محلہ میں کوئی بھی نماز نہ پڑھتا ہو اس وقت مسجد میں تنہا نماز پڑھنا گھر پر جماعت کرنے سے افضل ہے، اور مسجد میں نماز پڑھنے پر جو ثواب احادیث میں وارد ہے وہ ہر حال میں ہے خواہ تنہا پڑھے یا جماعت سے، اور جماعت کا ثواب اس کے علاوہ ہے (کذا دل علیہ اطلاق الحدیث) واللہ اعلم، جماعت حنفیہ کے نزدیک واجب عین ہے، اور مسجد میں جماعت کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، واللہ اعلم، قال فی الخلاصۃ قال الصدر الشہید انما الاساءۃ فیما اذا ترک اہل المسجد کلہم الجماعۃ فہم اساؤا وترکوا السنۃ وان صلوا بالجماعۃ فی البیت اختلف المشائخ فیہ والصحیح ان للجماعۃ فضیلۃ وللجماعۃ فی المسجد فضیلۃ اخری فہو قد اتی باحدی الفضیلتین وترک الاخری وہکذا الجواب فی المکتوبات اھ ص ۶۳ ج ۱، ۲۴ رجمادی الاولی سنہ

امام کا کتنا اونچا کھڑا ہونا مکروہ ہے؟

**سوال (۶)** ................. امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہ ہے خواہ کتنی ہی اونچی ہو، اس کی دلیل بحر الرائق (ج ۲ ص ۲۶) میں ہے اور محراب میں بھی امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، وقت فرصت جواب مرحمت ہو۔



**الجواب:** میں نے یہ عرض کیا تھا کہ امام کا مطلقاً کسی قدر اونچا کھڑا ہونا مکروہ نہیں، مثلاً دو اُنگل یا چار اُنگل اونچا ہو یہ جائز ہے، بحر الرائق کی عبارت سے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں قولہ وانفراد الامام علی الدکان وعکسہ اما الاول فلحدیث الحاکم مرفوعاً نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقوم الامام فوق ویبقی الناس خلفہ وعللوہ بانہ تشبہ باہل الکتاب فانہم یتخذون لامامہم دکانا واطلقہ فشمل ما اذا کان الدکان قدر قامۃ الرجل او دون ذلک وہو ظاہر الروایۃ وصححہ فی البدائع لاطلاق النہی وقیدہ الطحاوی بقدر القامۃ ونفی الکراہۃ فیما دونہ اھ غالباً رفشمل ما اذا کان الدکان قدر قامۃ الرجل او دون ذلک) سے آپ کو یہ شبہ ہوا ہے کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہے، حالانکہ صاحبِ بحر کا یہ مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود طحاوی کے قول کو رَد کرنا ہے، کہ انھوں نے قدِ آدم بلندی کو مکروہ کہا ہے، اس سے کم کو مکروہ نہیں کہا، یہ تقیید صحیح نہیں، کیونکہ اطلاقِ حدیث قدِ آدم اور اس سے کم دونوں کی کراہت کو مقتضی ہے، رہا یہ کہ قدِ آدم سے کم جس قدر بھی ہو سب مکروہ ہے، حتیٰ کہ ایک دو اُنگل بلندی بھی، یہ اس عبارت سے مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ آگے چل کر خود بحر الرائق میں تصریح ہے کہ تھوڑی سی بلندی مکروہ نہیں ہے، وقال قاضی خان فی شرح الجامع الصغیر انہ مقدر بذراع اعتبارا بالسترۃ وعلیہ الاعتماد وفی غایۃ البیان وہو الصحیح وفی فتح القدیر وہو المختار، اس میں تصریح ہے کہ صحیح اور معتمد قول یہ ہے کہ ایک ذراع بلندی مکروہ ہے، اس پر اعتماد ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں ولکن قال رای صاحب الفتح ۱۲) الاوجہ الاطلاق وہو ما یقع بہ الامتیاز لان الموجب وہو شبہ الازدراء یتحقق فیہ غیر مقتصر علی قدر الذراع اھ یعنی صاحب فتح نے کہا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ذراع کی قید نہ لگائی جائے، بلکہ اطلاق پر رکھا جاوے کہ جتنی بلندی سے امتیاز حاصل ہو وہ مکروہ ہے، سو اوّلاً یہ صاحب فتح کی رائے ہے روایت نہیں ہے، دوسرے ان کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ذرا سی بلندی بھی مکروہ ہے، کیونکہ وہ اگر ذراع کی قید نہیں لگاتے تو یہ قید ضرور بڑھاتے ہیں کہ جتنی بلندی سے امام کو امتیاز ہو جائے، وہ مکروہ ہے، اس سے کم مکروہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک دو اُنگل

بلندی سے امام کو امتیاز حاصل نہیں ہوتا، دوسرے اگر ذراسی بلندی بھی مکروہ ہوجاوے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مسجدوں کا فرش آلات سے جانچ کر لگانا ضروری ہو کیونکہ جب بدون آلات سے دیکھے کیف ما اتفق فرش لگایا جاوے گا تو ایک دو انگل کسی جگہ سے اونچا ہوجانا ضرور ممکن ہے حالانکہ زمانۂ قدیم میں اس طرح آلات سے فرش کی برابری نہیں دیکھی جاتی تھی، اور نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے، حدیث کا مطلب تشبہ اہلِ کتاب سے روکنا ہے، اور وہ لوگ امام کے لئے خاص طور پر اونچی جگہ ممتاز بناتے تھے، ایک دو انگل بلندی سے ان کا تشبہ لازم نہیں آتا، رہا محراب میں کھڑا ہونا وہ اُس وقت مکروہ ہے جبکہ امام پورا محراب میں ہو اور اگر قدم باہر ہوں اور سجدہ محراب میں ہو یہ جائز ہے، قال الشرنبلالی فی نور الایضاح ویکرہ قیام الامام بجملتہ فی المحراب لاقیامہ خارجہ وسجودہ فیہ (ص ٢١١) واللہ اعلم قال الشامی وفی التتارخانیۃ ویکرہ ان یقوم فی غیر المحراب الا لضرورۃ اھ ومقتضاہ ان الامام لو ترک المحراب وقام فی غیرہ یکرہ ولو کان قیامہ فی وسط الصف لانہ خلاف عمل الامۃ وھو ظاھر فی الامام الراتب دون غیرہ والمنفرد اھ، واللہ اعلم، ۲ر جمادی الثانیہ سنہ ١٣٤٢ھ

| غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم | سوال (٧)- |
|---|---|

.......... غیر مقلدین کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے، آیا بطریق اکمل واحسن نماز ادا ہوجاتی ہے یا کسی قسم کی خرابی لازم آتی ہے؟

**الجواب**: غیر مقلد اگر ائمہ اربعہ کو بُرا نہ کہتا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے بشرطیکہ طہارت وغیرہ میں مواقع خلاف کا مراعی ہو، واللہ اعلم، ۳ر شوال سنہ ۴۲ھ

| امامت کی فضیلت کا ثبوت | سوال (٨) |
|---|---|

زید کہتا ہے کہ امامت کا ثواب کہیں قرآن وحدیث یا فقہ کی کتابوں سے ثابت نہیں، اسی وجہ سے میں امامت نہیں کرتا، تو کیا واقعی کسی حدیث میں امامت کے ثواب کا کوئی درجہ ہے، اگر ہو تو استدلالاً احدیث صحیح سے جواب عطا فرمایا جاوے۔

**الجواب**: فضیلتِ امامت میں حسب ذیل احادیث وارد ہیں جو اس وقت میری نظر سے گذری ہے، عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من أم قوما فلیتق اللہ ولیعلم انہ ضامن مسئول



لما ضمن وان احسن کان لہ من الاجر مثل اجر من صلی خلفہ من غیر ان ینقص من اجورھم شیئا وما کان من نقص فھو علیہ رواہ الطبرانی فی الاوسط من روایۃ معارک بن عباد قلت وھو حسن علی قاعدۃ المنذری کما لا یخفی وعن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلثۃ علی کثبان المسک اراہ قال یوم القیمۃ عبد ادی حق اللہ وحق موالیہ ورجل أم قوما وھم بہ راضون ورجل ینادی بالصلوٰت الخمس فی کل یوم ولیلۃ رواہ احمد والترمذی وقال حدیث حسن ورواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط باسناد لا بأس بہ ولفظہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ لا یھولھم الفزع الاکبر ولا ینالھم الحساب ھم علی کثیب من مسک حتی یفرغ من حساب الخلائق رجل قرأ القراٰن ابتغاء وجہ اللہ وأم بہ قوما وھم بہ راضون الحدیث کذا فی الترغیب للمنذری، ص ٨، ج ١،

ان احادیث سے امامت کی حسب ذیل فضیلتیں ثابت ہوئیں، بشرطیکہ امام شرائطِ صلوٰۃ کی پوری رعایت کرے، (١) جتنے آدمی اس کے پیچھے ہوتے ہیں ان سب کی نمازوں کے برابر اس کو بھی ثواب ملتا ہے اور اس کی نماز کا ثواب علیحدہ ہے، (٢) قیامت کی گھبراہٹ سے مامون رہے گا (٣) حساب کتاب سے محفوظ رہے گا (٤) مشک کے ٹیلوں پر قیامت میں بے فکر بیٹھا رہے گا، یہاں تک کہ مخلوق حساب سے فارغ ہو، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ امامت اذان سے افضل ہے، کیونکہ امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حق ادا کرتا ہے، شوال سنہ ۴۲ھ

| اگر نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہو تو مجذوم کا گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے، اور اسے جماعت کا ثواب ملیگا | سوال (٩).......... |
|---|---|

.......... ایک آدمی کو عارضہ جذام کا ہوگیا ہے، مگر جسم مجذوم کا بالکل سلامت ہے: کسی عضو میں فرق نہیں ہے، اور ہر کس وناکس سے ملتا رہتا ہے، اور ہر مقام پر آتا جاتا ہے، مثلاً مسجد وخانقاہ، مجلس ومحفل وغیرہ اور وہ آدمی نماز جماعت کا شوقین اور پابند ہے، لیکن بعض آدمی اس سے نفرت کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ نماز جماعت میں شامل ہوگا تو میں نماز میں مسجد میں نہ پڑھوں گا مگر اکثر لوگ ملتے جلتے ہیں اور نماز باجماعت اس کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور اس کی مجالست ومخالطت رکھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ مرض خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے جس کو چاہے

دیدیوے، اور مجذوم کہتا ہے کہ قرآن وحدیث سے علماء منع فرمادیں تو میں اپنے مکان پر نماز جماعت ترک کر کے پڑھ لیا کروں، لہذا مسلمانوں کی رائے سے یہ استفتاء ارسال خدمت والا ہے، کہ بحوالۂ کتب معتبرہ کے ارشاد فرمادیں تاکہ مسلمانان اس کے مطابق عمل کریں، یعنی اس بیچارے جذامی کو ساتھ لے کر نماز پڑھیں یا پرہیز کریں؟

**الجواب:** جب مجذوم سے نمازیوں کو ایذاء ہوتی ہے تو اس کو نماز اپنے گھر پڑھنا چاہئے، جماعت یا جمعہ وغیر وغیرہ میں شریک نہ ہونا چاہئے، اس کو گھر پر نماز پڑھنے میں بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جبکہ وہ جماعت کا شوق دل میں رکھتا ہے، فی الفتاوی الشامیہ وکذلک الحق بعضھم بذلک من بفیہ بخر او بہ جرح لہ رائحۃ وکذلک القصاب والسماک والمجذوم والابرص اولی بالالحاق وقال سحنون لا اری الجمعۃ علیھما الی ان قال وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیقعد فی بیتہ صریح فی ان اکل ھذہ الاشیاء (مثل الثوم والبصل اذا کان عن ضرورۃ) عذر فی التخلف عن الجماعۃ وایضا ھنا علتان اذی المسلمین واذی الملائکۃ فبالنظر الی الاولی یعذر فی ترک الجماعۃ وحضور المسجد الخ ص۶۹۲ ج۱،

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ،

| بیٹھ کر نماز پڑھانیوالے امام کے پیچھے نماز کا حکم، |
|---|

**سوال (۱۰)** ایک صاحب بعمر ۱۸ سال سے لڑکے اور لڑکیاں پڑھاتے رہے، اور مسجد میں پیش امام بھی رہے ہیں، اور اب انکی عمر ۸۵ سال ہے، یا زیادہ کی ہوگی، اور پھر یہ امر ربی ہوا کہ ۴، ۳ سال قحط جو ہوا بسبب تنگی گھاس درخت سے گر کر ضرب شدید ٹانگوں میں ہوگئی، اور ہڈی وغیرہ میں کچھ ضرب نہیں ہوئی، اور پھر وہ ہی اپنا کام بیٹھ کر کرتے رہے، اور نماز باقاعدہ پڑھا رہے ہیں، کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ ان کے مقتدیوں کی نماز میں کچھ فرق تو نہیں پڑتا، ....... بسبب ناطاقتی کے بیٹھ کر پڑھاتے ہیں،

**الجواب:** اگر یہ شخص بوجہ عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھاتا ہے اور رکوع وسجدہ بجالاتا ہے، یعنی رکوع وسجدہ کے لئے محض اشارہ نہیں کرتا، بلکہ جس طرح تندرست آدمی بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے ہیں کہ رکوع کے لئے گھٹنوں کے مقابل سر جھکاتے ہیں، اور سجدہ کے لئے زمین پر سر ٹیکتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتا ہے تو مقتدیوں کی نماز



صحیح ہے، مگر اس صورت میں بھی احتیاط یہی ہے کہ امام ایسا آدمی ہو جو کھڑا ہو کر قیام اور رکوع بجالاوے، اور اگر یہ شخص سجدے کے لئے زمین پر سر نہیں ٹیک سکتا بلکہ اشارہ سے سجدہ کرتا ہے تو مقتدیوں کی نماز درست نہ ہوگی، قال فی نور الایضاح وصح اقتداء قائم بقاعد اھ قال الطحطاوی ای یرکع ویسجد وہذا عندہما خلافا لمحمد وقولہا احوط کما فی البرہان وغیرہ اھ ص ۱۷۲، واللہ اعلم ۶ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

| احق بالامامت کو مقدم کرنا سنت مؤکدہ ہے یا مستحب اور غیر احق کو مقدم کرنے کا حکم، |
|---|

**سوال (۱۱)** باب الامامۃ میں جو احق بالامامت الاعلم باحکام الصلوٰۃ مذکور ہے، تو باب اول کتب فقہ کی ترتیب کا ملحوظ رکھنا از قبیلۂ مندوبات ہے یا سنتِ مؤکدہ ہے، بہشتی زیور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت ہے، مسئلہ: اجارہ علی الطاعات متقدمین کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ متاخرین بعض طاعات میں بضرورت اس کے جواز کے قائل ہیں، پس امامت کے لئے کسی کو اجرہ پر مقرر کرنا بے ضرورت جائز ہے یا نہیں یعنی فی زمانہ جو متولیان ومنتظمان کی مساجد کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ وہ کسی حافظ وغیرہ کو اجرت پر امام مقرر کرتے ہیں اور قوم میں بعضہم فوق بعض عالم، فاضل، قاری موجود ہوتے ہیں، ان سے اس بارے میں کچھ مشورہ نہیں کیا جاتا، اور مقتدیوں میں سے جو پنجگانہ نماز میں حاضر رہتے ہیں اور بہت سے ان میں احق بالامامۃ ہوتے ہیں ان سے نہیں کہا جاتا کہ تم میں جو احق بالامامۃ ہو وہ کارِ امامۃ اپنے ذمہ لے، بلکہ محض اپنی رائے سے جو مناسب اجرہ پر کوئی معمولی شخص دستیاب ہوگیا کہ نہ وہ ذی علم ہوتا ہے نہ صحت کے ساتھ مثل قاریوں کے قرآن شریف پڑھ سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ محض حافظ ہوتا ہے اور اس کو امام مقرر کردیتے ہیں، پھر بسا اوقات اُن لوگوں کو جو احق بالامامت ہوتے ہیں ان کو اس شخص کی اقتداء میں گوناگوں وجوہ سے ضیق واقع ہوتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اگر نماز پڑھانا ہمارے متعلق ہوجاوے تو ہم اس کو بطیب خاطر گوارہ کرلیں اور ہمیں تنخواہ وغیرہ سے کچھ غرض نہیں، لیکن متولیان ومنتظمان مساجد اس طرف توجہ نہیں کرتے، تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر قوم میں عالم فاضل افضل لوگ موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں متولیانِ مساجد کو بلا مرضی ان کی کے کسی غیر احق کو امام مقرر کرنا جائز ہے اور موافق سنت ہے یا نہیں اور متولیانِ مساجد کو اور قوم کو ایسا حق حاصل ہے یا نہیں؟ کہ وہ بموجودگی احق بالامامۃ کے

غیر کو بلا مرضی و استمزاج احق بالامامت امام مقرر کر سکیں، اور اگر قوم یا متولیانِ مساجد کسی غیر احق کو مقدم کریں تو احق اور افضل کو حقِ منع حاصل ہے یا نہیں، باب الجنائز در مختار میں مذکور ہے ثم الولی بترتیب عصوبة الانکاح الا الاب فیقدم علی الابن اتفاقا، قال الشامی قوله فیقدم علی الابن اتفاقا الخ هو الاصح لان للاب فضیلة علیه وزیادة سن والفضیلة والزیادة تعتبر ترجیحا فی استحقاق الامامة کما فی سائر الصلوٰة، بحر عن البدائع، بعد ازاں در مختار میں یہ مذکور ہے وله ای للولی و مثله کل من یقدم من باب اولی الاذن لغیره فیها لانه حقه فیملک ابطاله الا انه ان کان هناک من یساویه فله ای لذلک المساوی ولو اصغر سنا المنع لمشارکته فی الحق، شامی لکھتے ہیں فلو کان شقیقین فالاسن اولی لکنه لو قدم احدا فللاصغر منعه ولو قدم کل منهما واحدا فمن قدمه الاسن اولی، بحر، پس جب کہ ان عبارات سے یہ معلوم ہو گیا کہ باب اولیٰ کا حکم باب الامامة اور باب الجنائز میں برابر ہے، از روئے استحقاق کے تو اس سے ظاہر تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ متولیانِ مساجد اور قوم اگر کسی غیر اولیٰ کو بموجودگی اولیٰ امام بنا دیں تو اولیٰ شخص کو حقِ منع حاصل ہے، اور کتبِ فقہ میں جو اجرہ علی الطاعات متاخرین کے نزدیک مجوز ہے وہ بشرطِ ضرورت ہے، چنانچہ یہ امر مصرح ہے کہ اہداء ثواب کے لئے قراءة قرآن اجرہ پر ناجائز قرار دیا گیا ہے، بوجہ اس کے کہ اس کو ایک امر غیر ضروری مانا ہے، نیز کتاب الفرائض باب الرد میں یہ امر مصرح ہے کہ رد علی الزوجین بموجودگی دیگر ورثاء ناجائز ہے، البتہ اگر ماسوا زوجین کے کوئی اور وارث نہ ہو تو ان پر رد صحیح ہے، پس یہ صورتیں مقتضی اس امر کی ہیں کہ بے ضرورت اجرہ پر امام مقرر کرنا بھی ناجائز ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ بموجودگی اولیٰ و افضل غیر اولیٰ کو ہمیشہ کے لئے امام مقرر کیا جاوے، بینوا توجروا؟

الجواب: قال فی الدر والاحق بالامامة تقدیما بل نصبا مجمع الانهر الاعلم باحکام الصلوٰة اه قال الشامی قوله تقدیما ای علی من حضر معه قوله بل نصبا ای للامام الراتب وفی الدر ایضا ولو قدموا غیر الاولیٰ اساءوا بلا اثم وفی رد المحتار قال فی التتارخانیة ولو ان رجلین فی الفقه والصلاح سواء الا ان احدهما اقرأ فقدم القوم الآخر فقد اساءوا وترکوا السنة ولکن



لا یاثمون لانهم قدموا رجلا صالحا وکذا الحکم فی الامامة والحکومة اما الخلافة وهی الامامة الکبریٰ فلا یجوز ان یترکوا الافضل وعلیه اجماع الامة اه فافهم وفی الدر ایضا واعلم ان صاحب البیت ومثله امام المسجد الراتب اولیٰ بالامامة من غیره مطلقا وقال الشامی ای ان کان غیره من الحاضرین من هو اعلم واقرأ منه الخ (ص ۵۸۳ ج ۱) وفی الدر ایضا وکذا تکره خلف امرد الی ان قال ومن ام باجرة، قال الشامی بان استوجر لیصلی اماما سنة او شهرا بکذا ولیس منه ما شرطه الواقف علیه فانه صدقة ومعونة له رحمتی ای یشبه الصدقة ویشبه الاجرة کما سیاتی ان شاء الله تعالیٰ فی الوقف علی ان المفتی به مذهب المتاخرین من جواز الاستیجار علی تعلیم القرآن والامامة والاذان للضرورة اه (ص ۵۸۷ ج ۱) وفی الدر ایضا طالب التولیة لا یولی الا المشروط له النظر لانه مولی فیرید التنفیذ وفیه ایضا ثم اذا مات المشروط له بعد موت الواقف ولم یوص لاحد فولایة النصب للقاضی اذ لا ولایة لمستحق الا بتولیة اه (ج ۳، ص ۶۳۵ و ۶۳۶) وفی رد المحتار وفی البیری عن حاوی الحصیری عن وقف الانصاری فان لم یکن من یتولی من جیران الواقف وقرابته الا برزق و یفعل واحد من غیرهم بلا رزق فذلک الی القاضی ینظر فیما هو الاصلح لاهل الوقف اه وفیه ایضا من الاشباه اذا ولی السلطان مدرسا لیس باهل لم تصح تولیته لان فعله مقید بالمصلحة خصوصا ان کان المقرر عن مدرس اهل فان الاهل لم ینعزل وصرح البزازی فی الصلح بان السلطان اذا اعطی غیر المستحق فقد ظلم مرتین بمنع المستحق واعطاء غیر المستحق اه (ص ۵۹۰ ج ۳)

ان عبارتوں سے امور ذیل مستفاد ہوئے (۱) سنت یہ ہے کہ احق بالامامة کو امام مقرر کیا جاوے، (۲) اگر متولیانِ مسجد غیر احق کو مقرر کریں تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر وہ امامت کا اہل بھی نہیں، مثلاً مسائلِ صلوٰة سے جاہل ہے، یا قرآن قدر صلوٰة جواز پڑھنے سے عاجز ہے یا فاسق ہے، تب تو متولیوں کے امام بنانے سے وہ امام ہی نہ ہوگا، اور اگر متولی اس کو تنخواہ مسجد کی آمدنی سے دیں گے تو ظالم و گنہگار ہوں گے، اور اگر

اہل ہے گو احق نہ ہو تو اس کا امام مقرر کرنا خلاف سنت ہے مگر متولیان کو گناہ نہ ہوگا، (۳) جب کوئی شخص امام راتب مقرر ہو جائے بشرطیکہ وہ نا اہل نہ ہو تو پھر وہی احق بالامامت ہے گو اس کے پیچھے اس سے افضل و اکمل موجود ہوں، (۴) مستحق امامت کو قبل از تقرر بوجہ اپنے علم و فضل وغیرہ کے کسی امام کو امامت سے روکنے کا حق نہیں (۵) جو شخص خود امام بننا چاہتا ہو وہ امامت کا مستحق نہیں، گو کیسا ہی افضل ہو، ہاں اگر اس کے سوا اور کوئی اہل نہ ہو تو وہی مستحق ہے، یا وہ بلا تنخواہ امامت پر راضی ہو اور دوسرے تنخواہ کے بغیر راضی نہیں تو متولیان کو وقف کی مصلحت پر نظر کرنا چاہئے، اور جو مناسب ہو اس کو امام مقرر کرنا چاہئے، اگر بلا تنخواہ امامت کرنے والا ویسے ہی پابندی کر سکے جتنی تنخواہ والا کرتا ہے، اور وہ احق بالامامت بھی ہو اور اکثر نمازی اس کو پسند بھی کرتے ہوں، تو تنخواہ دار کا ایسی حالت میں رکھنا وقف کی مصلحت کے خلاف ہے (۶) اگر واقف نے وقف مسجد میں امام کی تنخواہ مشروط کر دی ہو تو وہ اجرت نہیں بلکہ وہ اعانت و امداد ہے، جو اتفاقاً جائز ہے، اور مشروط نہ کی ہو تو وہ اجرت ہے جو متأخرین کے نزدیک جائز ہے، واللہ اعلم، ۲۲ صفر سنہ ۴۱ھ

امامت کے لئے عمامہ باندھنا

سوال (۱۲)........................ آیا عمامہ باندھنا فعل رسول اللہ ہے، اور ہمیشہ یا گاہ بگاہ، کیا آپ ہمیشہ نماز عمامہ سے پڑھاتے تھے، یا کبھی بلا عمامہ بھی نماز پڑھایا ہے، اگر کوئی پیش امام کبھی بلا عمامہ نماز پڑھاوے تو وہ تارکِ سنت کہا جائے گا، یا اس کا ثواب کم ہو جائے گا یا کیا بحوالہ کتب احادیث صحیحہ ارشاد فرمائے گا، اور شرح سفر السعادت بمقابلہ کتب احادیث صحیحہ کیا مرتبہ رکھتی ہے، بینوا توجروا،

الجواب: عمامہ باندھنا نماز اور غیر حالتِ نماز دونوں میں سنت ہے، امام کے لئے بھی اور مقتدی کے لئے بھی، لیکن بدون عمامہ کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز میں کچھ کراہت نہیں ہوتی، بلکہ جہاں عمامہ کو نماز کے لئے لوگ ضروری سمجھتے ہوں وہاں امام کو اصلاح عقیدۂ عوام کے لئے گاہے گاہے عمامہ کا ترک کر دینا افضل ہوگا قال العلامة المحدث عبد الرؤف المناوی فی شرح الشمائل للترمذی مانصه والعمامة سنة لاسيما للصلوٰة وبقصد التجمل لاخبار كثيرة فيها واشتداد ضعف كثير فيها يجبره كثرة طرقها وزعم وضع اكثرها



تساهل وتحصل السنة بكونها على الرأس او القلنسوة تحتها الى ان قال ولابأس بلبس القلنسوة اللاصقة بالرأس والمرتفعة المضربة وغيرها تحت العمامة وبلا عمامة لان ذلك كله جاء عن المصطفى صلى الله عليه وسلم وبذلك اين بعضهم ما اعتيد فى بعض الاقطار من ترك العمامة من اصلها وتمييز علمائهم بطيلسان على قلنسوة بيضاء ولكن الافضل العمامة اه وقال العلامة القارى فى شرح الشمائل ايضا ولابى داؤد والمصنف فرق مابيننا وبين المشركين العمائم على القلانس قال المصنف غريب وليس اسناده بالقائم اه ص ۱۲۵ و ۱۲۶ ج ۱، وفى زاد المعاد لابن القيم وكانت له صلى الله عليه وسلم عمامة تسمى السحاب كساها عليا وكان يلبسها ويلبس تحتها القلنسوة وكان يلبس القلنسوة بغير عمامة ويلبس العمامة بغير قلنسوة وكان اذا اعتم ارخى عمامته بين كتفيه اه ص ۳۴ ج ۱، قلت وهذا عام للصلوٰة ولغيرها، والله اعلم، ۱۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۱ھ

امام اعظمؒ کو برا بھلا کہنے والے کے پیچھے نماز کا حکم،

سوال (۱۳) بعد تھوڑے عرصہ کے جناب حافظ صاحب مسجد میں نماز مغرب کے قبل تشریف لاکر مصلیوں سے کہنے لگے کہ دیکھئے دیکھئے صاحبو اس کتاب نام لامعلوم میں لکھا ہے، کیا لکھا ہے مسئلہ مردود امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک زنا کی خرچی حلال عینی کی شرح میں موجود ہے، بس مصلیوں میں سے ایک شخص بول اٹھا کہ جناب حافظ صاحب آپ شاید امام صاحب کے حالات سے واقف نہیں، امام صاحب وہی ہیں کہ ایک وضو سے چالیس برس تک نماز فجر کی پڑھی، تو حافظ صاحب نے جواب دیا کہ امام صاحب نے بدعت کیا، تو اسی مصلی نے کہا کہ ادنماز یو دیکھو اعتقاد حافظ صاحب کا معلوم ہو گیا اور ان کے پیچھے نماز ہرگز نہ ہوگی، کیونکہ اس روز ملا ابو حنیفہ کو بدوڑی بنایا، اور آج امام صاحب کو زنا کی تہمت لگایا اور بدعتی بنایا، افسوس: جناب حافظ صاحب آپ اگر جماعت مسلمان علم والوں میں ہوتے تو اس گفتگو پر جماعت سے گوشمالی دے کر نکال دیئے جاتے اور امام بننے کے لائق نہ رہتے، اور دیکھو بھائیو میں اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا، اور اگر جماعت ہوتی رہے گی تو دارکعوا مع الراکعین کے خیال سے جماعت میں شریک ہو کر نماز اپنی دُہراؤں گا، چونکہ حافظ صاحب اس محلہ کے امام ہیں، خلاصہ

یہ ہے کہ اظہارِ حق ہو اس شخص کا کلام ارقام سے باہر ہے، ایسے کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں، اور ایسے اعتقاد والے کو کیا کہنا چاہئے، صاف صاف مدلل تحریر ہو؟

**الجواب**: جس نے امام اعظم کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کئے وہ خود مردود ہے، اس کے پیچھے نماز درست نہیں، مسلمانوں کو کوئی اور امام صالح حنفی متقی تلاش کرنا چاہئے، واللہ اعلم ۴ ر رجب ۴۱ھ

امام اگر ایک سجدہ کرکے بیٹھ جائے الخ

**سوال (۱۴)** امام نے دوسری رکعت میں ایک سجدہ کرکے بیٹھ گیا تو اب لقمہ کس طرح دیوے، کہ امام کو معلوم ہوجاوے کہ میں دوسرا سجدہ بھول گیا،

**الجواب**: جب امام ایک سجدہ کرکے بیٹھ جاوے تو مقتدی سبحان اللہ کہدیں اس سے امام کو یاد آجاوے گا کہ مجھ سے کچھ رہ گیا ہے،

صفوں کا قبلہ کی جانب سے ٹیڑھا بچھانا

**سوال (۱۵)** مسجد کا پیش امام مسجد میں صفیں غیر رُخ بچھاتا ہے اگر کوئی مقتدی صف کو درست کرتا ہے تو خفا ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ صفیں درست ہیں، مگر صفیں بالکل ٹیڑھی ہوتی ہیں جس کا خاکہ یہ ہے [قبلہ صحیح — صف مسجد] اس حالت میں نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی،

**الجواب**: صورتِ مذکورہ میں نماز تو سب کی ہوجاتی ہے، مگر امام کا بلاوجہ صفیں ٹیڑھی بچھانا اور اس پر اصرار کرنا موجب نقصانِ صلوٰۃ ہے، اور باعث تشویش قوم لہٰذا اس کو اس لغو حرکت سے احتراز کرنا چاہئے، قال فی الخلاصۃ فی القبلۃ المختار انہ ینظر الی غروب الشمس فی اقصر یوم فی الشتاء، والی الغروب فی اطول یوم فی الصیف فیجعل ثلثی ذلک عن یمینہ والثلث عن یسارہ ویصلی فیما بین ذلک، ص ۷، ج ۱، ۲۲ ر رمضان ۴۱ھ

اعرج کے لئے صف اول میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے،

**سوال (۱۶)** لنگڑا آدمی جو کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھ سکتا، وہ بیٹھ کر اپنی نماز پڑھتا ہے، اس کو جماعت میں صف اول میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**؛ جائز ہے، واللہ اعلم ۱۱ ر شعبان ۴۲ھ

دو منزلہ مسجد میں اوپر نیچے ایک جماعت کرنے کا حکم،

**سوال (۱۷)** دو منزلہ مسجدوں میں امام کے سامنے اوپر کو کھلا ہونا جیسا کہ دیکھا جاتا ہے ضروری ہے یا بغیر اس کے بھی بیک



جماعت دونوں منزلوں میں نماز جائز ہے؟

**الجواب**؛ جب مسجد کی منزل اسفل نمازیوں سے بھر جاوے تو اوپر کی منزل میں کھڑے ہوکر مقتدی جماعت میں شریک کرسکتے ہیں بشرطیکہ امام سے آگے نہ بڑھیں، اور امام کے افعال کی اطلاع ہوتی رہے، امام کے سامنے اوپر کا حصہ کھلا ہونا شرط نہیں، البتہ اس سے اطلاع احوالِ امام میں سہولت ہوتی ہے، واللہ اعلم، ۲۴ ر شعبان ۴۲ھ

طاق اور محراب میں امام کا کھڑا ہونا

**سوال (۱۸)** مسجد کی کمانوں میں اور مسجد کے دونوں ستونوں کے درمیان میں امام کو کھڑا ہوکر نماز پڑھانا جائز ہے یا نہ، اگر امام کمان سے ذرا ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے کی صف والے کو سجدہ کی جگہ نہیں رہتی، لہٰذا امام عین کمان میں کھڑے ہوکر نماز پڑھاتے ہیں، فقط بینوا توجروا،

**الجواب**، کمانوں اور ستونوں میں بتمامہ امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے، لیکن اگر جگہ تنگ ہو تو کراہت باقی نہ رہے گی، قال فی مراقی الفلاح ویکرہ قیام الامام بجملتہ فی المحراب لا قیامہ خارجہ وسجودہ فیہ والکراہۃ لاشتباہ الحال علی القوم واذا ضاق المکان فلا کراہۃ اھ (ص ۲۱۱) ۲۵ ر شعبان ۴۲ھ

بیٹھ کر امامت کرانے والے اعرج کے پیچھے نماز کا حکم

**سوال (۱۹)** قصبہ مرادنگر میں ایک مسجد کے پیش امام پیشتر بھی اپنی ٹانگوں سے مجبوری کی حالت میں تھا، لیکن وقتی اور جمعہ کی نماز کھڑے ہوکر بدقت تمام ادا کرتا تھا، اب معذوری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا، اور بیٹھ کر وقتی اور جمعہ کی نمازوں کی امامت ادا کرتا ہے، ایسی حالت میں نماز جمعہ خصوصاً اور وقتی نماز عموماً اس کے پیچھے جائز ہیں یا نہیں، جواب سے مشرح طور پر آگاہی بخشی جاوے؛

**الجواب**؛ قال فی الدر ویکرہ تنزیہا خلف امرد وسفیہ ومفلوج وابرص شاع برصہ اھ قال الشامی وکذلک اعرج یقوم ببعض قدمہ فالاقتداء بغیرہ اولی والظاہر ان العلۃ النفرۃ ولذا قید الابرص بالشیوع لیکون ظاہرا ولعدم امکان اکمال الطہارۃ ایضا فی المفلوج وغیرہ اھ (ص ۵۸۷، ج ۱ ملخصا) صورت مسئولہ میں اگر امام مذکور کے برابر یا اس سے زیادہ علم وقرات والا کوئی دوسرا امام مل سکے تو اس کی اقتداء افضل ہے، اور اس صورت میں امام اعرج کی اقتداء

مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی اس جیسا نہ مل سکے تو اسی امام کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوگی
واللہ اعلم۔ ۱۹ ذیقعدہ ۴۲ھ

**امام کے بدعتی ہونے پر مسجد کی جماعت ترک کرنے اور گھر میں جماعت کرنے کا حکم،**

**سوال** (۲۰) واضح ضمیر منیر ہو کہ کسی جگہ میں بعض اشخاص نے تمام بدعات مروجہ فی زماننا کو اعتصاما بالکتاب والسنۃ دفعۃً چھوڑ دیا، اور اپنی اموات وغیرہ میں کتبِ فقہ کی ہدایات کے مطابق عامل بن گئے، اور کسی کے بُرا بھلا کہنے کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، اور فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کو پسند کیا، تو مبتدع امام کا مسئلہ معلوم کرنے پر اُن کو خیال ہوا کہ ہم اہلِ سنت بدعتیوں کے پیچھے کیوں پڑھیں، ہم اپنی جماعت الگ قائم کر سکتے ہیں، اور چونکہ ہماری جماعت کے آدمی بیس پچیس کی تعداد سے متجاوز ہیں، مگر باوجود این ہمہ مساجد کے اماموں کو بسبب مبتدعین کے غلبہ کے معزول و برطرف نہیں کر سکتے، اب یا تو تارکِ جماعت ہو کر فرادی فرادی نمازیں مسجدوں میں پڑھا کریں، یا کسی مکان مثل گھیرلہ وغیرہ کے محلہ میں اپنی جماعت کے لوگوں کو جمع کر کے بجماعت اپنی نمازیں پڑھا کریں، پس اُن لوگوں نے اس صورت ثانی کو اختیار کر کے محلہ کی مسجد کے قریب ایک وسیع گھیرلہ میں اپنی جماعت قائم کرلی ہے، تو کیا یہ جماعت قائم کرلینا ان کا جائز بلا کراہت کے ہوگا یا مکروہ ہے، کیونکہ مسجد میں نماز پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ فرادی فرادی پڑھیں، اس میں تو ہمیشہ کے لئے تارکِ جماعت بنتے ہیں، اور مبتدع کے پیچھے مکروہ ہے، اور وہاں یعنی اس گھیرلہ میں اپنی جماعت مستقل ہوتی ہے، چونکہ مسجد میں فتنہ و فساد کے عذر سے جماعت نہیں قائم کر سکتے، اور اس مکان میں کوئی مانع نہیں ہے، تو یہ مذکور لوگ تمام یا اکثر اپنی جماعت جو کرتے ہیں اس میں ان کا یہ عذر شرعی عذر ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیا ان کی نماز بسبب اس عذر کے مسجد کے جماعت کے برابر فضیلت رکھے گی یا نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کے باب الجہاد میں یہ حدیث ہے کہ اذا مرض العبد او سافر کتب لہ مثل ماکان یعمل مقیما صحیحا، اس سے تو فضیلت مسجد کے برابر ہی سمجھی جاتی ہے، اور ہدایہ کی اس حدیث (صلوٰۃ القاعد علی النصف من صلوٰۃ القائم) کے تحت میں صاحب کفایہ لکھتے ہیں وصلوٰۃ المعذور لیست علی النصف بل ہو مثل صلوٰۃ القائم، اور اس سے عذر کو پورا دخل معلوم ہوتا ہے، اور اسی بنا پر وہ لوگ اپنی جماعت اُس گھیرلہ میں قائم کرتے ہیں، پس جواب مفتیٰ بہ ہو اس سے مطلع فرمائیں،



**الجواب**؛ قال فی البحر وذکر فی غایۃ البیان معزیا الی الاجناس ان تارک الجماعۃ یستوجب اساءۃ ولا تقبل شہادتہ اذا ترکہا استخفافا بذلک ومجانۃ اما اذا ترکہا سہوا او ترکہا بتاویل بان یکون الامام من اہل الاہواء او مخالفا لمذہب المقتدی لایراعی مذہبہ فلا یستوجب الاساءۃ وتقبل شہادتہ اھ (ص ۳۴۵ ج ۱) وفیہ ایضا وذکر الشارح وغیرہ ان الفاسق اذا تعذر منعہ یصلی الجمعۃ خلفہ وفی غیرہا ینتقل الی مسجد آخر وعلل لہ فی المعراج بان فی غیر الجمعۃ یجد اماما غیرہ فقال فی فتح القدیر وعلی ہذا فیکرہ الاقتداء بہ فی الجمعۃ اذا تعددت اقامتہا فی المصر علی قول محمدؒ وہو المفتی بہ لانہ بسبیل من التحول حینئذ اھ (ص ۳۴۹ ج ۱) وفی تعلیق البحر لابن عابدین عن القنیۃ اختلف العلماء فی اقامتہا فی البیت والاصح انہا کاقامتہا فی المسجد الا فی الفضیلۃ وہو ظاہر مذہب الشافعی اھ (ص ۳۴۵ ج ۱) عبارت اولیٰ سے بدعتِ امام مسقط جماعت معلوم ہوتا ہے، اور عبارتِ ثانیہ سے وجوب تحول بجانب امامِ دیگر مفہوم ہوتا ہے اور عبارت ثالثہ سے جماعتِ خانہ کا حکم مثل جماعتِ مسجد معلوم ہوتا ہے، صرف فضیلت کا فرق ہے، پس اگر عذر بدعتِ امام کی وجہ سے گھر میں جماعت اہلِ سنت کے ساتھ نماز پڑھی جاوے تو عباراتِ مذکورہ سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، رہا یہ کہ اس صورت میں جماعت بیت سے مسجد کی فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ مراقی الفلاح میں کہا ہے واذا انقطع عن الجماعۃ لعذر من اعذارہا المبیحۃ للتخلف وکانت نیتہ حضورہا لولا العذر الحاصل یحصل لہ ثوابہا لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی اھ (ص ۱۷۴) اور اوپر بدعتِ امام کا عذر ہونا معلوم ہو چکا ہے، ان مقدمات سے مستنبط ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں مسجد کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے گی، واللہ اعلم، لیکن اس پر خدشہ یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے حجاج وغیرہ کے پیچھے جماعت ترک نہیں کی، حالانکہ وہ بھی اپنے کسی گھر میں الگ جماعت کر سکتے تھے، اگر یہ افضل ہوتا تو صحابہ ضرور ایسا کرتے، ہاں یہ ممکن ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے تخلف جماعت نہ کیا ہو، فتدبر، ۱۹ ذیقعدہ ۴۲ھ

تجوید سے قرآن مجید پڑھنے والے کی غیر مجوّد کے پیچھے نماز کا حکم،

**سوال (۲۱)** اگر کوئی بڑا عالم نماز میں حا۔ کی جگہ ہا، یا عین کی جگہ الف اور ضاد کو دال پڑھے تو جو کوئی عالم نہیں لیکن قرآن صحیح پڑھتا ہے اس کی اقتدار اس عالم کے ساتھ کرنا جائز ہے یا نہیں، بر تقدیر اوّل پھر نماز کا اعادہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

**الجواب:** اگر یہ عالم اپنی قدرت کے موافق تصحیح حروف میں سعی کر چکا پھر بھی صحیح پڑھنے پر قادر نہیں ہوا یا اس کی زبان میں علت ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح پڑھنے سے معذور ہے، ان دو صورتوں میں صحیح پڑھنے والے کی نماز اس کے پیچھے درست ہو جائے گی، اور اگر اس نے سعی نہیں کی، نہ اس کی زبان میں علت ہے تو اس کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز درست نہیں، اس صورت میں اس نماز کا اعادہ واجب ہے، جو اس کے پیچھے پڑھی گئی ہو، واللہ اعلم۔ ۲۲، ذی الحجہ ۴۲ھ

صحیح خواں کی غلط خواں کے امام کے پیچھے نماز کا حکم،

**سوال (۲۲)** اگر محلہ کی مسجد کا امام قرآت میں ایسی غلطیاں کرتا ہو کہ بجائے معروف صیغوں کے مجہول اور بجائے مجہول کے معروف اور بجائے صاد کے سین پڑھتا ہو تو اس صورت میں وہ شخص جو قرآن صحیح پڑھتے ہوں محلہ کی مسجد کے خیال سے اسی مسجد میں اسی امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا دوسری جگہ؟

**الجواب،** غلط خواں امام کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز بعض صورتوں میں فاسد ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ اگر فساد نہ ہو تو غلط خواں امام کو امامت سے الگ کر کے صحیح خواں امام مقرر کیا جائے، اگر اس میں فتنہ کا احتمال ہو تو صحیح قرآن پڑھنے والے غلط خواں کی اقتدار نہ کریں، بلکہ مسجد محلہ کو چھوڑ کر کسی صحیح خواں امام کی اقتدار کریں، واللہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۴۲ھ

اعرج کی امامت مکروہ کا بیان اور اس کی تفصیل،

**سوال (۲۳)** ............................................................ زید کے عذر کی وجہ سے چلتے وقت بایاں قدم ذرا دبا کر چلتا ہے، اور نماز میں سجدہ اور قعدۂ اولیٰ سے اٹھتے وقت دایاں قدم تقریباً ایک بالشت آگے بڑھ جاتا ہے، ایسے حالت میں شخص مذکور فقہائے حنفیہ کے نزدیک اعرج کے حکم میں داخل ہے یا نہیں، اور درمختار کی عبارت (ولو امّ قوما وہم لہ کارہون ان الکراہۃ لفساد فیہ اولانہم احق بالامامۃ منہ کرہ لہ ذلک تحریما لحدیث ابی داؤدالخ) کی رُو سے کیا شخص مذکور کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی؟ جبکہ شخص مذکور بحالتِ قیام دونوں قدم پر کھڑا ہوتا ہو، اور با ایں ہمہ خود بھی امامت



سے گریز کرتا ہو، معتبر اور صاحبِ فہم اصحاب ان کے اعلم اور اقرء ہونے کی وجہ سے جبراً امام بناتے ہیں، اور یہاں فسادِ خُلقی اور خِلقی دونوں مراد ہیں یا صرف فسادِ خُلقی مثل فسق و فجور وغیرہ کے مراد ہے، اور اگر فسادِ عام مراد ہے تو صورتِ حاضرہ اس میں داخل ہے یا نہیں، اور اگر داخل بھی ہو تو صورتِ واقعہ اس طرح ہونے پر کہ اوّل کسی ذاتی کاوش کی وجہ سے ایک شخص شخصِ مذکور سے ناراض ہو کر اس کی امامت سے مُنہ موڑتا ہے، پانچ چھ روز کے بعد ایک شخص کو اپنا ہم خیال بنا کر مسجد اور جماعت سے علیحدہ کرتا ہے، پھر بعد ایک ماہ کے ایک تیسرے شخص کو مع اس کے اتباع کے مسجد اور جماعت معہود سے علیحدہ کر کے طرح طرح کے فساد برپا کرتا ہے، اور اعرجیت کی صورت کو آڑ بنا کر اس سے اپنے فساد میں امداد لیتا ہے، ایسی حالت میں کیا ان علیحدہ شدہ بعض قوم کی نفرت شرعاً مقبول ہوگی یا نہیں، بحوالہ کتاب بیان فرما کر ثواب دارین حاصل کریں،

**الجواب:** قال فی الدر وکذا تکرہ خلف امرد وسفیہ ومفلوج وابرص شاع برصہ اھ، قال الشامی وکذلک اعرج یقوم ببعض قدمہ فالاقتداء بغیرہ اولی الی ان قال والظاہر ان العلۃ النفرۃ اھ وفی الدر ایضا ہذا ان وجد غیرہم ای من ہو احق بالامامۃ منہم ۱۲ شامی) والا فلا کراہۃ بحر بحثا قال الشامی وقد علمت انہ موافق للمنقول عن الاختیار وغیرہ ۱۲) اھ (ص ۵۸۷ ج ۱)

چونکہ اعرج میں یقوم ببعض قدمہ کی قید لگائی گئی ہے، اور قیود فقہیہ احترازی ہوتی ہیں اس لئے معلوم ہوا کہ جو شخص دونوں پیروں پر بخوبی کھڑا ہوتا ہے وہ اس اعرج میں داخل نہیں جس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، کیونکہ عرج قلیل موجب نفرت نہیں ہوتا، پھر جس اعرج کے پیچھے نماز مکروہ بھی ہے تو کراہت اس وقت ہے جبکہ مقتدیوں میں اس سے افضل موجود ہو اور اگر اس سے علم و قرأت میں افضل کوئی نہ ہو تو اعرج کامل کے پیچھے نماز میں کچھ کراہت نہیں رہتی اور اس حالت میں لوگوں کی نفرت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائے گا، قال فی البحر قید کراہۃ امامۃ الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لایکون افضل القوم فان کان افضل فہو اولی الی ان قال ولعل وجہہ ان تنفر الجماعۃ بتقدیمہ یزول اذا کان افضل من غیرہ بل التنفیر یکون فی تقدیم غیرہ اھ (ص ۵۸۵ ج ۱)

پس بصورت مذکورہ اس اعرج کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہے، اور نفرتِ قوم کا اعتبار

نہیں خصوصاً جبکہ اس نفرت کا منشاء ذاتی عداوت ہو جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے،
ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲۳ ذی الحجہ ۴۲ھ

**اس شخص کی امامت کا حکم جس کی بیوی اعزہ سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہو**

**سوال (۲۴)** بکر ایک امام مسجد ہے، اور ایک چھوٹے موضع کا رہنے والا ہے، اور اکثر بکر کی زوجہ اپنے عزیز و اقارب سے بغرض ملاقات ایک چادر اوڑھ کر چلی جاتی ہے، اور عام طور سے کسی جگہ نہیں آتی جاتی، جیسا کہ عام زمینداران کی مستورات کھیت وغیرہ میں کھلے منہ روٹی وغیرہ لے کر جاتی ہیں اور دن میں بہت کم ادھر ادھر آتی جاتی ہے، بلکہ اکثر رات کو چلی جاتی ہے بکر کی امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** صورت مذکورہ میں بکر کی امامت درست ہے، لیکن یہ لازم ہے کہ بکر اپنی زوجہ کو تاکید کرے کہ جب اعزہ و اقارب سے ملنے جایا کرے تو چادر سے سارا بدن خوب چھپا کر جایا کرے، ۵ ربیع الثانی ۴۵ھ

**عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم**

**سوال (۲۵)** ......................

پردہ نشین لکھی پڑھی عورت نماز عیدین اور نماز جمعہ اپنے گھر میں صرف عورتوں ہی عورتوں کی امام بن کر پڑھا سکتی ہے؟ اگر نماز جمعہ نہیں پڑھا سکتی تو کیا عیدین کی نماز پڑھانے کی اجازت ہے، اور کچھ کراہت تو نہیں؟ اگر باجماعت نہیں تو عیدین میں عورتیں ایک گھر میں جمع ہو کر علیحدہ علیحدہ اپنی دو رکعت پڑھ سکتی ہیں، اور کیا روایات ذیل سے جماعت نساء کی اباحت پر استدلال صحیح ہے! خاص کر عیدین کی جماعت نساء پر، مفصل جواب سے تمام شبہات کو دفع فرماتے ہوئے دستخط خاص سے مزین فرماویں،

روایات یہ ہیں، سنن ابوداؤد میں حدیث طویل میں مروی ہے وکانت ای ام ورقۃ قد قرأت القرآن فاستاذنت النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان تتخذ فی دارہا مؤذنا فاذن لہا وامرہا ان تؤم اہل دارہا،

کتاب الآثار محمد بن الحسن میں ہے اخبرنا ابوحنیفۃ نا حماد عن ابراہیم عن عائشۃ انہا کانت تؤم النساء فی شہر رمضان فتقوم وسطہن،

تخریج رافعی میں ہے اخرج ابن ابی شیبۃ ثم الحاکم من طریق ابن ابی لیلی عن عطاء عن عائشۃ انہا کانت تؤم النساء فتقوم معہن فی الصف،



واخرج الشافعی وابن ابی شیبۃ وعبد الرزاق عن ام سلمۃ انہا کانت امت النساء فقامت وسطہن، اور مستدرک میں یہ ہے ان عائشۃ کانت تؤذن وتقیم وتؤم النساء فتقوم وسطہن، بعض میں مطلق امامت کا ذکر ہے، اور بعضوں میں مقید برمضان، نیز کارہین جماعت ان روایات کا کیا جواب دیتے ہیں،

**الجواب:** اخرج الہیثمی فی مجمع الزوائد عن عائشۃ رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاخیر فی جماعۃ النساء الا فی المسجد او فی جنازۃ قتیل رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط الا انہ قال لاخیر فی جماعۃ النساء الا فی المسجد جماعۃ وفیہ ابن لہیعۃ وفیہ کلام اھ (ص ۱۵۵ ج ۱) قلت قد حسن لہ الترمذی واحتج بہ غیر واحد کما فیہ ایضا (ص ۱۲۶ و ص ۵ ج ۱) ولا یخفی ان جماعۃ النساء فی مسجد الجماعۃ لا تکون الا مع الرجال فمعنی الحدیث لاخیر فی جماعۃ النساء الا مع الرجال فعلم ان جماعۃ النساء وحدہن مکروہۃ لنفیہ صلی اللہ علیہ وسلم الخیریۃ عنہا، وقد اجمعت الامۃ علی کراہۃ خروج النساء الی مسجد الجماعۃ ایضا ولو خرجن فلم یجوز احد من الائمۃ ان یجمعن وحدہن بل لابد لہن من الصلوٰۃ خلف الرجال فافہم وکل ما ورد عن عائشۃ وام سلمۃ فی امامتہما النساء فلا یخلو عن مثل لیث بن ابی سلیم وابن ابی لیلی وغیرہما ممن فیہ مقال فلم یکن راجحا علی اثر ابن لہیعۃ ہذا ورِوایۃ ابراہیم عن عائشۃ منقطعۃ فلا ترجیح لہ ایضا ولا یخفی ترجیح المرفوع علی الموقوف ولم یتبین مخالفۃ عمل الراوی لروایۃ ہل کانت قبل الروایۃ او بعدہا فلا یعل بفعل عائشۃ رض اثرہا المرفوع فافہم والبسط فی الاعلاء (ص ۱۱۴ و ۱۱ ج ۲)

روایات مذکورۂ سوال کا جواب تو عبارت عربی میں دیدیا گیا کہ حضرت عائشہ رض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کی جماعت میں خیر نہیں ہے، اسی پر حنفیہ کا عمل ہے، اور اسی سے ان کے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، پس عورتوں کو باہم جماعت کرنا مکروہ ہے، اور عید کی جماعت تو صرف عورتوں سے منعقد ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ مثل جمعہ کے ہے، جس کے لئے رجال کا وجود شرط ہے، اور اس کے

سو ابھی اُن کی جماعت مکروہ ہے، اور عید کے دن الگ الگ بھی نماز پڑھنا ایک گھر میں جمع ہو کر مکروہ ہے، کیونکہ اجتماع نساء فتنہ سے خالی نہیں، ہاں ہر عورت اپنے گھر میں بہ نیت نفل جتنی چاہے نماز پڑھے، واللہ اعلم، ۱۹ ار رجب ۴۵ھ

امام رکوع میں ہو اور مقتدی تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کرلے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں

**سوال** (۲۶) ...... امام رکوع میں ہو تو تحریمہ کہہ کر فوراً مقتدی رکوع کرسکتا ہے یا نہیں، اس کی نماز ایسا کرنے سے ہوگی یا نہیں؟ ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں ہے، اس نے تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً رکوع میں شرکت کرلی، یعنی تکبیر تحریمہ کہہ کر قیام کچھ نہیں کیا، فوراً جھک گیا تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

**الجواب**: اگر تکبیر تحریمہ بحالتِ قیام کہی ہے یا بحالت انحناء کہی ہے، اگر وہ اقرب الی القیام تھا تو نماز درست ہے، اور اگر بحالت انحناء کہی اور اقرب الی الرکوع تھا تو نماز درست نہیں ہوئی، غرض تکبیرِ تحریمہ کا بحالتِ قیام یا بحالتِ اقرب الی القیام ہونا فرض ہے، تکبیر تحریمہ کے بعد مزید قیام فرض نہیں قال فی مراقی الفلاح والثانی من شروط صحة التحریمة الاتیان بالتحریمة قائما او منحنیا قلیلا قبل وجود انحنائه بما هو اقرب للرکوع قال فی البرهان لو ادرك الامام راكعا نحنی ظهره ثم كبر ان كان الی القیام اقرب صح الشروع ولو اراد به تكبیر الركوع وتلغو نیته لان مدرك الامام فی الركوع لا یحتاج الی تكبیر مرتین خلافا لبعضهم وان كان الی الركوع اقرب لا یصح الشروع اھ ص ۱۲۷، ۳ر شعبان ۴۱ھ

جماعتِ ثانیہ

**سوال** (۲۷) ..................... جس مسجد میں امام اور مؤذن مقرر ہے اور اس گاؤں کے تمام آدمی اس مسجد میں اول جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اس کے بعد اگر دو ہی آدمی پھر جماعت کریں مکروہ تحریمی ہوگا یا نہیں، چند کتب معتبرہ کی عبارت نقل فرماکر جواب عنایت فرمادیں، بینوا توجروا،

**الجواب** واللہ الموفق للصواب: ذکر فی رد المحتار عن المنبع ثم قال فی الاستدلال ولنا انه علیه[عه] الصلوٰة والسلام کان خرج لیصلح بین

عه قلت اخرجه الطبرانی فی الکبیر والاوسط عن ابی بکرة ورجاله ثقات کذا فی مجمع الزوائد (ج ۲ ص ۱۶) ظ



قوم فعاد الی المسجد وقد صلی اهل المسجد فرجع الی منزله فجمع اهله وصلی ولو جاز ذلك[عه] لما اختار الصلوٰة فی بیته علی الجماعة فی المسجد ولان فی الاطلاق هكذا تقلیل الجماعة معنی فانهم لا یجتمعون اذا علموا انها لا تفوتهم ومقتضی هذا الاستدلال كراهة التكرار فی مسجد المحلة ولو بدون اذان ویؤیده ما فی الظهیریة ولو دخل جماعة المسجد بعد ما صلی فیه اهله یصلون وحدانا وهو ظاهر الروایة اھ وهذا مخالف لحكایة الاجماع المارة (وهو ما ذكره قبل عن المنبع والتقیید بالمسجد المختصة بالمحلة احتراز من الشارع وبالاذان الثانی احتراز عما اذا صلی فی المسجد المحلة جماعة بغیر اذان حیث یباح اجماعا اھ (ص ۵۱۶ ج ۱)

لبدائع فی بیان ما یفعله بعد فوات الجماعة ما نصه لا خلاف فی انه اذا فاتته الجماعة لا یجب علیه الطلب فی مسجد آخر لكن كیف یصنع ذكر فی الاصل انه اذا فاتته الجماعة فی مسجد حیه فان اتی مسجدا آخر یرجو ادراك الجماعة فیه فحسن وان صلی فی مسجد حیه فحسن وذكر القدوری انه یجمع باهله ویصلی بهم یعنی وینال ثواب الجماعة وقال شمس الائمة الحلوانی ان لم یدخل مسجد حیه فان دخل فحسن لحدیث الحسن[عه] قال كانوا اذا فاتتهم الجماعة فمنهم من یصلی فی مسجد حیه ومنهم من یتبع الجماعة اراد به الصحابة رضی الله عنهم ولان فی كل جانب مراعاة حرمة وترك اخری ففی احد الجانبین مراعاة حرمة مسجده وترك الجماعة وفی الجانب الآخر مراعاة فضیلة الجماعة وترك حق مسجد فاذا تعذر الجمع

عه اورد علیه بعض الناس نقلا عن التحریر المختار بقوله ولا یتم الاستدلال به الا اذا وجد جماعة یصلی بهم فی المسجد ومع هذا اختار الصلوٰة فی منزله باهله اھ قلت عدم وجدانه مثل هذه الجماعة بعید لانه صلی الله علیه وسلم لم یكن یذهب للصلح بین الاقوام وحده بل كان یذهب بجماعة من اصحابه كما هو المعروف من عادته صلی الله علیه وسلم تنزلا فكان یمكن ان یجمع الصلوٰة باهله فی المسجد فان النساء كن یشهدن الصلوٰة فیه مع النبی صلی الله علیه وسلم كما عرف فی موضعه فالاستدلال به تام ولا یضره الاحتمالات البعیدة ۱۲ ظ، علی انه قد ثبت عن الصحابة انهم لم یجمعوا فی المسجد ثانیا مع قدرتهم علی ذلك كما سیأتی،

عه سیأتی ما یدل له ویؤیده ۱۲ منه

بينهما مال الى ايهما شاء وذكر القدوري انه اذا فاتته الجماعة جمع باهله في منزله وان صلى وحده جاز لما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم انه خرج من المدينة الى صلح بين حيين من احياء العرب فانصرف منه وقد فرغ الناس من الصلوٰة فمال الى بيته وجمع باهله في منزله وفي هذا الحديث دليل على سقوط الطلب اذ لو وجب لكان اولى الناس به رسول الله صلى الله عليه وسلم وذكر الامام السرخسي ان الاولى في زماننا انه اذا لم يدخل مسجده ان يتتبع الجماعة وان دخل مسجده صلى فيه اھ (ص ۱۵۶ ج ۱)

قلت وهذا يدل على كراهة الجماعة الثانية مطلقا ولو بدون اذان لانه حصر صنع فاتت الجماعة في تتبعها في مسجد اخر ان كان يرجو ادراكها فيه وفي صلوٰته في مسجد حيه منفردا وعلله بان في كل جانب مراعاة حرمة وترك اخرى فاذا تعذر الجمع بينهما مال الى ايهما شاء فلو كانت الجماعة الثانية بدون الاذان غير مكروهة لا نتفى ذلك التعذر بان يجمع ثانيا في مسجد حيه كما لا يخفى فالظاهر ان المذهب عندنا وظاهر الرواية هو الكراهة مطلقا ولو بدون اذان فان صاحب البدائع والقدوري والسرخسي اعرف الناس بالمذهب من غيرهم وتقييدها بالاذان لعلها في النوادر قال الشعراني في رحمة الامة ومن دخل مسجدا فوجد امامه قد فرغ من الصلوٰة فان كان المسجد في غير ممر الناس كره له ان يستانف فيه جماعة عند ابي حنيفة رح ومالك رح والشافعي رح وقال احمد رح لا يكره اھ (ص ۳۴) والدلائل ايضا تقتضي الكراهة مطلقا منها ما قد مر ذكره ومنها ما رواه سحنون رح عن ابن القاسم عن مالك عن عبد الرحمن بن المجبر قال دخلت مع سالم بن عبد الله مسجد الجحفة وقد فرغوا من الصلاة فقالوا الا تجمع الصلاة فقال سالم لا تجمع صلوٰة واحدة في مسجد واحد مرتين رجاله كلهم ثقات قال ابن وهب اخبرني رجال من اهل العلم عن ابن شهاب ويحيى بن سعيد وربيعة والليث مثله اھ من المدونة الكبرى لمالك (ص ۸۹ ج ۱) فهؤلاء اكابر التابعين كرهوا الجماعة الثانية



في مسجد واحد ولم يقيدوها بالاذان وقال الشافعي عه وانا قد حفظنا ان قد فاتت رجالا معه صلى الله عليه وسلم الصلوٰة فصلوا بعلمه منفردين وقد كانوا قادرين على ان يجمعوا وان قد فاتت الصلوٰة في الجماعة قوما فجاؤا المسجد فصلى كل واحد منهم منفردا وقد كانوا قادرين على ان يجمعوا في المسجد اھ من الام (ص ۱۳۷ ج ۱) قلت فلو كانت الجماعة الثانية غير مكروهة بدون الاذان لما تركها الصحابة وهم سباقون الى الغايات راغبون الى افضل الطاعات قال الشافعي رحمه الله وانما كرهت راي تكرار الجماعة في المسجد ۱۲ منه) ذلك لهم لانهم ليس مما فعل السلف قبلنا بل قد عابه بعضهم اھ من الام (ص ۱۳۶ ج ۱) قلت وكما لم يفعله السلف بالاذان ثانيا في المسجد كذا لم يفعلوه فيه بدون الاذان ايضا ومن ادعى غير ذلك فليأت ببرهان قال الشافعي رحمه الله واحسب كراهية من كره ذلك منهم انما كان لتفرق الكلمة وان يرغب رجل عن الصلوٰة خلف امام جماعة فيتخلف هو ومن اراد عن المسجد في وقت الصلوٰة فاذا قضيت دخلوا فجمعوا فيكون في هذا اختلاف وتفريق كلمة وفيهما المكروه وانما اكره هذا في كل مسجد له امام ومؤذن فاما مسجد بني على ظهر الطريق او ناحية لا يؤذن فيه مؤذن راتب ولا يكون له امام معلوم ويصلي فيه المارة ويستظلون فلا اكره ذلك لانه ليس فيه معنى الذي وصفت من تفرق الكلمة ثم قال وانما كرهوا لئلا يجمعوا في مسجد مرتين ولا باس بان يخرجوا الى موضع فيجمعوا فيه اھ من الام، (ص ۱۳۶ و ۱۳۷ ج ۱) قلت وهذا كله موافق لما ذكره اصحابنا غير انهم عللوا الكراهة بتقاعد القوم من الجماعة الاولى ولا يخفى ان العلة التي ذكرها الشافعي رح اشد واحذر واكثر وقوعا واحتمالا لا سيما في زمان الفساد وانقطاع الوداد ومقتضاها كراهة التكرار ولو بدون اذان هذا هو الحق الراجح عندي والمراد بالكراهة كراهة التحريم،

عه هذا يؤيد ما ذكره صاحب البدائع عن الحسن ان الامام الشافعي رحمه الله مجتهد امام في الفقه والحديث فتعليقه جزما

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ مسجد محلہ میں جس میں امام اور مؤذن مقرر ہے دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ بدون اذان ثانی کے ہو یا مع اذان واقامت کے، دلائل کا مقتضیٰ یہی ہے، اور ظہیریہ اور بدائع وغیرہ سے بھی اطلاق کراہت ہی مستفاد ہوتا ہے، گو بعض فتاویٰ میں بدون اذان ثانی کے جماعت ثانیہ کو مباح لکھا ہے، مگر دلائل پر نظر کرکے یہ قید ضعیف معلوم ہوتی ہے، اور اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جاوے تو اباحت سے مراد کراہت تحریمیہ کی نفی ہوگی، کراہت تنزیہیہ کی نفی مراد نہیں، کذا قالہ بعض اکابرنا منہم قطب وقتہ مولانا الشیخ رشید احمد قدس سرہ، دوسرے جن روایات میں اطلاق ہے ان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بدون اذان کے بھی کراہت ہے، اور جن میں تقیید ہے، یعنی جن میں بدون اذان کے اجماعاً مباح کہا ہے، اگر امام صاحب سے یہ روایت بھی صحیح ہو تو اُن کا مقتضا اباحت بدون الاذان ہے، اور جب کراہت واباحت میں تعارض ہو تو کراہت کو ترجیح ہوگی، ۱۴؍ رمضان ۱۳۴۲ھ

**حکم نماز امام بلا عمامہ**

**سوال (۲۸)** امام اگر بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں اُن کی نماز ہوجاوے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اگر پیش امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے تو جو مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں ان کی نماز نہ ہوگی،

**الجواب**: اگر امام بلا عمامہ کے نماز پڑھاوے اور مقتدی عمامہ باندھے ہوئے ہوں تو سب کی نماز درست ہے، کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ امام مالک کے نزدیک امام مسجد کو بغیر چادرہ اوڑھے امامت کرنا مکروہ ہے، لیکن اس کے ترک سے کسی کی نماز فاسد ان کے نزدیک بھی نہیں ہوتی، قال مالک واکرہ للامام ان یصلی بغیر رداء الا ان یکون امام قوم فی سفر او رجلا ام قوما فی موضع اجتمعوا فیہ او فی دارہ فاما... مسجد جماعۃ او مساجد القبائل... فاکرہ لہ ذلک واحب الی ان یجعل عمامۃ علی عاتقہ اذا کان مسافرا او صلی فی دارہ اھ (ص ۸۵ ج ۱ مدونہ) قلت والخروج من الخلاف مستحب عندنا ایضا واللہ اعلم، ۳؍ محرم ۱۳۴۵ھ

**ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے**

**سوال (۲۹)** ولد الزنا کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی یا نہیں؟

**الجواب**: ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، فی الدر ص ۵۸۴ (ویکرہ) تنزیہا (امامۃ عبد) الی ان قال (وولد الزنا) ھذا ان وجد



غیرہم والا فلا کراھۃ بحر بحثا (وقال الشامی تحت قول الدر ونحوہ الاعمی) لکن ما بحثہ فی البحر صرح بہ فی الاختیار حیث قال ولو عدمت ای علۃ الکراھۃ بان کان الاعرابی افضل من الحضری والعبد من الحر وولد الزناء من ولد الرشدۃ والاعمی من البصیر فالحکم بالضد اھ ونحوہ فی شرح الملتقی للبہنسی وشرح درر البحار ولعل وجہہ ان تنفیر الجماعۃ بتقدیمہ یزول اذا کان افضل من غیرہ بل التنفیر یکون فی تقدیم غیرہ اھ (ص ۵۸۵ ج ۱)

۲۶؍ ذیقعدۃ ۱۳۴۳ھ

**ستونوں کے درمیان صفیں بنانا مکروہ ہے**

**سوال (۳۰)** ما تقولون ان مسجد الہ اعمدۃ ھل یجوز ان یجعل الصفوف بینہا ام لا؟

**الجواب**: یکرہ الصف بین السواری ما لم یضطر الیہ لورود النہی عن ذلک ولعل فقہہ انتفاء رص الصفوف وھو ماموربہ فی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم تراصوا، اخرج ابن ماجۃ وابن خزیمۃ والحاکم عن معاویۃ بن قرۃ عن ابیہ قال کنا ننہی ان نصف بین السواری علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونطرد عنہا طردا، رجالہ رجال الصحیح الا ھارون بن مسلم وھو حسن الحدیث وثقۃ ابن حبان وروی الترمذی عن عبد الحمید بن محمود قال صلینا خلف امیر من الامراء فاضطرنا الناس فصلینا بین الساریتین فلما صلینا قال انس بن مالک کنا نتقی ھذا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الترمذی حدیث حسن صحیح (ص ۳۱ ج ۳) قال العلامۃ العینی فی شرح البخاری اذا کان منفردا لا باس فی الصلوٰۃ بین الساریتین اذا لم یکن فی جماعۃ وقید بغیر جماعۃ لان ذلک یقطع الصفوف وتسویۃ الصفوف مطلوبۃ فی الجماعۃ اھ (ص ۲۷۸ ج ۲) وفی فتح الباری قال المحب الطبری کرہ قوم الصف بین السواری للنہی الوارد عن ذلک ومحلہا الکراھۃ عند عدم الضیق والحکمۃ فیہ اما لانقطاع الصف او لانہ موضع النعال اھ (ص ۴۷۷ ج ۱) قلت وقواعدنا لا تاباہ لا سیما والعینی من ائمتنا وقد منعہ ایضا واللہ اعلم،

**مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہوسکتی ہے یا نہیں؟**

سوال (۳۱) اگر امام کے پیچھے مقتدی نابالغ ہوں تو جماعت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: نابالغ مقتدی اگر سمجھدار ہے تو جماعت صحیح ہے، فی العالمگیریۃ (ص۵۲ ج۱) اذا زاد علی الواحد فی غیر الجمعۃ فھو جماعۃ وان کان معہ صبی عاقل کذا فی السراجیۃ۔

**بلاعذر جماعت چھوڑنا گناہ اور اصرار فسق ہے،**

سوال (۳۲) جس مسجد میں پانچ وقت باقاعدہ جماعت ہوتی ہے اسی مسجد میں ایک شخص اکثر پہلے نماز پڑھ لیتا ہے، اور بعض اوقات اذان مسجد میں سنکر نماز پڑھ کر چلا جاتا ہے، اس کی نماز جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب: جماعت سے نماز پڑھنا سنت مؤکدہ قریب واجب ہے، لہذا بلاعذر اس کا چھوڑنا گناہ ہے اور ترک جماعت کا عادی ہونا فسق ہے ایسا شخص شرعاً فاسق ہے الاحقر عبدالکریم، ۲۴ صفر ۴۴ھ

**محراب اور در میں امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے**

سوال (۳۳)................. امام مسجد کے در میں کھڑا ہوا اور مقتدی فرش کے اوپر کھڑے ہوئے، ایک شخص نے منع کیا کہ محراب میں امام کے کھڑے ہونے سے نماز نہ ہوگی، ایک دوسرے شخص نے کہا کہ محراب نہیں ہے یہ در ہے، محراب اس کو کہتے ہیں جو مسجد کے اندر دیوار میں گہرا ہوتا ہے، اس میں اگر امام کھڑا ہوا اور مقتدی سے غائب ہو اس میں نماز پڑھانے سے نماز نہ ہوگی، اب حضور جو تحریر فرمادیں وہ عمل کیا جاوے،

الجواب: فی الدر المختار (وقیام الامام فی المحراب لا سجودہ فیہ) و قدماہ خارجہ لان المعتبر للقدم (مطلقا) وان لم یشتبہ حال الامام ان علل بالتشبیہ الخ وقال الشامی تحت (قولہ ان علل بالتشبیہ) قید للکراھۃ وحاصلہ انہ صرح محمد فی الجامع الصغیر بالکراھۃ ولم یفصل فاختلف المشائخ فی سببھا فقیل کونہ یصیر ممتازا عنھم فی المکان لان المحراب فی معنی بیت اٰخر وذلک صنیع اھل الکتاب واقتصر علیہ فی الھدایۃ واختارہ الامام السرخسی (ص ۶۷۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مختار وجہ کراہت کی تشبیہ وامتیاز ہے، اور اس میں اندر دنی محراب اور دروازے برابر ہیں، لہذا مسجد کے در میں کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے، واللہ اعلم

احقر عبدالکریم عفی عنہ، جمادی الاولی ۴۴ھ الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ



**امام نے سہواً بلاوضو نماز پڑھادی تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟**

سوال (۳۴) اگر کوئی......... پیش امام بھول کر بلاوضو نماز پڑھادیوے جب نماز کا وقت نکل جاوے تب یاد آوے کہ بلاوضو نماز پڑھادی ہے، اس حالت میں کیا کرنا چاہئے، ایسا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے یہ کارڈ لکھا گیا ہے، اور سب مقتدی جواب کے انتظار میں ہیں، کہ نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب: امام پر لازم ہے کہ جن اشخاص کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اس نماز میں شریک تھے، ان سب کو جس طرح ممکن ہو اطلاع کردے، اور امام عادل ہو تو ان پر اس کی اطلاع سے اعادہ کرنا ضروری ہے، اور اگر امام عادل نہ ہو تو اعادہ مستحب ہے، کما فی الدر (ص۴۹ والشامی ص ۴۱۸ ج۱) (واذا ظھر حدث امامہ بطلت فیلزم اعادتھا کما یلزم الامام الاخبار بالقدر الممکن) بلسانہ او بکتاب او رسول علی الاصح (لو معینین والا لا یلزمہ، بحر، قال الشامی واذا ظھر ای بشھادۃ الشھود او باخبارہ عن نفسہ وکان عدلا والا ندب کما فی النھر عن السراج،

عبدالکریم عفی عنہ ۶ ج ۲ ۴۴ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد

**امرد کی امامت مکروہ ہے**

سوال (۳۵) بے ریش بالغ کے پیچھے نماز درست ہے؟ جبکہ ایک ڈاڑھی والا آدمی ایک ہی لیاقت کا موجود ہے،

الجواب: فی الشامی (وکذا تکرہ خلف امرد) الظاھر انھا تنزیھیۃ ایضا والظاھر ایضا کما قال الرحمتی ان المراد بہ الصبیح الوجہ لانہ محل الفتنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ حسین امرد کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، واللہ اعلم،

احقر عبدالکریم عفی عنہ ۵ محرم ۴۵ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۶ محرم ۴۵ھ

**ایضاً ایضاً ایضاً**

سوال (۳۶)................ ایک حافظ جس کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال کی ہے، اور وجود ظاہری بھی بالغ نظر آتا ہے، لیکن ڈاڑھی ابھی تک نہیں آئی، اور تین چار سال تک رمضان شریف میں قرآن شریف نفلوں میں سناتا رہا، بوجہ نابالغی کے جب بالغ ہوا تب محراب سنائی، اب اس کو ایک مسجد میں لوگ امام مقرر کرتے ہیں اور اردو دو چار جماعت تک پڑھا ہوا ہے اور پڑھتا ہے، اور دینیات، مفتاح الجنۃ وغیرہ بھی پڑھتا ہے، اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اس امرد بالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا تو بلاکراہت جائز ہے، جبکہ اور

حافظ غیر امرد نہ ملے، لیکن فرائض کی نماز میں بہتر یہ ہے کہ اس کو امام نہ بنایا جاوے، اگر وہ خوب صورت ہو، اور اگر خوب صورت اور محلِ فتنہ نہ ہو تو فرائض میں بھی اس کی امامت بلا کراہت درست ہے، قال فی الدر وکذا تکرہ خلف امرد وسفیه الخ قال الشامی الظاهر انها تنزیه ایضا والظاهر ایضا کما قال الرحمتی ان المراد به الصبیح الوجه لانه محل الفتنة اھ (ص ۵۸۰ ج ۱) قلت انما قلت بجواز امامته فی التراویح لاختلاف الفقهاء فی جواز امامة الصبی فیها فجوزها مشایخ بلخ والاصح عدم الجواز کما فی الشامیة عن الهدایة (ص ۶۰۴ ج ۱) فلما اختلفوا فی الصبی الغیر البالغ فینبغی ان یتفقوا علی جواز امامة الامرد البالغ اذا لم یوجد حافظ غیره ولان فیه ابقاء لحفظ القرآن ولعل مشایخ بلخ جوزوا امامة الصبی فیها نظراً الی ذلك ولکن الصبی لیس باهل لها والامرد البالغ اهلها وانما الکراهة لعارض فتنة فی بالضرورة، واللّٰہ اعلم، ۲۰ رشعبان ۱۳۴۵ھ

| سوال (۳۷) زید پیش امام ہے اور اپنی ڈاڑھی کے سفید بال اکھڑواتا ہے، آیا اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں، | ڈاڑھی کے سفید بال اکھڑوانے والے کی اقتداء کا حکم، |
|---|---|

اور ڈاڑھی کے سفید بال اکھڑوانا ناجائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: اگر یہ شخص قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہو تو تب تو نتف شیب جائز ہے بشرطیکہ محض زینت کی نیت نہ ہو، بلکہ ارضاء زوجہ مقصود ہو یا اور کوئی ضرورت ہو، اور اگر بوڑھا قبل از وقت نہیں بلکہ وقت پر ہوا ہے ... تو نتف شیب مکروہ ہے، اور کراہتِ تنزیہیہ ہے، قال فی الهندیة ونتف الشیب مکروه للتزیین لا لترهیب العدو وکذا نقل عن الامام کذا فی جواهر الاخلاطی (ص ۲۳۵ ج ۶) قلت واحفظ عن موضع لا یحضر فی الآن لفظ لا بأس به فی ذلك والجمع بینهما ما ذکرته ولعله جمع حسن، واللّٰہ اعلم، ۲۱ رشعبان ۱۳۴۵ھ

| سوال (۳۸) آجکل ایک فصلی حافظ صاحب تراویح پڑھاتے ہیں، اور میں بھی اس جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، | جو شخص تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لیتا ہو اس کی اقتداء کا حکم |
|---|---|

یہ یقینی بات ہے کہ بعد ختم کلام مجید حافظ صاحب کی خدمت کی جاوے گی، اور مجھ کو بھی



شامل ہونا پڑے گا، ایسی حالت میں میرے لئے تراویح کا پڑھنا ایسے امام کے پیچھے جائز ہے یا ناجائز؟

**الجواب**: اگر یہ حافظ قرآن ختم قرآن کی اجرت پہلے سے طے کر لیتا ہے اور یہ شخص اس مسجد میں جہاں تراویح پڑھاتا ہے امام بھی نہیں تو یہ فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہ چاہئے، بلکہ الم ترکیف سے چند آدمیوں کے ساتھ جدا جماعت کر لی جاوے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو تنہا پڑھ لی جائے، اور اگر یہ شخص پہلے سے اجرت طے نہیں کرتا بلکہ قرآن تراویح میں سنا دیتا ہے، اور بعد تراویح کے لوگ حسبِ ہمت خدمت کر دیتے ہیں، اور یہ کمی بیشی پر کچھ اعتراض و مطالبہ نہیں کرتا، تو گو اس صورت میں بھی یہ رقم تو اس کو لینا جائز نہیں لکونہ معاوضة الختم لان المعروف کالمشروط، مگر یہ شخص مرتکب کبیرہ نہیں، اس کے پیچھے نماز جائز ہے، واللّٰہ اعلم، ۱۰ ررمضان شریف ۱۳۴۵ھ

| سوال (۳۹) میرے سابق محلہ کی مسجد جناب نے دیکھی ہے اس کی سطح مستوی ہے، اور جمعہ کے دن کثرتِ مصلیان | صحتِ اقتداء کے لئے علم بانتقالاتِ امام شرط ہے رویت نہیں، |
|---|---|

کی وجہ سے وہاں کچھ نمازی کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر مسجد کی چھت میں کوئی روشندان، جیسا کہ دو منزلہ مساجد میں اکثر معمول ہے نہیں ہے بکر کی آواز بلکہ خود امام کی قرأت و تکبیر کی بھی آواز جاتی ہے، مگر امام کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں اوپر کھڑے ہونے والے نمازیوں کی نماز ہو جاوے گی یا نہیں، اور دوسرے مکانات کی چھتوں پر بھی لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، جو محض مکبر کی تکبیر پر رکوع و سجدہ میں جاتے ہیں، اس میں اور اس میں کیا فرق ہے، اور چونکہ یہ واقعہ ہے اس لئے اس کے جواب کے قبل از جمعہ..... ضرورت ہے تاکہ نماز صحیح نہ ہو تو روک دیا جائے، روایات کی چنداں ضرورت نہیں، محققانہ قول فیصل مفتی بہ درکار ہے،

**الجواب**: صحتِ اقتداء کے لئے علم بانتقالات امام شرط ہے، رویت ضروری نہیں، پس سقف مسجد پر نماز پڑھنے والوں کی نماز درست ہے، گو امام کو دیکھتے نہ ہوں قال فی الدر وعلمه بانتقالاته الخ قال الشامی ای بسماع اورؤیة للامام او لبعض المقتدین رحمتی وان لم یتحد المکان ط اھ (ص ۵۷۵ ج ۱) ۱۸ ررمضان ۱۳۴۳ھ

| سوال (۴۰) جماعت میں صفوں کو سیدھا کرنے کی | تحقیق تسویۂ صفوف والصاق القدم بالقدم |
|---|---|

تاکید ہو کہ کندھے سے کندھا ملا دیں، اور حضرات اہلِ حدیث فرماتے ہیں کہ سد الخلل سے مراد پیرسے پیر بھی ملا کر صف میں نمازی کھڑے ہوں، اور الصاق سے مراد حقیقۃً ملانا ہے تو کیا ان کا کہنا حق ہے، اور احناف غلطی پر ہیں کہ جو پیروں کو نہیں ملاتے،

۲، کیا سد الخلل کندھے کے ملانے سے ہوتا ہے کہ نہیں، اگر ہوتا ہے تو کیا پیروں کو فراخ کر کے ملانے سے سد الخلل نہیں ہوگا، ان کو واضح کر کے جواب لکھیں، اس میں ہمارے یہاں کے احناف بھی مبتلا ہوتے ہیں،

**الجواب**: عن انس مرفوعاً قال رصوا صفوفکم وقاربوا بینھا وحاذوا بالاعناق رواہ ابوداؤد والنسائی وصححه ابن حبان بلوغ المرام (ص ۴۷، ج ۱) قال فی المجمع البحار تراصوا فی الصفوف ای تلاصقوا حتی لایکون بینکم فرج من رص البناء اذا الصق بعضھا ببعض اھ (ص ۱۲، ج ۲) وفی الباب عن النعمان بن بشیر یقول اقبل علینا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بوجھه فقال اقیموا صفوفکم ثلثا واللہ لتقیمن صفوفکم اولیخالفن اللہ بین قلوبکم قال فلقد رأیت الرجل منا یلزق منکبه بمنکب صاحبه ورکبته برکبته وکعبه بکعبه اخرجه ابوداؤد وصححه ابن خزیمة (فتح الباری، ص ۱۷۶، ج ۲) وعن انس مرفوعاً قال اقیموا صفوفکم فانی اریکم من وراء ظھری وکان احدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه وقدمه بقدمه رواہ البخاری قال الحافظ فی الفتح (ص مذکور) واخرجه الاسمعیلی (فی مستخرجه الصحیح) من روایة معمر عن حمید بلفظ قال انس فلقد رأیت احدنا الی اٰخرہ وزاد معمر فی روایة ولو فعلت ذلک باحدھم الیوم لنفر کانه بغل شموس اھ وذکرت فی اعلاء السنن اخذت طائفة فی زماننا بظاھر ھذا الحدیث فتراھم یلزقون اقدامھم باقدام من یلیھم فی الصف ولایزالون یتکلفون ذلک الی اٰخر الصلوٰۃ ولایخفی ان فی الزاق الاقدام بالاقدام مع الزاق المناکب بالمناکب والرکب بالرکب مشقة عظیمة لا سیما مع ابقائھا کذلک الی اٰخر الصلوٰۃ کما ھو مشاھد والحرج مدفوع بالنص علی ان الزاق تلک الاعضاء باجمعھا حقیقة غیر ممکن اذا کان المصلون مختلفی القامة فالمراد منه جعل بعضھا فی محاذات بعض قال



الحافظ فی الفتح تحت قول البخاری باب الزاق القدم بالقدم فی الصف المراد بذلک المبالغة فی تعدیل الصف وسد خلله (ص مذکور) وفی عون المعبود قوله صلی اللہ علیه وسلم حاذوا بالمناکب ای اجعلوا بعضھا حذاء بعض بحیث یکون منکب کل واحد موازیاً لمنکب الآخر ومسامتاً له فتکون المناکب والاعناق والاقدام علی سمت واحد اھ (ص ۲۱۵، ج ۱) وقال الشیخ ولو حمل الالزاق علی الحقیقة فالمراد منه احداثه وقت الاقامة لتسویة الصف فان احداث الالزاق فی تلک الاعضاء طریق تحصیل ھذہ التسویة ولا دلالة فی الحدیث علی ابقاءہ فی الصلوٰۃ بعد الشروع فیھا ومن ادعی ذلک فلیأت بحجة علیه اھ قلت وقول انس کان احدنا وقوله ولقد رأیت احدنا یفید ان الفعل المذکور کان فی زمن النبی صلی اللہ علیه وسلم ولم یبق بعدہ کما صرح به فی روایة معمر بقوله ولو فعلت ذلک باحدھم لنفر کانه بغل شموس فلوکان ذلک سنة مقصودۃ من سنن الصلوٰۃ لم یترکھا الصحابة والتابعون ولم ینفر منھا احد فالصحیح ما قلنا ان ذلک کان للمبالغة فی تسویة الصف حین الاقامة لابعدھا فی داخل الصلوٰۃ اھ (ص ۲۹۶، ج ۴)

ان عباراتِ مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ سد الخلل سے مراد یہ ہے کہ نمازی خوب مل کر کھڑے ہوں کہ درمیان میں فرجہ نہ رہے، اور یہ بات کندھا ملانے سے حاصل ہوتی ہے، قدم سے قدم ملانے سے فرجہ پیدا ہو جائے گا، اور قدم سے قدم ملانا نماز شروع کرنے سے پہلے اسی غرض سے ہے تاکہ صف سیدھی ہو جائے نماز کے اندر قدم سے قدم ملانا سنت نہیں ہے، اس لئے احناف غلطی پر نہیں ہیں،

۲، پیروں کو فراخ کر کے ملانے سے سد الخلل نہ ہوگا، بلکہ کندھے سے کندھا ملانے سے سد الخلل ہوگا، کیونکہ ان اللہ یحب الذین یصفون کما تصف الملائکة کانھم بنیان مرصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازیوں کو بنیان مرصوص کی طرح مل کر کھڑا ہونا چاہئے، اور یہ تراص الزاق مناکب ہی سے ہوتا ہے، واللہ اعلم،

۲۱ ذی الحجہ ۲۵ھ

اس شخص کی اقتداء کا حکم جو خارج مسجد بذریعہ اتصالِ صفوف امام کی آواز یا مسجد کے اندر موجود مقتدیوں کی حرکات دیکھ کر نماز ادا کرے

**سوال (۴۱)** مقتدی اگر مسجد سے باہر ہوں یعنی جس جگہ وہ کھڑے ہیں وہ مسجد کی حد سے

باہر ہے، اور وہاں تک صفیں بھی متصل نہیں ہے، تو اس صورت میں اگر مقتدی امام کی آواز سنتے ہوں، یا مسجد کے اندر جو مقتدی ہیں ان کی حرکات کو دیکھتے ہیں تو باہر والے مقتدیوں کی نماز درست ہے یا نہیں؟

**الجواب**: صورتِ مسئولہ میں ایسے مقتدیوں کی نماز درست ہو جاوے گی، قال فی الدر وشرط عشرۃ نیۃ المؤتم الاقتداء واتحاد مکانہما وصلوتہما وصحۃ صلوٰۃ امامہ وعدم محاذات امرأۃ وعدم تقدم علیہ بعقبہ وعلمہ بانتقالاتہ وبحالہ من اقامۃ وسفر ومشارکۃ فی الارکان وکونہ مثلہ اودونہ فیہا،

قال الشامی تحت قولہ وشرط عشرۃ؛ ھذہ الشروط فی الحقیقۃ شروط الاقتداء وقولہ واتحاد مکانہما) فلو اقتدی راجل براکب اوبالعکس او راکب براکب دابۃ اخری لم یصح لاختلاف المکان فلو کانا علی دابۃ واحدۃ صح لاتحادہ کما فی الامداد وسیأتی واما اذا کان بینہما حائط فسیأتی ان المعتمد اعتبار الاشتباہ لااتحاد المکان فیخرج بقولہ وعلمہ بانتقالاتہ وسیاتی تحقیق ھذہ المسئلۃ بمالامزید علیہ قال الشامی تحت قولہ وعلمہ بانتقالاتہ) ای بسماع اورؤیۃ الامام او بعض المقتدین رحمتی وان لم یتحد المکان، اس جواب کی بنا اس پر ہے کہ صحتِ اقتداء کے لئے اتحادِ مکان امام و مقتدی شرط نہیں، اور یہ بنا صحیح نہیں کیونکہ شرط اتحادِ مکان امام ابو حنیفہ رح کا مذہب مشہور ہے، تمام متون میں یہ شرط مذکور ہے، اور طحطاوی نے جو وان لم یتحد المکان فرمایا ہے اس کا منشاء بعض فروع سے مغالطہ میں پڑنا ہے، جیسا کہ خود درمختار اور شامی میں صفحہ ۶۱۳ و ۶۱۴ پر ان فروع کی تفصیل آتی ہے، ان فروع کو اور متون کے اشتراطِ مکان کو دیکھ کر قول فیصل یہ ہے کہ اتحادِ مکان کا مشروط ہونا تو یقینی ہے، اور جس نے اس شرط کی نفی کی یہ اس کی غلطی ہے، کیونکہ جو شرط متون میں بالاتفاق مذکور ہے، اور امام کے مذہب میں اس شرط کا ہونا مشہور ہے اس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، لیکن اتحادِ مکان کا مدار عرف پر ہے، اگر عرفاً مکانِ مقتدی مکانِ امام سے متحد ہو تو اقتداء صحیح ہے اور عرفاً متحد نہ ہو تو اقتداء صحیح نہیں، اس لئے بعض فروع میں بعض مشائخ نے اقتداء



۱۰

کو صحیح کہا، کیونکہ اُن کے نزدیک اتحادِ عرفی موجود تھا، اور بعض نے صحیح نہیں کہا، اُن کے نزدیک اتحادِ مکان عرفاً تھا، باقی اشتراط اتحادِ مکان پر سب متفق ہیں، ہکذا ینبغی ان یفہم المقام والعلم عند اللہ الملک العلام، ۲۶ صفر ۴۶ھ

جو شخص قطرہ آنے کا مریض ہو اسکی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

**سوال (۴۲)** ایک شخص بڑا ذی علم اور خاندانِ انصار میں سے ہے، اور شریعت کا بڑا پابند ہے اور عابد بھی ہے، یعنی نماز تہجد واشراق وچاشت وغیرہ کا بڑا پابند ہے، ہر وقت ہی یادِ الٰہی کرتا رہتا ہے، روزانہ قرآن شریف کی منزل سے بھی زیادہ تلاوت کرتا ہے، اب کچھ عرصہ سے قطرہ کی تکلیف ہو گئی ہے، یعنی پیشاب کے کچھ دیر بعد قطرہ آجاتا ہے، اور بعض دفعہ بالکل نہیں آتا، مگر اس شخص کے دل پر عشاء وتہجد کے وقت پر، کیونکہ ان دونوں وقتوں میں وضو سے پیشتر پیشاب کرنا پڑتا ہے، اسی کا خیال آتا ہے، اور پھر وہ دیکھ بھی لیتا ہے کہ اگر دوبارہ قطرہ آگیا ہو تو دوبارہ وضو کرلے، اگر کپڑے کو لگ گیا تو کپڑا پاک کرلے، ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اگر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے وہ کیسا ہے؟ بینوا توجروا؟

**الجواب**: اگر یہ شخص پورا محتاط ہے کہ وقت شروع نماز سے اتنی دیر پہلے پیشاب کرنے کا اہتمام رکھتا ہے جس میں آمد قطرہ سے اطمینان کلی ہو جاوے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اتفاقاً کبھی قطرہ آجانے پر جب وہ دیکھ لیتا ہے اور نماز کا اعادہ کرلیتا ہے اور مقتدیوں کو بھی اعادہ کا امر کرتا ہے اس سے اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں رکاوٹ نہ ہونا چاہئے، اور اگر یہ پورا محتاط نہیں، یا باوجود احتیاط کے بھی قطرہ کا مریض ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ روزانہ یا مہینہ میں اکثر اوقات اعادہ صلوٰۃ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جاوے، بلکہ کوئی تندرست آدمی امام بنایا جاوے، لان عدم الاہتمام بالاستبراء حرام ومرتکبہ فاسق لوجوب الاستبراء بحیث یطمئن قلبہ قبل الشروع فی الصلوٰۃ صرح بہ فی مراقی الفلاح فی فصل الاستبراء وان کان مبتلی بظہور القطرۃ مع الاہتمام بالاستبراء ایضاً وکان ذلک منہ کثیراً فہو مریض، کالمعذور والصحیح اولیٰ منہ، واللہ اعلم، ۱۱ رجب ۴۶ھ

لواطت سے تائب کی اقتداء کا حکم

**سوال (۴۳)** ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کہ جس سے فعل قومِ لوط علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سرزد ہوا ہو مگر اس فعلِ شنیع سے توبہ کرلی ہو، اور

آئندہ اسی عہد پر قائم رہنے کا عزم رکھتا ہو کیسا ہے، اور اگر مقتدی ایسے شخص کو امام بنادیں تو اُن پر کچھ وبال ہوگا یا نہیں؟ اور اس فعلِ بد کا کفارہ کیا ہوسکتا ہے، بینوا بالتفصیل توجروا من اللہ الجلیل،

الجواب: التائب من الذنب کمن لاذنب لہ، اس فعل کا کفارہ توبۂ صادقہ ہی ہے جو شخص توبہ کرلے اور قرائن سے اس کی توبہ صحیح معلوم ہو کہ اب اس فعل سے اور اس کے مقدمات سے کلی اجتناب کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز بلاکراہت جائز ہے، لیکن اگر یہ شخص بدنام ہوچکا ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ کنارہ کریں تو کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جو بدنام نہ ہو، لفضیلۃ الاورع من غیرہ وکون تقلیل الجماعۃ مکروہا، واللہ اعلم، شعبان ۴۶ھ

جس لڑکے کی عمر پندرہ سال ہو اس کی اقتدا میں تراویح بلاکراہت جائز ہے، البتہ فرائض میں اس کو امام بنانا مناسب نہیں،

سوال (۴۴) ایک لڑکا جس کا عمر پندرہ برس کی ہے کیا لڑکا تراویح میں امام بن سکتا ہے، اور تراویح میں امام بنانے کی صورت میں کیا فرض نماز کی امامت کرسکتا ہے، اور فتاوے عالمگیریہ مطبوعہ نولکشور جلد سوم صفحہ ۹۰۶ میں یہ عبارت ہے، بلوغ الغلام بالاحتلام او الانزال والجاریۃ بالاحتلام او الحیض او الحمل کذا فی الدر المختار والسن الذی یحکم ببلوغ الغلام والجاریۃ اذا انتہیا الیہ خمس عشرۃ سنۃ عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ وھو روایۃ عن ابی حنیفۃ وعلیہ الفتوٰی وعن ابی حنیفۃؒ ثمانی عشرۃ سنۃ للغلام وسبع عشرۃ سنۃ للجاریۃ کذا فی الکافی، کیا اس عبارت پر قیاس کرکے تراویح وغیرہ میں اس لڑکے کی امامت کا حکم دے سکتے ہیں؟

الجواب: جس لڑکے کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو وہ قول مفتی بہ میں بالغ ہے اس کے پیچھے تراویح کی نماز بلاکراہت درست ہے، البتہ فرض میں امام نہ بنایا جاوے، لکراھۃ المکتوبۃ خلف الامرد الذی یشتھی ولم یعتبر ھذہ الکراھۃ فی التراویح لتوسیع الفقہاء فی امر النافلۃ حتی ان بعضھم جوز صلوٰۃ البالغ خلف الصبی الذی لم یبلغ فی التراویح وان کان ذلک ضعیفا ولکنہ مشعر بتوسیعھم فی امر النافلۃ فافھم، ۲۷ شعبان ۴۶ھ

ستونوں کے درمیان صف بندی بلاعذر مکروہ ہے

سوال (۴۵) ........



........ مسجد کے دروازوں یا پانچ مسجد میں ستونوں کے درمیان مقتدی صف باندھ کر اقتدا کرلے مثلاً اس کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازہ میں تین چار مقتدی سماسکتے ہیں، پھر بیچ میں ستون آجاتا ہے تو آیا یہ ستون کا درمیان آجانا مانع اقتدا ہے یا مستلزم کراہت کا ہے، اور یہ کراہت کا لزوم عام ہے یا خاص، باوجود گنجائش وعدم تنگی کے وقت پر منحصر ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: قال العینی فی شرح البخاری اذا کان منفردا لا باس بالصلوٰۃ بین الساریتین اذا لم یکن فی جماعۃ وقید بغیر جماعۃ لان ذلک یقطع الصفوف وتسویۃ الصفوف فی الجماعۃ مطلوبۃ اھ (ص ۲۸۴ ج ۲) وفی الدر فی کراھۃ قیام الامام فی المحراب وعلی مکان مرتفع مانصہ وھذا کلہ عند عدم العذر کجمعۃ وعید فلو قاموا علی الرفوف والامام علی الارض او فی المحراب لضیق المکان لم یکرہ اھ (ص ۶۷۶ ج ۱) وذکر الحافظ فی الفتح عن المحب الطبری کرہ قوم الصف بین السواری للنھی الوارد عن ذلک ومحل الکراھۃ عند عدم الضیق اھ (ص ۴۷۷ ج ۲) قلت وکلام علمائنا یوافقہ فی ھذا التقیید واللہ اعلم

ستونوں کے درمیان صف بندی کرنا بلاعذر مکروہ ہے، مگر مانع اقتدا نہیں ہے، اور یہ کراہت عام ہے اس صورت کو بھی جبکہ صف ستونوں کے درمیان اس طرح باندھی جاوے کہ فرجہ باقی نہ رہے، کیونکہ اس صورت میں بھی ستون قاطع صف ہے، البتہ اگر جمعہ وعید کے موقع پر تنگی ہو تو ایسی حالت میں صف بین السواری بلاکراہت جائز ہے، واللہ اعلم، ۴ شوال ۴۶ھ

جماعت کے سنت مؤکدہ قریب من الواجب ہونے کا مطلب اور یہ کہ جماعت کن لوگوں پر واجب ہے، اسکی مختلف صورتوں کے متعلق استفتاء،

سوال (۴۶) ...... یہ جو فقہا نے لکھا ہے کہ جماعت پنجگانہ سنت مؤکدہ قریب بواجب ہے، یہ خاص مسجد محلہ میں محلہ والوں پر ہے یا عام ہے، مثلاً اہل محلہ نے گھر میں جماعت نماز پڑھ لی تو آیا اُن پر سے حضور مسجد محلہ کی جماعت کا سقوط ہوجائے گا یا نہیں، ایسا ہی کوئی باہر جانے والا ہے اپنی مسجد محلہ میں قبل جماعت فقط تین چار آدمیوں سے جماعت کرکے باہر چلا جاوے تو بھی جماعت ساقط ہوجاوے گی یا نہ؟

(۲) سوائے مسجد محلہ کے کوئی سفر میں ہو، یا اگر شرعی مسافر نہ ہو لیکن اپنے وطن کے سوا اور کہیں ہو تو بھی اس پر حضور مسجد کی جماعت کا لازم ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ جو

وعید تارکِ جماعت پر وارد ہوا ہے وہ مطلقاً جماعت کے تارک کیلئے ہے یا مسجد محلہ کی جماعت کے تارک پر؟ اکثر کتب میں اس کی تفصیل و تفریق نہیں لکھی ہے، اس لئے بعض اس کے قائل ہونے لگے ہیں کہ جماعت مؤکد عام ہے، اس کی تحقیق و تفصیل سے آگاہی بخشئے گا؟

**الجواب**: حنفیہ کے نزدیک صلوات مکتوبہ کی جماعت مسجد محلہ میں سنت مؤکدہ بلکہ واجب ہے، گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جاویگا، لیکن ترک سنتِ مؤکدہ اور ترکِ واجب کا گناہ ہوگا، قال فی التنویر والجماعة سنة مؤكدة للرجال واقلها اثنان وقيل واجبة وعليه العامة اھ قال فی الدر عن البحر وهو الوجوب الراجح عند اهل المذاهب اھ (ص ۵۷۶ ج ۱) اس سے تو جماعت کا وجوب معلوم ہوا، رہی اس کی دلیل کہ مسجد میں جماعت کرنا واجب ہے، سو حنفیہ سب اس پر متفق ہیں کہ اجابتِ اذان واجب ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ اجابت باللسان واجب ہے، یا بالقدم، شرنبلالی نے نور الایضاح و مراقی الفلاح میں دونوں کو واجب کہا ہے (ص ۱۰۰) اور قاضی خاں و حلوانی وغیرہ نے صرف اجابت بالقدم کو واجب کہا ہے، اور اجابت باللسان کو مستحب کہا ہے، قال فی البحر قال قاضی خان اجابة المؤذن فضيلة وان تركها لايأثم واما قوله عليه السلام من لم يجب الاذان فلاصلوٰة له فمعناه الاجابة بالقدم لا باللسان فقط اھ وقال الحلوانی الاجابة بالقدم لا باللسان حتى لو اجاب باللسان ولم يمش الى المسجد لايكون مجيبا ولو كان فی المسجد حين سمع الاذان ليس عليه الاجابة اھ (ص ۲۵۹ ج ۱) اور ظاہر ہے کہ اجابت بالقدم سے مراد یہی ہے کہ مسجد جاکر جماعت سے نماز پڑھے وفی رد المحتار فيما اذا فاتته الجماعة فی مسجد حية وذكر القدوری يجمع باهله ويصلی بهم يعنی و ينال ثواب الجماعة كذا فی الفتح وذكر الشرنبلالی بان هذا ينافی وجوب الجماعة واجاب بان الوجوب عند عدم الحرج وفی تتبعها فی الاماكن القاصية حرج مع مافی مجاوزة مسجد حية من مخالفة قوله صلى الله عليه وسلم لاصلوٰة لجار المسجد الا فی المسجد اھ (ص ۵۸۰ ج ۱)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ گھر میں جماعت کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ مسجدِ محلہ میں جماعت نہ مل سکی ہو، اور اگر مسجد محلہ میں جماعت ابھی نہیں ہوئی تو گھر میں جماعت



کرنا جائز نہیں، بحر میں ہے وسئل الحلوانی عمن يجمع باهله احيانا هل ينال ثواب الجماعة اولا قال لا ويكون بدعة ومكروها اھ (ص ۳۴۶ ج ۱) اس میں صاف تصریح ہے کہ گھر میں جماعت کرنا بدعت و مکروہ ہے، یعنی جب کہ مسجد محلہ میں جماعت ملنے کی امید ہو، اور اگر وہاں جماعت ہو چکی تو پھر گھر میں جماعت کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا، لیکن ترکِ جماعت فی المسجد کا گناہ بھی ہوگا، اگر اس نے قصداً کسل وغیرہ کی وجہ سے دیر کی ہو، اور اگر عذر شرعی کی وجہ سے دیر ہوگئی تو گناہ نہ ہوگا، پس صاحب قنیہ نے جو مطلقاً لکھا ہے اختلف العلماء فی اقامتها فی البيت والاصح انها كاقامتها فی المسجد الا فی الفضيلة وهو ظاهر مذهب الشافعی كذا فی حاشية البحر، یہ صحیح نہیں، کیونکہ اصحابِ مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں، اور صاحبِ قنیہ کی نقل ضعیف ہے، اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے عن ابن مسعود رضی الله عنه قال من سره ان يلقى الله غدا مسلما فليحافظ على هؤلاء الصلوات الخمس حيث ينادى بهن فان الله شرع لنبيه صلى الله عليه وسلم سنن الهدى فانهن من سنن الهدى وانی لا احسب منكم احد الاله مسجد فی بيته يصلی فيه فلو صليتم فی بيوتكم وتركتم مساجدكم لتركتم سنة نبيكم ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم الحديث اخرجه النسائی و اللفظ له ومسلم وابوداؤد ولفظ مسلم قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم علمنا سنن الهدى وان من سنن الهدى الصلوٰة فی المسجد الذی يؤذن فيه اھ، اس میں صاف مسجد میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنے کو سنت مؤکدہ اور گھر میں نماز پڑھنے کو ضلالت کہا ہے،

وعن ابن عباس رضی مرفوعا من سمع النداء ولم يجب فلا صلوٰة له الا من عذر صححه الحاكم وابن حبان، وعن علی رضی مرفوعا لا صلوٰة لجار المسجد الا فی المسجد رواه ابن حبان وسنده حسن والتفصيل فی اعلاء السنن

اور جو شخص سفرِ شرعی سے کم مسافت کا مسافر ہے وہ بحکم مقیم ہے، اس پر بھی جماعت مسجد کا اہتمام واجب ہے لاستثناء الفقهاء المسافر دون المقيم، البتہ اگر اس حالت میں جماعت سے کوئی دوسرا عذر مانع ہو تو تخلف عن الجماعۃ کی گنجائش ہے، والاعذار مذكورة فی الفقه بالبسط، واللہ اعلم

بدعتی اور غیر مقلد کی اقتدا کا حکم اور انہیں کون اور کس کی اقتدا بہتر ہے؟

**سوال** (۴۷) ۱ ہم لوگ تھوڑے آدمی اہل سنت والجماعت حنفی المذہب ہیں، ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ نے کوئی اچھی بات نہیں چھوڑی، جو کچھ ان سے ثابت ہو اس پر عمل کرنا چاہئے اپنی طرف سے کوئی نیا کام ایجاد نہ کرنا چاہئے، اپنے امام کا پورا مقلد حقیقی طور پر رہنا چاہئے۔

۲، دوسری جماعت جو اپنے کو حنفی اور مقلد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی کہتے ہیں تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بہت کام جس کا امام صاحب سے ثبوت نہیں کرتے ہیں، مثلاً مولود، وقت ذکر پیدائش قیام، فاتحہ مروجہ، گیارہویں، رجبی شریف، عرس، اور زیارت مزار بزرگان کے واسطے پھولواری شریف، اجمیر شریف، بہار شریف وغیرہ بھی جاتے ہیں، اذان میں اشہد ان محمد رسول اللہ پر جب مؤذن پہونچتا ہے تو یہ انگوٹھوں کے ناخن کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں، ان میں سے کوئی کام جائز ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے گا،

۳، تیسری جماعت ہے جو تقلید شخصی کو ناجائز کہتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق عمل چاہئے، البتہ قرآن و حدیث میں جو مسئلہ نہ ملے تو اماموں کا قول قابل عمل ہے، آمین آواز سے کہتے ہیں، رفع یدین کرتے ہیں، رکوع سے اٹھ کر اللھم ربنا لک الحمد پورا پڑھتے ہیں سجدہ سے اٹھ کر اللھم اغفرلی پورا پڑھتے ہیں، مولود، نیاز، گیارہویں، رجبی شریف عرس وغیرہ نہیں کرتے ہیں ۱۱

اب قابل غور بات یہ ہے کہ دو مسجدیں یہاں ہیں، ایک مسجد میں جماعت نمبر ۲ حنفی مذہب کے امام ہیں، جماعت بھی ان کی کثیر ہے، ہم لوگ جماعت ۱ ان کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو ہم لوگوں کے لڑکوں پر برا اثر ..... پڑتا ہے، یعنی یہ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی حنفی یہ بھی حنفی، تو اتنی بڑی جماعت جو کام کرتی ہے وہ ضرور جائز ہی ہوگا، ورنہ اُن کے علماء، تو منع کرتے، علماء، تو خود مولود، نیاز، عرس وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں، اور اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دوسری مسجد میں امام غیر مقلد ہیں، ان کی جماعت کثیر اس مسجد میں نماز پڑھتی ہے، یہاں ہم لوگ اگر نماز پڑھیں تو مقتدی بننا پڑتا ہے، ان کے ساتھ نماز پڑھنے میں ہم لوگوں کے لڑکوں پر برا اثر پڑنے کا خوف نہیں، کیونکہ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اُن کا مذہب ہی دوسرا ہے، مگر آمین، رفع یدین یہ لوگ کرتے ہیں، ایسی حالت میں ہم لوگوں کا جماعت ۲ کے ساتھ نماز پڑھنا بہتر ہے یا جماعت ۳ غیر مقلدوں کے



ساتھ نماز پڑھنا اچھا ہے،

**جوابات**: (۱) حنفی مقلدوں کو یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کتاب اللہ اور حدیث کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے جو کچھ انھوں نے مسائل شرعیہ بیان فرمائے ہیں وہ قرآن و حدیث کے خلاف ہرگز نہیں، اور خطاء سے بجز انبیاء کے کوئی معصوم نہیں، ممکن ہے کہ امام صاحب سے کسی جگہ خطا بھی ہوئی ہو، مگر یہ احتمال جیسا امام صاحب کے متعلق ہے تمام ائمہ اور محدثین کے متعلق بھی ہے، پس جو شخص کسی مسئلہ میں امام صاحب کو خطاء پر بتلائے اگر وہ مجتہد ہے تو ممکن ہے کہ خود اسی کا قول خطا ہو، اور اگر مجتہد نہیں تو اس کو امام صاحب جیسے مجتہد اعظم کی شان میں ایسی بات کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے، جو سخت بے ادبی ہے، پس حنفی یوں سمجھیں کہ ہم قرآن و حدیث ہی کا اتباع کرتے ہیں، اس تفسیر کے موافق جو امام ابوحنیفہ رح نے بیان فرمائی ہیں، اور جو لوگ مجتہد نہ ہوں ان پر واجب ہے کہ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کسی مجتہد کا اتباع کریں، محض اپنی سمجھ سے مطلب نہ گھڑیں، کیونکہ ہر علم میں ماہرین کا اتباع لازم ہے، اور قرآن و حدیث کے ماہر مجتہدین ہی ہیں،

(۲) یہ لوگ بدعتی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے، یہ امام ابوحنیفہ رح کے پورے مقلد نہیں بلکہ بہت باتیں اُن کے خلاف کرتے ہیں، چنانچہ جتنی باتوں کا اس نمبر میں ذکر ہے امام ابوحنیفہ رح نے ان کو جائز نہیں فرمایا، بلکہ ان کے مذہب کی رُو سے یہ سب بدعات ہیں،

(۳) یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اور اسلام میں جس قدر فتنے پیدا ہوتے ہیں ترک تقلید ہی سے پیدا ہوتے ہیں، پس حنفی مقلدوں کو نمبر ۲ و ۳ دونوں جماعتوں سے الگ رہنا چاہئے، اور کسی کے ساتھ بھی نماز نہ پڑھیں، بلکہ اپنی جماعت الگ کریں، اور بدرجہ مجبوری جماعت نمبر ۲ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں، کیونکہ وہ لوگ نماز، وضو، پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابوحنیفہ کے مذہب پر عمل کرتے ہیں تو حنفیوں کی نماز اپنے مذہب کے موافق صحیح ہو جاوے گی، اور جماعت ۳ وضو اور غسل اور پاکی ناپاکی کے مسائل میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کی بہت امور میں مخالف ہیں، ان کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ منی اُن کے یہاں پاک ہے، غسل جنابت میں کلی کرنا، ناک میں پانی دینا ان کے یہاں ضروری نہیں، خون، پیپ، قے وغیرہ سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا، کنویں میں چوہا وغیرہ مرنے سے کنواں ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتا، ایسی حالت میں اُن کے وضو اور پاکی کا کیا اعتبار، رہا اولاد کا بگڑنا سو اس کا اندیشہ غیر مقلدوں کے ساتھ

میل جول میں زیادہ ہے کیونکہ وہ خود نمازی کے اندر بہت باتیں ہمارے خلاف کرتے ہیں، جس سے بچوں کو وحشت ہوگی کہ یہ نئی باتیں کیسی ہیں، پھر ممکن ہے کہ وہ بھی غیر مقلد ہو جائیں اور یہ سخت فتنہ ہے، جس کے بعد ایمان کی خیر بہت کم ہے، واللہ اعلم، ۱۸ شوال ۴۶ھ

اگلی صف پُر ہونے کے بعد اکیلا آدمی کیا کرے؟

**سوال (۴۸)** ............ اگر کوئی شخص جماعت کھڑی ہونے کے بعد آئے اور تنہا ہو تو صف میں سے کسی نمازی کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے واسطے پیچھے کو کھینچے تو نیت اول باندھے (یعنی تکبیر تحریمہ اول کہی) یا بدون نیت (و تکبیر تحریمہ) باندھے کھینچ لے، اور اس کو اپنے برابر کھڑا کر کے نیت باندھے، اگر بدون نیت باندھے کھینچے گا تو تعلیم خارج تو نہ ہوگی؟

**الجواب**: آجکل کسی کو نہ کھینچے، نہ بعد تکبیر تحریمہ نہ قبل تکبیر تحریمہ، بلکہ مسبوق صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہو جاوے، اور تفرد خلف الصف میں جو کراہت ہے وہ جب ہے کہ صف میں فرجہ ہو، اور جب صف بھر گئی ہو پھر تفرد میں کراہت نہیں، آجکل فتویٰ اسی پر ہے، اور اگر کوئی مسئلہ جذب ہی پر عمل کرنا چاہے تو جذبِ عالم بعد التکبیر اولیٰ ہے، اور قبل التکبیر بھی جائز ہے، فساد کسی صورت میں نہیں، اور جذبِ جاہل میں فساد کا خوف ہے قال فی رد المحتار عن القہستانی عن الجلابی ان المقتدی یتأخر عن الیمین الی خلف اذا جاء آخر وفی الفتح ولو اقتدی واحد بآخر فجاء ثالث یجذب المقتدی بعد التکبیر ولو جذبه قبل التکبیر لا یضرہ اھ قلت ومسئلة المنفرد خلف الصف مثله، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۹ ربیع ا ۴۷ھ

حکم نزاع در امامت

**سوال (۴۹)** ......... جناب کو ماجرائے ذیل میں ثالث ہم لوگوں نے مانا ہے، جیسا فرمان ہو، عمل میں لاویں گے، ایک محلہ کے قدیمی دائمی امام قاری صاحب نے دوسرے ضلع میں بضرورت جانا چاہا، مصلی لوگوں نے جواب دیا کہ منشی لطف الرحمٰن غیر ملکی کو جیسا کہ آگے اور ایک سال چند روز جمعہ (یعنی الکلین) دیکر گئے تھے اب بھی دیئے جایئے، امام قدیم نے موافق اجازت مصلی نئے خطیب سے جا کر کہہ کر دوسرے ضلع کو چلے گئے، نئے خطیب نے بعد دو جمعہ آکر مصلیوں سے کہا کہ میں کئی جمعہ کے لئے قبول نہیں کرتا اگر برابر سرابرامامتی دوگے پڑھاؤں گا، مصلیوں نے مجبوراً کہا کہ آپ نئے امام ٹھیک ہیں اور قدیمی امام کو آئندہ نہیں رکھیں گے، اور قسم بھی اس پر کھائی، اب قدیمی امام آکر دعویدار ہوئے، اور فساد یہاں تک بڑھا کہ اب (اب سب مصلی اور قدیم وجدید دونوں امام جناب سے دست بستہ



عرض گذار ہیں کہ اس درمیانی قول و قرار و قسم کرنے سے نئے امام کا حق امامت کرنا ہے یا قدیم امام کا، موافق حکم و اجازت مصلی جو کہ نئے امام کو کہہ کر اور امامت کا حکم دے کر دوسرے ضلع گیا تھا، ابھی اسی کا دعویٰ اور حقِ امامت بحال رہے گا، کس کا خطیبی بحال رہے گا،

الحاصل مصلی لوگ اور دونوں امام قدیم محلہ و امام وخطیب غیر محلہ سب مل کر دستخط کر کے جناب سے مسئلہ طلب کرتے ہیں، اور ثالث مانتے ہیں کہ کون دائمی خطیب موافق شرع محمدی کے ہے، موافق اس کے عمل کریں گے،

**الجواب**: صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام قدیم رخصت لے کر گیا تھا مستعفی ہو کر نہیں گیا تھا، اور اہلِ محلہ یعنی مصلیوں نے امام جدید کو مقرر کرتے ہوئے امام قدیم کو اطلاع نہیں دی کہ تم کو معزول کر دیا گیا، اس لئے امام قدیم منصبِ امامت پر بدستور باقی ہے، فان الاجارة لا ینفسخ فیہما الا بحضرة المتعاقدین حقیقة او حکما ولم یوجد، اور اس کا دعویٰ حق بجانب ہے، کیونکہ نہ اُس نے استعفیٰ دیا، نہ اس کو عزل کی اطلاع دی گئی، اور امام جدید کا دعویٰ بھی حق بجانب ہے، کیونکہ جس وقت اس نے امامت سے انکار کیا تو اہلِ محلہ نے اس کو ہمیشہ کے واسطے امام بنا لیا، اور اس سے عہد بھی کر لیا تھا، پس امام قدیم اور امام جدید دونوں امامت کے عہدے پر قائم ہیں، اور ان ایام کی تنخواہ دونوں کو دینی پڑے گی، اور اب اہلِ محلہ کو اختیار ہے کہ اگر دونوں کو امام نہ رکھ سکیں تو ان میں سے ایک کو جواب دیکر الگ کر دیں، خواہ قدیم کو خواہ جدید کو، اور وسعت ہو تو دونوں کو امام بنا لیں، یہ تو صورت مسئولہ کا جواب تھا، اب بطور نصیحت کے لکھا جاتا ہے کہ اہلِ محلہ نے اس معاملہ میں سخت کوتاہی کی کہ جس وقت امام جدید کو مستقل امام دائمی بنایا تھا اس وقت امام قدیم کو اطلاع کیوں نہیں دی، کہ تم کو آج سے معزول کر دیا گیا، اور امام جدید نے یہ سخت بے مروتی کی کہ امام قدیم کے منصب کی طمع کی، اور اس کی جگہ پر قبضہ جمانا چاہا، اور امام قدیم نے یہ غلطی کی کہ جب اس کی جگہ اہلِ محلہ نے دوسرے کو رکھ لیا تھا تو اس میں آکر جھگڑا اور منازعت کی یہ امور علم و اسلام کی شان سے بہت بعید تھے، واللہ اعلم ۲۳ ربیع الثانی ۴۷ھ

صفِ اول میں امام کے پیچھے پھر داہنی اور پھر بائیں جانب کھڑے ہونے کی فضیلت

**سوال (۵۰)** جماعت کی نماز میں صفِ اول سب سے بہتر جگہ اس شخص کی ہے جو امام کے پیچھے ہوتا ہے اور اس کے بعد جو داہنی طرف اور بعد ازاں وہ شخص جو بائیں طرف ہے، اس ترتیب مراتب کے

بارے میں جو فقہاء کی عبارت ہو وہ بجنسہ تحریر فرمانے کا ارشاد فرمادیں، یہ ترتیب غالبًا بحرالرائق میں مذکور ہے، کتاب یہاں میسر نہیں آئی۔

**الجواب**، قال الشامی روی فی الاخبار ان اللہ تعالیٰ اذا انزل الرحمۃ علی الجماعۃ ینزلہا اولا علی الامام ثم تتجاوز عنہ الی من بحذائہ فی الصف الاول ثم الی المیامن ثم الی المیاسر ثم الی الصف الثانی اتمامہ فی البحر اھ ص ۵۹۴ ج ۱ قلت والحدیث اخرجہ فی کنزالعمال نحوہ قریبًا منہ والظاہر من جلالۃ السیوطی انہ لایسکت عن الموضوع فلا بأس فی الفضائل، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲ رمضان ۴۷ھ

**سوال (۵۱)** ظلم وفسق کا مرتکب لائق امامت نہیں ہے ...................... ایک نابینا حافظ راجپوت مسلمان قاضی صاحب کی بہن کو قرآن شریف پڑھانے جایا کرتے تھے، حافظ صاحب کو لوگوں نے منع کیا، حافظ جی پڑھانے سے منع نہ ہوئے، حافظ جی صاحب نے قاضی کی بہن کا نکاح اس کے تایازاد بھائی سے کردیا، ایک دن گھر میں خوشدامن کے ساتھ لڑائی ہوئی، طعنہ وتشنیع ہونے لگی، غرض قاضی کی بہن کو نکال دیا، اور پھر طلاق نامہ لکھ کر اس کو دیدیا، پھر عدتِ طلاق ختم کے بعد حافظ صاحب نے اپنی شاگردن سے نکاح پڑھوالیا، قاضی صاحب کی بہن کی اولاد حافظ صاحب کے تخم سے ہوئی، حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا، اب حافظ صاحب کے لڑکے مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ میں پڑھنے کے واسطے گئے تو قاضی صاحب نے اپنے بھانجوں کو نکلوادیا، اور یہ کہا یہاں پڑھنے مت آنا، جو پڑھنے آئے تو ماردیں گے، ایسے امام کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟

**الجواب**؛ اس قاضی امام کا ان بچوں کو یعنی بھانجوں کو مدرسہ سے نکالنا ظلم ہے، جو محض عصبیت اور جاہلیت پر مبنی ہے، اور ظلم وفسق ہے، لہذا جب تک یہ امام اپنے بھانجوں سے اس ظلم کو رفع نہ کرے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ کرے، امامت سے الگ کردیا جاوے، فقط واللہ اعلم،

**سوال (۵۲)** صحتِ اقتداء کیلئے علم بحالِ وانتقالاتِ امام شرط ہے، سماعِ صوت ضروری نہیں، دو منزلہ مسجد میں اگر اوپر کے درجہ پر امام مع معتقدین ہو اور نیچے بھی مقتدین ہوں یا بالعکس ہو تو علی الاطلاق سب کی نماز درست ہے، یا اس کے متعلق کچھ شرائط ہیں؟



مثلاً امام کی آواز سب کو پہونچنا ضروری ہے یا نہیں، اگر امام کی آواز نہ پہونچے تو مکبر کی تکبیر کافی ہے یا نہیں؟

**الجواب**، علم بحال الامام وبانتقالاتہ شرط ہے، خواہ سماع صوت امام سے ہو یا سماع صوتِ مکبر سے، اور ایک شرط یہ ہے کہ امام سے تقدم نہ ہو، اگر کوئی متقدم ہوگیا اس کی نماز درست نہ ہوگی،

**سوال (۵۳)** مسجدِ محلہ میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے جماعتِ ثانیہ جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**؛ محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰ صفر ۴۵ھ،

**سوال (۵۴)** پیش امام تیمم سے جماعت کراسکتا ہے یا نہیں؟ پیش امام تیمم سے جماعت کراسکتا ہے یا نہیں؟

**الجواب**؛ اگر امام نے کسی عذر سے تیمم کیا ہے تو شیخین کے نزدیک اس کی امامت صحیح ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک صحیح نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ کسی اور شخص متوضی کو امام بنایا جاوے، البتہ اگر اور کوئی شخص امامت کے قابل موجود نہ ہو تو خود ہی پڑھاوے، اور نمازِ جنازہ میں بالاتفاق امامت متیمم جائز ہے فی الدرالمختار وصح اقتداء متوضیٔ (لاماء معہ بمتیمم) وقال الشامی ای عندھما وقال محمدؒ لایصح فی غیر صلوٰۃ الجنازۃ (ص ۶۱۵ ج ۱) احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۲۹ ربیع الثانی ۴۵ھ

**سوال (۵۵)** مواضع وقف کے علاوہ وقف کرنیوالے کی نماز اور اس کی اقتداء کا حکم اگر قاری نے حالتِ نماز میں اضطرارًا ایسے موقع پر وقف کرکے اعادہ لفظ موقوف کا کیا جو نہ اوقاف معتبرہ میں سے کوئی وقف نہیں ہے، تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے، زید کہتا ہے کہ فقہاء نے تکرار کو مکروہ لکھا ہے، اور اس نے لفظ موقوف کا تکرار کیا، لہذا نماز مکروہ ہوئی، نیز ایسے شخص کی امامت جائز نہیں، ثبوت میں فتاویٰ عالمگیری باب الامامۃ کی یہ عبارت پیش کرتا ہے، ومن یقف فی غیر مواضعہ ولایقف فی مواضعہ لاینبغی لہ ان یؤم اب گذارش یہ ہے کہ تکرار کا اطلاق اعادہ لفظ موقوف پر بھی ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہو تو ابتداء مابعد سے کرنی ہوگی، اور یہ صورت قراء کی تصریح کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ وہ لوگ وقف قبیح پر اعادہ لازم کہتے ہیں، آیا یہ لزوم غیر نماز میں ہے یا نماز میں بھی، جواب بالتفصیل ارشاد فرماویں، بینوا توجروا

**الجواب**: بحالتِ اضطرار میں وقت اور تکرار کا مضائقہ نہیں اور ایک آدھ لفظ کے تکرار کو فقہاء نے مکروہ نہیں کہا، اور عالمگیریہ کی عبارت میں وہ شخص مراد ہے جو بلاضرورت بکثرت ایسا کرتا ہو، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ رج ا ۱۳۴۸ھ

**سوال (۵۶)** ...................... جماعت میں پوری صف ہونے کے بعد اگر کوئی شخص آوے اور داہنی بائیں صف میں جگہ باقی نہ ہو تو بائیں جانب سے کسی مقتدی کو کھینچے یا داہنی جانب سے یا بیچ سے، اندیشۂ فساد کی جگہ تو تنہا پیچھے کھڑا ہونا چاہئے، مگر جہاں اہلِ علم ہوں وہاں کس طرف سے کھینچے،

(جب صف میں جگہ نہ ہو تو بعد میں آنیوالا تنہا کھڑا ہو یا کیا کرے ؟؟)

**الجواب**: جب صف میں جگہ نہ ہو تو تنہا صف میں کھڑا ہونا مکروہ تو ہے نہیں جیسا کہ عالمگیری میں محیط سے بروایت محمد بن شجاع و حسن بن زیاد عن ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ ہے، اور صف سے کسی کو کھینچنے میں اندیشہ ہے اور کھینچنا ضروری ہے نہیں فقط اولیٰ ہے، اس واسطے فقہاء نے اب اس سے مطلقاً منع کر دیا ہے، اور تنہا کھڑا ہونے کو اولیٰ قرار دیا، فی الطحاوی علی مراقی الفلاح الاصح انہ ینتظر الی الرکوع فان جاء رجل والا جذب الیہ رجلاً ودخل فی الصف والقیام وحدہ اولیٰ فی زماننا لغلبۃ الجہل فلعلہ اذا جرہ تفسد صلوٰتہ، اور اس میں یہ تفصیل کہ اگر عالم بالاحکام ہو تو اس کو کھینچ لے ورنہ نہیں قیل کے ساتھ نقل کی ہے، اور ایسے موقع پر اندیشۂ فساد کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عین اس وقت اس شخص سے فسادِ صلوٰۃ متوہم ہو جس کو کھینچنا چاہتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کو شائع کرنے سے اور اس پر عمل کرنے سے اندیشہ ہے کہ عوام اپنی نمازیں توڑلیں گے، غلبۂ جہل سے اس طرف اشارہ ہے کہ گو قلیل مقدار میں عالم ہیں، مگر کثرت کے اعتبار کر کے سب جگہ یکساں عمل کریں گے واللہ اعلم، باقی رہی یہ بات کہ اگر کوئی بنا بر جواز کسی عالم بالاحکام[عہ] کو کھینچنا چاہے تو کس جگہ سے کھینچے تو اس کا جزئیہ تو ملا نہیں، لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع تک انتظار کرے کہ شاید کوئی نمازی آجاوے، اور اگر نہ آوے تو درمیان سے کھینچے، کیونکہ اس میں ایک ہی خرابی ہے، کہ صف مقدم میں جگہ خالی رہے گی، اور کنارہ سے کھینچنے میں اس کے علاوہ یہ بھی

عہ اس کے ساتھ ہی ایک قید مراقی الفلاح میں یہ بھی ہے لایتأذی بہ ۱۲ منہ



خرابی ہے کہ صف آخر درمیان سے شروع نہ ہوگی، اور جب ہے کہ دونوں جگہ عالم بالاحکام موجود ہوں، ورنہ جہاں ہو وہیں سے گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اسلم یہی ہے کہ تنہا کھڑا ہو جاوے، اور قواعد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کھینچنے کے بعد اگر کوئی شخص آجاوے تو جدید آنیوالے کو چاہئے کہ صف مقدم میں جو جگہ خالی ہو اس کو پُر کرے، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۷ رمضان ۱۳۴۸ھ

**سوال (۵۷)** ...................... بوجہ گرمی امام دالانِ مسجد اور صحنِ مسجد کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جا کر جماعت کرے تو اس کا یہ طرز عمل از روئے شرع شریف صحیح ہوگا یا خلاف اور نماز ایسی صورت میں ہو جاوے گی، یا دوبارہ پڑھنی پڑے گی، اس کا جواب باصواب باتشریح مع حوالہ جات تحریر فرمائیں، بینوا توجروا ؟

(مسجد کی چھت پر بلاضرورت جماعت کرنا مکروہ ہے)

**الجواب**: نماز صحیح تو ہو جاوے گی، دوبارہ پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں، مگر بلاضرورت مسجد کی چھت پر جانا اور نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس واسطے اس سے پرہیز کرنا چاہئے، کما قال العلامۃ الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ تحت قول التنویر (والوطئ فوقہ) ثم رأیت القہستانی نقل عن المفید کراھۃ الصعود علی المسجد اھ ویلزمہ کراھۃ الصلوٰۃ ایضاً فوقہ فلیتأمل، اور گرمی کی شدت بھی ضرورت اور عذر میں داخل ہے یا نہیں اس کی تصریح نہیں ملی، مگر بظاہر عذر[عہ] نہیں معلوم ہوتا، اس لئے احقر کے نزدیک چھت پر جماعت کرنا مکروہ ہے و ہو الاحوط، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۱ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ

**سوال (۵۸)** ایک شخص امام مسجد مقرر ہے اب اس امام کو کوئی مرض لاحق ہوا ہے، جس کی وجہ سے جلوس عورتوں کی طرح پیر ایک طرف نکال کر کرتا ہے، نیز بیٹھک اوٹھک میں ہاتھ سے ٹیک لگاتا ہے، ایسے شخص کو امام مقرر رکھنا کیسا ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے، اگر کراہت ہے تو کیسی؟

(تورک واعتماد معذور اور ایسے شخص کی اقتداء کا حکم)

**الجواب**: اس کی امامت درست ہے، کچھ کراہت نہیں، تورک واعتماد غیر معذور کے لئے مکروہ ہے، معذور کے لئے مکروہ نہیں، فقد فعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین بدن لکبرہ، ۲۰ محرم ۱۳۴۹ھ

عہ چونکہ یہ جزئیہ کہیں مصرح نہیں اسی لئے دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جائے ۱۲ منہ

## فصل فی المسبوق واللاحق

**مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ وہ سجدۂ سہو میں امام کی متابعت کرے اور امام پر سجدۂ سہو واجب نہ ہو**

**سوال (۱)** ..................... میں نے ایک مرتبہ جناب سے سجدۂ سہو کے متعلق دریافت کیا تھا، اگر بلاضرورت سجدۂ سہو کرلیا جاوے تو کیا نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے؟ چنانچہ جناب نے حسب ذیل فتویٰ صادر فرمایا:۔

(نقل فتویٰ) اگر مصلی سجدۂ سہو کی ضرورت سمجھ کر سجدۂ سہو کرے اور بعد میں معلوم ہو کہ سجدۂ سہو کی ضرورت نہ تھی تو اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب نہیں، الامداد کی عبارت میں دیکھوں تو اس کو حل کرسکتا ہوں، قال فی حاشیۃ نور الایضاح ولو تابع المسبوق امامہ فی سجود السہو فتبین انہ لاسہو علیہ فصلوٰۃ المسبوق جائزۃ عند المتاخرین وعلیہ الفتویٰ اھ (ص ۱۹۷) قلت وھذا فرع لصحۃ صلوٰۃ الامام فان صلوٰۃ المسبوق تفسد بفساد صلوٰۃ امامہ کما لایخفی، الامداد کی عبارت حسب ذیل غور فرمائیے، الامداد بابت ماہ رجب ۱۳۳۳ھ (ص ۱۹)

(سوال) اگر آخرین میں کسی نے ضم سورۃ سہواً کیا اور اس نے سجدۂ سہو اس کو موجب سہو سمجھ کر کرلیا تو نماز ہوجاوے گی یا نہیں، آیا سجدۂ بے ضرورت کو زیادت فی الرکن قرار دیکر اعادۂ صلوٰۃ لازم قرار دیں گے یا نہیں؟

(جواب) فی الدر المختار واجبات الصلوٰۃ ولفظ السلام مرتین فالثانی واجب (وفیہ قبیل باب الاستخلاف ولو ظن الامام السہو فسجد لہ فتابعہ المسبوق) فبان ان لاسہو فالاشبہ الفساد لاقتدائہ فی موضع الانفراد ........ وفی رد المحتار وفی الفیض وقیل لاتفسد وبہ یفتی وفی البحر عن الظہیریۃ قال الفقیہ ابو اللیث فی زماننا لاتفسد لان الجہل فی القراء غالب اھ، وفی الخلاصۃ اذا ظن الامام ان علیہ سہواً فسجد للسہو وتابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سہو فیہ روایتان اختلف المشایخ لاختلاف الروایتین واشہرہما ان صلوٰۃ المسبوق نفسہ وقال الامام ابو حفص الکبیر لایفسد والصدر الشہید اخذ بہ فی واقعاتہ



ص ۶۶۳ ج ۱۶۴)

ان روایات سے امور ذیل مستفاد ہوتے، نمبر ۱ نماز ہوجاوے گی، نمبر ۲، اگر دونوں طرف سلام پھیرا ہے تو اعادہ واجب نہیں اور ایک طرف سلام پھیرا ہے تو چونکہ ایک واجب یعنی سلام ثانی ترک کردیا اعادہ واجب ہوگا، نمبر ۳، اگر یہ شخص امام ہے تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسبوق ہوا اور اس نے بھی سجدۂ سہو اور اس کے بعد قعدہ میں اس کا اقتداء کیا، اس مسبوق کی نماز در مختار کے قول پر اور وہی مقتضا قواعد کا بھی ہے فاسد ہوگئی لیکن اگر اس مسبوق کو اس فضول سہو کا پتہ ہی نہ لگا، تو یہ معذور ہے، اور میرے نزدیک صاحب فیض اور ابو اللیث کے حکم عدم فساد کا محل اسی کو قرار دیا جاوے تو بہتر ہے کہ جب مسبوق کو پتہ نہ لگے، پس دونوں قولوں میں تطبیق ہوجاوے گی،

**الجواب**؛ مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، جناب کا والا نامہ موصول ہوا تھا، میں سفر میں تھا، اس لئے دیر ہوئی، پھر حضرت مولانا سے دریافت کا موقعہ نہ ملا، کہ آج آپ کا دوسرا خط موصول ہوا تو میں نے اس کی بابت حضرت مولانا سے عرض کیا، حضرت کے ارشاد کے بعد جو رائے میری قائم ہوئی وہ یہ ہے کہ الامداد میں قواعد کے موافق جواب دیا گیا ہے، اور احقر نے متاخرین کے قول مفتیٰ بہ کے موافق جواب دیا ہے، رہا سلام کا مسئلہ تو الامداد میں ایک سلام کے بعد نماز کو ختم مانا ہے، اور دوسرا سلام گویا فوت ہوا اور میرا یہ خیال ہے کہ ایک سلام کے بعد جب سجدۂ سہو کیا گیا پھر دونوں طرف سلام پھیرا گیا تو اس سلام سے سلام ثانی کی قضا ہوگئی، گویا کہ سلام ثانی فوت نہیں ہوا، بلکہ مؤخر ہوا، رہا یہ کہ اس تاخیر سے سجدۂ سہو دوبارہ لازم ہونا چاہئے، اس کا جواب ظاہر ہے کہ ایک بار سجدۂ سہو تمام سہوات کے لئے کافی ہے، بہرحال اس صورت میں اعادۂ صلوٰۃ واجب نہیں، ہذا ما علمتہ واللہ اعلم، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلیں اور جو محقق ہو اس سے مجھے بھی اطلاع دیں۔

فقط　۱۳ ر رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ

**مسبوق نے غلطی سے سلام پھیر دیا اور پھر کسی کے کہنے پر کھڑا ہوگیا**

**سوال (۲)** امام نے سلام پھیرا اور مسبوق نے نادانی یا سہو سے سلام پھیر دیا یا چپ بیٹھا رہا تب امام یا دوسرے مقتدی کے (جواب خارج نماز میں ہی) بتلانے سے وہ خیال کیا کہ نماز باقی رہی باقی پڑھی، یہ درست ہوا یا نہ؟

**الجواب**؛ اس حالت میں سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی، اور مقتدی

خارج صلوٰۃ یا امام فارغ عن الصلوٰۃ کے بتلانے سے اگر مسبوق کو یاد آگیا اور اپنی یاد پر کھڑا ہوا تو نماز فاسد نہیں ہوئی بشرطیکہ کوئی عمل منافی صلوٰۃ نہ کیا ہو، پس اگر امام کے سلام کے بعد فوراً بتلانے سے کھڑا ہوا تب تو سجدۂ سہو بھی نہیں، اور تین سبحان اللہ کی مقدار دیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہے، ۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ

**مسبوق اگر امام کے ساتھ سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟**

**سوال** (۳) اگر مسبوق نے امام کے ساتھ سجدۂ سہو میں یہ سمجھ کر سلام پھیرا کہ مجھ کو بھی دیگر مقتدیوں کی طرح سلام پھیرنا چاہئے تو اس کا کیا حکم ہے، اور سہواً سلام پھیرا تو کیا حکم ہے؟

**الجواب**؛ قال فی الدر ولو سلم (المسبوق) ساھیا ان بعد امامه لزمه السھو والا لا قال الشامی قوله ولو سلم ساھیا قید به لانه لو سلم مع الامام علی ظن ان علیه السلام معه فھو سلام عمد فتفسد کما فی البحر عن الظھیریة اھ ص ۶۳۶ ج ۱ وفی الخلاصة المسبوق اذا سلم مع الامام علی ظن ان علیه ان یسلم مع الامام فھو سلام عمد ایمنع البناء اھ ص ۱۶۹ ج ۱، صورت اولیٰ میں جب کہ مسبوق نے سلام سہو میں امام کی متابعت عمداً کی ہے مسبوق کی نماز فاسد ہوگئی، اور صورتِ ثانیہ میں جبکہ سہواً سلام پھیر دیا تو حکم یہ ہے کہ اگر یہ سلام امام کے ساتھ پھیرا تب تو مسبوق پر کچھ نہیں، لکونہ مقتدیاً فی ہذہ الحالۃ وسھو المقتدی لایوجب شیئاً، اور اگر امام کے بعد سلام پھیرا تو مسبوق کے ذمہ سجدۂ سہو لازم آئے گا، لکونه منفرداً فی ھذه الحالة وسھو المنفرد یوجب سجود السھو، میں کہتا ہوں کہ مقتضیٰ قیاس کا یہ ہو کہ اس صورت میں بھی مسبوق پر سجدۂ سہو لازم نہ آوے، کیونکہ اگر اس نے امام کے بعد بھی سلام پھیرا ہو جب بھی وہ شرکتِ سجودِ سہو کی وجہ سے حالتِ اقتداء کی طرف لوٹ آیا تو یہ سہو بھی سہوِ منفرد نہیں بلکہ سہوِ مقتدی ہے وھو لایوجب شیئا قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاح اما سلامه بعد سلام الامام من سجود السھو فلا یلزم به سھو لانه لما سجد للسھو معه عاد الی الاقتداء ولا سھو علی المقتدی فتأمل فیه کلام اھ ص ۲۶۹ ج ۱، ۲ر شعبان ۱۳۴۱ھ

**امام کے ساتھ ایک رکعت پانیوالے مسبوق پر ایک رکعت ادا کرنیکے بعد قعدہ لازم ہے یا نہیں؟**

**سوال** (۴) درمختار کی اس عبارت فمدرک رکعة من غیر فجر یاتی برکعتین بفاتحة وسورة وتشھد بینھما سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ثلاثی اور رباعی نماز کی ایک رکعت پانے والے مسبوق ایک رکعت تسلیم



امام کے بعد پڑھ کر وجوباً قعدہ کرے اور تشہد پڑھے، اور اگر نہ کیا تو سجدہ سہو کرنا چاہئے، ورنہ کراہت تحریمی ہوگی اور تشہد بینھما کے تحت میں علامہ شامی نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ قال فی شرح المنیة ولو لم یقعد جاز استحسانا لا قیاسا ولم یلزمه سجود السھو لکون الرکعة اولیٰ من وجه، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قعدہ اور تشہد مذکورہ واجب وضروری نہیں، ورنہ سجدۂ سہو یا اعادہ واجب ہوتا، اگر ترک کی صورت میں نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوتی ہے یا سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، تو حضور تکلیف فرما کر اثباتِ مدعیٰ کے لئے کوئی عبارة علاوہ ان عبارات کے تحریر فرماویں تاکہ اطمینان ہو ورنہ متن وشرح کی عبارت کی توجیہ فرمادیں کہ بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں،

**الجواب**؛ قال فی الدر فی احکام المسبوق ویقضی اول صلوته فی حق قرأة واٰخرھا فی حق تشھد اھ وفی رد المحتار ھذا قول محمد رح کما فی مبسوط السرخسی وعلیه اقتصر فی الخلاصة وشرح الطحاوی والاسبیجابی والفتح والدرر والبحر وغیرھم وذکر الخلاف کذلک فی السراج لکن فی صلاة الجلابی ان ھذا قولھما وتمامه فی شرح الشیخ اسمٰعیل وفی الفیض عن المستصفی لو ادرکه فی رکعة الرباعی یقضی رکعتین بفاتحة وسورة ثم یتشھد ثم یاتی بالثالثة بفاتحة خاصة عند ابی حنیفة رح وقالا رکعة بفاتحة وسورة وتشھد ثم رکعتین اولاھما بفاتحة وسورة وثانیتھما بفاتحة خاصة وظاھر کلامھم اعتماد قول محمد رح اھ ص ۴۲۳ و ۴۲۴ ج ۱، وفی کتاب الاٰثار لمحمد قال اخبرنا ابو حنیفة رح عن حماد عن ابراھیم ان مسروقا وجندبا دخلا فی صلوٰة الامام فی المغرب فادرکا معه رکعة وسبقھما برکعتین فصلیا معه رکعة ثم قاما یقضیان فاما مسروق فجلس فی الرکعة الاولیٰ التی قضی واما جندب فقام فی الاولیٰ وجلس فی الثانیة فلما انصرفا اقبل کل واحد علی صاحبه ثم انھما تساوقا الی عبد اللہ بن مسعود فقصا علیه القصة فقال کلا کما قد احسن وان اصلی کما صلی مسروق احب الی قال محمد رح وبقول ابن مسعود رض ناخذ یجلس فی الرکعتین جمیعا اللتین فاتاه وھو قول ابی حنیفة رح اھ ص ۲۷،

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ درمختار میں جو قول نقل کیا ہے وہ افضل ہے، اور اگر ثلاثی ورباعی نماز کی ایک رکعت پانے والا مسبوق تسلیم امام کے بعد ایک رکعت پڑھکر قعدہ نہ کرے بلکہ دو رکعت کے بعد قعدہ کرے تو یہ بھی جائز ہے، اور سجدۂ سہو لازم نہیں آئیگا واللہ اعلم، ۲۳ر شوال سنہ ۱۳۴۱ھ،

امام اگر چار رکعت کے بعد سہواً کھڑا ہوجاوے تو کیا مسبوق اس کی اقتداء کرے،

**سوال** (۵) چار رکعت والی نماز میں اگر امام قعدہ اخیرہ کرکے سہواً کھڑا ہوجاوے، اور دو رکعت اور منضم کرے تو ان دو رکعت میں مسبوق اس امام کی اقتداء کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور در صورت جواز یہ دو رکعت مسبوق کے ...... حق میں کیا ہوگی؟

**الجواب**: قعدۂ اخیرہ کے بعد اگر امام سہواً کھڑا ہوجاوے تو مسبوق کو اس زائد نماز میں اقتداء جائز نہیں، اگر اقتداء کرے گا تو مسبوق کی نماز فاسد ہوجاوے گی، قال فی الدر ولو قام امامه لخامسة فتابعه ان بعد القعود تفسد والا لا اھ قال الشامی قوله تفسد ای صلوٰة المسبوق لانه اقتداء فی موضع الانفراد اھ (ص ۶۲۶ ج ۱) واللہ اعلم، ۴ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۱ھ

مسبوق کی نماز کا حکم جبکہ امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے، حالانکہ امام پر سجدۂ سہو واجب نہ تھا

**سوال** (۶) فرض نماز میں اگر امام نے سجدہ سہو کیا، اور پھر معلوم ہوا کہ جس صورت میں سجدۂ سہو کیا ہے، اس میں سجدۂ سہو واجب نہیں تھا، یعنی کوئی واجب ترک نہیں ہوا تھا، تو اس صورت میں جو ایسے مقتدی ہیں جن کی کوئی رکعت جماعت سے جاتی رہی ہے، مثلاً ایک یا دو رکعت ہونے کے بعد شریک جماعت ہوئے ہیں، اور امام کے ساتھ انھوں نے بھی سجدۂ سہو کیا ہے، تو ان کی نماز میں کچھ نقص تو نہ ہوگا؟

**الجواب**: اس میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں مسبوق کی نماز فاسد ہے، اور دوسری میں فاسد نہیں، کما فی الخلاصة (ص ۱۶۳ ج ۱) اور عموم بلویٰ کی وجہ سے میں دوسری صورت میں فتویٰ دیتا ہوں، ۲ر جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۴ھ

نماز مغرب میں امام نے سہواً چوتھی رکعت ملا کر سلام پھیر دیا اور دوبارہ نماز پڑھائی تو جو لوگ پہلی جماعت کی دوسری یا بعد کی رکعتوں میں شریک ہوئے تھے وہ دوسری جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

**سوال** (۷) امام نے مغرب کی نماز قاعدہ کے موافق تین رکعت پوری کرکے چوتھی رکعت سہواً اور پڑھادی



بعد سلام کے مقتدیوں نے یاد دلایا کہ چار رکعت ہوئی ہیں، امام نے یہ سن کر دوبارہ پھر نماز پڑھادی، سو یہ نماز یقیناً ادا ہوگئی ہوگی، اب اس میں دو بات اور قابلِ تحقیق ہیں،

(۱) پہلی نماز میں جو لوگ دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت میں آکر شریک ہوئے تھے وہ بھی اس اعادہ میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں (۲) جو لوگ اس اعادہ میں والی نماز میں از سر نو شریک ہوئے ہیں ان کی نماز بھی ہوجاوے گی یا نہیں؟

**الجواب**: اس کے متعلق جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن قواعد سے اختلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے ادون ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں، اور صورتِ مذکورہ فی السوال میں اعادہ کیا جاوے تو اس میں یہ اختلاف ہے کہ دوسری نماز یا فرض واقع ہوگی یا نماز اوّل کے لئے جابر ہوتی ہے، اس لئے اعادۂ مذکورہ کے وقت کسی نئے آدمی کی اقتداء میں اختلاف ہوگا، اور چونکہ مختار قول ثانی ہے، کما صرح فی الدر مع شرحہ ص ۴۷۶ ج ۱، اس لئے اقتداء نہ کرنا مختار ہوگا، اور جس شخص نے چوتھی رکعت میں اقتداء کی ہے چونکہ اس کی اقتداء صحیح نہیں ہوئی، (کما فی الشامی ص ۴۸۲ ج ۱ تمہ، لو اقتدیٰ به مفترض فی قیام الخامسة بعد القعود قدر التشهد لم یصح ولو عاد الی القعدة) اس لئے وہ اس شخص کے مانند ہے جو پہلی نماز میں بالکل شامل نہیں ہوا، اور دوسری تیسری رکعت میں شامل ہونے والوں نے اگر اپنی وہ رکعت جس میں یہ مسبوق ہیں ادا کرلی ہے تب تو جماعت ثانیہ میں شریک ہوجاویں، اور اگر دوسری جماعت کی تیاری سن کر انھوں نے نماز توڑ دی ہے تو وہ بھی نئے اشخاص کے حکم میں ہوں گے، کما لا یخفی، واللہ اعلم،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ　　　　کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ،

حکم اقتداء مسبوق بوقت سلام امام

**سوال** (۸) اگر مسبوق نمازی جماعت میں ایسے وقت آکے ملے کہ وہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے صرف نیت ہی باندھنے پایا یا قعدہ میں ملنے کے لئے کچھ تھوڑی ہی جھکا تھا، مگر قعدہ نہ مل سکا، اور امام نے سلام پھیر دیا، تو یہ فرمایئے کہ وہ مسبوق نمازی جماعت میں شامل ہوا یا نہیں، اگر جماعت میں شامل ہوا نہیں تو اسی نیت سے اپنی نماز فرداً پوری کرے، یا پھر سے علیحدہ نماز کی نیت کرے؟

**الجواب**: قال فی الدر لو کبر قائما فرکع ولم یقف صح لان ما اتی به الی ان یبلغ الرکوع یکفیه قنیه ص ۴۶۳ ج ۱ وفی الشر بنلالیة والثانی من شرط

عہ یعنی جب کوئی واجب ترک ہوا ہو ۱۲

صحۃ التحریمۃ الاتیان بالتحریمۃ قائما اومنحنیا قلیلا قبل وجود انحنائہ بما ھو اقرب للرکوع قال فی البرھان لوادرک الامام راکعا فحنی ظھرہ ثم کبر ان کان الی القیام اقرب صح الشروع ولو اراد بہ تکبیر الرکوع وتلغو نیتہ لان مدرک الامام فی الرکوع لایحتاج الی تکبیر مرتین خلافا لبعضھم وان کان الی الرکوع اقرب لایصح التحریمۃ اھ ص ۱۲۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لئے بقدر اللہ اکبر قیام کافی ہے، زیادہ کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ مصلے پر تحریمہ کے بعد قیام بھی فرض ہو، صرف صحتِ تحریمہ کے لئے ادراکِ رکوع وغیرہ میں قیام زائد علی قدر اللہ اکبر لازم نہیں، پس اگر سلام امام سے پہلے نیتِ صلوٰۃ کے بعد اللہ اکبر کہہ لے تو اقتدا صحیح ہوگئی، گو جھکنے بھی نہ پایا ہو، بیٹھنے بھی نہ پایا ہو، اور اللہ اکبر کے بعد وقفہ بھی نہ ہوا ہو، واللہ اعلم، ۲۲ر صفر ۴۶ھ

مسبوق امام کے قعدۂ اخیرہ میں تشہد درود دونوں پڑھے یا فقط تشہد پر اکتفا کرے،

**سوال** (۹) مسبوق قعدۂ اخیرہ میں تشہد اور درود شریف دونوں پڑھے یا فقط تشہد یا ساکت رہے، اور دعاء ماثورہ پڑھے یا نہیں؟

**الجواب**: غالباً قعدۂ اخیرہ سے مراد وہ قعدہ ہے جو امام کا قعدۂ اخیرہ ہے، سو اس میں مسبوق کو صرف تشہد پڑھنا چاہئے، خواہ تشہد کو آہستہ آہستہ ٹھہر کر اس طرح پڑھے کہ سلام امام تک ممتد ہوجائے یا تشہد کو مکرر پڑھتا رہے، اس پر درود دعا کا اضافہ نہ کرے، ۱۴ر رجب ۴۷ھ

امام قعدۂ اخیرہ کے بعد سہواً پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے اور مسبوق امام سے علیحدہ اپنی نماز پوری کردے تو سجدۂ سہو میں امام کیساتھ شریک ہو یا نہیں، اور شریک ہوجائے تو اس کی نماز ہوجائے گی یا فاسد ہوگی؟

**سوال** (۱۰) مسبوق کا امام قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر سہو سے پانچویں رکعت کو کھڑا ہوگیا مسبوق بعد کھڑے ہوجانے کے امام کے اپنی بقیہ نماز امام سے علیحدہ ہوکر پڑھنی شروع کردے، اور امام نے ابھی تک پانچویں رکعت کا سجدہ بھی نہ کیا تھا مگر امام پانچویں رکعت کا رکوع کرچکا تھا اور اس مسبوق نے اپنی بقیہ نماز کی امام سے علیحدہ ہوکر مع رکوع سجدہ کے ایک رکعت پوری کرلی اور امام کو پانچویں رکعت کا رکوع کرنے کے بعد پانچویں رکعت میں ہونا یاد آیا اور امام سجدۂ سہو کی طرف لوٹا تو یہ مسبوق ایک رکعت



علیحدہ پڑھنے کے بعد سجدۂ سہو میں امام کا شریک ہووے یا نہیں، اور اگر شریک ہوگیا ہو تو اس مسبوق کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہوا تو یہ مسبوق اپنی بقیہ نماز پوری کرکے قعدۂ اخیرہ میں سجدۂ سہو کرے یا نہیں، اور اگر شریک نہ ہوا اور سجدۂ سہو بھی نہ کیا تو مسبوق کی نماز فاسد ہوجاوے گی یا نہیں؟ مفصل تحریر فرمایئے گا،

**الجواب**: قال فی الخلاصۃ الامام اذا قام الی الخامسۃ وتابعہ المسبوق ان کان قعد الامام علی الرابعۃ تفسد صلوٰۃ المسبوق وان لم یکن قعد لا تفسد حتی یقید الخامسۃ بالسجدۃ فان قید فسدت صلوٰۃ الکل اھ، (ص ۱۶۴ ج ۱) وفی الدر ولو اقام امامہ لخامسۃ فتابعہ ان بعد القعود تفسد والا لا اھ قال الشامی تفسد ای صلوٰۃ المسبوق لانہ اقتدا فی موضع الانفراد ولان اقتداء المسبوق بغیرہ مفسد کما مر وقولہ والا لا، لان ما قام الیہ الامام علی شرف الرفض ولعدم تمام الصلوٰۃ اھ (ص ۶۲۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر پانچویں رکعت کی طرف کھڑا ہوجائے تو اب مسبوق کو اس کا اتباع نہ کرنا چاہئے، بلکہ اس سے علیحدہ ہوکر اپنی نماز پوری کرلینا چاہئے، اور اگر اس نے پانچویں رکعت میں امام کی موافقت کی تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی، اور عدم موافقت کی صورت میں مسبوق پر سجدۂ سہو لازم نہ آئے گا، کیونکہ امام پر یہ سہو ایسی حالت میں لازم آیا ہے، جبکہ مسبوق منفرد ہوچکا ہے، اور اگر امام خامسہ کے سجدہ سے پہلے سجدۂ سہو کی طرف لوٹ آئے جب بھی مسبوق اس کی موافقت نہ کرے بلکہ اگر موافقت کریگا نماز فاسد ہوجائے گی، ۵ر شوال ۴۷ھ

مسبوق کے شاملِ جماعت ہوتے ہی امام سلام پھیردے تو وہ تشہد پڑھے یا نہیں؟

**سوال** (۱۱) مسبوق کے اقتدا کرکے بیٹھتے ہی امام نے سلام پھیر دیا، اب وہ مسبوق تشہد پڑھ کے کھڑا ہوگا یا کیا کرے گا؟

**الجواب**: مسبوق کے شامل ہوتے ہی اگر امام سلام پھیردے تب بھی مسبوق کو تشہد پوری کرکے کھڑا ہونا چاہئے، کما فی الدر (بخلاف سلامہ) اوقیامہ الی الثالثۃ (قبل اتمام التشھد) فانہ لایتابعہ بل یتمہ لوجوبہ ولو لم یتم جاز وقال الشامی ای ولو خاف ان تفوتہ الرکعۃ الثالثۃ مع الامام کما

صرح به فی الظہیریة وشمل باطلاقه مالواقتدی به فی اثناء التشہد الاوّل او الاخیر فحین قعد قام امامه اوسلّم ومقتضاه انه یتم التشہد ثم یقوم ولم اره صریحا ثم رأیته فی الذخیرة ناقلًا عن ابی اللیث المختار عندی انه یتم التشہد وان لم یفعل اجزأه اھ وللہ الحمد (وقوله جاز) ای صح مع کراھة التحریم کما افادہ ح ونازعه ط والرحمتی الخ (ص ۱۵) قلت وکذا قوله اجزأہ یحمل علی الاجزاء مع الکراھة کما لایخفی، واللہ اعلم،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۲۷/ج۱/۱۳۴۵ھ، کتبہ الاحقر عبدالکریم ۲۷/ج۱/۱۳۴۵ھ

## فصل فی الحدث فی الصلوٰۃ

خون غیر سائل ناک سے نکلنے کے بعد اگر ہاتھ سے پونچھا اور آخر نماز تک ہاتھ پر رہا تو نماز ہوجائے گی

**سوال** (۱) ایک شخص نے وضو کیا، بعد میں وہ نماز کے لئے کھڑا ہوا اور اس کو نماز کے اندر ناک کے اوپر سے خون نکلا اور جاری نہیں ہوا، اور اس نے نماز کے اندر ہاتھ سے پونچھا، اور ہاتھ پھر اخیر تک رہنے دیا، پھر نماز ختم کی، تو آیا اس صورت میں نماز ہوگئی یا نہیں؟ اس کو مع کتاب کے حوالے کے جواب دیدیں،

**الجواب**: قال فی الدر الکنز وغیرہما لیس بحدث فلیس بنجس، صورت مسئولہ میں نماز درست ہوگئی، کیونکہ جب خون بہا نہیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹا، اور جس چیز کے نکلنے سے وضو نہ ٹوٹے وہ پاک ہے، تو یہ خون پاک تھا، اس کے ہاتھ میں لگے رہنے سے نماز میں خرابی نہ آئے گی، ۳۰ محرم ۱۳۴۵ھ

## فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا،

نماز میں چیخنے، چلانے اور اچھلنے کودنے کا حکم،

**سوال** (۱) ......................... ضلع بریسال میں ایک فرقہ درویش چشتیہ طریقہ کا ہے، ان لوگوں میں ایک عجیب حال یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ گاہ بگاہ چیخیں مارتے ہیں اور یہ حال نماز میں زیادہ ہوتا ہے، کبھی ہا ہا کبھی ہُو ہُو کرکے چیخ مارتے ہیں، مطلب یہ کہ رنگ برنگ کی چیخیں مارتے ہیں، اگر کوئی اجنبی آدمی ان لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہو تو ڈر کے مارے نماز کی اقتدا بھی چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ عجیب آواز ہوتی ہے، لوگ اس سے خوفزدہ



ہوجاتے ہیں، اور کوئی کبھی نماز میں سامنے کی طرف بڑھ جاتا ہے، اور کبھی پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے، اور کبھی کود کر اوپر کی طرف اُٹھ جاتا ہے، جس میں دونوں پاؤں زمین سے علیحدہ ہوجاتے ہیں، اور کبھی نماز میں تالیاں بجاتا ہے، اور کبھی التحیات یا قراءت میں سے چند لفظوں کو بلند آواز سے اور باقی خفی، ان لوگوں سے اگر دریافت کیا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ افعال ہم سے بلا اختیار ہوتے ہیں، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ افعال مذکورہ شریعت میں درست ہیں یا نہیں، اور ان لوگوں سے مرید ہونا اور ان لوگوں کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں، اور افعال مذکورہ میں سے کون کون مفسدِ صلوٰۃ ہیں، تحریر فرمادیں؟

**الجواب**: اگر واقعی ان لوگوں سے یہ حرکات بے اختیار بحالتِ اضطرار صادر ہوتی ہیں جسکو اصطلاح صوفیہ میں غلبۂ حال کہتے ہیں تو اس کا حکم حسب ذیل ہے:-

(۱) چیخنے اور چلانے اور قہقہہ مارنے سے نماز فاسد نہ ہوگی (۲) نماز میں آگے پیچھے ہٹنے سے بھی نماز فاسد نہ ہوگی، بشرطیکہ سینہ قبلہ ہی کی طرف رہے، قبلہ سے نہ پھرے اور بشرطیکہ ایک دفعہ میں مقدار صف سے زیادہ مشی نہ ہوتی ہو، گو متفرقاً زیادہ ہوجاتی ہو، (۳) زیادہ کودنے سے نماز باطل ہوجائے گی، لانہ کالاستدبار فی کونہ منافیاً (۴) تالیاں بجانے سے نماز فاسد نہ ہوگی، لانہ کالتصفیح وھو مشروع للنساء (۵) التحیات یا قرأت میں سے اگر کسی قدر حصہ کو جہر سے پڑھ دیں تو نماز فاسد نہ ہوگی، لانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یجہر بالآیة احیانا فی الظہر وفی الحدیث من السنة اخفاء التشہد قلت وھو لیس بواجب فاذا جہر به عمد الاتفسد فکیف اذا جہر به لعذر، قال فی مراقی الفلاح ولا تفسد بحصولها (ای بحروف مسموعة) من ذکر جنة اونار اتفاقا قالدلالتها علی الخشوع اھ، قال فی الحاشیة لواعجبته قراءة الامام فبکی وقال نعم اوبلی لاتفسد ولو وسوسه الشیطان فحوقل ان لامور الآخرة لاتفسد وان لامور الدنیا فسدت اھ (ص ۱۹۰) قال ویفسدھا التنحنح بلاعذر لما فیه من الحروف وان کان لعذر کمنعه البلغم من القراءة لایفسد وفی الحاشیة للطحطاوی ومحل الفساد به عند حصول الحروف اذا امکنه الامتناع عنه اما اذا لم یمکنه الامتناع عنه فلا تفسد به عند الکل کالمریض اذا لم یمکنه منع نفسه عن الانین والتاوہ لانه حینئذ

کالعطاس والجشاء اذا حصل بهما حروف اھ (ص ۱۸۹) ای ولم یمکنه دفعه، وفیه ایضا وذکر المحقق ابن امیر حاج ماحاصله ان المشی لا یخلو اما ان یکون بلا عذر او یکون بعذر فان کان بلا عذر فان کان کثیرا متوالیا یفسد صلوته سواء استدبر القبلة مع ذلك اولا لانه حینئذ عمل کثیر لیس من اعمال الصلوٰة ولم تقع الرخصة فیه وان کان کثیرا غیر متوال بل تفرق فی رکعات او تخلله مهلات فان استدبر معه القبلة فسدت لوجود المنافی قطعاً من غیر ضرورة وان لم یستدبر معه القبلة لم تفسد ولکن یکره لما عرف ان ما افسد کثیره کره قلیله عند عدم الضرورة وان کان بعذر کان لاجل الوضوء من الحدث فی الصلوٰة اولا نصرافه الی وجه العدو او رجوعه من صلوٰة الخوف لا یفسد ولا یکره مطلقا سواء کان قلیلا او کثیرا استدبر القبلة اولم یستدبر اھ (ص ۱۸۹) واللّٰه اعلم، اور یہ جواب اس وقت ہے جبکہ یہ حرکات بالاضطرار صادر ہوتے ہوئے ان لوگوں کو ہوش باقی رہتا ہو، اور اگر ہوش بھی نہیں رہتا اور اس درجہ بے خبری ہو جاتی ہے کہ اگر ریح صادر ہو جائے تب بھی اُن کو خبر نہ ہو تو اس حالت میں نماز بھی فاسد ہو جائے گی اور وضو بھی، لانه کالغشی والنوم الثقیلین وبهما تفسد الصلوٰة لمظنة خروج الناقض، لیکن جب ان لوگوں کی ان حرکات سے نمازیوں کو توحش اور خوف لاحق ہوتا ہے تو ایسے غلبۂ حال کی حالت میں ان لوگوں کو جماعت سے نماز نہ پڑھنا چاہئے، اپنے گھر میں پڑھنا چاہئے، لما قد ورد فی الحدیث من اکل الثوم فلا یقربن مصلانا وعلة النهی ایذاء المسلمین فیدخل تحته کل ما حصل به الایذاء،

رہا ان سے مرید ہونا تو اگر یہ لوگ متبع شریعت ہوں، اور کسی شیخ محقق نے ان میں سے کسی کو مجاز و خلیفہ کر دیا ہو تو اس سے بیعت ہونا جائز ہے ورنہ نہیں، واللّٰہ اعلم، ۵ ارذیقعدہ ۱۳۴۱ھ،

| بغیر ضرورت کے صرف بنیان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، |
|---|

**سوال (۲)**: گنجی (بنیان) جو آجکل نہایت کثرت سے لوگ پہننے ہیں مثل نیمہ کے کہنی کے اوپر ہوتا ہے اس کو پہن کر نماز بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: جس شخص کے پاس کُرتہ نہ ہو اس کی نماز گنجی (بنیان) پہن کر بلا کراہۃ



درست ہے، اور جس کے پاس آستین والا کرتہ ہو اس کی نماز گنجی پہن کر بکراہت درست ہے؛ کیونکہ نماز میں کہنیوں کا بلا عذر کھولنا مکروہ ہے، نیز عادۃً صرف بنیان پہن کر مجالسِ عامہ میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے تو صاحبِ استطاعت کو ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جس کو پہن کر مجالسِ عامہ میں وہ نہ جا سکے، واللّٰہ اعلم، ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

| نابینا کو نماز میں قبلہ رُخ کر دینا درست ہے یا نہیں؟ |
|---|

**سوال (۳)** .................... ایک نابینا آدمی نے نماز کی نیت باندھی اور اس کا رُخ ٹھیک قبلہ کی طرف نہیں ہے تو اس صورت میں دوسرے آدمی کو زبان سے بتلانا یا ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو قبلہ رُو کر دینا جائز ہے یا نہیں، بینوا توجروا،

**الجواب**: جائز ہے بشرطیکہ نماز شروع کرنے کے وقت کوئی بتلانے والا میسّر نہ ہو، اور اگر میسّر تھا اور پھر بدون پوچھے اندھے نے نماز شروع کر دی، تو وہ نماز اوّل ہی سے باطل ہے، بعد کا بتلانا اور قبلہ رُو کرنا مفید نہ ہوگا، قال فی العالمگیریة ولو اشتبهت القبلة فی المفازة فوقع اجتهاده الی الجهة فاخبره عدلان اذا کان من اهل ذلك الموضع لا یجوز له الا ان یاخذ بقولهما کذا فی الخلاصة اھ (ص ۳۹ ج ۱) وفیها الاعمیٰ اذا صلی رکعة الی غیر القبلة فجاء رجل وحوله الی القبلة واقتدی به ان لم یجد الاعمی (حین افتتح الصلوٰة) من یسئله جازت صلوٰة الامام (ای الاعمیٰ) وفسدت صلوٰة المقتدی اھ (ص ۴۰ ج ۱) مختصرا قلت ولکن دل الجزئیتان علی جواز نفس الاخبار والتحویل، واللّٰه اعلم، ۱۲ رجب ۱۳۴۳ھ

| منبر کی سیڑھی پر سجدہ کرنے کا حکم |
|---|

**سوال (۴)** ایک مسجد میں امام کے خطبہ پڑھنے کا جو منبر ہے اس کی ایک سیڑھی کچھ زیادہ آگے کو ہے، جس کی وجہ سے جو صفِ اوّل نمازیوں کی ہوتی ہے اس میں دو نمازیوں کو سجدہ اسی سیڑھی کے اوپر کرنا پڑتا ہے، اور یہ سیڑھی فرشِ مسجد سے پانچ گرہ اونچی ہے، اگر مجبوری ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ ایسی صورت میں اندر کے درجے میں بجائے تین صف کے دو صف ہوتی ہیں، اور اگر منبر کے سامنے جو سیڑھی ہے اسی قدر جگہ کو چھوڑ دی جائے تو صفیں تو ضرور تین ہو جاویں گی، لیکن درمیان میں دو نمازیوں کی جگہ خالی رہتی ہے، اور سلسلہ صف شکستہ ہوتا ہے، اور یہ بات نہیں ہے کہ مسجد میں گنجائش نہیں ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ گنجائش ہے، لہٰذا اندریں صورت اُن دو نمازیوں

کی نماز صحیح ہوتی ہے اور جائز ہے یا کیا صورت ہے؟

**الجواب**: ایک بالشت اونچی سیڑھی پر سجدہ جائز ہے، اور وہ سیڑھی پانچ گرہ ہے، اس لئے نماز جائز نہیں ہوتی، فی العالمگیریۃ (ص ۴۴ ج ۱) اذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین بقدر لبنۃ او لبنتین منصوبتین جاز وان زاد لم یجز کذا فی الزاہدی واحد اللبنۃ ربع ذراع کذا فی السراج الوہاج، اور بلا ضرورت صف میں جگہ چھوڑنا بھی مکروہ ہے، اس لئے اندر دو صف باندھی جائیں،

کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۸ ربیع الثانی ۴۶ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**قعدہ آخری میں تشہد پڑھنے کے بعد امام سہواً کھڑا ہوا مقتدی کے لقمہ دینے پر بیٹھ گیا اور تشہد پڑھ کر سجدہ سہو کیا، اور پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیرا، تو نماز ہوگئی یا نہیں؟**

**سوال** (۴) ایک شخص قعدۂ اخیرہ میں بیٹھا اور تشہد پڑھنے لگا، اور تشہد پڑھنے کے بعد یہ سمجھ کر کھڑا ہوا کہ شاید دوسری رکعت یعنی قعدۂ اولیٰ ہے، مگر مقتدی کے آواز دینے سے بیٹھا اور پھر التحیات پڑھ کر سجدۂ سہو کیا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرا، ایسی حالت میں اس کی نماز کیسی ہوئی؟

**الجواب**: قال فی الدر وان قعد فی الرابعۃ مثلا قدر التشہد ثم قام عاد وسلم ولو سلم قائما صح اھ قال الشامی ای عاد للجلوس لما مر ان ما دون الرکعۃ محل للرفض وفیہ اشارۃ الی انہ لا یعید التشہد وبہ صرح فی البحر قال فی الامداد والعود للتسلیم جالسا سنۃ لان السنۃ التسلیم جالسا والتسلیم حال القیام غیر مشروع فی الصلوٰۃ المطلقۃ بلا عذر فیاتی بہ علی الوجہ المشروع فلو سلم قائما لم تفسد صلاتہ وکان تارکا للسنۃ اھ (ص ۸۲ ج ۱) قلت ومثال العذر ما اذا انتقض وضوءہ وہو قائم فیسلم قائما ولا ینتظر القعود فان المغنی فی الصلوٰۃ بعد انتقاض الوضوء لا یجوز واللہ اعلم وذکرت ہذہ المسئلۃ استطرادا للحاجۃ الیہا واللہ تعالیٰ اعلم

اس صورت میں دوبارہ تشہد پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بیٹھتے ہی سلام پھیر کر سجدۂ سہو کر لینا چاہئے تھا، لیکن اگر بیٹھنے کے بعد دوبارہ تشہد پڑھ لیا، پھر سلام پھیر کر سجدۂ سہو کیا، جب بھی نماز صحیح ہوگئی، اور سجدۂ سہو اس تاخیر کا بھی جابر ہوگیا،



واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم، یکم محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

**عورتوں کیلئے نماز میں عقص شعر مکروہ ہے یا نہیں؟**

**سوال** (۵) زید دعویٰ می کند کہ در حالت عقص شعر نماز گذاردن مر مرداں را مکروہ است نہ زناں را زیرا کہ برین کراہت بحدیثے کہ صاحب ہدایہ وغیرہا استدلال کردہ اند مورد ش مرد است نہ زن ونیز موئے سر زن حکم عضوے میدارد وبرین تقدیر اگر برائے سجدہ موئے زن موئے خود را بگذارد تا بوجہ برون شدن از پارچہ سر نمازش فاسد گردد، اما عمرو می گوید کہ در کراہت آں عقص شعر حکم مرد وزن یکسان است چرا کہ اگرچہ مورد حدیث مذکور خاص است لیکن حکمش عام است لہذا فقہاء در جائے کہ حکم آں کراہت بمرداں تخصیص نہ کردہ اند،

**الجواب**: قال فی الدر فی باب المکروہات وعقص شعرہ اھ قال الشامی ای ضفرہ وفتلہ والمراد بہ ان یجعلہ علی ہامتہ ویشدہ بصمغ او یلف ذوائبہ حول رأسہ کما یفعلہ النساء فی بعض الاوقات او یجمع الشعر کلہ من قبل القفا ویشدہ بخیط او خرقۃ وجمیع ذلک مکروہ لما روی الطبرانی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نہی ان یصلی الرجل ورأسہ معقوص اھ (ص ۶۶۷ ج ۱) وفی نیل الاوطار عن العراقی وہو مختص بالرجال دون النساء لان شعرہن عورۃ یجب سترہ فی الصلوٰۃ فاذا نقضتہ ربما استرسل وتعذر سترہ فتبطل صلاتہا اھ (ص ۲۳۵ ج ۲) قلت وقول العراقی لا تأباہ قواعدنا بل ہی تؤیدہ فان شعر النساء عورۃ عندنا ایضا، پس دریں مسئلہ ہم قول زید نزد ما صحیح است، نہ قول واللہ اعلم،

(تنبیہ) در یک بار زیادہ از سہ سوال را جواب دادن اینجا قاعدہ نیست پس از بقیہ سوالات دوبارہ استفسار کنند اگر خواہند، ۸ محرم ۴۶ھ

**نماز میں رونے کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت کی وضاحت**

**سوال** (۶) در مطلب ایں عبارت بہشتی زیور کہ اگر جنت و دوزخ کو یاد کرنے سے دل بھر آیا، اور زور سے آواز نکل پڑی تو نماز نہیں ٹوٹی، بحث شدہ است، کسے گوید کہ ایں آواز خاص است وکسی گوید عام، پس اگر خاص باشد حد او چہ وآں آواز اختیاری است یا نہ و مراد از "دل بھر آنا" چیست؟ وامامت آں کس اگر متبع شریعت باشد درست است یا نہ،

للہ فرمودہ اجرش عند اللہ امانت دارند وبس،

**الجواب:** مراد ازیں عبارت گریہ بے اختیاری است کہ برضبط آں قدرت نباشد الابالحرج، پس ایں چنیں گریہ اگر از ذکر جنت ودوزخ یا از غلبۂ محبتِ خداوندی درحالتِ نماز طاری شود نماز فاسد نگردد اگرچہ بآواز بلند وصیاح مزید باشد قال المحقق فی الفتح تحت قول الہدایۃ فان انّ فیہا اوتاوّہ اوبکیٰ فارتفع بکاءہ فان کان من ذکر الجنۃ اوالنار لم یقطعھا لانہ یدل علی زیادۃ الخشوع اھ، مانصہ وان حصل بہ الحروف اھ (ص ۳۴۷ ج ۱) وفی موضع آخر والصیاح ملحق بالکلام الذی بساطہ ذلک الصیاح وسیاتی انہ اذا ارتفع بکاءہ من ذکر الجنۃ والنار لاتفسد وان کان یقال ان المراد اذا حصل بہ الحروف ولو صرح بہ (ای بالجنۃ والنار بسوالہا والعیاذ منہا) لاتفسد اھ ملخصا (ص ۳۲۲ ج ۱) پس گریہ را کہ بذکر آخرت باشد حدے نیست بجز آنکہ از قصد واختیار نباشد، واللہ اعلم، غرہ جمادی الثانی سنہ ۴۶ھ

**مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟**

**سوال** (۷) مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا کیسا ہے، مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر رمضان شریف میں ایک امام نیچے مسجد میں تراویح پڑھاوے اور دوسرا امام مسجد کی چھت پر پڑھاوے تو بلاکراہت جائز ہے یا نہیں، اگر مسجد میں دو درجہ یعنی دو منزلیں ہوں تو دوسرے درجہ کا چھت میں شمار ہوگا یا نہیں، فتاویٰ قاضیخاں مطبوعہ نولکشور جلد اول صفحہ ۷۱ میں یہ عبارت ہے وکذا لو صلّی علی السطح فی شدۃ الحر لقولہ تعالیٰ قل نار جہنم اشد حرا لو کانوا یفقہون، کیا اس عبارت سے چھت پر نماز پڑھنے کو مکروہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں،

**الجواب:** قال فی الدر وکرہ تحریما الوطأ فوقہ والبول والتغوط لانہ مسجد الی عنان السماء اھ قال الشامی ولذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیہ اذا لم یتقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیہ ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ ولو حلف لایدخل ہذہ الدار فوقف علی سطحہ یحنث اھ (ص ۶۸۶ ج ۱) وایضا فان الفقہاء لم یذکروا من مکروہات الصلوٰۃ سوی ظہر بیت اللہ اھ مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ

۵ دلّ علیہ قولہ فارتفع بکاءہ لم یقل رفع بکاءہ والقواعد تدل ایضا،



نہیں، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، البتہ یہ جائز نہیں کہ جماعت سقف ہی پر ہو نیچے کے درجہ میں نماز ہی نہ ہو، کیونکہ اصل مسجدیت میں داخلی حصہ ہی ہے، سقف کی مسجدیت تبعاً للتحت ہے پس داخلی حصہ میں نماز نہ ہونا صرف سقف پر ہونا مکروہ ہوگا، الا للحاجۃ الشدیدۃ بان کان المسجد ذا منزلین وتعذر الصلوٰۃ فی الداخل للحر ونحوہ فہو عذر، ولان المنزلۃ الثانیۃ لیس فی حکم السقف بالکلیۃ بل لہ حکم المسجد والسقف ما کان فوق المنزلۃ الثانیۃ، اور یہ صورت بلاکراہۃ جائز ہے کہ امام تحت میں داخل مسجد ہو اور کچھ جماعت اس کے ساتھ ہو، اور کثرتِ جماعت کے وقت کچھ آدمی اوپر چھت پر اقتداء کرلیں بشرط التخلف عن الامام (وفی شرح المنیۃ للحلبی وکذا یکرہ) لو صلی علی سطح المسجد من شدۃ الحر لقولہ تعالیٰ قل نار جہنم اشد حرا لو کانوا یفقہون اھ وفی القنیۃ امام یصلی التراویح علی سطح المسجد اختلف فی کراہتہ والاولی ان لایصلی فیہ عند العذر فکیف بغیرہ اھ (ص ۳۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تحت مسجد کو چھوڑ کر سقف پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، یہ تو سقف کا حکم ہے، اور دو منزلہ کے بارے میں یہ کہنا کہ بالائی منزل سقف کے حکم میں ہے صحیح نہیں، بلکہ سقف وہ ہے جو بالائی منزل کے اوپر ہے، پس دو منزلہ میں یہ جائز ہے کہ کسی وقت تحتانی منزل میں نماز نہ پڑھی جائے، صرف بالائی میں پڑھی جائے وہ اس کی نظیر ہے کہ کسی وقت مسجد کے داخلی حصہ میں نماز نہ ہو، بلکہ صحن میں پڑھی جاوے کہ یہ بلاکراہت جائز ہے، رہی یہ صورت کہ دو منزلہ مسجد میں ایک امام تحتانی منزل میں ہو اور ایک امام بالائی منزل میں ہو، اور دونوں الگ الگ تراویح پڑھاویں، سو یہ صورت مکروہ ہے، کیونکہ فقہاء نے ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتوں سے منع کیا ہے، ولو صلّوا التراویح ثم ارادوا ان یصلی ثانیا یصلی فرادیٰ کذا فی الخلاصۃ (ص ۶۴ ج ۱) وفی شرح المنیۃ (ص ۳۸۹) ولو ام فی التراویح مرتین فی مسجد واحد کرہ وکذا لو صلاہا مرتین ماموما فی مسجد واحد وان صلی فی المسجدین اختلف المشائخ فیہ اھ نیز تکرار جماعت ایک مسجد میں ایک وقت میں سلف سے ثابت نہیں، والخیر کلہ فی اتباع السلف ولا یغتر احد بما یفعلہ اہل الحرم من تعدد الجماعات فی التراویح فان الحرم یجوز فیہ تکرار الجماعۃ فانہ لایصدق علیہ انہ مسجد محلۃ بل ہو کمسجد شارع وقد تقرر انہ لاکراہۃ فی تکرار الجماعۃ فیہا اجماعا (شامی ص ۸۰۵) وبالجملۃ فکل مسجد یجوز تکرار الجماعۃ فیہ لاباس بتکرار التراویح فیہ اذا کان الامام والمومون فی کل علیحدۃ تہم والا فلا، ۲۷ شعبان سنہ ۴۶ھ

حکم نماز بلا عمامہ وبلا قلنسوۃ

**سوال** (۸) لوگ آجکل مختلف ہیں، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۱) سر پر کلاہ اور کلاہ کے اوپر عمامہ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں، (۲) صرف ٹوپی سے فریضہ ادا کرتے ہیں بمشکل ۵، ۱ فی صدی ہوں گے، (۳) سر پر صرف لنگی یا ململ وغیرہ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پگڑی باندھے ہوئے نماز پڑھتے ہیں، پگڑی وغیرہ کے نیچے ٹوپی نہیں ہوتی، ایسے ۴۰، ۵۰ فی صدی ہوں گے،

دیگر یہ کہ ایسا بھی دیکھا کہ نمبر ۲ سے اگر ضرورتاً امام بھی بن جائیں تو وہ ٹوپی اُتار کر صرف گز دو گز یا کم وبیش رومال وغیرہ باندھ کر جماعت کرا دیتے ہیں، پورے طور پر تمام سر بھی نہیں ڈھکا جاتا، نمبر ۳ کے سر تو بالعموم درمیان سے کھلے رہتے ہیں، لہٰذا باآدب التماس ہے کہ ہر سہ اقسام مذکورہ کے درجات نماز، نیز از روئے شریعت دیگر حالات پر نظر ڈالتے ہوئے نماز امام اور دیگر اشخاص نمبر ۳ میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ اگر ہے تو آگاہ فرما دیجئے،

**الجواب**: قال فی شرح الشمائل ولا بأس بلبس القلنسوۃ اللاصقۃ بالرأس والمرتفعۃ المضربۃ وغیرھا تحت العمامۃ وبلا عمامۃ لان کل ذلک جاء عن المصطفیٰ و بذلک ایذ بعضھم ما اعتید فی بعض الاقطار من ترک العمامۃ من اصلھا لکن الافضل العمامۃ اھ ولابی داؤد والترمذی فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس قال الترمذی غریب واسنادہ لیس بالقائم اھ (ص ۱۶۶ ج ۱) وفیہ (ص ۱۶۸) وقال میرک وروی عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یلبس القلانس تحت العمائم ویلبس العمائم بغیر القلانس اھ وقد ورد انہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الاعتجار فی الصلوٰۃ وفسرہ الفقھاء کما فی مراقی الفلاح بانہ شد الرأس بالمندیل او تکویر عمامتہ علی راسہ وترک وسطھا مکشوفا اھ (ص ۲۰۴)

اس سے معلوم ہوا کہ صورت نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳ تینوں جائز ہیں، مگر افضل صورت نمبر ۱ ہے اور نمبر ۳ ایسی شرط سے جائز ہے کہ سر کا درمیانی حصہ بھی عمامہ سے مستور رہے کشوف ہو ورنہ نماز مکروہ ہوگی، واللہ اعلم،

۱۵ ربیع الثانی ۴۷ھ



مجنونہ کی محاذات مفسد نماز نہیں

**سوال** (۹) مجنونہ عورت کی محاذات باعث فساد نماز ہوگی یا نہیں؟

**الجواب**: نہیں، کیونکہ فساد صلوٰۃ بالمحاذات کے لئے اشتراک فی الصلوٰۃ والتحریمہ شرط ہے اور مجنونہ کی نماز ہی صحیح نہیں، صرح فی کتب الفقہ کلھا باشتراطا شتراکھما تحریمۃ واداء وھو فرع صحۃ الصلوٰۃ والمجنون لا تجب علیہ الفرائض ولا تصح منہ وھذا ظاھر، واللہ اعلم، وفی الشامیۃ عن القھستانی قال وفیہ اشارۃ الی ان محاذاۃ المجنونۃ لا تفسد لان صلاتھا لیست بصلوٰۃ فی الحقیقۃ اھ (ص ۵۹۹ ج ۱) ۱۸ جمادی الثانیۃ ۴۷ھ

بلا ضرورت بنیان یا میل خوری میں جن کی آستینیں مرفقین تک ہوں نماز پڑھنا مکروہ ہے

**سوال** (۱۰) بنیان یا میل خوری جن کی آستینیں مرفقین تک ہو یا اس سے کچھ اوپر فقط اس کو پہن کر نماز ادا کرنا مکروہ ہے یا نہیں؟

**الجواب**: مکروہ ہے، جبکہ اس کے پاس اور کپڑے بھی ہوں، کیونکہ اس کو پہن کر آدمی محافل وسوق میں نہیں جا سکتا، عادۃً، نیز مرفقین کا کھولنا خود مکروہ ہے، ۱ رجب ۴۷ھ

بخوف طوالت رکعت ثانی امام کو رکوع میں لیجانے کیلئے سامع کا اللہ اکبر کہنا مفسد نماز ہے یا نہیں؟

**سوال** (۱۱) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شخص تراویح میں قرآن عظیم سنا رہا ہے، دوسرا سماعت کرتا ہے، جبکہ سماعت کرنے والا یہ خیال کرے کہ پہلی رکعت سے دوسری بڑھی جاتی ہے، یا ایسا بھول گیا ہے کہ دونوں سے نہیں نکلتا، یا اس سامع کا منشاء آگے بڑھوانے کا نہیں ہے، ان صورتوں میں امام کو رکوع میں لانے کے واسطے سماعت کرنیوالا اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں لے آئے تو نماز ہو جاوے گی یا نہیں؟ اور سامع پر کوئی مواخذہ تو نہیں ہوگا

**الجواب**: اگر سامع کا اللہ اکبر کہتے ہی امام نے رکوع کر دیا یعنی محض اس کے حکم کی تعمیل کی تو نماز فاسد ہو گئی، اور اگر امام نے اس کے اللہ اکبر سے متنبہ ہو کر اپنے اختیار سے اور اپنی رائے سے رکوع کیا، تو نماز صحیح ہو گئی، بہرحال سامع کا امام کو اللہ اکبر کہکر رکوع کی طرف لانا سخت خطرناک بات ہے، ایسا کبھی نہ کرنا چاہئے، واللہ اعلم، قال فی الدر حتی لو امتثل امر غیرہ فقیل لہ تقدم فتقدم او دخل فرجۃ الصف فوسع لہ

فسدت بل یمکث ساعۃ ثم یتقدم برایہ قہستانی اھ قال الشامی ھذا امتثال بالفعل ومثلہ ما لو امتثل بالقول کما اذا امر رجل المؤذن ان یجھر بالتکبیر فجھر المؤذن ان قصد جوابہ فسدت صلوتہ اھ (ص ۶۵۰ ج ۱) ۱۹ رمضان ۴۷ھ

جس پر سجدۂ سہو لازم نہیں اور وہ لازم سمجھ کر سہو کرے تو نماز ادا ہوجائیگی یا ایسی نماز واجب الاعادہ ہے؟

**سوال** (۱۲) نمازی نے مغرب کی نماز فرض میں تیسری رکعت میں الحمد کے بعد سہو سے قل ہو اللہ کی سورۃ تمام یا اور کوئی سورۃ پڑھ لی اور لاعلمی سے یہ سمجھا کہ تیسری رکعت فرض میں سورت ملانے سے سجدۂ سہو لازم ہوگیا، اور قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر سجدۂ سہو کر کے پھر تشہد اور درود و دعاء ماثورہ پڑھ کر نماز کو ختم کر دیا، چونکہ فرض نماز کی تیسری رکعت میں سورت ملانے سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اور اس نے بغیر سجدۂ سہو لازم ہونے کے نماز میں سجدۂ سہو کیا تو اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور اگر درست ہوئی تو کیسی ہوئی، مکروہ تحریمی یعنی یا تنزیہی ہوئی اور اس نماز کا اعادہ لازم ہے یا نہیں، یا اعادہ بہتر ہے؟ تحریر فرمایئے گا،

**الجواب**: قال فی الخلاصۃ اذا ظن الامام ان علیہ السھو فسجد للسھو و تابعہ المسبوق فی ذلک ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سھو فیہ روایتان اشھرھما ان صلوۃ المسبوق تفسد وقال الامام ابو حفص الکبیر لا تفسد والصدر الشھید اخذ بہ فی واقعاتہ وان لم یعلم الامام ان لیس علیہ سھو لم یفسد صلوۃ المسبوق عندھم جمیعًا اھ (ص ۱۶۴ ج ۱) وفی رد المحتار عن الفیض قیل لا تفسد و بہ یفتی وعن البحر قال الفقیہ ابو اللیث فی زماننا لا تفسد لان الجھل فی القراء غالب واللہ اعلم (ص ۶۲۶ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اگر یہ سمجھ کر سجدہ کرے کہ میرے اوپر سجدہ سہو ہے، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ سجدۂ سہو نہ تھا تو امام کی اور مدرکین کی نماز تو صحیح ہوجائے گی، البتہ مسبوق کی نماز میں اختلاف ہے کہ مسبوق کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں، مشہور روایت یہ ہے کہ فاسد ہوجائے گی، اور ایک روایت یہ ہے کہ اس کی بھی صحیح ہے، پس مسبوق کے لئے احوط اعادہ ہے، اور گنجائش اس کی بھی ہے، کہ اعادہ نہ کرے، کیونکہ فتویٰ اس پر ہے کہ مسبوق کی نماز بھی صحیح ہے، ۵ رشوال ۴۷ھ

چارپائی پر نماز پڑھنے کا حکم

**سوال** (۱۳) چارپائی پر نماز کا جواز بکراہت ہے یا بلا کراہت، اور کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی؟ اس کے متعلق جو تفصیل ہو اس سے مطلع فرمائیں،



**الجواب**: چارپائی پر نماز پڑھنا خلافِ اولیٰ ہے فان الافضل ان یصلی علی ما یشابہ الارض یہ اس وقت ہے جبکہ پلنگ خوب کسا ہوا ہو، ورنہ نماز کی صحت میں ہی شبہ رہیگا، واللہ تعالیٰ اعلم ۲۰ ر ذی الحجہ ۴۷ھ

کراہتِ عقص شعر نماز میں مرد و عورت کے لئے عام ہے یا صرف مردوں کے لئے خاص ہے؟

**سوال** (۱۴) کراہتِ عقصِ شعر نماز پڑھنے کے وقت مرد و عورت کے لئے عام ہے، یا فقط مردوں کے لئے خاص ہے، اور عورتوں کو عقصِ شعر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہ؟ ہمارے ہاں عقص عورتوں کے لئے نہایت ہی پردہ ہے،

**الجواب**: قال العراقی وھو ای الکراھۃ مختص بالرجال دون النساء لان شعرھن عورۃ یجب سترہ فی الصلوۃ فاذا نقضنہ ربما استرسل و تعذر سترہ فتبطل صلوتھا وایضا فیہ مشقۃ علیھا فی نقضہ للصلاۃ و قد رخص لھن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ان لا ینقضن ضفائرھن فی الغسل مع الحاجۃ الی بل جمیع الشعر اھ (ص ۲۳۵ ج ۲ نیل الاوطار) اس سے معلوم ہوا کہ کراہتِ عقصِ شعر عورتوں کے لئے نہیں بلکہ مردوں سے مخصوص ہے فان قواعدنا تؤید ما قالہ العراقی ولا تاباہ، ۲۴ رمحرم ۴۸ھ

نیم آستین واسکٹ میں نماز پڑھنا

**سوال** (۱۵) آدھی باہنوں کی واسکٹ سے بھی نماز ہوسکتی ہے یا مکروہ ہے،

**الجواب**: فقط نیم آستین پہن کر یعنی جب اس کے ساتھ کرتہ وغیرہ نہ ہو تو نماز مکروہ ہے، البتہ اگر کسی عذر سے ایسا کیا ہو تو پھر کچھ مضائقہ نہیں ہے، واللہ اعلم،
احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۴ ر ج ۲ ۴۵ھ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲ ج ۲ ۴۵ھ

واجب الاعادہ نماز کی جماعتِ ثانیہ میں شرکت کا حکم

**سوال** (۱۶) امام نے بجائے دو کے تین سجدے کئے، اتفاقاً سجدۂ سہو بھی ترک کر دیا، بعد میں نماز کا اعادہ کیا، اب کچھ مقتدی ایسے شریک ہوئے جو پہلے نہ تھے، ایسی صورت میں نووارد مقتدیوں کا فرض ادا ہوگا یا نہیں، جناب نے تتمہ امداد الفتاویٰ صفحہ ۲۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ "نووارد کا فرض شریک ہونے میں ادا ہوجائے گا"، لیکن غایۃ الاوطار جلد اول ص ۲۱۱ میں مترجم نے وکذا کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا والمختار انہ جابر للاول لان الفرض لا یتکرر

کے تحت میں لکھا ہے کہ اس کلیہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی نیا مقتدی دوسری بار میں شریک ہوگا تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ جب امام کی نماز فرض نہیں تو اقتدائے فرض والے کا اس کے پیچھے درست نہ ہوگا، بظاہر دونوں متعارض معلوم ہوتے ہیں، دفعِ تعارض کی کیا صورت ہوگی؟

**الجواب**: اس مسئلہ میں اختلاف ہے، راجح یہی ہے کہ نووارد جماعت میں شریک نہ ہو، حضرت مولانا صاحب مدفیوضہم العالی نے بھی اب اسی کو راجح فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۲ ر ج ۱۳۴۸ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

**سوال (۱۷)** | مسئلہ تخفیفِ صلوٰۃ | ................... زید عمر کا مزاج شناس ہے، اس کا ملازم ہے، اس کے حکم سے نماز پڑھتا ہے، اپنے اندر اہلیت امامت نہیں پاتا، محض امتثالِ امر کرتا ہے، عمر کے ضعف کی بناء پر نماز میں تخفیف کرتا ہے، بلکہ صلوٰۃ فجر میں قرآتِ مسنونہ بھی نہیں پڑھتا ہے، باوجود اس اختصار اور رعایت کے عمر چاہتا ہے کہ اور تخفیف کی جائے، اوّل تو زید کی نمازوں میں اخلاص نہیں ہوتا، اگر قدرے قلیل برائے نام ہوا بھی تو اندیشہ ہے کہ عمر کی اس قدر رعایت اور خاطر داری سے نماز بھی عمر کی نذر نہ ہو جائے کہ قیام وقعود ارکان میں اس کی گرانی کا خیال رہے، اب بجمالِ ادب زید عرض کرتا ہے کہ تخفیف نماز کا انتہائی درجہ جس کی رعایت بروئے حدیث شریف امام کو ضروری ہے، کیا ہے، اطلاع فرمانے پر اس کی پابندی کرے گا،

**الجواب**: فی الدر المختار ویکرہ تحریما تطویل الصلوٰۃ علی القوم زائداً علی قدر السنۃ الخ، اس سے معلوم ہوا کہ تخفیف مامور بہ تو یہی ہے کہ مقدار مسنونہ سے زیادتی نہ کرے، البتہ ضرورتِ شدیدہ کے وقت تخفیف کے جواز کی حد یہ ہے کہ مقدار واجب ادا ہو جائے، کما ذکر فی البحر معزیا الی المجتبیٰ ان الحسن روی عن الامام انہ اذا قرأ فی المکتوبۃ بعد الفاتحۃ ثلث آیات فقد احسن ولم یسئ اھ (شامی ص ۵۹۰ ج ۱)

پس نمازیوں کی رعایت سے اگر قدر مسنون سے بھی کمی کرنا پڑے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ امام کو اضعف قوم کی رعایت کا امر ہے، پس یہ رعایت خلوص کے منافی نہ ہوگی، جبکہ نیت اتباعِ سنت کی ہو، فقط واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۲ ر ج ۱۳۴۸ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ

**سوال (۱۸)** | لنگوٹھ پر تہبند یا پاتجامہ پہنکر نماز پڑھنا | لنگوٹھ نیچے بندھا ہوا اوپر پاک



پائجامہ پہن کر یا تہبند باندھ کر نماز پڑھیں ادا ہو جاتے گی یا نہ، بصورت عذر یا بلا عذر کے،

**الجواب**: نماز ہو جاوے گی، لعدم ما یدل علی الحرمۃ وفساد الصلوٰۃ، اور لوگوں میں جو اسکی ممانعت مشہور ہے وہ بے سند بات ہے،، واللہ اعلم، عبدالکریم عفا عنہ ۳۰ ر ج ۱۳۴۶ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد، یکم رجب ۱۳۴۶ھ

**سوال (۱۹)** | معذور کی نماز کی ایک صورت | ............... ایک شخص کے ہاتھ پر چوٹ لگی، سال بھر اس نے سخت تکلیف پائی، علاج معالجہ بہت کچھ کیا، اب اس کا ہاتھ کلائی کے جوڑ سے خشک ہو گیا ہے، دایاں ہاتھ ہے، یہ بھی تکلیف سے خالی نہیں، کسی نے بتایا ہے کہ گدھے کی لید پانی میں پکا کر اس جگہ باندھی جائے اور دس دن تک کھولی نہ جائے، بندھی ہی رہے، کیا اس صورت میں نماز پنجگانہ صحیح ہو جائے گی؟ اگر نہیں ہو تو بعد ازاں قضا کرے گا، لیکن اگر اس اثناء میں مر گیا تو وارثوں پر اس کی فوت شدہ نمازوں کا فدیہ واجب ہوگا؟ کتنا واجب ہوگا؟

**الجواب**: صورت مسئولہ میں باوجود اس ناپاک چیز باندھنے کے بھی بضرورت نماز صحیح ہو جاوے گی، ونظیرہ ما فی الدر مریض تحتہ ثیاب نجسۃ وکلما بسط شیئا تنجس من ساعتہ صلی علی حالہ وکذا لو لم یتنجس الا انہ یلحقہ مشقۃ بتحریکہ اھ (شامی ص ۷۹۹ ج ۱) واللہ اعلم بالصواب، ۳ ر ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ

**سوال (۲۰)** | نماز میں پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا | ........................ زید امامت کراتا ہے، اور اُس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا رہتا ہے، عمرو نے کہا ٹخنوں سے نیچا پاجامہ رکھنا غیر مشروع ہے اور سخت گناہ ہے، اس سے نماز مکروہ ہوتی ہے، تو زید نے یہ کہا کہ غیر مشروع اور سخت گناہ بھی ہے، مگر نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ نماز مکروہ نہیں ہوتی ہے، یہ صحیح ہے یا غلط ہے، بینوا وتوجروا؟

**الجواب**: زید کا قول غلط ہے، عمرو کا صحیح ہے، یہ صورت سدل میں تو داخل نہیں مگر جس طرح سدل نماز میں مکروہ ہے اسی طرح غیر مشروع لباس میں بھی نماز مکروہ ہے صرح بہ الفقہاء ومنہ کراھۃ الصلوٰۃ فی ثوب الحریر، قال العینی قال تاج الشریعۃ الاصح التفصیل لو صلی فی ثوب حریر او ثوب مغصوب لم تصح صلوتہ فی احدی الروایتین عن احمد بن حنبل وفی اخری تصح مع التحریم وعندنا

تصح ویکرہ کذا فی مطالب المؤمنین اھ من نفع المفتی والسائل (ص ۳۸) قلت
وکذا اکل لباس غیر مشروع فہو فی حکم ثوب الحریر والثوب المغصوب لان
الکراھۃ بھما لیس للنجاسۃ ولا لقلۃ الستر بل لتعلق النہی بلبسھما فکذا
کل لباس تعلق بہ النھی، واللہ اعلم، ثم رأیت البیہقی قد عقد باب کراھیۃ
اسبال الازار فی الصلوٰۃ واخرج فیہ حدیث ابی ھریرۃ مرفوعا ان اللہ عزو
جل لایقبل صلوٰۃ رجل مسبل ازارہ اھ (ص ۲۴۱ ج ۲) وھذا یدل علی نقصان
الصلوٰۃ بھذا الفعل صراحۃ وای نقصان اعظم من عدم القبول، ۶ ذیقعدہ ۴۲ھ

**ساڑی میں نماز پڑھنے کا حکم**

سوال (۲۱) اس ملک میں عورتیں جو ایک کپڑا تمام بدن میں دے کر نماز پڑھتی ہیں، جس کو ہمارے ملک میں ساڑھی بولتے ہیں، تھوڑی پہنتی ہیں، اور تھوڑی بدن میں ڈالتی ہیں، یا دھوتی بولتے ہیں،

الجواب: ساڑی میں نماز جائز ہے بشرطیکہ عورت کا تمام جسم مخفی رہے، مگر بدون کرتے کے نماز مکروہ ہے، جس کے پاس کرتہ ہو، پس عورتوں کو ساڑی کے نیچے کرتہ ضرور پہننا چاہیئے کہ بغیر اس کے ستر کھلنے کا بھی اندیشہ ہے، ۲۸ ذی الحجہ ۴۵ھ

## فصل فی القرأۃ ومسائل زلۃ القاری

**فاتحہ خلف الامام**

سوال (۱): حافظ صاحب نے یہ ایجاد کیا ہے کہ بلا سورۃ فاتحہ کے نماز نہ ہوگی نماز سری ہو یا جہری، کل مصلی سخت پریشان ہیں، اس کے بارہ میں جو ثبوت ہو مدلل ارقام فرمادیں اور جو کتاب دربارۂ مسئلہ ہذا میں ہو اطلاع فرماویں؟

الجواب: حنفیہ کے مذہب میں بدون سورۃ فاتحہ پڑھنے کے مقتدی کی نماز درست ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری، اس شخص نے جو مسئلہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہے، مسلمانوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیئے، ۴ رجب ۱۳۴۱ھ

**ضاد صحیح ادا کرنے والے کی ضاد غلط پڑھنے والے کے پیچھے اقتداء کا حکم**

سوال (۲) بیشتر جو کارڈ بندہ نے راولپنڈی سے خدمت عالیہ میں روانہ کیا تھا جس میں ضاد معجمہ کے متعلق استفتاء تھا اس کا جواب ملا تسلی ہوگئی ہے، اب بندہ بغرض تعلیم وارد امرتسر ہے، اسی کے متعلق



تھوڑی سی بات دریافت طلب ہے، لہذا جوابی کارڈ تحریر ہے، اگرچہ یہاں بھی مفتی صاحب و دیگر علماء موجود ہیں، لیکن وہ ایسی باتوں کو چنداں اہم نہیں سمجھتے، اور ان کے عمل درآمد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضاد معجمہ کو مشابہ دال مہملہ پڑھنے کو اصح قرار دیتے ہیں، اس لئے ذیل کا سوال ان سے نہیں کیا گیا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ جو شخص ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے کماحقہ بلحاظ صفات ادا کرسکتا ہو یا کماحقہ نہ ادا کرسکتا ہو، لیکن متوسط درجہ کا یا ضعیف جیسا اس کے اپنے مخرج ہی سے ادا کرتا ہو، تو اس کی نماز ایسے شخص کے پیچھے جو ضاد معجمہ کو خالص دال مہملہ یا اطباق دے کر پڑھتا ہو صحیح ہے یا نہ؟ مثلاً امام ماہر تجوید نہ ہو عامی ہو یا ماہر تجوید سند یافتہ ہو لیکن غیر پانی پتی ہو یعنی مشابہ دال پڑھنے والا ہو، پیچھے مقتدی جو ہو وہ پانی پتی ہو سند یافتہ ہو، یا صرف مخارج کا جاننے والا ہو بے سند ہو، لیکن ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے متوسط یا ضعیف جیسا پڑھ سکتا ہو، ان جملہ صور کا کیا حکم ہے، ضاد معجمہ کو اپنے مخرج سے ادا کرنے والا اگر معذور کے پیچھے اقتداء کرے تو اس کو نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہ، اگر اعادہ ضروری ہے تو نماز جمعہ کا بھی اعادہ ہوسکتا ہے یا نہ، چونکہ اس کا اعادہ تو کرنا ہی ہوتا ہے تو تو جماعت سے قبل پڑھ کر پھر شامل جماعت ہو جایا کرے یا نہ، اگر بایں خیال اکثر جماعت چھوڑ دیا کرے کہ میری اقتداء کسی کے پیچھے صحیح نہیں، تو کس حد تک گناہگار ہوتا ہے، در آنحالیکہ وہ امام نہ بن سکتا ہو، جواب مختصر ہو، دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف قلم مبارک سے لکھ دینا ہی دلیل ہے، والسلام،

الجواب: قال فی مراقی الفلاح والثغ بالثاء المثلثۃ والتحریک وھو واللثغۃ بضم اللام وسکون الثاء تحرک اللسان من السین الی الثاء ومن الراء الی الغین ونحوہ لایکون اماما لغیرہ واذا لم یجد فی القرآن شیئا خالیا عن لثغہ وعجز عن اصلاح لسانہ آناء اللیل واطراف النہار فصلوٰتہ جائزۃ لنفسہ واذا ترک التصحیح والجھد فصلاتہ فاسدۃ اھ قال الطحطاوی قولہ لایکون اماما لغیرہ الا لمثلہ وفی الخانیۃ ذکر الشیخ ابو بکر محمد بن الفضل انہ تصح امامتہ لغیرہ لان ما یقولہ صار لغۃ لہ واختارہ ابن امیر حاج وحمل قولھم لا یؤم الا مثلہ علی الاولویۃ خروجا من الخلاف وقولہ اھ قال فی الخلاصۃ اذا کان یجتھد آناء اللیل والنہار فی تصحیحہ ولا یقدر علی ذلک فصلوٰتہ جائزۃ

وان ترك جهده فصلاته فاسدة الا ان يجعل العمر فی تصحيحه ولا آن يتركه جهده فی باقی عمره اھ قال صاحب الذخيرة وهذا الشق الثانی مشكل لان ما كان خلقة لا يقدر العبد علی تغيره اھ وكذا اذا كان لعارض ليس مما يزول عادة واذا كان كذلك فلا يعول فی الفتوی علی مقتضی هذا الشرط ومن ثمه ذكر فی خزانة الاكمل عن فتاوی ابی الليث لو قال الحمد لله بالهاء بدل الحاء او كل هو الله احد بالكاف بدل القاف جاز اذا لم يقدر علی غير ذلك علی لسانه لا تفسد اھ فلم يذكر هذا الشرط ولسا علته قال الفقيه وان لم يكن بلسانه علة ولكن جری ذلك علی لسانه لا تفسد اھ فلم يذكر هذا الشرط الی ان قال قلت كلامه يفيد ان هذا الشرط فيه خلاف والاكثر لم يذكروه لان فيه حرجا عظيما اھ (ص۱۱) اگر امام نے تصحیح حروف میں سعی کامل کی ہو پھر ضاد صحیح نہ نکال سکتا ہو یا اس کی زبان میں علت ہو جس کی وجہ سے وہ صحیح مخرج سے ادا کرنے سے بالکل عاجز ہو، اس کے پیچھے صحیح پڑھنے والے کی نماز درست ہوجائے گی، اور اگر باوجود قدرت کے بھی تصحیح حروف کی امام نے سعی نہ کی ہو تو اس کے پیچھے ماہر ضاد کی نماز درست نہ ہوگی، واللہ اعلم،

(۲) جمعہ کی قضا ظہر ہے، (۳) جماعت میں شرکت کرکے بعد میں اعادہ کرلیا جاوے، اور یہ بات جواب اول سے معلوم ہوجائے گی کہ اعادہ کب ضروری ہے، کب نہیں، واللہ اعلم

فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل یا اُن کے کچھ کچھ حصے پڑھنے کا حکم

**سوال** (۳) فرض نمازوں میں دو سورتیں کامل یا دو سورتوں کے کچھ کچھ حصے پڑھ سکتے ہیں؟

**الجواب**: یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا، کیا یہ مطلب ہے کہ ایک رکعت میں دو سورتیں کامل یا دو سورتیں کے کچھ کچھ حصے پڑھے، یا دو رکعتوں میں ایسا کرے، پہلی صورت میں فرض نمازوں میں مکروہ ہے، اور دو رکعتوں میں دو سورتیں کامل پڑھنے میں شبہ ہی کیا ہے، ایسا ہی کرنا چاہئے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ کامل پڑھے، اور اگر ایک رکعت میں ایک سورۃ کا کچھ حصہ اور دوسری میں دوسری سورۃ کا کچھ حصہ پڑھ دیا تو یہ بھی جائز ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے، اس لئے گاہے تو مضائقہ نہیں مگر عادی نہ ہونا چاہئے، ۲۴ شعبان ۴۲ھ

نوافل میں جہر کا حکم جبکہ انہیں سراً شروع کیا ہو،

**سوال** (۴) جس شخص نے نماز نفل آہستہ پڑھنی شروع کی پھر زور سے پڑھنے کو جی چاہتا ہے تو درمیان نماز سے زور سے



پڑھنا درست ہوگا یا نہیں؟ والسلام

**الجواب**: اگر نفلیں دن میں پڑھ رہا ہے تو جہر نہ کرے، اور اگر رات میں پڑھ رہا ہے تو جہر جائز ہے، خواہ ابتداء سے جہر کررہا ہو یا وسط میں شروع کردے، ہر طرح اجازت ہے، قال فی مراقی الفلاح والمنفرد بفرض مخير فيما يجهر الامام فيه كمتنفل بالليل فانه مخير ويكتفی بادنی الجهر والجهر افضل مالم يؤذ نائما ونحوه كمريض ومن ينظر فی العلم اھ اور اس کا قیاس اس صورت پر صحیح نہیں کہ نفل کو قیام کے ساتھ شروع کرنے سے پھر قعود جائز نہیں رہتا، کیونکہ وہاں قیام رکنِ صلوٰۃ ہے اور قعود سے اقویٰ ہے، اور قعود قائم مقام قیام کے رخصۃً ہے نوافل میں، اور یہاں نوافلِ لیل میں سر یا جہر کوئی واجب نہیں، بلکہ دونوں مخیر فیہ اور مساوی ہیں، اور نہ سر اقویٰ ہے جہر سے بلکہ بعض دلائل سے نوافلِ لیل میں جہر کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا انتقال من الاقویٰ الی الادنیٰ نہ ہوگا، بلکہ انتقالِ مساوی سے مساوی کی طرف یا غیر افضل سے افضل کی طرف ہوگا، پس صحت میں کیا شبہ ہے، اور ہدایہ وغیرہ میں جو یہ جزئیہ ہے لو ترک سورۃ اولی العشاء قرأها وجوبا مع الفاتحة جهرا فی الاخريين لان الجمع بين جهر ومخافتة فی ركعة شنيع، یہ جزئیہ جماعت و امام کیساتھ مخصوص ہے، کیونکہ جہر اسی پر واجب ہے نہ منفرد پر خصوصاً منفرد فی النوافل پر تو جہر واجب ہے ہی نہیں، وصرح فی الهداية فی باب سجود السهو بان الجهر والمخافتة من خصائص الجماعة پس جماعت میں جمع بین الجہر والسر فی رکعۃ مکروہ ہے نہ انفراد میں، واللہ اعلم ۱۸ ذیقعدہ ۴۲ھ

ضاد کو دواد پڑھنا یا ظا پڑھنا اور صحیح خواں کا غلط خواں کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم،

**سوال** (۵) ..................... اس امر میں تو شک ہی نہیں معلوم ہوتا کہ حرف ضاد کو جو آجکل عوام دواد پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، البتہ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس حرف کو جبکہ اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو اشتباہ بالظاء ہوتا ہے اور اس پر عوام شور مچاتے ہیں، پس ایسی حالت میں اس کو کسی کے کہنے سے ..... دواد پڑھنا درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں تو جو اشخاص اس کو دواد پڑھتے ہیں ان کی اقتداء کرانا درست ہے یا نہیں، بندہ کے جو دو چار رسائل اور فتاویٰ اس کے بارے میں نظر سے گذرے ہیں بہ فہم ناقص میں آیا کہ نماز نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہیں، مجموعۃ الفتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی یوسفی استفتاء نمبر ۱۵ جلد اول اور استفتاء نمبر ۱۴ جلد دوم میں

نہایت قوی۔ سے دلائل سے ثابت کیا ہے اور قریب ۳۶ کتابوں کے حوالہ دیا ہے، اور رسالہ مرصاد فی قرءۃ الضاد میں تراسی کتابوں اور چھیاسی فتاوٰی سے ثابت کیا ہے کہ نماز نہیں ہوتی، جو مؤلفہ ہے مولوی محمد حسین تمنا مراد آبادی کی مطبوعہ نیر اعظم پریس مراد آباد اور تفسیر اکسیر اعظم جلد اوّل میں بعد ختم ہونے تفسیر سورۂ فاتحہ کے دلائلِ قویہ سے ثابت کیا ہے، اور ان سب کا خلاصہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جن دو حرفوں میں فرق بآسانی ممکن ہو وہاں تبدیل حرف بحرف سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور جن میں فرق بمشقت ہو تو وہاں فاسد نہیں ہوتی، اور اسی قاعدہ کو مختار لکھا ہے، پس یہ تو جملہ کتب فقہ و تجوید و صرف و تفسیر سے ثابت ہے کہ ضؔ اور ظؔ میں فرق بمشقت ہے، اور دوآد کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور یہ ذکر نہ کرنا قرینہ ہے اس کا کہ ان دونوں میں تباین ہے، پس جب تباین ہوا تو بقاعدۂ مذکورہ بالا فاسد ہونا چاہئے، اور اگر ضاد کی جگہ ظؔ نکل گیا، تو وہاں فاسد نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہاں تشابہ ہے، اور اس کا بھی بندہ کو تجربہ ہو گیا ہے کہ جو علماء اس کو دوآد پڑھتے ہیں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں اور محض ضد ہے، میں چند علماء کے پاس استفتاء لیکر گیا، لیکن جواب دیا تو یہ دیا کہ اس کو قاری جانیں (یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ حضرات نہیں جانتے تو پھر مداخلت کیوں کرتے ہیں) جب زیادہ کہا گیا تو فرمانے لگے کہ ہم نے تو ایسا ہی پڑھا ہے، اور اپنے باپ بھائی سے ایسا ہی سُنا ہے (کتابی دلیل کوئی نہ دے سکے) نوبت بایجا رسید کہ فرمانے لگے کہ تم تمام جہان سے فتوٰی منگالو، اگر میری طبیعت کے موافق ہوگا تو دستخط کر دوں گا ورنہ پھینک دونگا (گویا دین کے خود تابع نہیں بلکہ دین کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں، تو اب دو وجہ ہو گئیں، ایک غلط خوانی، دوسری ضد خلاف وجہ شرعیہ،

اب جبکہ غور کرتا ہوں کہ رسائلِ مذکورہ کی طرف تو فسادِ صلوٰۃ لازم آتا ہے، پھر دل میں خیال آتا ہے کہ ترکِ جماعت ہوتی ہے تو پھر اس کا بھی جواب فوراً دل میں یہ گذرتا ہے کہ جب اول سے نماز ہی نہیں ہوتی تو جماعت کس کام کی، اور اگر کہا جاوے کہ عمومِ بلوٰی کی وجہ سے نماز فاسد نہ ہوگی تو حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری نے رسالہ الاقتصاد فی الضاد میں لکھا ہے کہ یہاں پر عمومِ بلوٰی معتبر نہیں، اور تمام شکوک جو اس حرف کے متعلق ہیں ان کا بھی جواب دیا ہے۔ (جو دراصل قائلینِ دوآد کے نزدیک دلائلِ قویہ ہیں)،



امید کرتا ہوں کہ جملہ امور مذکورہ بالا کا جواب شافی مرحمت فرمائیں گے،

**الجواب**: آپ نے جو کچھ سمجھا ہے سب صحیح ہے، مگر ظؔ سے فاسد نہ ہونا علی الاطلاق صحیح نہیں، اور دوآد سے فاسد ہونا بھی محلِ تامل ہے،

## سوال (۶) ضاد کو دال یا مشابہ دال یا مشابہ ظاء پڑھنے والے کی اقتداء

آیا کوئی شخص سب حروف صحیح پڑھتا ہو یا قریب صحیح کے پڑھتا ہو، مگر صرف اس حرف ضاد کو دال یا مشابہ دال کے پڑھتا ہے تو اس کے پیچھے بھی ایسے شخص کو جو اس حرف ضاد کو مشابہ بالظاء پڑھتا ہو اقتداء کر لینے سے اعادۂ صلوٰۃ تو واجب نہیں، اور اگر نہ لوٹاؤں تو کوئی حرج تو نہیں متاخرین کے قول پر، اور اگر ایسا شخص نماز پڑھائے جو اور حروف میں بھی تبدیلیاں کرتا ہے مثلاً قاف کو چھوٹا کاف بڑے شین کو سین، جیم کو زے اور حروف بھی گھٹا بڑھا دیتا ہو جس سے بالکل معنی بدل جاتے ہوں، ایسے ائمہ کے پیچھے اگر اعادۂ صلوٰۃ کی دقت سے بچنے کی غرض سے تنہا خفیہ نماز پڑھ لیا کروں تو ترکِ جماعت کی معصیت تو میرے اوپر نہ ہوگی، اس میں شرعی حکم حضور والا سے معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

**الجواب** واللہ الموفق للصواب، قال فی الدر ولاغیر الالثغ بہ ای بالالثغ علی الاصح کما فی البحر عن المجتبی وحررہ الحلبی وابن الشحنۃ انہ بعد بذل جہدہ دائما حتما کالامی فلا یؤم الامثلہ- الی ان قال ھذا ھو الصحیح المختار فی حکم الالثغ وکذا من لایقدر علی التلفظ بحرف من الحروف اھ (ص۶۰۸ ج ۱ مع الشامی) وفی رد المحتار تحت قولہ علی الاصح ای خلافا لما فی الخلاصۃ عن الفضلی من انہا جائزۃ لان مایقول صار لغۃ لہ ومثلہ فی التتارخانیہ وفی الظہیریۃ وامامۃ الالثغ لغیرہ تجوز وقیل لا ونحوہ فی الخانیۃ عن الفضلی وظاہرہ اعتمادھم الصحۃ وکذا اعتمدھا صاحب الحلیۃ قال لما اطلقہ غیر واحد من المشایخ من انہ ینبغی لہ ان لایؤم غیرہ ولما فی خزانۃ الاکمل وتکرہ امامۃ الفأفأ ولکن الاحوط عدم الصحۃ اھ ص ۶۰۸ ج ۱)

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے:۔ (۱) الثغ کی امامت کے جواز میں اختلاف ہے،

(۲) الثغ صرف وہی نہیں جس میں صحیح پڑھنے کی قابلیت ہی نہ ہو، کیونکہ حلبی وابن شحنہ نے اس پر بذلِ جہد واجب کیا ہے، اور وجوبِ جہد فرع ہے قدرت کی، پس الثغ سے مراد وہ الثغ ہے جو اس حالتِ موجودہ میں صحیح پڑھنے پر قادر نہیں (۳) جو شخص الثغ نہ ہو لیکن اس وقت کسی حرف کے صحیح تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بھی بحکم الثغ ہے، پس ہر چند کہ صحیح مختار قول یہ ہے کہ الثغ کی امامت غیر الثغ کی لئے درست نہیں، اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ صحیح خواں کی اقتداء ایسے شخص کے پیچھے جائز نہ ہو جو حروف کو صحیح ادا نہیں کرتا، مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے امام فضلی کے قول پر فتوی دینے کو جی چاہتا ہے، خصوصًا حرفِ ضاد کے مسئلہ میں، کیونکہ عام طور پر قراء تک اس کو غلط پڑھتے ہیں، لہذا قاری کی اقتداء کرنا غیر قاری کے پیچھے صحیح ہے، البتہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح نہیں، جو بحالتِ موجودہ تصحیح حروف پر قادر ہے، مگر غفلت یا بے توجہی یا رعایتِ عوام کی وجہ سے کسی حرف کو مثلاً ضاد کو اصلی مخرج سے نہیں نکالتا، کیونکہ وہ بحکم الثغ نہیں بلکہ عمداً غلط پڑھنے والا ہے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۹ ارج ۱۳۴۳ھ، صح الجواب، اشرف علی ۱۹ ارج ۱۳۴۳ھ

| ولا الضالین میں ضاد کے بجائے ذال پڑھ لیا تو نماز ہوجائے گی، |
|---|

**سوال** (۷) اگر نماز کے اندر ختم الحمد شریف میں بجائے ولا الضالین کے اگر ذال کے ساتھ تلفظ ادا کیا جائے تو درست ہے یا نہیں اور نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

**الجواب**: نماز درست ہوگئی، لکونہ من الزلۃ فلم یفسد المعنی، باقی جو شخص صحیح تلفظ پر قادر ہو اس کو ذال پڑھنا عمداً جائز نہیں، ۸ ار ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

| تحقیق حرف ضاد |
|---|

**سوال** (۸) یہ جو حرفِ ضاد مشابہ ظاء کے پڑھتے ہیں صحیح نہیں ہے بلکہ ضاد کو مشابہ دال کے پڑھنا چاہئے، کیونکہ دال بہ نسبت ظاء کے ضاد کے ساتھ قریب تر ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی امداد الفتاوی جلد اول صفحہ ۱۴۳ سطر ۳ میں فرمایا ہے کہ "اسی طرح ضاد و دال میں تقارب بلیغ ہے"، اور سطر نمبر ۶ میں فرماتے ہیں "بلکہ باعتبار مخرج کے ضاد کو دال کے ساتھ زیادہ قرب ہے بہ نسبت ظاء کے"،

**الجواب**: حضرت مرشدنا سلمہ نے جو فرمایا ہے حق وصواب ہی، لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ضاد کو دال کے مشابہ پڑھنا چاہئے نہ ظاء کے، دیکھو اس صفحہ کے حاشیہ پر مرقوم ہے ؏ یعنی باعتبار قربیت مخرج کے نہ کہ صفات وصوت کے، للعحہ مشابہت



مع تبدیل مخرج ہے ورنہ مخرج سے ادا ہونے سے مشابہت صورت لازم ہے ۱۲ منہ

دیکھو حضرت سلمہ صوت کا تشابہ تو ظاء کے ساتھ ثابت فرمایا باقی باعتبار قربت مخرج کے دال کو ضاد کے ساتھ زیادہ قریب لکھا بہ نسبت ظا کے، کیونکہ جب سائل نے حضرت سلمہ کی خدمت میں یہ سوال کیا کہ ضاد کو اس کے مخرج سے ادا کرنے پر قدرت نہ ہو تو وہ شخص حرف مذکور کو بصوت ظاء منقوطہ کہ دونوں حرف مفخم اور متشابہ الصوت ہیں پڑھے یا بصوتِ دال مہملہ جو کہ مرقق وغیر متشابہ الصوت ہی پڑھے، تو حضرت سلمہ نے سائل کو جواب میں فرمایا، کہ ضاد کو ظاء یا دال پڑھنا ایسا ہے جیسے باء کو تاء، ثاء کو جیم، حاء کو خاء وہذا باطل بالاجماع،

پس اگر ضاد کی جگہ ظاء کو پڑھنا بسبب اتحادِ صفات اور تشابہ صوت کے جائز ہے، تو ضاد کی جگہ دال پڑھنا بھی جائز ہو، کیونکہ بہ نسبت ظاء کے دال قریب ہی باعتبار مخرج کے، اس لئے حضرت سلمہ نے قربت مخرج ثابت فرمائی اور باعتبار ادا تعمد کے دونوں یعنی ظاء اور دال کو ضاد کی جگہ جواز وعدمِ جواز میں متساوی الاقدام فرمایا ہے، مطلب یہ ہوا کہ حضرت سلمہ کی اس تحریر سے یہ ثابت نہیں ہی کہ ضاد متشابہ الصوت بدال ہے، بلکہ حضرت سلمہ نے الزامًا فرمایا کہ اگر عمداً ظاء کو ضاد کی جگہ پڑھنا بسبب تشابہ صوت واتحاد صفت استعلاء کے جائز ہو تو ضاد کی جگہ دال پڑھنا بھی بسبب اتحاد صفت جہر وقربتِ مخرج کے جائز ہونا چاہئے، حالانکہ دونوں ناجائز ہیں، باقی یہ الگ بات ہے کہ ضاد کو اگر اپنے مخرج اور صفات صحیح طور سے ادا کیا جاوے تو اس کا صوت دال سے مشابہ ہوگا یا ظاء کے، اس کے متعلق حضرت سلمہ کی اور تحریریں اسی جلد میں موجود ہیں، اور اسی تحریر کے حاشیہ پر بھی موجود ہی، کہ ضاد کا صوت ظاء سے متشابہ ہے نہ دال سے، اور یہ شبہ کرنا کہ جب ضاد اور ظاء میں تشابہ صوت پایا جاتا ہے اور ضاد کی اداء پر قدرت نہیں ہے، تو پھر اس کی جگہ وہی حرف پڑھنا چاہئے، کہ جو اس کی صوت جیسی سنائی دے یا جو باعتبار مخرج کے قریب ہو مثل دال کے، تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسا تو ع اور ء، اور ح اور ہ اور س اور ص اور ث اور ت اور ط، اور کاف اور قاف میں بھی تشابہ صوت پایا جاتا ہے، اگرچہ ہر متشابہ الصوت حرف میں ممیز موجود ہے، پھر بھی اتنا امتیاز نہیں ہے کہ عوام فرق سمجھ سکیں تو چاہئے کہ بسبب عدم قدرت کے یہ ہر متشابہ الصوت حروف بھی ایک دوسرے کی جگہ پڑھے جاویں، یعنی عین کی جگہ ء اور ح کی جگہ ہ اور ث کی جگہ س وامثالہا، یا بسبب

قربت مخرج کے آپس میں ایک دوسرے کی جگہ پڑھے جاویں جیسے ع کی جگہ ۃ اور غ کی جگہ خ اور ش کی جگہ ذ اور ت کی جگہ د ہرگز جائز نہیں،

صاحبا! ہجی بات یہ ہے کہ غیر ماہرین فنِ تجوید کو ذال ظاء، زاء اور س، ص، ث اور ت ط کے تشابہ سے تو کیا بلکہ عمداً ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ دینے سے بھی اتنے قدر وحشت و نفرت نہیں ہوتی ہے کہ جس قدر ظاء وضاد کے خفیف تشابہ سے ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ضاد چونکہ بمشکل ادا ہوتا ہے، اس لئے عرصہ بعیدہ سے بہ سبب عدم توجہی علمِ تجوید کے اگلے دانتوں کے مسوڑھوں سے دال کے مخرج کے پاس سے ادا کرتے ہیں، اس لئے دال کی طرح صوتِ شدیدہ مسموع ہوتا ہے، اس لئے اس سے مانوس ہو گئے ہیں، اور اگر صحیح طور نکالا جاتا ہے تو وہ ظاء کی صوت سے متشابہ ہو کر رخوہ ادا ہوتا ہے، اس لئے اس سے متوحش ہوتے ہیں، اب ایک بات اور ضروری عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ قرب واتحاد مخارج کی وجہ سے تشابہ فی الصوت پیدا نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو دال وتاء میں اور ثاء وذال میں اور زاء وسین اور ع وہ میں ہوتا، باقی یہ بات مسلّم ہے کہ قرب واتحاد مخارج کی وجہ سے وہ حروف آپس میں متقاربین ومتجانسین کہلاتے ہیں، اگرچہ صوت میں بیّن امتیاز ہوتا ہے پس قرب واتحاد مخرج ہی کی وجہ سے وہ آپس میں ادغام ہوتے ہیں، نہ تشابہِ صوت کی وجہ سے، اور بُعد مخرج کی وجہ سے وہ متقارب نہ رہیں گے، اگرچہ صوت میں متشابہ ہوں، پس جب متقارب نہ رہے تو ادغام بھی نہ کئے جاویں گے، اس سے معلوم ہوا کہ متجانسین ومتقاربین بھی ایک دوسرے کی جگہ جب کہ قاعدۂ ادغام پایا جاوے تو ہر دو کو متماثل بنا کر آپس میں ادغام کر دیئے جاویں گے، تو یہ بھی گویا ایک دوسرے کی جگہ پڑھنے کا جواز ثابت ہوا، باقی باوجود بُعد مخرج کے اور نہ پائے جانے قواعدِ ادغام کے محض تشابہِ صوت کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کی جگہ کبھی نہ پڑھے جاویں گے، باقی یہ شبہ کرنا کہ جب تشابہ صوت موجبِ اتحاد وقربت نہیں ہے تو پھر یہ تشابہِ صوتی کیونکر پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ تشابہِ صوتی کا اصلی سبب یہ ہے کہ خاص کسی مخرج سے خاص کسی صفت ایک یا چند کے ادا ہونے سے پیدا ہوتا ہے، پس بتیس دانتوں کا مخرج عام ہے، یعنی بتیس دانتوں میں جتنے مخرج ہیں ان میں سے جو حروف صفتِ ہمس اور رخوۃ سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے تو ان کا صوت متشابہ ہوگا مثل س، ص، ث کے، پس اس تشابہ کو یہ لازم نہیں ہے کہ یہ



تینوں ایک ہیں، یا یہ اعتراض کرنا کہ س، ص، ث آپس میں متشابہ کیوں ہیں، ایسا ہی مخرجِ حلق کو دیکھئے کہ جتنے مخرج حلق ہیں ان میں سے جو حروف صفتِ جہر وشدت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے، تو وہ آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے، جیسا کہ ء اور عین اگرچہ بینیہ ہے لیکن بینیت شدۃ اور رخوۃ کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، اور عین میں حصہ شدۃ نے بالحاق صفتِ جہر کے حلق میں یہ اثر پیدا کیا، یعنی یہ سمجھو کہ جہر وشدۃ اگر ایک جگہ جمع ہو کر حلق سے ادا ہوں گی تو ایسی صوت پیدا ہوگی، حالانکہ ہمزہ کے قریب تو ہ تھی، لیکن چونکہ وہ صفت ہمس سے متصف ہے اس لئے متشابہ بہمزہ نہ ہوئی، اور جو حروف صفتِ ہمس اور رخوۃ سے متصف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابہ صوت ہوں گے جیسا ہ اور ح اور اسی طرح جو حروف صفت رخوۃ اور جہر سے موصوف ہو کر حلق سے ادا ہوں گے تو وہ بھی آپس میں متشابہ ہوں گے، جیسا ع اور غ، عین میں جب کہ صفتِ رخوۃ کے حصہ کو کچھ زور دے کر ادا کیا جاوے گا تو عین مشابہ غین کے ہو جاوے گی، اور ازاں سوا غین چونکہ مفخم بھی ہے، اس لئے بیّن فرق ہے، اور ایسا ہی ح اور خ میں تفخیم ممیز ہے، پس عین اور حاء میں گلا نہ گھونٹنا چاہیئے، ورنہ ع اور غ اور ح اور خ متشابہ الصوت ہو جاویں گے، یہاں فقط یہ بتلانا منظور تھا کہ حلق میں سے جب صفت رخوۃ اور جہر مل کر ادا ہوں گی تو تشابہ پیدا ہوگا اگرچہ ادنیٰ ہی سہی، اسی طرح مخرج لہات میں سے جو حروف صفتِ شدت سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے تو وہ بھی متشابہ الصوت ہوں گے، جیسا ک اور ق اگر ک کو رخوۃ پڑھا جاویگا، جیسا کہ بعض کی رائے ہے تو پھر یہ تشابہ نہ رہی گا، ک نبطی اسی کو کہتے ہیں جو کہ کھ سے متشابہ ہوتا ہے، اسی طرح پڑھنا صحیح نہیں ہے بلکہ ک کو شدیدہ اور پست کر کے ھموسہ پڑھنا چاہیے تا کہ مجہور نہ ہو جاوے، جیسا کہ اکثر پڑھتی ہے، اب دانتوں کے مخرج میں سے اگر صفت جہر واستعلاء اور اطباق کے ساتھ جب صفتِ شدۃ ملحق ہو کر ادا ہونے سے جو صوت پیدا ہوگی اس کے ساتھ وہ صوت بھی متشابہ ہوگی جو کہ صفتِ ہمس اور شدۃ کے الحاق سے پیدا ہوگی، جیسا کہ طاء اور تاء، اور جو حروف صفتِ جہر اور شدۃ سے بغیر استعلاء واطباق کے یا بغیر ہمس وشدت کے ادا ہوگا تو وہ طاء وتاء سے متشابہ نہ ہوگا، جیسا کہ دال، اب دیکھنا چاہیے کہ طاء سے دال صفتِ جہر اور شدت اور اصمات اور قلقلہ میں متفق ہے، اور طاء سے تاء فقط شدت

اور اصمات اور ان دونوں صفتوں میں متفق ہے، اور تا، دال سے صفت شدت اور استفال اور انفتاح اور اصمات میں متفق ہے، چاہیئے تھا کہ تا، دال سے متشابہ ہوتی، لیکن چونکہ اوپر بتایا گیا ہے کہ خاص دانتوں میں سے جس حرف میں صفتِ جہر وشدۃ واستعلاء واطباق کے اجتماع سے جو صوت پیدا ہوگی اس کے ساتھ اس حرف کی صوت بھی متشابہ ہوگی، جو کہ صفتِ ہمس اور شدت سے متصف ہو کر دانتوں سے ادا ہوگی، اب دیکھو کہ اگر صوت کو قربت میں دخل ہوتا تو طا، اور تا، قریب تر ہوتیں، بہ نسبت تا، اور دال کے اگرچہ یہ تینوں آپس میں متجانس ہیں، لیکن قربتِ صفاتی کی وجہ سے دال تا، میں ادغام ہوتی ہے، نہ طا، میں، اس سے معلوم ہوا کہ دال اور تا، آپس میں زیادہ تر متقارب ہیں بہ نسبت تا، اور طا، کے، پھر بھی سابق کلیہ کی وجہ سے طا، اور تا، میں تشابہ صوت پایا گیا، اور باوجود قرابتِ صفاتی کے دال اور تا، میں بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ سابقہ کے تشابہ نہ رہا، دوسرے یہ کہ اگر مخرج دانتوں میں سے جو حروف صفتِ ہمس اور رخوۃ سے موصوف ہو کر ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے، مثل ث، س، ص کے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، حالانکہ ث اور ذ متجانس ہیں، پھر بھی بہ سبب نہ پائے جانے کلیہ مذکورہ کے ان میں تشابہ صوتی نہ رہا،

ایسے ہی اگر صفتِ جہر سے اور رخوۃ سے جو حروف موصوف ہو کر دانتوں سے ادا ہوں گے وہ سب آپس میں متشابہ الصوت ہوں گے جیسے زا، ذال، ظا، ضاد، حالانکہ زا، بہ نسبت ذال کے سین سے قریب تر ہے، لیکن چونکہ سین میں جہر نہیں ہے اس لئے تشابہ نہ رہا، اسی طرح ضاد باعتبار مخرج کے دال کیسا قریب ہے، بہ نسبت ظا، کے، اسی وجہ سے بعض قراء نے ہر دو کو متقاربین قرار دے کر قد ضلّوا میں ادغام کیا ہے، پھر بھی بسبب سابق کلیہ کے ضاد اور ظا، اور ذال اور زا، میں تشابہ ہے، نہ ضاد اور دال میں، پس اگر محض تشابہ سے وحشت ہوتی ہے تو پھر طا، اور تا، سے بھی متوحش ہوں، اور اگر ضاد اور دال کے تشابہ کو پسند کرتے ہو بسبب قربت کے تو پھر تا، اور دال کو بھی متشابہ پڑھو، بسبب قربتِ بلیغ کے،

میرے اس سارے معروض کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خاص مخارج میں اثر رکھا گیا ہے، کہ اگر فلاں صفت مفردہ یا بالحاق فلاں صفت کے خاص فلاں مخرج سے ادا ہوگی تو



اس قسم کی صوت پیدا ہوگی، یہی وجہ ہے تشابہ صوتی کی، پس جب دانتوں سے صفتِ رخوۃ وجہر سے جو حروف ادا ہوں گے تو وہ آپس میں متشابہ ہوں گے، اگرچہ سب میں تمیز بیّن موجود ہوتی ہے، گویا یہ سمجھو کہ ہر حرف پست کلام ہوگا بسبب صفت ہمس کے یا بلند کلام ہوگا بسبب صفت جہر کے، پھر اس کی پست کلامی اور بلند کلامی جاری ہوگی بسبب صفت رخوۃ کے یا بند ہوگی بسبب صفت شدت کے پس خاص دانتوں کے مخرج میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ اگر اس سے جو حرف پست کلام بسبب ہمس کے اور اس کی ہمس جاری ہو کر نکلے گی بسبب رخوۃ کے تو اُن کی صوت سا، سا، سا، کی طرح مسموع ہوگی، یہی وجہ ہے ث، س، ص کے متشابہ الصوت ہونے کی، اور اگر دانتوں کے مخرج سے جو حروف بلند کلام بسبب صفت جہر کے اور اس کی جہر جاری ہو کر نکلے گی بسبب رخوۃ کے تو اس کی صوت زا، زا، زا کی طرح سنائی دے گی، یہی وجہ ہے کہ جو حروف صفتِ جہر اور رخوۃ سے موصوف ہو کر دانتوں کے مخرج سے ادا ہوتے ہیں تو وہ آپس میں متشابہ الصوت ہوتے ہیں، جیسے زا، ذال، ظا، ضاد، پس جس طرح اور حروف متشابہ الصوت کا امتیاز مانتے ہو جیسے س، ص، ث کا ایسا ہی ضاد، اور ظا، ذال اور زا، کا تصور فرمایئے، واللہ اعلم،

کتبہٗ شیر محمد

حضرت مرشدی سلمہٗ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجا گیا تو یہ الفاظ ارقام فرمائے "خوب تحقیق اور نہایت مفید ہے"، اشرف علی

اور استادی قاری صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تو یہ ارقام فرمایا! "مضمون متعلق تشابہ ضاد وظا، دیکھ کر محظوظ ہوا ماشاء اللہ خوب لکھا ہے"، محمد یامین

**سوال (۹)** نفل نماز میں سب رکعتوں میں سورت پڑھنا فرض ہے، اور فرض نماز میں فقط دو رکعت میں سورت پڑھنا فرض ہے، اس کا کیا سبب ہے؟ نفل کی سب رکعتوں اور فرضوں کی دو رکعتوں میں قرآت فرض ہے، اس کا کیا سبب ہے؟

**الجواب:** فرضیت قرآت آیۃ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سے ثابت ہے اور فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں فرض نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ سے روایات عدم وجوب قرینہ ہیں کہ یہ امر رکعت ثالثہ رابعہ کی بابت وجوب کے لئے نہیں، کمافی البحر الرائق (ص ۵۶ ج ۲) وانما لم تكن القرأة في الاخريين واجبة في الفرض كما هو

الصحیح من المذھب مع وجود الامر المذکور المقتضی للوجوب موجود صارف له عنه وھو قول الصحابة علی خلافه کمارواہ ابن ابی شیبة عن علی وابن مسعود قال اقرأ فی الاولیین وسبح فی الاخریین لکن ذکر المحقق فی فتح القدیر انه لایصلح صارفا الا اذا لم یرد عن غیرھما من الصحابة خلاف والاختلاف فی الوجوب لایصرف دلیل الوجوب عنه فالاحوط روایة الحسن رحمه الله بالوجوب فی الاخریین انتھی وقد یقال ان مقتضاہ لزوم قرأۃ ماتیسر فی الاخریین وجوبًا لاتعیین الفاتحة کماھو روایة الحسن فلیس موافقا لکل من الروایتین اھ قلت مقتضی الامر الوارد فی الأیة وجوب قرأۃ ماتیسر فی الصلوٰۃ مطلقا ولاتعرض له بالرکعة ولا الرکعتین ولا الاولیین و لا الاخریین وانما قلنا بفرضیة القرأۃ فی الرکعتین من الفرض لقیام الاجماع علیه ولا اجماع فی الاخریین واما تعیین الاولیین للقرأۃ فواجب لافرض بدلیل قضاءھا فی الاخریین اذا ترکھا فی الاولیین و دلیل الوجوب فی ذلك مواظبة النبی صلی الله علیه وسلم علی ذلك من غیر ترك، والله تعالیٰ اعلم، ۲۶ ر ذیقعدہ ۴۳ھ

**سوال** (۱۰) | حکم جہر منفرد در تکبیرات صلوٰۃ | مسئلہ بہشتی گوہر (جدید) ص ۳۶، فجر، مغرب، عشاء، کے وقت پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ اور سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں امام بلند آواز سے کہے، اور منفرد کو قرأت میں تو اختیار رہے، مگر سمع اللہ لمن حمدہ اور تکبیریں آہستہ کہے، اور ظہر کے وقت امام صرف سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں بلند آواز سے کہے اور منفرد آہستہ اور مقتدی ہر وقت تکبیریں وغیرہ آہستہ کہے (ص ۴۹۵ ج شامی) اس مسئلہ میں منفرد کو قرأت میں سر اور جہر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تین وقتوں میں (یعنی فجر، مغرب، عشاء) مگر سمع اللہ لمن حمدہ اور سب تکبیریں آہستہ کہنے کو لکھا ہے، شبہ یہ ہے کہ پرانے بہشتی گوہر میں تکبیر وغیرہ کا اختیار مطلقاً لکھا ہے خواہ آہستہ کہے یا جہراً کہے، اور چونکہ اس مسئلہ کے الفاظ تغیر و تبدل کیا گیا، مگر حاشیہ میں کچھ نہیں لکھا کہ فلاں عبارت بڑھائی گئی ہے جیسا کہ شروع میں ہدایت کی گئی ہے کہ جو عبارت جدید بڑھائی جاوے گی اس کو حاشیہ میں تحریر کرکے



۱۳

بتلادیا جاوے گا کہ فلاں عبارت بڑھائی ہے، اس لئے تحقیق طلب ہے، فقط

**الجواب**: ہاں اس مسئلہ میں بہشتی گوہر سابق سے کچھ عبارت بدلی ہوئی ہے، اور اس کی اطلاع حاشیہ میں اس لئے نہیں دی گئی کہ اس اطلاع کا التزام صرف بہشتی زیور میں کیا گیا ہے، بہشتی گوہر میں اس کا التزام نہیں کیا گیا، ملاحظہ ہو دیباچہ جدید بہشتی گوہر صفحہ ۴/۴۳، بہشتی گوہر قدیم میں صرف اتنی عبارت تھی کہ منفرد کو اختیار ہے جس سے جہر تکبیر و تسمیع و تحمید میں بھی اختیار کا ایہام ہوتا تھا، حالانکہ منفرد کو صرف جہر قرأت کا اختیار ہے، تکبیرات و تسمیع وغیرہ کا جہر اس کے لئے مشروع نہیں، اس لئے اس مرتبہ عبارت میں ترمیم کردی گئی، اور دلیل اس ترمیم کی در مختار مع الشامی بیان سنن الصلوٰۃ صفحہ ۴۹۵ ج المطبوعہ ۱۲۹۴ھ میں مذکور ہے ونصہ و جھر الامام بالتکبیر بقدر حاجته للاعلام بالدخول والانتقال وکذا بالتسمیع والسلام واما المؤتم والمنفرد فیسمع نفسه اھ، اس میں صراحۃً جہر و تکبیرات و تسمیع و سلام کو امام کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، اور منفرد کو اس بارے میں مقتدی کی طرح اخفاء کا حکم کیا گیا ہے، اور فصل قرأۃ جو کہا گیا ہے ویخیر المنفرد فی الجھر وھو افضل ان ادی الخ وہاں صرف جہر بالقرأت میں تخییر مراد ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ فافہم، یکم محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

**سوال** (۱۱) | قرأۃ خفی کی حالت میں سانس لیتے ہوئے قرأۃ جاری رکھنا | اثناء نماز قرأت خفی کی حالت میں سانس لیتے ہوئے قرأت کا جاری رکھنا جبکہ کوئی فتور قرأت میں نہ پڑے جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: اگر قرأت میں فتور نہ آئے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے، ۲۶ ر شعبان ۴۶ھ

**سوال** (۱۲) | قرأت فاتحہ کے بعد نماز میں بجائے کسی اور سورۃ کے خود سورۃ فاتحہ کا قصداً یا سہواً ضم کرنے کا حکم | نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کے بعد بجائے کسی اور سورۃ کے ضم کرنے کے خود سورۃ فاتحہ ہی ضم کرنا عمداً یا سہواً کیسا ہے،

**الجواب**: قال فی شرح المنیة ولو کرر الفاتحة فی رکعة من الاولیین متوالیا اوقرأ القرآن فی رکوعه اوفی سجودہ اوفی موضع التشھد یجب علیه سجود السھو للزوم تاخیر الواجب وھو السورۃ فی الصورۃ الاولیٰ

والقرأۃ فیما لم یشرع فیه فیما بعدہ والتحرز عن کل ذلك واجب ولو قرأ الفاتحة ثم السورۃ ثم الفاتحة لا یلزمه السهو وقیل یلزمه اھ (ص ۴۳۳) وفی الدر فی واجبات الصلوٰۃ ویجب تقدیم الفاتحة علی کل السورۃ وکذا ترك تکریرها قبل سورۃ (الرکعتین) الاولیین اھ (ص ۴۷۹ ج ۱) وفیه ایضا وحفظ فاتحة الکتاب وسورۃ واجب علی کل مسلم اھ قال الشامی ای اقصر سورۃ او ما یقوم مقامها من ثلاث آیات قصار اھ (ص ۵۶۴ ج ۱) قلت فلو کان اعادۃ الفاتحة بنیة الضم تنوب عن وجوب السورۃ لم یکن حفظ سورۃ ما عدا الفاتحة واجبا و قال الطحطاوی فی حاشیة علی مراقی الفلاح ولو قرأ الفاتحة علی قصد الدعاء تنوب عن القراءۃ کما فی الفتاوی الصغری (ص ۱۴۴) وفیه اشعار بان النیة لا اثر لها، پس جس شخص کو فاتحہ کے علاوہ سورۃ یا آیات یاد نہ ہوں اس کو فاتحہ کا بنیت ضم پڑھنا مکروہ ہے، اس سے واجب ادا نہ ہوگا، کیونکہ ضم سورۃ علاوہ فاتحہ کے واجب ہے، اور جسکو یاد نہ ہو وہ بعد فاتحہ کے تسبیح پڑھے، تکرارِ فاتحہ سے سجدۂ سہو لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۱۳ شوال سنہ ۴۶ھ

| تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر تکرار قل ہو اللہ کیسا ہے، |
| --- |

**سوال** (۱۳) تراویح میں ختم قرآن میں تین بار قل ہو اللہ کا پڑھنا کیسا ہے، پورے قرآن کو ایک مرتبہ اور قل ہو اللہ کو تین بار پڑھنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ قاری اس سورۃ کو دیگر قرآن پر فضیلت دیتا ہے،

**الجواب**: قال فی شرح المنیة وقراءۃ قل ہو اللہ احد ثلث مرات عند ختم القرآن لم یستحسنها بعض المشایخ وقال الفقیه ابو اللیث هذا شیٔ استحسنه اهل القرآن وائمة الامصار فلا بأس به الا ان یکون الختم فی المکتوبة فلا یزید علی مرۃ اھ (ص ۴۶۴) لیکن اگر تکرار کا التزام ایسا ہو گیا ہے کہ اس کے ترک پر ملامت ہوتی ہے تو اس کا ترک کرنا ضروری ہے؛ کما ہو مقتضی التزام المباح والمستحب، ۱۳ شوال سنہ ۴۶ھ

| دو سورتوں کے درمیان ترک سورۃ مکروہ ہے |
| --- |

**سوال** (۱۴) پہلی رکعت میں ایک سورۃ پڑھی، جیسے لم یکن الذین اور دوسری رکعت میں درمیان میں سے ایک



سورۃ جیسے اذا زلزلت الارض چھوڑ کر اور ایک سورۃ جیسے العادیات[عه] پڑھی تو اس صورت میں نماز مکروہ ہوگی یا نہیں اور بیچ میں کتنی چھوٹی سورۃ چھوڑنے سے نماز مکروہ ہوتی ہے، اور اس کی مقدار کیا ہوتی ہے؟ تحریر فرمائیں،

**الجواب**: یہ صورت اگر قصداً کی جائے تو مکروہ ہے، سہواً ہو جائے تو کراہت نہیں، درمیان میں ایک سورۃ کا چھوڑنا اس وقت جائز ہے جبکہ وہ اتنی بڑی سورۃ ہو کہ اس کے پڑھنے سے رکعتِ ثانیہ رکعت اُولیٰ سے بہت لمبی ہو جائے، اور قدرے طول کا مضائقہ نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُولیٰ میں سبح اسم ربک اور ثانیہ میں سورۃ الغاشیہ پڑھی ہے، اور وہ سبح اسم ربک سے طویل ہے مگر اطول نہیں، پس ایسی صورت میں ترک مکروہ ہے، پس سورۃ القدر پڑھ کر سورۃ الزلزال پڑھنا جائز ہے، کیونکہ کلمات و حروف میں سورۃ لم یکن الذین کفروا ان دونوں کے برابر ہے، اس کے عدم ترک سے رکعتِ ثانیہ بہت طویل ہو جائے گی، پس اس کا ترک مکروہ نہیں، اور سورۃ لم یکن پڑھ کر والذریٰت پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سورۃ الزلزال اتنی لمبی نہیں کہ رکعتِ ثانیہ طویل ہو جائے، پس اس کا ترک مکروہ ہے، قال فی مراقی الفلاح مع الطحطاوی ویکرہ فصله بسورۃ بین سورتین قرأهما فی رکعتین لما فیه من شبهة التفضیل والهجر وقال بعضهم لا یکرہ اذا کانت السورۃ طویلة (لانها بمنزلة سورتین قصیرتین) کما لو کان بینهما سورتان قصیرتان اھ، وفی الشامیة (ص ۷۰ ج ۱) ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ اما بسورۃ طویلة بحیث یلزم منه اطالة الرکعة الثانیه اطالة کثیرۃ فلا یکرہ شرح المنیة اھ قلت وهذا هو الذی قاله سیدی حکیم الامة بن وقه وحاصله ان القاری معذور فی ترك مثل هذہ السورۃ الطویلة شرعا ولیس بمعذور فی ترك القصیر فافهم، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۴ رجب سنہ ۴۷ھ

| سورۃ بنی اسرائیل کی آیت "سنة من قد ارسلنا" سے قرأت کی ابتداء کرنا خلاف اولیٰ ہے؛ |
| --- |

**سوال** (۱۵) ایک شخص نے سورۃ بنی اسرائیل سے قرأت اس طرح کی کہ سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا سے ابتداء کی، اور اس کے بعد ختم رکوع تک پڑھتا چلا گیا، نماز کے بعد زید نے کہا کہ نماز فاسد ہو گئی، کیونکہ معنی متغیر ہو گئے، اگر وان کادوا لیستفزونك سے ابتداء کی جاتی تو نماز درست ہو جاتی، عمرو نے کہا کہ نماز اب بھی درست ہو گئی ہے،

[عه] او لانه معذور فی الترک ۱۲

اعادہ واجب نہیں پس فیصلہ فرمایا جاوے کہ ان دونوں میں صحیح قول کس کا ہے؟

**الجواب**: اس طرح قراءت کرنا خلاف اولیٰ ضرور تھا (لکون الوصل بین الحال و ذی الحال احسن) مگر نماز صحیح ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، (لان فواصل الأی فی انفسها مقاطع فاذا جاز الوقف علی قوله الا قلیلا جاز الابتداء بقوله سنة من قد ارسلنا ایضا لجواز الفصل بین الحال وذی الحال کقوله تعالیٰ صبغة الله وهو حال من قوله بل ملة ابراهیم حنیفا علی قول وهو کما تری مفصول) واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۸ رجب ۱۳۴۷ھ

**قرأۃ میں قصار و ساط اور طوال کی رعایت مسنون ہے یا مستحب اور ان کی تفصیل کیا ہے!**

**سوال** (۱۶) فجر و ظہر میں طوال عصر و عشاء میں وساط اور مغرب میں قصار کی قرأت مستحب یا مسنون ہے مگر کہاں سے کہاں تک طوال اور کہاں سے کہاں تک وساط اور کہاں سے کہاں تک قصار ہے؟

**الجواب**: یہ رعایت مسنون ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو بذریعہ خطوط کے اس کی تاکید فرمائی ہے، اور احادیث مرفوعہ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے؛

والطوال من قٓ الی البروج والاوساط منها الی لم یکن والقصار منها الی آخر القرآن هذا هو المشهور بین الحنفیة وفیه اقوال أخر ایضا، ۲۰ شعبان ۱۳۴۶ھ

**نماز میں سورۃ انشقاق پڑھنے کا حکم**

**سوال** (۱۷) فرضوں میں اقرأ، سورۃ انشقاق، یعنی سجدہ والی سورۃ ارادۃ پڑھنی کیسی ہیں، اور ان کے پڑھنے سے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟

**الجواب**: اگر مقتدی زیادہ نہ ہوں تو سورۃ انشقاق پڑھنے میں کچھ کراہت نہیں اور اگر زیادہ ہوں (جن کے اشتباہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو) تو سورۃ انشقاق (اور اسی طرح وہ سورتیں جن میں آیۃ سجدہ کے بعد تین آیتیں ہوں ان کا) پڑھنا مکروہ ہے،

**حکم قرأۃ بسملہ بین الفاتحہ والسورۃ**

**سوال** (۱۸) قرأۃ بسم اللہ بین الفاتحہ والسورۃ کو علامہ شامیؒ نے حسن کہا ہے، (قوله ولا تکره اتفاقا) ولهذا صرح فی الذخیرة والمجتبی بانه ان سمی بین الفاتحة والسورة المقروءة سرًا وجهرًا کان حسنا عند ابی حنیفة ورجحه المحقق ابن الهمام وتلمیذه الحلبی بشبهة الاختلاف فی کونها آیة من کل سورة، بحر شامی ص ۳۶۲ ج ۱، مصری)



لیکن اسی کے اوپر جو عبارت ہے وہ یہ ہے کہ (قوله لا تسن) مقتضی کلام المتن ان یقال لا یسمی لکنه عدل عنه لایهامه الکراهة بخلاف نفی السنیة ثم ان هذا قولهما وصححه فی البدائع قال محمد تسن ان خافت لا ان جهر بحر ونسب ابن الضیاء فی شرح الغزنویة الاول الی ابی یوسف فقط فقال وهذا قول ابی یوسف وذکر فی المصفی ان الفتوی علی قول ابی یوسف انه یسمی فی اول کل رکعة ویخفیها وذکر فی المحیط المختار قول محمدؒ وهو ان یسمی قبل الفاتحة وقبل کل سورة فی کل رکعة وفی روایة الحسن ابن زیاد انه یسمی فی الرکعة الاولی لا غیر وانما اختیر قول ابی یوسف لان لفظة الفتوی آکد وابلغ من لفظة المختار ولان قول ابی یوسف وسط وخیر الامور اوسطها کذا فی شرح عمدة المصلی اھ، شامی جلد ۱ ص ۳۶۲ مصری

اور عالمگیریہ کتاب الصلوٰۃ باب چہارم صفت نماز کی فصل نماز کی سنتوں اور اس کے آداب کے بیان میں ہے "تعوذ کے بعد آہستہ بسم اللہ پڑھے اور بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے" سورتوں میں فصل کے واسطے اتری ہے، یہ ظہیریہ میں مکروہاتِ صلوٰۃ کے بیان میں لکھا ہے؛ صرف بسم اللہ سے فرض قرأت ادا نہیں ہوتا، یہ جوہرۃ النیرہ میں لکھا ہے، بسم اللہ ہر رکعت کے اول میں پڑھے، یہ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے، یہ محیط میں ہے، اور حجۃ میں ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے، یہ تاتارخانیہ میں ہے، فاتحہ اور سورۃ کے درمیان میں بسم اللہ نہ پڑھے، یہ وقایہ میں اور نقایہ میں لکھا ہے، یہی صحیح ہے، یہ بدائع اور جوہرہ نیرہ میں لکھا ہے، فتاویٰ ہندیہ ترجمہ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۹۹ جلد ۱ مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۵ھ،

افسوس ہے کہ فتاویٰ عالمگیریہ اصل عربی میں یہاں موجود نہیں ہے، میں نے حوالہ میں کتاب الصلوٰۃ اور باب اور فصل درج کردی، حضور اس عربی میں ملاحظہ فرمالیں، عبارت عالمگیریہ سے صاف واضح ہے کہ بین الفاتحہ والسورۃ بسم اللہ نہ پڑھے، اور لفظ فتویٰ اور لفظ صحیح کافی دوافی طور پر اس کے دلائل ہیں، اور عبارت شامی میں وانما اختیر سے خط کشیدہ عبارت بین الفاتحہ والسورۃ بسم اللہ نہ پڑھنے کے اوپر دلالت صریحہ کررہی ہے،

اس کے باوجود کہ لفظ لفظۃ الفتوی آکد وابلغ کے مقابلہ میں قول مختار امام محمدؒ کا بھی چھوڑ دیا گیا، اور امام ابو یوسفؒ کا قول اختیار کیا گیا، بہشتی زیور میں بسم اللہ پڑھنا لکھا گیا ہے

"پھر بسم اللہ پڑھ کر الحمد پڑھے اور ولا الضالین کے بعد آمین کہے، پھر بسم اللہ پڑھ کے کوئی سورۃ پڑھے"، بہشتی زیور مدلل و مکمل حصہ دوم ص ۲۴) تو کیا فتوی کے مقابلہ پر حسن پر عمل کیا جائیگا۔ حالانکہ نہ پڑھنے کو صحیح کہا گیا ہے "عالمگیری"، تو سوال یہ ہے کہ اوّل تو بہشتی زیور سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بسم اللہ کا پڑھنا بطور مباح کے ہے یا بطور سنت کے پڑھنے کو لکھا ہے لیکن پھر بھی فتوی آکد و ابلغ کے مقابلہ پر حسن کا اختیار کرنا سمجھ میں نہ آیا، حضور والا تسلّی و تشفی فرما کر احسانِ عظیم فرمادیں، ابتک میرا عمل نہ پڑھنے پر ہے، اور یوں ہی دوسروں کو مسئلہ بتاتا ہوں، ہاں البتہ جب میں تراویح میں ختم کرتا ہوں تو بسم اللہ بین السورتین کر لیتا ہوں بسبب تصادم روایت عاصمؒ کے کہ بروایت اُن کے ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ سنت ہے، و بسمل بین السورتین بسنتہ و درایۃ و تحملاً، تاکہ قرآن کے نقص کا احتمال نہ رہے، اور ایسا ہی آپ نے فتاویٰ امدادیہ میں جواب دیا ہے اسی قسم کے ایک سوال کا، لیکن یہ بات عام نمازوں میں تو نہیں، پھر بھی فتویٰ کو چھوڑ دینا کیسا، بینوا بالدلائل توجروا بالفضائل۔

**الجوابُ**؛ قول ابی یوسفؒ پر فتویٰ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ تسمیہ قبل سورۃ کو مسنون نہ کہا جاوے گا، لیکن بناء بر مزید احتیاط اس کو حسن سمجھ کر پڑھ لیا جاوے تو اس فتوے کے خلاف نہیں ہے، کما لایخفی،

اور بہشتی زیور میں جو ترکیب نماز کی بیان کی ہے، اس میں دو سرے افعال کے مسنون وغیرہ ہونے سے بھی تعرض نہیں جو ان میں تصریح کی حاجت ہوتی، وفی الطحطاوی علی المراقی الفلاح (ص ۱۵۱) عن الکمال و تلمیذہ ابن امیر حاج ان الخلاف فی السنیۃ فلاخلاف انہ لوسمی لکان حسنا لشبھۃ الخلاف فی کون آیتہ من کل سورۃ الخ، باقی رہا سوال تراویح میں ہر سورۃ کے شروع پر بسم اللہ پڑھنے کا، سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مولانا مدّ فیوضھم[عہ] و نیز دیگر اکابر کا یہی معمول ہے کہ ہر سورۃ پر بسم اللہ نہیں پڑھتے، بلکہ تمام قرآن میں فقط ایک سورۃ کے شروع میں پڑھتے ہیں، کیونکہ تسمیہ آیۃ من القرآن ہے، نہ کہ آیۃ من کل السورۃ، اور احکام نماز میں ائمۃ الفقہ کے قول پر عمل کرنا چاہئے، اور امام عاصمؒ کا قول خارج صلوٰۃ قابلِ عمل ہے، و نیز امام عاصمؒ کی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ کو بحیثیت جزءِ القرآن ہونے پڑھتے تھے، لہذا ختمِ قرآن میں شبہ نہ کیا جائے، بیش بریں نیست کہ ان کے نزدیک جو چیز مسنون تھی وہ ترک ہوگئی،

عہ اور امداد الفتاوی میں،



سو اس کا مضائقہ نہیں، کیونکہ ہم فقہ میں اُن کے مقلد نہیں ہیں، اور نماز جہریہ میں امام محمدؒ بھی تسمیہ کے قائل نہیں، اس لئے تسمیہ بین السورتین کو جو حسن کہتے ہیں اُن کے نزدیک بھی تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب،

احقر عبد الکریم عفی عنہ  الجواب صحیح  ظفر احمد عفا عنہ ۲۰ رمضان ۱۳۴۸ھ

**ضاد کو دال پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم۔**

**سوال** (۱۹) اکثر لوگ ضاد کی جگہ دال پڑھتے ہیں، اور صاد کی جگہ اور ثاء کی جگہ سین اور ظاء کی جگہ ذال اور زاء پڑھ لیتے ہیں، اور فقہاء کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حروف مشتبہ الصوت ہیں اور ان میں فرق بلا مشقت کے حاصل نہیں ہوتا ہے تو متأخرین کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے، تو کیا ضاد اور دال میں بھی فرق مشکل ہے، بلا مشقت اس میں امتیاز نہیں ہو سکتا ہے، جو اکثر لوگ ایسا ہی پڑھتے ہیں، اس میں فرق نہ کرنے سے نماز ہو جائے گی، احقر اس میں بہت متردد رہتا ہے، کہ غیر المغدوب اور ولا الدآلین پڑھتے ہیں، یعنی ض کو دال کے مخرج سے ادا کرتے ہیں تو اس صورت میں قاضی خاں فرماتے ہیں ولو قرأ الدالین بالدال تفسد صلوٰتہ، اور کبیری میں ہے لاتفسد صلوٰتہ، اور یہی تردد کا باعث ہے، تو کس کا قول معتبر مانا جائے البتہ شامی میں اس کی تصریح کر دی ہے، کہ متأخرین کا مذہب اوسع ہے اور متقدمین کا قول احوط ہے، اور اسی بناء پر جب مجھ کو تحقیق تمام ہو جاتی ہے کہ دال ہی پڑھا گیا ہے تو نماز کو لوٹا لیا کرتا ہوں، پس امید ہے کہ اس تردد سے احقر کی رہائی فرما دیں گے،

**الجواب**؛ اس مسئلہ میں احوط متقدمین کا قول ہے، مگر ابتلاء عام کی وجہ سے فتوی اس پر دیا جاتا ہے کہ ضاد کو دال پڑھنے والے کے پیچھے نماز صحیح ہو جاتی ہے، بشرطیکہ وہ اس وقت صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور اگر قادر ہو اور محض سستی کی وجہ سے غلط پڑھتا ہے تو نماز فاسد ہے، یہ تو نماز کا حکم ہے، اور خود اس شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ اس پر تصحیح مخرج واجب ہے، اگر اس کی کوشش نہ کریگا گنہگار ہوگا۔ واللہ اعلم، شوال ۴۸ھ

**قرأت کی بعض غلطیوں کا حکم**

**سوال** (۲۰) امام سے قرأت میں حسب ذیل غلطیاں ہوں تو فاسد ہوگی یا نہیں؟ بصورت اُولیٰ نماز دُہرانا ضروری ہے یا نہیں؟

(۱) اگر مَاوَدَّعَکَ کو مَاوُدُّعَاکَ پڑھے تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

(۲) مَنْ تَمَنّٰى يَمَّنِى میں مَن مِن تانی یُمَنِّی پڑھنا موجب فساد ہے کہ نہیں؟
(۳) انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء میں لفظ "اللہ" کو پیش سے پڑھنے سے فساد ہوگا کہ نہیں
(۴) عصیٰ فرعونُ الرسولَ میں فرعون کو زبر اور الرسول کو پیش سے پڑھے تو نماز ہوگی کہ نہیں
(۵) وَلَا الضَّالِّين کو وَلَا الضُّآلِّين، ض کے پیش اور ض کے بعد ء (ہمزہ) اور مد کے ساتھ پڑھنا مفسد نماز ہے کہ نہیں،
یہ آخری غلطی عام ہے، کیا اس صورت میں نماز دہرانا پڑے گی؟

**الجواب:** (۱) دال پر ضمہ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، کما فی رد المحتار تحت قول الدر (فلو فی اعراب الی قولہ لم تفسد) ککسر قوام مکان فتحہا او فتح باء نعبد اھ، لیکن میم کے بعد الف کے اضافہ میں تغیر فاحش پیدا کرتا ہے، یعنی مفرد کو تثنیہ بنا دیتا ہے، اور تثنیہ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے حق میں کسی طرح جائز نہیں، اور اشباع کا یہ موقع نہیں اور فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ کسی حرف کے بڑھا دینے سے اگر معنی میں تغیر ہو جاوے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ غلطی فساد صلوٰۃ کا موجب ہے، البتہ اگر بکثرت اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہو تو عموم بلویٰ کے سبب فساد کا حکم نہ دیا جاوے گا، اور صلوٰۃ فاسدہ کا اعادہ ضروری ہونا محتاج بیان نہیں،
(۲) یہ غلطی بھی فی نفسہ موجب فساد ہے، لتغیر المعنی، ولیکن عموم بلویٰ کے سبب عدم فساد کا فتویٰ دیا جاوے گا،
(۳) اس غلطی کو شامی نے متقدمین کے نزدیک مفسد صلوٰۃ فرمایا ہے، جبکہ ہمزۂ علماء کو مفتوح بھی پڑھا ہو، (اور اگر مفتوح نہ پڑھا ہو بلکہ مضموم یا موقوف پڑھا ہو تو مفسد نہیں، کیونکہ اس کا مفعول ہونا مشتبہ ہوگیا) ولیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تغیر کو فاحش کہنا (یعنی الذی یکون اعتقادہ کفراً) صحیح نہیں، کیونکہ خشیت صرف خوف کے معنی میں منحصر نہیں، بلکہ دیگر معانی میں بھی مستعمل ہے، چنانچہ قول خداوندی فخشینا ان یرہقہما میں اصل معنی مراد نہیں، بعض نے علمنا سے اس کی تفسیر اور بعض نے کرہنا سے، اسی طرح "یخشی اللہ" میں زمخشری وغیرہ نے رفع کی قرأت (شاذہ) نقل کی ہے، اور صاحب روح المعانی نے خشیۃ کو تعظیم پر محمول کیا ہے، و نیز ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ خشیت کے معنی اختیار (یعنی اجتباء) کے بھی آتے ہیں، پس جب اس غلطی کے



ہوتے ہوئے ایک صحیح معنی ہو سکتے ہیں تو متقدمین کے قول پر بھی نماز فاسد نہ ہوگی، واللہ اعلم اور متاخرین کے قول میں تو بہت گنجائش ہے، کہ باوجود تغیر فاحش کے بھی فساد صلوٰۃ کا حکم نہیں کرتے، حاصل یہ کہ اس غلطی سے نہ متقدمین کے قول پر نماز فاسد ہوگی نہ متاخرین کے قول پر، واللہ اعلم بالصواب،
(۴) یہ غلطی متقدمین کے قول پر موجب فساد ہے، ولیکن متاخرین کے نزدیک موجب فساد نہیں، اور قول متاخرین پر فتویٰ ہونا خلاصہ میں نوازل سے منقول ہے، لہٰذا عوام کے واسطے اسی میں سہولت ہے، ولیکن اگر اس قسم کی غلطی بکثرت واقع نہ ہوتی ہو تو اعادہ نماز کا کر لیا جاوے، لیکن قول متقدمین احوط واوفق بالقیاس ہے،
(۵) اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے معنی متغیر نہیں ہوتے،
کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۱ر محرم ۵۲ھ

**حکم جہر بسم اللہ در سورۃ اقرأ**

**سوال (۲۱)** ...... زید نے رمضان شریف میں نماز تراویح میں بروز ختم قرآن شریف سورۃ اقرأ شروع کرتے وقت زور سے بسم اللہ الرحمن پڑھی تو عمرو نے اس پر اعتراض کیا کہ نہ پڑھنا چاہئے، اور کہتا ہے کہ قرآن شریف تسلسل کے ساتھ پڑھا جا رہا تھا، بسم اللہ کو درمیان میں کیوں حائل کیا، زید کہتا ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے، اگر میں بسم اللہ جہر کے ساتھ نہ پڑھتا تو ایک جزو قرآن شریف کا رہ جاتا، لیکن عمرو زید کی اس گفتگو پر یقین نہیں کرتا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ فعل کس حد تک صحیح ہے اور کس کی بات تسلیم کیجائے اگر دونوں راہ حق پر نہیں ہیں تو براہ شرع شریف جو حکم ہو اس سے آگاہی فرما کر طمانیت بخشی جاوے،

**الجواب:** زید کا قول صحیح ہے، تمام قرآن میں ایک جگہ کسی سورۃ پر بسم اللہ کا جہر لازم ہے تاکہ ختم پورا ہو جاوے، اور سورۃ اقرأ پر جہر کرنا ہمارے اکابر کا مختار ہے، کیونکہ یہ سورۃ نزول میں مقدم ہے، اور عمرو کا یہ کہنا کہ اس سے تسلسل قرآن جاتا رہا بالکل غلط ہے، کیونکہ بسم اللہ بھی تو قرآن ہی ہے، پس قرآن کی آیت سے تسلسل قرآن میں کیوں کمی آجاوے گی، ۲ر ذیقعدہ ۴۵ھ

**دو رکعتوں میں ایک چھوٹی سورۃ پڑھنا**

**سوال (۲۲)** زید نے نماز تراویح میں آیۃ الذی

میں دو رکعت اس طور پر کی کہ پہلی رکعت میں لفظ "مسکین" تک اور دوسری رکعت میں ختم تک، آیا یہ دو رکعتیں ہوئیں یا نہیں، اگر نہیں ہوئیں تو اب اس کی مکافات کیا ہو سکتی ہے؟

**الجواب**: یہ دونوں رکعتیں صحیح ہو گئیں، مگر ایسا کرنا مناسب نہ تھا، ایسی چھوٹی سورتوں میں دو رکعتیں ایک سورۃ کے اندر نہ کرنا چاہئے، کہ اس صورت سے ہر رکعت میں تین آیات نہیں ہوئیں۔

حکم تکرار قل ہو اللہ احد

**سوال** (۲۳) قل ہو اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ تین مرتبہ پڑھنا مسنون ہے، اگر کوئی شخص صرف ایک مرتبہ تلاوت کرتا ہے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس بارہ میں جو شرع شریف کا حکم ہو اس سے آگاہی بخشی جاوے،

**الجواب**: تکرار قل ہو اللہ فی نفسہٖ مباح ہے، مگر جہاں ترک تکرار سے اعتراض ہوتا ہو وہاں ترک لازم ہے، تاکہ لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں، واللہ اعلم، ۲ر ذیقعدہ ۴۵ھ

مسئلہ قرأۃ

**سوال** (۲۴)........................ زید نے مغرب کی نماز میں امام بن کر دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سورۃ مزمل کی اخیر کی آیتوں میں سے واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ہو خیرا واعظم اجراً ط واستغفروا اللہ، ان اللہ غفور الرحیم ۃ تک جہاں تین جگہ ط اور اخیر میں ہ علامت آیت موجود ہے، پڑھی، اور باقی رکعت کو حسب دستور ادا کیا، فاتحہ کے بعد اسی قدر آیتِ قرآنی پڑھنے سے اس کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں، بینوا توجروا،

**ہو المصوب**: صورتِ مسئول عنہا میں زید کی نماز مع الکراہۃ صحیح ہوئی، کیونکہ اس کو پہلی دو رکعت میں فاتحہ کے بعد ایک سورۃ یا چھوٹی تین آیتیں یا بڑی ایک آیت پڑھنا واجب تھا، لیکن اس نے قصداً ایک آیت سے بھی کم پڑھ کر واجب کو ترک کیا، اس لئے اس پر نماز پھر پڑھنی واجب ہے، اور نماز کو اعادہ نہ کرنے سے وہ فاسق اور گنہگار ہوا، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کی عبارت اس پر شاہد ہے، عالمگیری میں ہے ویجب قراءۃ الفاتحۃ وضم السورۃ او ما یقوم مقامها من ثلث آیات قصار او آیۃ طویلۃ فی الاولیین بعد الفاتحۃ کذا فی النہر الفائق انتہی، اور درمختار میں ہے، ولها واجبات لا تفسد بترکها وتعاد وجوبا فی العمد والسهو ان لم یسجد له وان لم یعدها یکون فاسقا آثما انتہی، اور شامی میں ہے تحت



قولہ وتعاد وجوبا ای بترک هذه الواجبات او واحد منها انتہی، اور ہدایہ کے مکروہات الصلوٰۃ میں ہے والصلوٰۃ جائزۃ فی جمیع ذلک لاستجماع شرائطها وتعاد علی وجه غیر مکروه وهو الحکم فی کل صلوٰۃ ادیت مع الکراهۃ کما اذا ترک واجبا من واجبات الصلوٰۃ انتہی، اور جامع الرموز میں ہے وواجبها قرأۃ خصوص الفاتحۃ وضم مقدار سورۃ من آیۃ طویلۃ او ثلث قصار، وفی الکلام اشارۃ الی انه یجب تاخیر السورۃ عن الفاتحۃ والی انه یجب ان یقرأ مرۃ کما فی المحیط، والی انها واجبۃ ولذا کان تارکها یؤمر بالاعادۃ کما فی القنیۃ والی ان نفس السورۃ واجبۃ ایضا کما قال القاضی فی الجامع (اس کے بعد مجیب نے اوقاتِ قرآن کی بحث طرداً لکھی ہے ہم نے اختصاراً حذف کر دیا) اس لئے صورتِ مسئول عنہا میں امام مذکور کی قراءت میں بعد فاتحہ کے ایک آیت بھی نہیں پائی گئی، کیونکہ وہاں تین جگہ ط اور اخیر میں ہ علامت آیۃ موجود ہے، اسی سبب سے وہ تارکِ واجب ہوا، اور پھر نماز کو اعادہ نہ کرنے کی وجہ سے شرعاً فاسق اور گنہگار بھی ہوا، ہٰکذا حکم الکتاب واللہ اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب، حررہ الراجی رحمۃ ربه الولی محمد رمضان علی لکوشاکاوی

اقول وباللہ التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق، الجواب جواب لا یماثل جواب والمنکر علی خلاف الصواب، لان البعض قد استشکل بعبارۃ الهندیه والشامی حیث حررت فی مقامهما انه لو قرأ بعض آیۃ الکرسی فی رکعۃ والبعض فی رکعۃ اخری لا یجوز عند الامام وعند العامۃ یجوز ویکتفی فلا تثبت من قول الجواز والکفایۃ الصحۃ الکاملۃ لترک الواجب وهو قراءۃ الآیۃ التامۃ فی رکعۃ واحدۃ فعلیه ان یعید وجوبا فی العمد والسهو ان لم یسجد له وان لم یعدها یکون فاسقا آثما کما فی الوقایه فرض القرأۃ آیۃ...... والمکتفی بها مسیئ لترک الواجب وفی القدوری یقرأ فاتحۃ الکتاب وسورۃ او ثلاث آیات من ای سورۃ شاء، وفی الذخیرۃ قرأۃ ثلاث آیات قصاراً او آیۃ طویلۃ من واجبات الصلوٰۃ بالاجماع فلو قرأ مع الفاتحۃ آیۃ قصیرۃ سهوا فعلیه السهو وفی الهندیۃ لو قرأ اقل من آیۃ وان کان حرفا یکره وفی الدر المختار کل صلوٰۃ ادیت مع کراهۃ التحریم تجب اعادتها، واللہ اعلم، محمد مبارک علی

**الجواب:** حقیقت یہ ہے کہ جو مقدار قرآت کی فرض ہے وہی مقدار سورۂ فاتحہ کے بعد واجب ہے، کیونکہ فقہائے کرام جو الفاظ یعنی سورۃ او ما یقوم مقامہا وغیرہ فرض قرآت میں ذکر کرتے ہیں وہی الفاظ واجبات میں ذکر کرتے ہیں، کما لایخفی، بس اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیت طویلہ کا حصہ جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو وہ تین آیتوں کے قائم مقام ہے یا نہیں، سو عالمگیری شامی وغیرہ کتب فقہ میں مصرح ہے اذا قرأ آیة طویلة فی الرکعتین نحو آیة الکرسی و آیة المداینة البعض فی رکعة والبعض فی اخری عامتھم علی انہ یجوز کذا فی المحیط، اس سے ثابت ہوا کہ آیت طویلہ کا جزو مطلقاً کافی ہے، یعنی بدون فاتحہ کافی عن الفرض ہے، اور مع الفاتحہ کافی عن الواجب ہے، پس جواب مرسل کی تصدیق میں جو لکھا ہے فی الوقایة فرض القرأة آیة والمکتفی بہا مسیئ لترک الواجب، اس میں اکتفاء علی الآیة بدون الفاتحہ کا ذکر ہے، اور ہندیہ سے جو لو قرأ اقل من آیة وان کان حرفا یکرہ نقل کیا ہے وہ عبارت اس وقت ملی نہیں، اگر اس میں ہو تو مراد کراہۃ تنزیہیہ لی جاوے گی، للجمع بین الروایات، اور عبارات فقہیہ جو واجبات صلوٰۃ میں ہیں کہ وضم السورة او ما یقوم مقامہا من ثلاث آیات قصار او آیة طویلة یہ بر سبیل تمثیل ہے آیۃ طویلہ کے حصہ کا اس میں ذکر نہیں نفیاً نہ اثباتاً، اور دوسری جگہ آیت کے جزو کا کافی ہونا مصرح ہے، تو اس محکم کو مقدم رکھنا ضروری ہے، اس تمثیل کی بناء پر اس محکم جزئیہ میں کلام نہیں ہو سکتا، لہٰذا صورتِ سوال میں نماز بالکل درست ہو گئی، ترکِ واجب نہیں ہوا، البتہ عالمگیریہ کی روایت جس کے متعلق گذر چکا ہے کہ ہمیں نہیں ملی اس کی بناء پر خلاف اولیٰ کا حکم ضرور کیا جاویگا لترک السنة، کتبہ عبد الکریم ۲۳ رجب ۵۳ھ

## فصل فی الوتر و دعاء القنوت

نماز فجر میں دعاء قنوت پڑھنے کا حکم

**سوال (۱)** موجودہ زمانہ میں نمازِ فجر میں دعاء قنوت پڑھنا کیسا ہے؟

**الجواب:** جائز ہے، واللہ اعلم، بلکہ ایک قول پر مستحب ہے، فافہم، ۳ رمضان ۴۰ھ

نماز وتر کے لئے مطلق وتر کی نیت چاہیے یا وتر واجب کہنا ضروری ہے؟

**سوال (۲)** ............... صلوٰۃ وتر میں مطلق وتر کی نیت کرنا



چاہیے یا واجب وتر کی، عالمگیریہ فتویٰ ہندیہ میں باب نیت میں مطلق وتر کی نیت کو لکھا ہے ... وجوب کی بناء پر اختلافِ روایت کے اور علامہ شامیؒ نے خلاف اس کے در باب وتر و النوافل میں لکھا قولہ لا الوتر الواجب الذی ینبغی ان یفہم من قولہم انہ لاینوی انہ واجب لایلزم تعیین الواجب .... لا منعہ من ذلک لانہ ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویہ لیطابق اعتقادہ وان کان غیرہ فلا تضرہ تلک النیة (بحر) لکھا ہے کہ اب قول فیصل در باب نیت اور علامہ شامیؒ کی اس عبارت کا مطلب بیان فرما کر ہدایت فرمادیں، کیونکہ یہاں کے علماء میں بہت اختلاف ہو رہا ہے،

**الجواب:** علامہ شامی کی یہ عبارت اقتداء وتر خلف الشافعی کے متعلق ہے، کیونکہ درمختار کی عبارت بھی اس کے متعلق ہے کہ اقتداء بالشافعی کے وقت وتر واجب کی نیت نہ کرے، بلکہ صرف وتر کی نیت کرے، تاکہ دونوں کی نیت یعنی امام اور مقتدی کی متحد رہے، اختلاف نہ ہو، علامہ شامیؒ کہتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی وتر واجب کی نیت کرے تو مضر نہیں، جائز ہے، باقی منفرد کے لئے اداءِ وتر کے واسطے مطلقِ نیت وتر بھی کافی ہے، اور نیت وتر واجب بھی کافی ہے، اس میں یہی قول فیصل ہے کہ ہر دو طرح نیت وتر درست ہے، اس میں اختلاف کرنا محض ایک لایعنی ولا طائل امر ہے، واللہ اعلم ۲۲ ربیع ۲ ۴۳ھ

وتر کا قعدۂ اُولیٰ فرض ہے یا واجب اور اس کے ترک سے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

**سوال (۳)** وتر کا قعدۂ اُولیٰ فرض ہے یا واجب، اس کے ترک سے نماز ہو سکتی ہے؟

**الجواب:** قعدۂ اُولیٰ واجب ہے، اگر سہواً ترک ہو جائے تو سجدۂ سہو سے نماز وتر درست ہو جائے گی، قال فی الدر وھو ثلٰث رکعات بتسلیمة کالمغرب حتی لو نسی القعود لایعود ولو عاد ینبغی الفساد کما سیجیٔ اھ والراجح عدم الفساد ونقل عن البحر انہ الحق ۱۲ شامی) فقط، ۲۷ ربیع الاول ۴۵ھ

حکم اقتداءِ حنفی باشافعی در وتر و شرائط آں،

**سوال (۴)** ماہ رمضان میں بعد تراویح کے وتر کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، اس وتر میں دو جماعت ہوتی ہیں، ایک امام حنفی، دوسرا شافعی ....، الگ الگ اپنے اپنے امام سے پڑھتے ہیں، دوسری صف میں ایک ہی ساتھ ہوتے ہیں، اور اسی وتر میں الگ پڑھنا میرے خیال میں نہیں آتا، غرضکہ ہمارے مرشد نے بھی تاکید کی کہ ایک ہی جماعت سے پڑھ لیا کریں، ہمارے پیر بھائی تو پڑھتے ہیں

آئندہ بھی پڑھیں گے، کتاب شہابیہ مذہب شافعی کی اور شرائط المذہب میں بھی پڑھنے کا طریقہ لکھا ہوا ہے، ان کتابوں کو دکھانے سے بھی نہ حنفی نہ شافعی کوئی نہیں مانتا اس لئے اس وتر کی نماز کو ایک ہی جماعت سے پڑھیں یا نہ پڑھیں، حکم شرعی صادر فرماویں،

**الجواب**: حنفی کو وتر میں شافعی المذہب کی اقتدا، قول اصح کی بنا، پر جائز ہے بشرطیکہ وہ تین رکعت بدون فصل بالسلام کے پڑھے، اور بشرطیکہ امام نیت مطلق وتر کی کرے، وتر تطوع یا وتر مسنون کی نیت نہ کرے قال فی الدر وصح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام لان فصلہ علی الاصح فیہما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد اھ قال الشامی خلافا لما فی الارشاد من انہ لایجوز اصلا باجماع اصحابنا لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل اھ ثم قال تحت قولہ للاتحاد و استشکلہ فی الفتح بانہ اقتداء المفترض بالمتنفل وان لم یخطر بخاطرہ عند النیۃ صفۃ السنیۃ اوغیرہا بل مجرد الوتر لتقرر النفلیۃ فی اعتقادہ وردہ فی البحر بما صرح فی التجنیس ایضا من ان الامام ان نوی الوتر وہو یراہ سنۃ جاز الاقتداء کمن صلی الظہر خلف من یری ان الرکوع سنۃ وان نواہ بنیۃ التطوع لا یصح الاقتداء لانہ یصیر اقتداء المفترض بالمتنفل اھ (ص ۶۹۹ ج ۱) ہر چند کہ حنفی کی اقتدا، شافعی کے ساتھ وتر میں قول اصح پر جائز ہے، مگر مشائخ کا اسمیں اختلاف ہے بعض مشائخ نے اجازت نہیں دی اور جو جائز کرتے ہیں وہ بھی اس شرط سے جائز کرتے ہیں کہ شافعی امام وتر مطلق کی نیت کرے، وتر تطوع یا مسنون کی نیت نہ کرے، اور اس کی رعایت کا علم قدرے دشوار ہے، اس لئے جو حنفی جماعت وتر حنفی امام کے ساتھ شافعیہ سے الگ کرتے ہیں اُن پر ملامت نہیں کی جاسکتی، ۶/ شعبان ۴۳ھ

**حکم قنوتِ نازلہ بزبانِ عربی**

**سوال** (۵) ماقولکم یرحمکم اللہ فی القنوت النوازل کیف ہو ہل قبل الرکوع ام بعدہ وہل یرفع یدیہ ویکبر لہ ام لا، وہل یضع فیہ یدیہ ام یرسلہما وہل یخافت بہ ام یجہر؟

**الجواب**: قال ... الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح (ص ۱۵۰) تحت قول الماتن ویسن وضع الرجل یدہ الیمنی علی الیسری ما نصہ ولابد فی ذلک القیام ان یکون فیہ ذکر مسنون ومالا فلا مالا یطل فحینئذ



یضع کما فی السراج وغیرہ وقال محمد لا یضع حتی یشرع فی القراءۃ فہو عندہما ای الشیخین (۱۲ منہ) سنۃ قیام فیہ ذکر مشروع وعندہ سنۃ للقراءۃ فیرسل عندہ حالۃ الثناء والقنوت وفی صلوٰۃ الجنازہ وعندہما یعتمد فی الکل و اجمعوا علی انہ یرسل فی القومۃ بین الرکوع والسجود وبین تکبیرات العیدین بعدم الذکر والقراءۃ فی ہذہ المواضع فان قیل فی القومۃ من الرکوع ذکر مشروع وہو التسبیح والتحمید فینبغی ان یضع فیہا علی قولہما اجیب بان المراد قیام لہ قرار وہذا لا قرار لہ اھ وہل یضع فیہا فی صلوٰۃ التسبیح لکون القیام لہ قرار فیہ ذکر مشروع براجع اھ وقال الشامی ومقتضاہ ان یعتمد بیدیہ (فی القومۃ) فی النافلۃ ولم ار من صرح بہ تامل لکنہ مقتضی اطلاق الاصلین المارین ومقتضاہ ان یعتمد فی صلوٰۃ التسبیح ایضا اھ (ص ۵۰۹ ج ۱) قلت وقد مر تصریح الطحطاوی بالاعتماد فی القنوت عند الشیخین فینبغی ان یعتمد بیدیہ فی قنوت النازلہ سواء کان قبل الرکوع او بعدہ واما انہ قبل الرکوع او بعدہ فقال الطحطاوی فی حاشیۃ مراقی الفلاح واما القنوت فی الصلوات کلہا عند النوازل فلم یقل بہ الا الشافعی ولیس من مذہبنا قال الحموی وینبغی ان یکون القنوت قبل الرکوع فی الرکعۃ الاخیرۃ ویکبر لہ اھ (ص ۲۲۰) قلت اراد الحموی قنوت النازلۃ لذکرہ ذلک تحت قول الاشباہ اذا نزل بالمسلمین نازلۃ قنت الامام فی صلوٰۃ الفجر اھ (ص ۳۹۹) وقال الشامی وہل القنوت ہنا قبل الرکوع ام بعدہ لم ارہ والذی یظہر لی ان المقتدی یتابع امامہ الا اذا جہر فیؤمن وانہ یقنت بعد الرکوع لا قبلہ بدلیل ان ما یستدل بہ الشافعی علی قنوت الفجر وفیہ التصریح بالقنوت بعد الرکوع حملہ علماؤنا علی القنوت للنازلۃ ثم رأیت الشرنبلالی فی مراقی الفلاح صرح بانہ بعدہ واستظہر الحموی انہ قبلہ والاظہر ما قلناہ واللہ اعلم اھ (ص ۲۰۲ ج ۱) قلت ولکن الآثار تشہد لما قالہ الحموی ایضا فعن طارق بن شہاب قال صلیت خلف عمر صلوٰۃ الصبح فلما فرغ من القرأۃ فی الرکعۃ الثانیۃ کبر ثم قنت ثم کبر فرکع رواہ الطحاوی واسنادہ صحیح وعن ابی عبد الرحمن

عن علی انہ کان یقنت فی صلوٰۃ الصبح قبل الرکوع رواہ الطحاوی ایضا وسندہ حسن وعن ابی رجاء عن ابن عباس قال صلیت معہ الفجر فقنت قبل الرکعۃ رواہ الطحاوی ایضا واسنادہ صحیح کذا فی آثار السنن (ص ۱۹ ج ۲) فلا وجہ لرد قول الحموی فکان الشافعی لم یر قبل الرکوع محلا للقنوت فلم یقل بہ فی الفجر ولا فی الوتر ورأہ الحنفیۃ محلا لہ فقالوا بہ فی الوتر کذا فی قنوت النازلۃ ولکن الافضل ھنا بعد الرکوع لانہ ھو الثابت مرفوعا، واما انہ یرفع لہ ام لا فالدلیل الذی استدل بہ الحنفیۃ للرفع فی قنوت الوتر لا یعم غیرہ بل یختص بہ وھو اثر ابراھیم النخعی عند الطحاوی بسند صحیح قال ترفع الایدی فی سبع مواطن فی افتتاح الصلوٰۃ وفی التکبیر للقنوت فی الوتر وعن الاسود عن عبد اللہ کان یقرأ فی آخر رکعۃ من الوتر قل ھو اللہ ثم یرفع یدیہ فیقنت قبل الرکعۃ رواہ البخاری فی جزء رفع الیدین واسنادہ صحیح اھ آثار السنن (ص ۷، ۱۸ ج ۲) ولم ار من صرح بالرفع فی قنوت النوازل وفی رحمۃ الامۃ والسنۃ ان یقنت فی الصبح رواہ الشافعی عن الخلفاء الراشدین الاربعۃ وھو قول مالک وقال ابو حنیفۃ لا یسن فی الصبح قنوت وکان مالک لا یرفع یدیہ فی القنوت واستحبہ الشافعی ومحلہ عند الشافعی بعد الرکوع وقال مالک قبل الرکوع اھ (ص ۱۹) قلت وفی المدونۃ قال مالک فی القنوت فی الصبح کل ذلک واسع قبل الرکوع و بعد الرکوع قال مالک والذی اخذ فی خاصۃ نفسی قبل الرکوع اھ (ص ۱۰۰ ج ۱) قلت وقد صرح علماءنا بان یؤخذ بقول مالک فیما لا نص فیہ فی المذھب لکون مذھبہ اقرب المذاھب الینا کما فی رد المحتار ولم اظفر بموضعہ الآن، فینبغی ان لا ترفع الایدی فی قنوت النوازل نعم اذا قنت قبل الرکوع فلا یدع التکبیر لہ، لقول الحموی ویکبر لہ ولثبوتہ فی الآثار واذا قنت بعد الرکوع فلم نر التصریح بالتکبیر لہ فی قول فقیہ فاما ان یقاس علی القنوت قبل الرکوع واما ان یترک علی الاصل ولکن الترک



ھو الذی ینبغی لکون القیاس فیھما مع الفارق فان التکبیر للقنوت قبل الرکوع لعلہ للفصل عن القراءۃ والانتقال من حال الی حال ولا کذلک بعد الرکوع فان التسمیع ھناک کاف للفصل واللہ تعالیٰ اعلم، واما الجھر والاخفاء فلم یتعرض فقہاءنا بالبحث عنھما فی قنوت النوازل ایضا واختلفوا فی قنوت الوتر فقال فی الدر وقنت فیہ مخافتا علی الاصح ولو اماما لحدیث خیر الدعاء الخفی اھ قال الشامی وفصل بعضھم بین ان یعلمہ القوم فالافضل للامام الاخفاء والا فالجھر اھ وفی المنیۃ من اختار الجھر اختارہ دون جھر القراءۃ اھ (ص ۶۹۸ ج ۱) وقد تقدم قول الشامی فی قنوت النوازل و الذی یظھر لی ان المقتدی یتابع امامہ (ای یقرء القنوت اذا قنت) الا اذا جھر فیؤمن اھ وفی المدونۃ لمالک قلت لابن القاسم فھل یجھر بالدعاء فی القنوت اماما کان او غیر امام قال لا یجھر قلت وھو قول مالک قال ھو رأی اھ (ص ۱۰۰ ج ۱) وفی الوجیز للغزالی الشافعی رح ثم الجھر بالقنوت مشروع علی الظاھر والمأموم یؤمن فان لم یسمع صوتہ قنت علی احد الوجھین اھ (ص ۲۶ ج ۱) قلت ولکن العوام لا یعلمون قنوت النوازل فالافضل الجھر بہ کما ھو مقتضی تفصیل بعضھم وھو تفصیل حسن و واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۲ ذیقعدہ سنہ ۴۴ھ

| وتر میں شافعیہ کی اقتدا درست ہے یا نہیں؟ | سوال (۶) ......................... |
| --- | --- |

......................... یہاں زمانہ دراز سے حنفی شافعی رہتے ہیں، تقریباً پچیس تیس سال کے آگے حنفی امام مقرر تھے، کُل حنفی شافعی اس امام کے اتباع میں نماز پنجگانہ و وتر وتراویح وجمعہ وعیدین وغیرہ ادا کرتے تھے، اب تقریباً پچیس سال سے دوسرے شہر کے حافظ شافعی امام مقرر ہیں، کُل حنفی وشافعی ایک ہی امام کے پیچھے ایک ہی جماعت سے نماز پنجگانہ و وتر وتراویح وجمعہ وعیدین باتفاق تمام ادا کرتے آئے ہیں، وقت عصر وعشا وصبح میں شافعی امام حنفی مسئلہ کی رعایت سے تاخیر سے ادا کرتے آئے ہیں، رمضان شریف میں وتر بھی حسب عادت قدیم شافعی وحنفی علماء کی صلاح پر ایک ہی سلام سے شافعی امام پڑھاتے ہیں، یک بیک ایک صاحب

کہیں سے آکر شافعی وحنفی میں پھوٹ ڈالنے کے قصد کہا کہ نماز وتر بہ مذہب شافعی ایک سلام سے جائز نہیں، حنفی وشافعی جدا جدا دو جماعت سے ہی پڑھنا جائز ہوگا، اہلِ جماعت سے ایک دو صاحب ان کی بات کا اتباع کرکے وتر دو سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، مگر باقی اہلِ جماعت حسبِ عادتِ قدیم ایک ہی سلام سے پڑھنا چاہتے ہیں، کیونکہ دو سلام کے پڑھنے سے حنفیوں کی دوسری جماعت کرنی ہوگی، یہی افتراق آئندہ دوسرے اوقات میں بھی دو جماعت کا باعث ہوگا، پس ایک ہی مسجد میں دو جماعت ہونے سے ضرور فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے، اسی لئے اتفاق کو بحال رکھنے کے لئے اکثروں کا ارادہ مصمم ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق شرائط المذاہب اردو باب الوتر والنوافل میں ہے یعنی اور افضل ہے نزدیک ائمہ ثلثہ کے وتر فصل سے پڑھنا لیکن مقتدی حنفی ہوں تو وصل سے پڑھے نہیں تو اقتداء حنفی کی درست نہ ہوگی، انتہیٰ، چونکہ یہ عبارت اردو ہے، اس کی اصل عبارت کس کتاب میں ہے، معلوم نہیں، اور کتاب الاوطار ترجمہ در مختار میں ہے وصح الاقتداء فیہ ففی غیرہ اولیٰ ان لم یتحقق منہ ما یفسدها فی اعتقادہ فی الاصح کما بسط فی البحر بشافعی مثلا لم یفصلہ بسلام لا ان فصلہ علی الاصح فیہما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد، اور درست ہے وتر میں اقتداء حنفی کا پیچھے شافعی کے مثلاً جو وتر کو سلام سے جدا نہ کردے، یعنی دو رکعت پر سلام نہ پھیر دے تو وتر کے غیر میں اقتداء بطریقِ اولیٰ درست ہے، بشرطیکہ امام سے کوئی ایسا امر متحقق نہ ہو جو نماز کا مفسد ہو، انتہیٰ، باقی کتاب میں دیکھ لیں،

اور عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ مؤلفہ حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی مرحوم میں ہے قولہ خلافاً للشافعی ای فی احد اقوالہ الثلثۃ احدها کقولنا وثانیہا یوتر ثلثا بتسلیمتین بان یتشہد علی راس الرکعتین ویسلم ثم یصلی رکعۃ واحدۃ وثالثہا انہ مخیر بین ان یوتر بثلث بتسلیمۃ انتہیٰ، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بمذہب امام شافعی وتر کے بارے میں تین روایت ہیں، جن میں ایک روایت موافق حنفیہ ایک ہی سلام سے تین رکعت، اور ایک روایت میں تخییر ایک رکعت یا تین رکعت بیک سلام، ان روایات کی تفصیل سے اطلاع فرمادیں، اس مسئلہ کے متعلق مقام واقعہ یعنی کذمور۔ اولڈ، لون کے مذکورہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قول فیصل



کیا ہو سکتا ہے بحوالۂ کتب مع عبارت عربی تحریر فرماکر اہلِ جماعت کو ممنون فرماویں، کیونکہ افتراق کا سخت اندیشہ ہے، مذکور نماز وتر شافعی کے پیچھے حنفی کو حنفی کے پیچھے شافعی کو جائز نہ ہو تو کتنے سال کی نماز قضا کرنی چاہئے، صاف صاف مع حوالۂ کتب ومزین مُہر ودستخط سرفراز فرماویں؟

**الجواب:** قال فی رحمۃ الامۃ واقل الوتر رکعۃ واکثرہ احدیٰ عشر رکعۃ وادنی الکمال ثلث رکعات عند الشافعی واحمد وقال ابوحنیفۃ الوتر ثلث رکعات بتسلیمۃ واحدۃ لا یزاد ولا ینقص وقال مالک الوتر رکعۃ قبلہا شفع منفصل عنہا اھ (ص ۲۳) اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک وتر کی ایک رکعت جائز ہے، مگر کامل نہیں، وتر کامل ان کے نزدیک بھی تین رکعات ایک سلام کے ساتھ ہیں، کما هو مفہوم قولہ وادنی الکمال ثلث رکعات الخ ولیس محملہ ثلث بالفصل بالسلام بینہن لنذکرہ ذلک فیما بعد من مذہب المالک واللہ اعلم، اور زیادہ تحقیق مذہب شافعی کی علماء شافعیہ سے کی جاوے.

رہا یہ کہ حنفی کو شافعی کی اقتداء وتر میں جائز ہے یا نہیں، تو اصح قول حنفیہ یہ ہے کہ چند شرائط سے جائز ہے (۱) یہ کہ وہ تین رکعات بدون فصل بالسلام کے پڑھے اور درمیان دو رکعت پر قعدہ کرے (۲) یہ کہ وہ مطلق وتر کی نیت کرے، وتر کی نیت کرے وتر تطوع یا وتر مسنون کی نیت نہ کرے، صرّح بہ فی الشامیہ (ص ۶۹۹ ج ۱) واللہ اعلم

۲۱ شعبان ۴۵ھ،

**سوال (۷)** رمضان میں وتر با جماعت افضل ہے یا بغیر جماعت بعد تہجد؟ .................. تہجد گزار کے لئے غیر رمضان میں افضل ہے کہ وتر بعد تہجد کے پڑھے، بشرطیکہ جاگنے پر اعتماد ہو، مگر رمضان میں وتر با جماعت افضل ہے یا بعد تہجد، جواب مع نقل عبارات وحوالۂ کتب معتبرہ ارقام فرماکر عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور ہوں،

**الجواب من بعض العلماء:** تہجد گزار کو رمضان میں بھی افضل ہے کہ وتر تہجد کے بعد پڑھے، جبکہ جاگنے پر اعتماد ہو، وتر آخر شب میں پڑھنے کے متعلق حدیث میں فضیلت آئی ہے، عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ایکم خاف ان لا یقوم

من اٰخر اللیل فلیوتر ثم لیرقد ومن وثق بقیام من اٰخرہ فلیوتر من اٰخرہ فان قرأۃ اٰخر اللیل محضورۃ وذلک افضل رواہ احمد ومسلم والترمذی وابن ماجۃ یہ حکم عام ہے رمضان اور غیر رمضان دونوں کو شامل ہے اور یہ عمومیت درج ذیل اقوال سے مستفاد ہے ولعل من تاخرہ عن الجماعۃ فیہ واحب ان یصلی اٰخر اللیل فانہ افضل کما قال عمر والتی ینامون عنہا افضل وعلم من قولہ علیہ السلام اجعلوا اٰخر صلوٰتکم باللیل وترا فاخرہ لذلک فلا یدل ذلک علی ان الافضل فیہ ترک الجماعۃ لمن احب ان یوتر اول اللیل کما اعطیہ اطلاق جواب ہذا انتھٰی (کبیری شرح منیہ ص ۱۳۰۴۰۱) والضا جاء فی شرح المنیۃ انہ بناء علی استحباب تاخیرہ مطلقا لمن یأمن فواتہ واستحباب جعلہ اٰخر صلوٰۃ اللیل الخ (ص ۱۳۰۳۸۵) وان من تاخر عن الجماعۃ فیہ واحب ان یصلی اٰخر اللیل فانہ افضل کما قال والتی ینامون عنہا افضل وعلم من قولہ علیہ السلام اجعلوا اٰخر صلوٰتکم باللیل وترا فاخرہ لذلک والجماعۃ اذ ذاک متعذرۃ فلا یدل ذلک علی ان الافضل فیہ ترک الجماعۃ لمن احب ان یوتر اول اللیل کما یفہم من اطلاق اختیارھم (شرح مختصر الوقایۃ للعلامۃ القاری ص ۱۳۰۱۹۶) البتہ جو شخص وتر اول شب میں پڑھنا چاہے اس کیلئے رمضان المبارک میں جماعت سے پڑھنا افضل ہے اگر تہجد گذار رمضان میں وتر بعد تہجد کے پڑھنا چاہے تو اسکو چاہئے کہ اپنے مقام پر چلا جاوے وتر کی جماعت کے پیچھے الگ بیٹھے رہنا مذموم ہے بوجہ مشابہ ہونے اعراض عن الجماعۃ کے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ سید عبدالرحیم ۲۳ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۶ھ

**الجواب من جامع امداد الاحکام** :- جواب مذکور ایک روایت کے موافق صحیح ہے مگر دوسری روایت یہ ہے کہ رمضان میں وتر جماعت سے مسجد میں پڑھنا افضل ہے تنہا گھر میں پڑھنا افضل نہیں، خواہ اول لیل میں پڑھے یا آخر لیل میں، قال الشامی رحمہ الکمال الجماعۃ بانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اوتر بہم ثم بین العذر فی تاخرہ مثل ما صنع فی التراویح فالوتر کالتراویح فکما ان الجماعۃ فیہا سنتہ فکذلک الوتر، بحر وفی شرح المنیۃ والصحیح ان الجماعۃ فیہا اری فی الوتر افضل الا ان سنیتہا لیست کسنیۃ جماعۃ التراویح اھ قال الخیر الرملی وہذا الذی علیہ عامۃ الناس الیوم اھ وقوی المحشی ایضا بانہ مقتضی ما مر ان کل ما شرع بجماعتہ فالمسجد افضل فیہ اھ (ص $\frac{۴۲}{ج۱}$) واللہ اعلم اور دلیل سے بظاہر یہی دوسری روایت قوی ہے، اور اسی پر امت کا عمل ہے، فقط

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ ۱۲ر ذیقعدہ سنہ ۴۶ھ

**سوال (۸)** فضیلت تاخیر وتر آخر شب ................ ، افضل

وقت وتر را چیست وآنکہ عادت گذاردن وتر را در آخر شب دارد اگر او قبل ادائش در خواب بمیرد گناہ ترک واجب بر و لازم آید یا نہ؟

**الجواب** : تاخیر الوتر الی اٰخر اللیل افضل لمن یثق بالانتباہ ولمن لم یثق ان یوتر قبل ان ینام ہکذا فی العالمگیریہ ولا یلزمہ بشیٔ من الاثم ان مات قبل الصبح لان الوقت فی حقہ باق والمعتبر فی الفوت والقضاء ہو اٰخر



الوقت فمن لم یدرک اٰخرہ لم یکن فائتا للواجب الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۲ر صفر سنہ ۴۷ھ

الجواب صحیح، اشرف علی، ۲ر صفر سنہ ۴۷ھ

**سوال (۹)** عشاء کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی تو وتر جماعت سے پڑھے یا تنہا؟ ................

ایک مسئلہ میں اشکال پیدا ہو گیا، امید ہے کہ جواب باصواب ارشاد فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے، وہ یہ ہے کہ بہشتی گوہر میں، صفحہ ۴۰ مسئلہ ۵ "اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت پہونچے کہ عشاء کی نماز ہو چکے تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (ص ۳۷، ج ۱ شامی)

اور غایۃ الاوطار میں ہے ولو لم یصلہا ای التراویح بالامام او صلاہا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔ بعد ترجمہ کے تحریر فرماتے ہیں ۳ مراد اس سے یہ ہے کہ جس نے فرض کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے، کذا فی الشامی۔

موجب اشکال یہ ہے کہ شامی اور غایۃ الاوطار کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے، اور بہشتی گوہر سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھ سکتا ہے، اگر شامی میں کسی جگہ یہ مسئلہ ہو تو تحریر فرمایئے بہت بڑا اشکال ہو رہا ہے، اور اکثر معمول بھی یہی ہے کہ اکثر نمازی دیر میں آتے ہیں، اور فرض جماعت سے نہیں پڑھتے ہیں، اور وتر پڑھ لیتے ہیں، لیکن شامی اور غایۃ الاوطار کی عبارت کچھ اور کہہ رہی ہے، ضرورتاً محض بغرض تحقیق تکلیف دی گئی ہے، امید کہ از راہ کرم جواب جلد مرحمت ہوگا،

دیگر امر ضروری العرض یہ بھی ہے کہ احقر کو یہ مسئلہ اسی طرح معلوم تھا جو بہشتی گوہر میں ہے اسی طرح لوگوں کو بتلا دیتا تھا، مگر مولوی حبیب اللہ صاحب مدرس مدرسہ قومیہ میرٹھ جو بریلوی خیال کے ہیں، انھوں نے آج میرے پاس شامی بھیجی ہے، اور کہلا کر بھیجا ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، لہٰذا مکرر عرض ہے کہ بہشتی گوہر کے مطابق عبارت شامی کی ہو تو ضرور ارشاد فرمائی جائے،

**الجواب:** بہشتی گوہر کا مسئلہ اس صورت میں ہے جبکہ مسجد میں فرض نماز اور تراویح کی جماعت محلہ والوں نے کی ہو، مگر کسی ایک دو آدمی کو جماعت نہ ملی ہو تو ان بعد میں آنے والوں کے لئے وہی حکم ہے جو بہشتی گوہر میں ہے، اور عامۂ کتب فقہ میں اس کے موافق ہی ذکر ہے، درمختار میں ہے ووقتها ای وقت التراویح بعد صلوٰۃ العشاء الی الفجر قبل الوتر او بعده فی الاصح فلو فاتہ بعضها وقام الامام الی الوتر اوتر معه ثم صلی ما فاتہ اھ، قال الشامی بعد ذکره قولین مقابل الاصح الثالث، مشی علیه المصنف تبعا للکنز وعزاه فی الکافی الی الجمهور وصححه فی الهدایة والخانیه والمحیط والبحر اھ (ص ۳۷، ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بہشتی گوہر میں جس طرح مسئلہ مذکور ہے وہ ہی جمہور کا قول ہے، اور وہی اصح ہے، اسی کو ہدایہ، خانیہ، محیط وغیرہ میں صحیح کہا ہے، اور غایۃ الاوطار کی جس عبارت سے سائل کو دھوکہ ہوا ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ مسجد میں کسی نے بھی فرض نماز یا تراویح کی نماز جماعت سے نہ پڑھی ہو تو اس صورت میں اگر وتر جماعت سے پڑھنا چاہیں تو بیشک ایک صورت میں مکروہ ہے (جبکہ فرض میں جماعت ترک کی گئی ہو) اور دوسری صورت میں محل تامل ہے (جبکہ فرض تو سب نے جماعت سے پڑھے ہوں مگر تراویح کی جماعت کسی نے مسجد میں نہ کی ہو) درمختار میں ہے ولو ترکوا الجماعة فی الفرض لم یصلوا التراویح جماعة لانها تبع فمصلیه وحده یصلیها معه ولو لم یصلها ای التراویح مع الامام او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه بقی لو ترکها الکل هل یصلون الوتر بجماعة فلیراجع اھ، اور گو شامی نے اس مقام پر دیگر الفاظ بھی نقل کئے ہیں، مگر صاحب درمختار اور اکثر اہل متون کا مختار وہ ہی ہے جو مسئلہ جماعت ومنفرد کے بارے میں درمختار میں مذکور ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۵ رمضان ۱۳۴۷ھ

صلوٰۃ وتر سے قبل آیت ربنا ما خلقت ہذا باطلا کا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟

**سوال (۱۰)** صلوٰۃ الوتر سے قبل اکثر مصلیین آیۃ ربنا ما خلقت ہذا باطلا الخ پڑھا کرتے ہیں،

**الجواب:** اس کی کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، ۱۱ رمضان ۱۳۴۷ھ

جس نے عشاء کی نماز تنہا ادا کی ہو وتر جماعت سے ادا کرے یا تنہا،

**سوال (۱۱)** ..... کل بعد عشاء وتراویح مسئلہ بیان کیا گیا کہ جس شخص نے فرض نماز عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو (یعنی منفرداً پڑھی ہو) وہ وتر بھی منفرداً پڑھے، اور جماعت کی شرکت سلام سے پہلے امام



سے مشارکت ہو جانے سے ثابت ہو جاوے گی، اس کے بعد بعض لوگوں نے بیان کیا کہ بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ اگرچہ جماعت سے فرض عشاء نہ پڑھے ہوں تب بھی جماعت وتر میں شامل ہو اور وتر جماعت سے ادا کرے، اس کے بعد بہشتی زیور دیکھا گیا تو اس میں اس کے حصہ بہشتی گوہر میں مسئلہ بعبارت ذیل درج ہے؛

**تراویح کا بیان؛** مسئلہ؛ اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچے کہ عشاء کی نماز ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو، اور اگر اس درمیان میں تراویح کی کچھ رکعتیں ہو جاویں تو ان کو بعد وتر پڑھنے کے پڑھے، اور یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے (شامی، ص ۳۷، ج ۱) مکمل ومدلل بہشتی گوہر، ص ۴۰)

اس مسئلہ سے معلوم ہوا کہ منفرداً فرض عشاء پڑھنے پر بھی وتر جماعت سے پڑھے، بہشتی زیور میں حوالہ مذکور شامی مطبوعہ سند ۱۲۹۲ھ سے ہے، مگر یہاں وہ شامی نہیں بلکہ مطبوعہ مصر ہے، اس میں جب (مبحث صلوٰۃ التراویح) ص ۵۲۳ و ۵۲۴ میں دیکھا گیا تو مندرجہ ذیل عبارت ملی (ولو ترکوا الجماعة فی الفرض لم یصلوا التراویح جماعة لانها تبع فمصلیه وحده یصلیها معه درمختار (قوله لانها تبع) ای لان جماعتها تبع لجماعة الفرض فانها لم تقم الا بجماعة الفرض فلو اقیمت بجماعة وحدها کانت مخالفة للوارد فیها فلم تکن مشروعة اما لو صلیت بجماعة الفرض وکان رجل قد صلی الفرض وحده فله ان یصلیها مع ذلک الامام لان جماعتهم مشروعة فله الدخول فیها معهم لعدم المحذور هذا ما ظهر لی فی وجهه وبه ظهر ان التعلیل المذکور لا یشمل المصلی وحده فظهر صحة التفریع بقوله فمصلیه وحده الخ فافهم (شامی ص ۵۲۳ ج ۱ مصری) عبارت محررہ سے واضح ہوا کہ اگر فرض با جماعت نہ پڑھے ہوں تب بھی تراویح کی جماعت میں شرکت کرے، جیسا کہ خط کشیدہ عبارت ..... اس کو واضح کر رہی ہے، اب آگے یہ عبارت ہے (ولو لم یصلها) ای التراویح (بالامام) او صلاها مع غیره (له ان یصلی الوتر معه) درمختار (قوله ولو لم یصلها الخ) ذکر هذا الفرع والذی قبله فی البحر عن القنیة وکذا فی متن الدرر لکن فی التاتارخانیة عن عن التتمة انه سئل علی بن احمد عمن صلی الفرض والتراویح وحده

او التراویح نقط هل یصلی الوتر مع الامام فقال لا اھ ثم رأیت القہستانی ذکر
تصحیح ماذکرہ المصنف ثم قال لکنه اذا لم یصلی الفرض معه لا یتبعه
فی الوتر اھ فقوله ولو لم یصلها ای وقد صلی الفرض معه لکن ینبغی ان یکون
قول القہستانی معه احترازا عن صلاتها منفردا اما لو صلاها جماعة مع
غیرہ ثم صلی الوتر معه لا کراهة تامل (ص ۵۲۴ ج ۱ شامی مصری)

اس عبارت مسطورہ سے صاف صاف واضح ہے کہ تراویح چاہے منفرداً پڑھی ہو
چاہے اُس امام (جس کے پیچھے وتر پڑھنا ہے) کے سوا دوسرے امام کے ساتھ پڑھی ہو، وتر
اس امام کے پیچھے پڑھے، ہاں اگر فرض عشاء منفرداً پڑھے ہوں تو البتہ وتر امام کے ساتھ
نہ پڑھے، یعنی جماعت سے نہ پڑھے۔

باقی رہا یہ کہ "بقی لو ترکہا الکل یصلون الوتر الخ درمختار (قولہ بقی الخ) الذی یظہر ان
جماعة الوتر الخ (شامی ص ۵۲۴ ج ۱ مطبوعہ مصر) اس کو اس جزئیہ سے تعلق نہیں،

اب معروض یہ ہے کہ اگر اس وضاحت میں بھی احقر سے غلط فہمی ہوئی ہے اور مسئلہ
اس طرح صحیح ہے جس طرح بہشتی گوہر (بحوالۂ مذکور) میں ہے کہ اگر نماز عشاء منفرداً پڑھی
تب بھی وتر جماعت سے پڑھے تو نہایت ادب سے عرض ہے کہ اس کی تصریح اور وضاحت
فرما دی جاوے کہ احقر کے لئے شرح صدر کا باعث ہو، اور اس سے رجوع کر کے مصلّیوں کو
مسئلہ سُنا دیا جاوے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا محض رفع اشتباہ اور تحقیقِ حق کے لئے ہے نہ
حضور والا کے انتباہ کے لئے، پس سوال یہ ہے کہ اگر فرضِ عشاء اور تراویح دونوں گھر پڑھے
ہوں یا اکیلے کہیں اور پڑھے ہوں، اور وہ شخص ایسی جگہ (مسجد یا اور کسی مقام پر) حاضر ہوا
کہ وہاں وتر جماعت سے شروع ہوئی، تو یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں؟

**الجواب:** شامی ص ۳۰، ج ۱ مطبوعہ سندھ میں اس مسئلہ کا جزو اوّل یعنی
"ان کو بعد وتر پڑھے" تک ہے، اور جزو دوم یعنی "یہ شخص وتر جماعت سے پڑھے" اس جگہ
اس کا ذکر نہیں، بلکہ اس کا ذکر اسی عبارت میں ہے، جو سوال میں درج ہے، اور مطبوعہ
سندھ کے ص ۴۱، پر درج ہے، مگر شامی میں صفحہ مذکور پر جو عبارت مندرجہ فی السوال
ہے، اسی سے بہشتی گوہر کی تائید نہیں ہو سکتی، ولو لم یصلها الخ کا خلاف ہونا تو ظاہر ہے ہی،
لیکن لا نہ تبع لمصلیه الخ سے بھی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے فاقد الفرض کے لئے جماعت



تراویح میں جوازِ شرکت ثابت ہوتی ہے، نہ کہ جماعت وتر میں، کما یظہر بادنی التامل:

پس سائل کا استدلال صحیح ہے، مگر یہ ضرور نہیں کہ شامی اور درمختار میں عدم جواز شرکت
ہو تو مسئلہ بہشتی زیور یعنی جواز شرکت فی الوتر صحیح نہ ہو اب رہی یہ بات کہ جواز شرکت
کہاں سے ثابت ہے، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ فتاویٰ عبدالحی میں بعد نقلِ روایات
عدمِ جواز لکھا ہے، لیکن کدامے وجہ قوی معتدبہ عدمِ جواز معلوم نمی شود حقِ جواز معلوم می شود
واللہ اعلم، حررہ الراجی عفو ربہ القوی ابوالحسنات محمد عبدالحی تجاوز اللہ عن ذنبه الجلی والخفی،

بعدازاں مولوی محمد نعیم صاحب کی تصدیق اس طرح درج ہے، فی غنیة المستملی
فی شرح منیة المصلی واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمة الکرابیسی
انه لا یتبعه فی الوتر ولا فی التراویح وکذا اذا لم یتابعه فی التراویح لا یتابعه
فی الوتر وقال ابو یوسف اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه
الوتر وکذا اذا لم یدرک شیئا وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ له ان یصلی
الوتر معه وهو الصحیح ذکرہ ابو اللیث اھ وفی مختصرہ (ای الصغیری)
واذا لم یصلی الفرض مع الامام قیل لا یتبعه فی التراویح ولا فی الوتر و
کذا اذا لم یصل معه التراویح لا یتبعه فی الوتر والصحیح انه یجوز ان
یتبعه فی ذلک کله اھ واللہ علیم بالصواب وعندہ علم الکتاب۔

کتبه ابو الاحیاء محمد نعیم، عفی عنه ذنبه العظیم،

اب ایک خلجان اور باقی رہا وہ یہ کہ پھر بہشتی گوہر میں اس کو اس کو درمختار کی طرف
کیوں منسوب کیا گیا، جس میں بجائے موافقت کے مخالفت موجود ہے، سو اصل واقعہ بعد
کاوشِ بسیار یوں معلوم ہوا کہ علم الفقہ جو اصل ماخذ ہے گوہر کا اس میں جزو اول کا حوالہ
درمختار موجود ہے، اور گوہر میں جزو دوم کا اضافہ کر کے صغیری کا حوالہ بڑھا دیا گیا تھا،
جو مطبوعۂ قدیم میں موجود ہے، اور مکمل مدلل میں صغیری کا نام غلطی کاتب کے باعث
رہ گیا، واللہ اعلم، ۲۰ رمضان ۴۸ھ، کتبه عبدالکریم عفی عنه۔ **الجواب صحیح**۔ ظفر احمد عفا اللہ عنه

وتر وہی شخص پڑھائے جس نے فرض عشاء پڑھائی ہو یا دوسرا شخص بھی پڑھا سکتا ہے؟

**سوال** (۱۲) اگر فرض نماز عشاء ایک شخص نے پڑھائی
تو کیا وتر بھی وہی شخص ضرور پڑھائے، کیا دوسرے
شخص کے وتر کا امام بننے میں کچھ کراہت ہے یا خلاف اولیٰ؟

**الجواب**: بظاہر قواعد سے اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا، لیکن کوئی جزئیہ نظر سے نہیں گذرا، البتہ عالمگیریہ میں سراج وہاج سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فرض اور وتر خود پڑھاتے تھے اور تراویح حضرت اُبیؓ سے پڑھواتے تھے اھ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام فرض کو امام وتر بنانا بہتر ہے، ہاں اگر امام فرض وتر کی جماعت میں شریک ہی نہ ہو (خواہ کسی عذر کے باعث یا خود قرآن شریف دوسری جگہ پڑھنے وغیرہ کے سبب) تو پھر کسی دوسرے کو امام وتر بنانا خلافِ اولیٰ بھی نہیں ہے واللہ اعلم، کتبہ عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

**نمازِ وتر میں شوافع کی اقتدار کا حکم**

**سوال (۱۹۱۳)** شافعی مذہب کے امام ......... رمضان میں وتر دو سلام سے ادا کرتے ہیں، پہلے دو رکعت کی نیت کرکے سلام پھیرتے ہیں، اس کے بعد ایک رکعت کی نیت کرکے سلام پھیرتے ہیں، اکثر مقتدی حنفی المذہب بھی شریک تراویح ہوتے ہیں، امام صاحب شافعی کا یہ کہنا ہے کہ تم لوگ بھی شریکِ وتر ہو جاؤ، جب ہم دو رکعت پر سلام پھیریں تم فوراً کھڑے ہو جاؤ، اور اپنی ایک رکعت پوری کر لو، حنفی المذہب مقتدی ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنا دوسرا امام مقرر کرکے بہ جماعت وتر تین رکعت ادا کر لیتے ہیں،

**الجواب**: ایسی حالت میں اس کی اقتداء جائز نہیں ہے، اس طریقہ سے وتر صحیح نہیں ہو سکتے، کما فی الدر المختار (وصح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام) لا ان فصلہ (علی الاصح) فیہما وقال الشامی قولہ علی الاصح فیہما ای فی جواز اصل الاقتداء فیہ بشافعی وفی اشتراط عدم فصلہ الخ فقط واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ، ۸؍ شوال ۴۶ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۰؍ شوال ۴۶ھ

## فصل فی السنن والنوافل

**سننِ مؤکدہ کا ثبوت**

**سوال (۱)** ہر پنج وقتی نماز فرض کے بعد جو نفل یا سنت زوائد پڑھی جاتی ہیں خاص کر ظہر میں دو رکعت اور مغرب اور عشاء میں دو رکعت سنت کے بعد یہ سب کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے نہیں؟

**الجواب**: نماز فرائض کے قبل و بعد جو سنن زوائد ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان کو سنت فرمایا ہے، اور سنت وہی ہے جو حدیث سے ثابت ہو، امام صاحبؒ ہم سے زیادہ حدیث کو



جانتے تھے، انھوں نے کسی حدیث سے ان کا سنت ہونا معلوم کیا ہوگا، ہم کو حدیث ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مقلد ہیں، لیکن اس وقت محض تبرعاً حدیث صحیح لکھے دیتا ہوں، آئندہ ایسے سوالات کا جواب وہی ہوگا جو اوپر لکھا گیا ہے، اخرج البخاری عن نافع عن ابن عمر قال حفظت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر رکعات رکعتین قبل الظہر ورکعتین بعدہا ورکعتین بعد المغرب فی بیتہ ورکعتین بعد العشاء فی بیتہ ورکعتین قبل صلوٰۃ الصبح وکانت ساعۃ لا یدخل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیہا حدثتنی حفصۃ انہ کان اذا اذن المؤذن وطلع الفجر صلی رکعتین واخرج عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدع اربعا قبل الظہر ورکعتین قبل الغداۃ اھ،

ان حدیثوں سے بارہ سننِ مؤکدہ کا ثبوت کافی طور پر ہو رہا ہے، اور اگر سنن زوائد سے سننِ مؤکدہ کے علاوہ مراد ہیں تو دوبارہ سوال کیا جاوے،

**نماز تہجد سنتِ مؤکدہ ہے یا مستحب**

**سوال (۲)** ایک لڑکا کا نام حبیب اللہ، مالا بدمنہ اردو پڑھتا تھا، ایک جگہ لکھا ہے کہ نماز تہجد سنتِ مؤکدہ ہے، اسی درمیان میں ایک حافظ صاحب تشریف لائے، اور کہنے لگے کہ سنت مؤکدہ نہیں بلکہ نفل ہے، اور تم کو معلوم نہیں، لڑکے نے کہا کہ جناب حافظ صاحب ہم نے تنبیہ الغافلین میں بھی یہی پڑھا ہے کہ نمازِ تہجد سنتِ مؤکدہ ہے، اور مالا بدمنہ میں بھی موجود ہے، بس جناب حافظ صاحب بہت غصہ ہو کر بولے کہ تم کو کیا معلوم، اور کون شخص ہمارے میں اتنا مسئلہ جانتا ہے اس بستی میں، تو لڑکے نے کہا کہ ہم کو تو یہی کتاب بس ہے، تو فوراً حافظ صاحب نے کہا کہ ہم اس کتاب پدوڑی کو نہیں مانتے،

**الجواب**: نماز تہجد کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک سنت موکدہ ہے، بدلیل مواظبت صلی اللہ علیہ وسلم علیہا من غیر افتراض علیہ قال فی رد المحتار ومفادہ اعتماد السنیۃ فی حقنا لانہ صلی اللہ علیہ وسلم واظب علیہ بعد نسخ فرضیتہ وکذا قال فی الحلیۃ الاشبہ انہ سنۃ اھ ص ۶۱۶ ج ۱، اور بعض کے نزدیک مستحب ہے، وحملوا مواظبتہ صلی اللہ علیہ وسلم علی کونہا فریضۃ مختصۃ بہ، اور اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ امت کے حق میں صلوٰۃ تہجد مستحب ہے،

سنت مؤکدہ نہیں، قال فی مراقی الفلاح واکثر المتون علیه وندب صلوٰۃ اللیل خصوصا آخره کما ذکرناه، اور اس عبد ضعیف کا خیال یہ ہے کہ ابتداء تو صلوٰۃ تہجد مستحب ہی ہے، لیکن بعد شروع کردینے کے اور عادی ہوجانے کے اس پر مواظبت کرنا سنت مؤکدہ ہے، ودلیلہ قوله صلی اللہ علیه وسلم لابن عمر یا عبد اللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم اللیل ثم ترک' رواه البخاری فی کتاب صلوٰۃ التہجد ۱ھ، چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، اس لئے قاضی ثناء اللہ صاحب نے جو بہت بڑے محقق ومحدث وعالم ہیں سنتِ مؤکدہ ہونے کو اختیار فرمایا، لقوۃ دلیلہ عنده اس بناء پر ان پر اعتراض کرنا ہرگز جائز نہیں، اور کتاب مالا بد منه کو بد وڑی کتاب کہنا نہایت سخت کلمہ ہے، جس سے سلبِ ایمان کا اندیشہ ہے، جس نے یہ لفظ زبان سے نکالا ہو اسے فوراً توبہ واستغفار وتجدیدِ ایمان کرنا چاہئے، اور احتیاطاً تجدیدِ نکاح کرلینا بھی ضروری ہے، قال فی العالمگیریۃ رجل عرض علیه خصمه فتوی الائمة فردها وقال چه بار نامه فتوی آورده قیل یکفر لانه رد حکم الشرع ۱ھ ج ۳ ص ۱۶۴، ۴ رجب سنہ ۴۱ھ

سنن مؤکدہ کے تارک کا حکم

## سوال (۳)

.......... اکثر لوگ جمعہ کی فرض نماز کے بعد بغیر سنت پڑھے ..... چلے جاتے ہیں نہ اپنے مکانوں میں جاکر پڑھتے ہیں، بازاروں میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں، کتنا بھی تاکید کرو نہیں سنتے ہیں، نہ پند ونصیحت قبول کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا وعید آئی ہے، اور مذکورہ لوگوں کے لئے کیا عذاب ہے، شرعاً بالتفصیل بیان فرماکر عند اللہ ماجور ہوں؟

**الجواب**: یہ لوگ تارکِ سنتِ مؤکدہ ہیں، اور ترک سنتِ مؤکدہ گاہے بلاعذر ہوجائے تو صغیرہ ہے اور اس پر مداومت کرنا کبیرہ ہے، جس سے علاوہ سخت گناہ کے حرمانِ شفاعتِ نبوی ﷺ کا اندیشہ ہے، رجل ترک سنن الصلوٰۃ ان لم یر السنن حقا فقد کفر لانه ترکها استخفافا وان رآها حقا فالصحیح انه یأثم لانه جاء الوعید بالترک عالمگیریۃ واللہ اعلم قلت ومخافة حرمان الشفاعة رأیته فی مقام لا احفظ الآن موضعه واللہ اعلم، ۲۵ شعبان سنہ ۴۲ھ

صلوٰۃ التسبیح میں سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد قیام طویل میں ہاتھ باندھے یا کھلے رکھے

## سوال (۴)

مکمل ومدلل بہشتی زیور مطبوعہ اشرف المطابع سنہ ۱۳۴۴ھ دوسرا حصہ صفحہ ۴۴ پر

عہ ذکرہ فی اللآلی المصنوعة للسیوطی ۱۲ منه



صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ درج ہے "رکوع سے اٹھے اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد پھر دس دفعہ پڑھے"، حضرت صاحب اُس وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھنی چاہئے یا کہ کھلے ہی رکھے جائیں، مطلع فرمائیں،

**الجواب**: قال الطحطاوی فی حاشیة علی مراقی الفلاح (ص ۱۵۰) تحت قول المصنف ویسن وضع الرجل یده الیمنی علی الیسری ما نصه ولا بد فی ذلک القیام ان یکون فیه ذکر مسنون وما لا فلا ما لم یطل فحینئذ یضع کما فی السراج وغیره فان قیل فی القومة من الرکوع ذکر مشروع وهو التسبیح والتحمید فینبغی ان یضع فیها علی قولهما اجیب بان المراد قیام له قرار وهذا لا قرار له ام وهل یضع فیها فی صلوٰۃ التسبیح لکون القیام له قرار فیه ذکر مشروع یراجع ام قال الشامی ومقتضاه ان یعتمد بیدیه (فی القومة) فی النافلة ولم ار من صرح به تامل لکنه مقتضی اطلاق الاصلیین المارین ومقتضاه ان یعتمد فی صلوٰۃ التسبیح ام (۱-۵۰۹ ج) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ التسبیح میں قومہ کے وقت ہاتھ باندھ کر تسبیح پڑھی جاوے، فقط واللہ اعلم، ۱۴ صفر سنہ ۴۵ھ

تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد سنت ہیں یا مستحب اور اس کے متعلق چند سوال کے جوابات

## سوال (۵)

تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد یہ سنت ہے یا مستحب، ایک روز میں ان نمازوں کو کتنی بار اور کس وقت پڑھنا چاہئے، مسجد کو نماز کے وقت جاتے ہیں، ظہر کے وقت ظہر کو، عصر کے وقت عصر کو، ایسا ہی سب نمازوں کو کبھی اذان کے قریب اور کبھی اذان کے بعد اور کبھی نماز کے قریب جیسا اتفاق ہو، اب ان نمازوں کو کیسے ادا کرنا چاہئے، اور ان نمازوں میں کونسی سورتیں پڑھنا مناسب ہے؟ از راہِ مہربانی وبندہ پروری مفصل ترکیب اور اوقات سے مطلع فرماکر ممنون اور مشکور فرمادیں،

**الجواب**: تحیۃ الوضو مستحب ہے، اور تحیۃ المسجد سنت ہے، مگر مؤکدہ نہیں، تحیۃ الوضو ہر وضو کے بعد مستحب ہے، دن میں جتنی بار بھی وضو کیا جاوے، اور تحیۃ المسجد مسجد میں داخل ہونے کے وقت سنت ہے، جتنی بار بھی داخل ہو، لیکن جس کی آمد ورفت زیادہ رہتی ہو اس کو دن رات میں ایک بار تحیۃ المسجد پڑھنا بھی کافی ہے، اور تحیۃ المسجد

وتحیۃ الوضو سنن مؤکدہ اور فرائض سے بھی ادا ہوجاتی ہے، جبکہ وضو کے بعد فوراً یا مسجد میں جاتے ہی سنت اور فرض میں معاً مشغول ہوجاوے اور بعد طلوعِ فجر کے طلوعِ آفتاب تک اور بعد عصر کے غروب تک مستقلاً اور عین طلوع شمس و غروب اور استواء شمس کے وقت مطلقاً تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد پڑھنا جائز نہیں، باقی اوقات میں جس طرح چاہے پڑھے خواہ مستقلاً خواہ سنتِ مؤکدہ وغیرہ کے ضمن میں، اور ان کے لئے کوئی سورت خاص نہیں جو سورۃ چاہے پڑھے، ۲۶ ربیع الثانی ۴۵ھ

رکعتین بعد الوتر کے متعلق بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب،

**سوال** (۶) بہشتی زیور دوسرا حصہ بیان نفل پڑھنے میں لکھا ہے کہ نفل کھڑے ہو کر پڑھنا بیٹھکر پڑھنے سے بہتر ہے، اور اس میں وتر کے بعد کی نفل بھی آگئی، مگر مجموعہ فتاویٰ عبدالحی جلد سوم صفحہ ۵ میں ہے کہ وتر کے بعد نفل بیٹھ کر پڑھنا چاہئے، ان دونوں مسائل کو کیسا سمجھنا چاہئے، جواب باصواب سے مشرف فرماویں، دیگر جابے مجموعہ فتاویٰ جلد اول صفحہ ۱۵۴ میں بھی بیٹھکر پڑھنا بتلایا ہے، فقط

**الجواب**: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین (رواہ الدارمی عن ثوبان) ونیز ارشاد فرمایا ہے من صلی قاعداً فلہ نصف اجر القائم (رواہ البخاری عن عمران بن حصین) جو اپنے عموم کی وجہ سے نوافل بعد الوتر کو بھی شامل ہے، اور ابن ماجہ اور امام احمد نے کان یصلیہا وہو جالس جو روایت کی ہے ہمارے نزدیک یہ جلوس تعبداً نہ تھا، بلکہ بوجہ تکان وغیرہ کے تھا، اور کان ہمیشہ استمرار کے لئے نہیں ہوتا جو دوام ثابت ہو، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم، عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۹ شوال ۴۳ھ

دو سورتوں کے درمیان ترک سورۃ نوافل میں مکروہ نہیں،

**سوال** (۷) جب ہر رکعت میں بعد الحمد شریف کے دوسری سورۃ ملانے کی ضرورت ہو تو کیا اس میں دو یا تین رکعت کے بعد بھی بیچ میں ایک سورۃ چھوڑنا منع ہے؟

---

ع۵ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نمازیں اس وقت میں پڑھنا جائز ہیں ان کے ضمن میں یہ بھی درست ہے ۱۲ حضرت مولاناؒ،



**الجواب**: نوافل میں امر مذکور مکروہ نہیں ہے، کما فی مراقی الفلاح وفی الخلاصۃ لا یکرہ ہذا فی النفل قال الطحطاوی یعنی القرأۃ منکوساً والفصل والجمع کما ہو مفاد عبارۃ الخلاصۃ حیث قال بعد ذکر المسائل الثلاث وہذا کلہ فی الفرائض اما فی النوافل لا یکرہ (طحؒ) اھ، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۲ ذیقعدہ ۴۳ھ

سنن رواتب کے ترک کرنیوالے کا حکم

**سوال** (۸) سوال اول این کہ شخصے در اوقات خمسہ سنن رواتب علی سبیل التہاون والتکاسل نمی خواند فقط برخواندن نماز ہائے فریضہ اکتفا می کند درحق آنکس شرعاً چہ حکم است، ودر آخرت بوجہ ترک سنن رواتب معذب وماخوذ خواہد شد یا نہ، وباین سبب در زمرۂ بے نمازاں محشور شود یا نہ؟

سوال دوم اینکہ شخصے نماز ہائے پنجگانہ بجماعت میخواند بدیں طور کہ ہرگاہ بجماعت شریک شود اقتدیت بہذا الامام اللہ اکبر گفتہ باامام اقتدا کند، ولیکن دعا، ثنا، وتسبیحات رکوع وسجود وتکبیرات انتقالات وتشہد وغیرہ ہیچ نمی خواند وبعد تکبیر تحریمہ تا آخر نماز بالکل ساکت می ماند اما در افعال دیگر یعنی قیام وقعود ورکوع وسجود وقومہ وجلسہ باامام متابعت کرد وچوں نماز تمام شد باامام لفظ السلام علیکم ورحمۃ اللہ بہر دو جانب گفتہ از نماز بیروں شد، پس نماز ایں شخص کہ بطور مذکور فرائض بجماعت میگذارد صحیح شود یا نہ واز فرائض بری الذمہ گردد یا نہ،

**الجواب**: (۱) ترک سننِ مؤکدہ بلا عذر بطریق اصرار واستمرار موجبِ عتاب وقدرے گناہ ہے، لیکن تارکِ سنن بے نمازی شمار نہ ہوگا، قال الشامی عن الکشف الکبیر معزیا الی اصول ابی الیسر حکم السنۃ ان یندب الی تحصیلہا ویلام علی ترکہا مع لحوق اثم یسیر اھ وعن ہذا قال فی البحر ان الذی من کلامہم ان الاثم منوط بترک الواجب او السنۃ المؤکدۃ لتصریحہم باثم من ترک سنن الصلوات الخمس علی الصحیح وتصریحہم باثم من ترک الجماعۃ مع انہا سنۃ علی الصحیح ولا شک ان الاثم بعضہ اشد من بعض فالاثم لتارک السنۃ المؤکدۃ اخف منہ لتارک الواجب اھ وظاہرہ حصول الاثم بالترک مرۃ ویخالفہ ما فی شرح التحریر ان المراد الترک بلا عذر علی سبیل الاصرار وقال محمد فی المصرین علی ترک السنۃ

بالقتال وابو یوسف بالتادیب اھ فیتعین حمل الترک فیما مرعن البحر علی الترک علی سبیل الاصرار توفیقا بین کلامھم اھ (ص ۴۹۴، ج ۱) اور اگر احیاناً ترک ہوجائے یا عذر سے ترک ہو مثلاً سفر یا مرض یا تعب شدید کی وجہ سے تو موجب عتاب وملامت وگناہ نہیں،

(۲) اس شخص کے ذمہ سے فرض تو ساقط ہوجائے گا، لیکن ترکِ واجبات وترکِ سننِ مؤکدہ کا گناہ ہوگا وہو ظاہر، ۲۴ر ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

> طالب علم، قاضی یا مفتی کو درس، فتویٰ اور قضاء میں مشغول رہنے کی وجہ سے ترکِ سنن رواتب جائز ہے یا نہیں ؟

**سوال** (۹) طالب علمے بوجہ قلتِ فرصت بسبب کثرتِ اشتغال بمطالعہ کتبِ دینیہ اگر برخواندن فرائض فقط اکتفا کند وسننِ رواتب ترک سازد، ایں چنیں عمل کردن بعلتِ مذکور درحقِ او شرعاً روا باشد یا نہ ؟

**الجواب**، طالب علم یا قاضی یا مفتی کو سنتِ فجر کے سوا دیگر سننِ رواتب کا ترک وقت اشتغال بالعلم یا بالقضاء والفتویٰ جائز ہے، لیکن اگر وقتِ صلوٰۃ میں درس[عہ] و فتویٰ وقضاء سے فارغ ہوجائے تو سنن کا بجالانا ضروری ہے ولا یجوز ترکھا ای سنۃ الفجر لعالم صار مرجعاً فی الفتویٰ بخلاف باقی السنن فلو ترکھا لحاجۃ الناس الی فتواہ اھ قال الشامی معناہ انہ یترک وقت اشتغالہ بالافتاء لاجل حاجۃ الناس المجتمعین علیہ وینبغی انہ یصلیھا اذا فرغ فی الوقت و ظاہر التفرقۃ بین سنۃ الفجر وغیرھا انہ لیس لہ ترک الجماعۃ لانھا من الشعائر فھی آکد من سنۃ الفجر ولذا اجاز ترکھا لو خاف فوت الجماعۃ وافاد انہ ینبغی ان یکون القاضی وطالب العلم کذلک لاسیما المدرس اوفی المدرس نظر بخلاف الطالب العلم اذا خاف فوت الدرس اوبعضہ اھ (ص ۴۰۸ ج ۱) میں کہتا ہوں کہ شامی نے جو مدرس وطالب علم میں فرق کیا ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ طالب علم کو خوف فوت درس کے وقت تو ترکِ سنن غیر سنتِ فجر وجماعت جائز ہو، لیکن مطالعہ کی وجہ سے اُن کا ترک جائز نہ ہو، کیونکہ درس کے فوت کا تو بدل نہیں اور وہ دوسرے کے قبضہ میں ہے، اور مطالعہ اپنے قبضہ

عہ یعنی عند الدرس کما سیاتی، ۱۲



۱۵

میں ہے، دوسرے وقت بھی کرسکتا ہے، لیکن اگران لوگوں کے ترک سنن سے عوام الناس کو دینی ضرر ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں، واللہ اعلم، ۲۴ر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

> قبل عشاء چار رکعت کے قعدۂ اُولیٰ میں درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء وتعوذ پڑھنا جائز ہے،

**سوال** (۱۰) عشاء کی چار رکعت سنت میں جب دو رکعت پڑھ کر قعدۂ اُولیٰ سے قیام میں کھڑا ہو تب ثناء وتعوذ پڑھ کر قرأت شروع کرے، نیز قعدۂ اولیٰ میں درود شریف و دعاء پڑھے آیا یہ درست ہے ؟

**الجواب**؛ قبل عشاء چار رکعت کے قعدۂ اُولیٰ میں درود شریف اور تیسری میں ثناء وتعوذ پڑھنا جائز ہے، فی العالمگیریۃ وفی الاربع قبل الظھر والجمعۃ وبعدھا لا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القعدۃ الاولیٰ ولا یستفتح اذا قام الی الثالثۃ بخلاف سائر ذوات الاربع من النوافل (ص ۲۷، ج ۱) وھکذا فی الدر وقال ایضاً ویتعوذ (ص ۷۰، ج ۱ مع الشامی) کتبہ عبدالکریم عفی عنہ ۱۳ صفر ۱۳۴۳ھ

> نفل کی جماعت جبکہ مقتدی تین سے زائد ہوں مکروہ ہے،

**سوال** (۱۱) دو تین آدمیوں کی اقتداء بلا املائے نفل نماز میں درست ہے مگر جماعت کا ثواب نہیں ملتا، اور جب جماعت کا ثواب نہیں ملتا تو دو تین آدمیوں کی جماعت بلا املائے بے سود ہے ؟

**الجواب**؛ نفل کی جماعت کرنا جبکہ چار مقتدی ہوں تو اتفاقاً مکروہ ہے، اور تین مقتدی ہوں تو کراہت میں اختلاف ہے، اور جس صورت میں مکروہ نہیں اس میں ثواب نہ ملنے کی تصریح تو نہیں ہے، شامی نے قول بدائع ان الجماعۃ فی التطوع لیست بسنۃ سے استنباط کیا ہے، اور اس میں تامل بھی ظاہر کیا ہے (شامی ص ۴۲۱، ج ۱) بہر حال اہتمام جماعت نفل میں نہ کرنا چاہئے،

> عشاء وعصر کی چار سنت میں قعدۂ اولیٰ پر درود شریف اور تیسری رکعت میں ثناء و تعوذ پڑھنا جائز ہے،

**سوال** (۱۲) ............... عشاء اور عصر کی چار سنت میں دو رکعت کے بعد التحیات کے ساتھ درود شریف اور دعاء اور تیسری رکعت سبحانک اللہ سے شروع کرنی چاہئے؟

**الجواب**؛ فی الدر المختار (ولا یزید) فی الفرض علی التشھد فی القعدۃ الاولیٰ اجماعاً وقال الشامیؒ (قولہ فی الفرض) ای وما الحق بہ کالوتر

والسنن الرواتب وان نظر صاحب البحر فیھا (ص ۵۲۲ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ اس حکم میں عشاء وعصر کی چار سنتیں نوافل مطلقہ میں داخل ہیں، عبدالکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۳۴۵ھ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ ۶ محرم ۱۳۴۵ھ

چھوٹی مسجد جو صرف ایک مکان پر مشتمل ہو جماعت فجر کھڑی ہونے کے بعد اس میں سنت فجر ادا کرے یا ترک کردے؟

**سوال (۱۳)** ........................جو چھوٹی مسجد ایک مکانیت پر مشتمل ہو اس میں نہ صحن نہ حجرہ نہ برآمدہ نہ ستون نہ جگہ صیفی نہ شتوی، تو قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں سنتوں کا خصوصاً فجر کی سنت کا ترک کرنا ضروری ہے اور جماعت میں ملنا چاہئے، اور اولیٰ وافضل سنن کے لئے مکان ہی پر گھر سے سنت پڑھ کر آنا افضل ہے کیونکہ مسجد صلوٰۃ مکتوبہ کے لئے ہے نہ کہ سنت کے واسطے، اور افضلیت سنن ونوافل پڑھنے کی مکان میں مسجد سے حدیث سے ثابت ہے، خواہ سنت فجر ہو یا غیر، وعلیکم بالصلوٰۃ فی بیوتکم فان خیر صلوٰۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ، اور ترک کرنا اس وجہ سے بھی چاہئے کہ جب جماعت مکتوبہ قائم ہو جاوے تو اس وقت دوسری نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، چونکہ یہ مسجد ایک ہی مکانیت پر مشتمل ہے، اس میں کوئی گوشہ یا دوسری جگہ نہیں ہے، لہٰذا بربناء عباراتِ فقہیہ کے بھی ترک سنت فجر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، چنانچہ مجمع الانہر میں ہے وکرہ خلف الصف بلا حائل، اور فتاویٰ امدادیہ جلد اول صفحہ ۵۲ کی اس عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، فی رد المحتار باب ادراک الفریضۃ الحاصل ان السنۃ فی سنۃ الفجر ان یاتی بھا فی بیتہ والا فان کان عند باب المسجد مکان صلاھا فیہ والا صلاھا فی الشتوی او الصیفی ان کان للمسجد موضعان والا فخلف الصف عند ساریۃ الخ، یہ قول زید کا ہے،

عمر کہتا ہے کہ سنت فجر کی قیام جماعت مکتوبہ کی حالت میں پڑھے، جبکہ تیقن ہو کہ رکعت ثانیہ قطعی فوت نہ ہوگی اور وقت میں بھی گنجائش ہو، البتہ صفوف سے ہٹ کر بُعد اختیار کرے، جس قدر ممکن ہو والا فخلف الصف عند ساریۃ، عند ساریہ سے مسجد کی جگہوں میں خواہ گوشہ ہو، خواہ محاذی صف یا خلف صف ہو بُعد ہی مطلوب ہے، بحالت قیام جماعت فجر کی سنت کا ادا کرنا تعامل سے ہے، اور سنت فجر اشرف سنت مؤکدہ ہے، اور جماعت سنت مؤکدہ ہے، سنن کا ادا کرنا مکان میں مخصوص خواص کو ہے، عوام کے واسطے مسجد ہی



افضل ہے، بربناء فضل حدیث ثواب کے مکان سے مسجد میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت پڑھنا مسجد میں وارد و ثابت ہے، ترمذی شریف کی حدیثوں سے، اب حضرت والا ہم لوگوں کو کیا حکم فرماتے ہیں کہ کس کا قول صحیح اور کس پر عمل کیا جاوے، بالدلیل جواب کلی عطا فرمایا جاوے، بینوا بالکتاب وتوجروا یوم الحساب،

**الجواب**؛ قال الشامی بعد العبارۃ المذکورۃ فی الفتاوی الامدادیۃ التی نقلھا السائل مانصہ لکن اذا کان للمسجد موضعان والامام فی احدھما ذکر فی المحیط انہ قیل لایکرہ لعدم مخالفۃ القوم وقیل یکرہ لانھما کمکان واحد قال فاذا اختلف المشایخ فیہ فالافضل ان لا یفعل قال فی النھر وفیہ افادۃ انھا تنزیھیۃ اھ (ص ۴۹، ج ۱) قلت ھذا فیما اذا کان للمسجد موضعان واذا لم یکن سوی موضع واحد فالظاھر کراھۃ الاشتغال بالسنۃ ھناک تحریما الا اذا صلاھا بعیداً عن الصفوف منحرفا عن القوم فی جانب منہ واللہ اعلم

صورتِ مذکورہ میں کہ مسجد میں بجز مکان واحد کے کچھ نہیں ہے، اقامت للمکتوبہ کے بعد مسجد کے اندر سنتیں فجر کی پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ مسجد سے باہر دروازہ کے متصل پڑھنا چاہئے، یا اگر مسجد بڑی ہو اور جماعت قائم ہونے کے بعد ایک جانب گوشے میں سنتیں پڑھتے ہوئے صفوف سے بُعد کافی ہو جاتا ہو تو یہ بُعد بھی قائم مقام حائل کے ہو جائے گا، کما یظھر من قول الطحاوی وغیرہ من مشائخ الحنفیۃ وقد ذکرتہ فی اعلاء السنن بالبسط من ذلک واللہ اعلم،

اور نوافل وسنن مؤکدہ کا گھر میں پڑھنا فی نفسہٖ افضل ہے، مگر چونکہ عوام نے اس فضیلت کو ترکِ سنن کا وسیلہ بنا لیا ہے اب سنن مؤکدہ کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، ورنہ ترک سنن کے ساتھ متہم ہوگا، اور تہمت سے بچنا لازم ہے، لما فی الحدیث من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا مواضع التہم والامر للوجوب، واللہ تعالیٰ اعلم ۱۸ رجب ۱۳۴۶ھ

سامع اگر تراویح سے قبل نوافل میں امام کو قرآن سنائے جس سے مشغولین فی السنن وغیرہ کو تشویش ہو تو یہ عمل ان کا جائز ہے یا نہیں، اور اس جماعت نفل میں شرکت کا حکم

**سوال (۱۴)** ہمارے یہاں مسجد میں تراویح کے قاری کے جو حافظ صاحب سامع ہیں وہ قبل تراویح دو رکعت نفل میں اپنا قرآن شریف قاری کو سنا دیتے ہیں، مگر ان کے سنانے کے وقت عشاء کا وقت بھی ہو جاتا ہے اور لوگ کچھ ان کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں کچھ علٰحدہ ادائے سنن میں مشغول ہو جاتے ہیں

پھر یہ حافظ صاحب جو نفل میں قرآن شریف سناتے ہیں بالکل اسی جگہ کھڑے ہو کر سناتے ہیں، جو تراویح و فرض کے امام کی جگہ ہے، بظاہر مجھے یہ صورت پسندیدہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس میں مشغولین بالسنن سے تزاحم ہوتا ہے، اور ایسے وقت یا تو حافظ صاحب کے نفل موقوف ہوں یا سنن متروک، کیونکہ اذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا الآیة کا عموم موجودہ صورت کو جائز نہیں ٹھہراتا، پھر مجھے یاد ہے کہ مدینہ طیبہ میں میرے سامنے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی بلد سے یہ فرمایا تھا کہ لوگ مسجد نبوی میں تلاوت کرتے رہتے ہیں جس سے مصلّین کو تشویش ہوتی ہے، اس لئے اس کی ممانعت ہونی چاہئے تو قاضی صاحب نے وعدہ کیا تھا وہاں بھی تلاوت کرنے والے فرض نماز کی جماعت کے وقت نہیں کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تو وہ بھی جماعت میں شامل ہو جاتے تھے، البتہ قبل جماعت و بعد اذان تلاوت بلند آواز سے کرتے تھے جس سے ادائے سنن ورواتب میں تزاحم ہوتا تھا،

**الجواب**: آپ کا خیال صحیح ہے، اس حافظ سامع کو ایسا جہر نہ کرنا چاہئے جس سے مصلّین کو تشویش ہو، بلکہ کسی الگ جگہ پڑھا کریں، اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کو اقتدا بھی نہ کرنا چاہئے، کیونکہ نوافل مطلقہ کی جماعت میں تین چار سے زیادہ آدمی ہونا مکروہ ہیں، ۱۶ر رمضان ۴۸ھ

| اضطجاع بعد قیام اللیل سنت ہے یا نہیں؟ | **سوال** (۱۵) میرا معمول یہ ہے کہ اگر کبھی تہجد کو اٹھ بیٹھا تو پھر بغیر نماز فجر پڑھے نہیں لیٹتا، ایک صاحب نے جنھیں میں معتبر |
|---|---|

نہیں سمجھتا یہ کہا کہ تہجد کے بعد سو رہنا مسنون ہے اور فجر کے لئے پھر اٹھنا مسنون ہے

**الجواب**: اس قائل کا قول صحیح ہے مگر حنفیہ نے اضطجاع بعد قیام اللیل کی سنت عادت پر محمول کیا ہے، جس کا منشاء یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طول قیام لیل کے تعب رفع کرنے کے لئے اضطجاع فرماتے تھے، اور اگر یہ سنت مقصودہ بھی ہو تو اس پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ فوت جماعتِ فجر کا اندیشہ نہ ہو ورنہ واجب و فرض کا اہتمام ایسی سنت کے اہتمام سے مقدم ہے جس کا سنت مقصودہ ہونا ہی..... مختلف فیہ ہے، ۶ر رمضان ۴۸ھ



| خطبۂ جمعہ شروع ہونے کے بعد آنے والا پہلی چار سنتیں ادا کرے، اور کب؟ یا یہ سنتیں ساقط ہو جاتی ہیں؟ | **سوال** (۱۶) مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص ایسے وقت آکر کے شریک ہوا کہ خطبہ جمعہ کا ہو رہا ہے تو فرضوں سے پہلی جو چار سنت ہیں ان کو کب ادا کرے یا |
|---|---|

نہ کرے، یہاں پر لوگ اصرار کرتے ہیں کہ وہ سنت خطبہ ہونے سے پہلے پڑھے تو پڑھتے اور بعد جمعہ کے وہ نہیں پڑھی جاتی ہیں، وہ معاف ہو جاتی ہیں،

**الجواب**: جمعہ کے بعد والی سنتِ مؤکدہ ادا کرنے کے بعد اُن سنتوں کو پڑھے جو جمعہ سے قبل والی فوت ہو گئی ہیں کما فی الدر المختار (بخلاف سنة الظهر) وكذا الجمعة (فانه) ان خاف فوت ركعة (يتركها) ويقتدي (ثم يأتي بها) على انها سنة (في وقته) اى الظهر (قبل شفعه) عند محمد وبه يفتى وقال الشامي تحت (قوله وبه يفتى) اقول وعليه المتون لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين قال في الامداد وفي فتاوى العتابي انه المختار وفي مبسوط شيخ الاسلام انه الاصح لحديث عائشة انه عليه السلام كان اذا فاتته الاربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين وهو قول ابي حنيفة وكذا في جامع قاضي خان اه والحديث قال الترمذي حسن غريب فتح (شامی ص ۵۲۷ ج ۱)

اور بعض کتابوں میں ان سنتوں کا ساقط ہو جانا لکھا ہے، مگر شامی نے ان کے ایک استدلال کا جواب دیدیا ہے، اور دوسرے استدلال کے بعد فتأمل فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی پہلی سنتوں کا ظہر کی پہلی سنتوں کے...... برابر[1] ہونا راجح ہے، واللہ اعلم بالصواب، اور اگر بالفرض اُن کے سقوط کو راجح کہا جاوے تب بھی قضا سے اصرار کے ساتھ منع کرنا ٹھیک نہیں، کوئی شخص احتیاط کی بنا پر پڑھے تو اس کے روکنے کے کیا معنی، سنت نہ ہوں گی تو نفل کا ثواب مل جاوے گا، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، ۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ

الجواب صحیح　ظفر احمد عفا عنہ، ۲۶ر جمادی الاولیٰ ۴۵ھ

| استخارہ میں دونوں شقیں برابر ہوں تو کیا کرنا چاہئے؟ | **سوال** (۱۷) کسی خاص رسم کے معاملہ میں استخارہ کرنے کے لئے دو رکعت نماز پڑھ کر دعاء اللّٰہم انی استخیرک الخ پڑھنا |
|---|---|

[1] وقد صرح به ابن نجیم فی البحر، انظر بحر الرائق باب الجمعة،

اس کے بعد دل میں غور کرتا پھر جس طرف ارادہ پختہ ہو جاوے اسے حکم سمجھنا اور اس پر کاربند ہونا لکھا ہے، مگر مجھ گنہگار شخص کی یہ حالت ہے کہ غور کرنے میں دونوں جانب خیال کی حالت یکساں رہتی ہے،

**الجواب:** دونوں میں خیر ہے جس پر چاہے عمل کرے، بشرطیکہ وہ دونوں شقیں جائز ہوں، اور اگر ان میں سے ایک شق ناجائز ہو تو استخارہ جائز نہیں ہے، کیونکہ استخارہ اسی وقت مشروع ہے جبکہ دونوں صورتیں جائز ہوں، کتبہ العبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۵ رمضان ۴۸ھ

**تہجد کی کتنی رکعتیں ہیں**

**سوال (۱۸)** تہجد کی نماز کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئے، اور دو دو رکعت کی نیت باندھنی چاہئے یا چار چار کی؟

**الجواب:** آٹھ رکعتیں مختار ہیں، اور دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے،

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ — عبدالکریم عفا عنہ ۱۸ رمضان ۴۸ھ

**صلوٰۃ التسبیح کی دوسری رکعت کی تسبیحات میں راجح قول کونسا ہے، اور اس سے متعلق ایک ضمنی سوال،**

**سوال (۱۹)** صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں ترمذی شریف کے صفحہ ۶۳ پر ابو رافعؓ کی حدیث اور مشکوٰۃ کے صفحہ ۱۱۷ پر ابن عباسؓ کی روایت سے دوسری رکعت کے ختم کی تسبیحات بعد تشہد پڑھی جاسکتی ہیں، کیونکہ ان کی روایتوں میں پہلی کے ختم کی بھی جلسۂ استراحت میں ہیں، مگر کہتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک یہ صورت مرجوح ہے، راجح عبداللہ بن المبارکؒ کی ہے، جو ترمذی کے صفحہ ۶۴ پر ہے، اور اس میں جلسۂ استراحت کی ضرورت نہیں، کیونکہ قیام ہی میں پچیس ہو جاتی ہیں، تو اس راجح صورت عند الحنفیہ پر دوسری رکعت کی تسبیحات کی کیا صورت ہوگی، یا جو عبداللہ بن المبارکؒ نے یبدأ الخ سے بیان فرمایا ہے یہی ہے، اور آنجناب کی معمول بہا کونسی صورت ہے؟

**الجواب:** ابن عباس رضؓ کی روایت میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، کہ تسبیحات تشہد سے پیشتر پڑھی جاویں یا بعد تشہد، اور سوال میں بعد تشہد ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے اس سے مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا، پہلی اور تیسری رکعت کے جلسۂ استراحت

عہ حکم کا مطلب یہ ہے کہ ایک جانب رجحان ہونیکے بعد اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن اگر دوسری مرجوح شق پر بھی عمل کر لیا جاوے تو جائز ہے، ۱۲ عبدالکریم عفی عنہ



میں تسبیحات ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ دوسری اور چوتھی رکعت میں بعد تشہد ہو، البتہ اگر قراءت پر قیاس کیا جاوے تو ممکن ہے، یعنی یوں کہا جاوے کہ جس طرح قیام میں قراءت کے بعد تسبیحات ہیں اسی طرح قعود میں تشہد کے بعد پڑھی جاویں، لیکن ایک روایت میں قبل تشہد پڑھنے کی تصریح وارد ہوئی ہے، اس واسطے اس قیاس پر عمل نہ ہوگا، بلکہ روایت پر عمل کیا جاوے گا، والروایۃ قد اخرجھا الدارقطنی عن ابن عباس مرفوعًا وفیہا اذا جلست للتشھد قلت ذلک عشر مرات قبل التشھد (اللآلی المصنوعۃ ص: ۲۰) وقال العلامۃ السیوطی رجالہ ثقات الا صدقۃ وھو الدمشقی کما نسب فی روایۃ ابی نعیم وابن شاھین وھو ابن عبد اللہ ویعرف بالسمین ضعیف من قبل حفظہ ووثقہ جماعۃ (ص ۲۲)۔

اور ابن المبارک کی روایت میں سجدۂ ثانیہ کے بعد تسبیحات ہی نہیں جو ان کے محل کا سوال ہو، فافہم، اور عبداللہ بن المبارک سے ترمذی نے جو روایت کی ہے وہ مرفوعًا بھی مروی ہے، رواہ البیھقی من حدیث ابی خباب الکلبی عن ابی الجوزاء عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۵۲، ۳۶) والکلبی مختلف فیہ ضعفہ کثیرون وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال ابن نمیر صدوق کان صاحب تدلیس قال الفلاس قال ابو نعیم لم یکن بابی خباب بأس الا انہ کان یدلس وکذا قال احمد وابن معین وابوداؤد عن ابی نعیم وقال احمد بن سلیمان الرھاوی عن ابی نعیم مثل ذلک وزاد ما سمعت منہ شیئًا الا شیئًا قال فیہ حدثنا (تھذیب التھذیب) اور اللآلی المصنوعۃ (ص ۲۴) میں ہے قال الحاکم ولا یتھم بعبد اللہ انہ یعلم ما لم یصح عندہ سندہ وایضا فیہ (ص ۲۳) وقال البیھقی بعد تخریجہ کان عبد اللہ بن المبارک یصلیھا وتداولہ الصالحون بعضھم بعضا وفی ذلک تقویۃ للحدیث المرفوع، پس یہ روایت بھی ثابت ہے، اور جب دونوں طریق ثابت ہیں تو دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، جس طریق سے چاہیں پڑھ لیں اور حنفیہ اگر طریق اول پر پڑھیں، یعنی جلسۂ استراحت کریں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں

کیونکہ یہ ایک جداگانہ نماز ایک خاص طریق سے وارد ہوئی ہے، پس جس طرح اس میں تسبیحات کا اضافہ ہے اسی طرح جلسۂ استراحت کا اضافہ ہے، اس سے تمام نمازوں میں جلسۂ استراحت ہونا لازم نہیں آتا، اور حنفیہ میں سے بعض نے دونوں طریق نقل کئے ہیں، اور بعض نے طریق اول پر اقتصار کیا، اور بعض نے طریق ثانی پر، اور علامہ شامی نے کہا ہے: "الذی ینبغی فعل ہذہ مرة وہذہ مرة" اور ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں فرمایا ہے "وینبغی للمتعبد ان یعمل بحدیث ابن عباس تارة ویعمل بحدیث ابن المبارک اخری" ولیکن قنیہ میں روایت ابن المبارک کے متعلق ہے "انہا المختار من الروایتین" (شامی ص ۱۹، ج ۱) ونیز علامہ نوویؒ نے اذکار میں اس کی موافقت کی ہے (بذل المجہود، ص ۲۷۶ ج ۲) اور امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے "ہذا ہو الاحسن وہو اختیار ابن المبارک" (ص ۱۸۶ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ راجح طریق ابن المبارک کا ہے، اور نوویؒ وغزالیؒ کی موافقت سے معلوم ہوا کہ حنفیہ میں سے جن حضرات نے اس کو اختیار کیا ہے، ان کا مطمح نظر موافقت حنفیہ فی عدم الجلسۃ للاستراحۃ نہیں ہے، بلکہ کوئی اور وجہ ہے، اور اگر کوئی حنفی یہ بھی کہے کہ جب دونوں طریق ثابت ہیں تو ہمارے لئے وہ طریق اختیار کرنا بہتر ہے، جو اقرب الی المذہب ہو تو اس میں کچھ حرج بھی نہیں، ان پر اعتراض تو جب ہوتا ... جب غیر ثابت کو صرف موافقتِ مذہب کی بنا پر ترجیح دیتے، واللہ اعلم،

۱۷ شوال ۱۳۵۱ھ کتبہ عبد الکریم عفی عنہ

# فصل فی التراویح

| تراویح کی چار رکعت میں اگر قعدۂ اولیٰ بھول گیا تو کیا حکم ہے؟ |
|---|

**سوال** (۱) امداد الفتاویٰ جلد اول صفحہ ۹۳ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تراویح میں قعدۂ اولیٰ کو سہواً ترک پر سجدۂ سہو کے بعد چار ہی محسوب ہوں گی" اور قاضی خاں کی عبارت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ کبیری ہندوستانی مطبع ص ۳۹۰ میں ہے "ان صلی اربع رکعات بتسلیمۃ واحدۃ ولم یقعد علی رکعتین تجزیٔ عن تسلیمۃ واحدۃ وہو المختار قال قاضی خاں وہو الصحیح وقال ابو اللیث تنوب عن تسلیمتین والصحیح الاول انتہی مختصراً" اور طحطاوی مراقی الفلاح ص ۲۲۵ میں ہے "ویسلم علی کل رکعتین فاذا وصلہا وجلس علی کل شفع فالاصح انہ ان تعمد ذلک کرہ وصحت واجزأتہ عن کلہا واذا لم یجلس الا فی آخر اربع نابت عن تسلیمۃ" اس پر طحطاوی نے ایک خلجان بھی کیا ہے، مگر کچھ وقیع نہیں، بالجملہ اس کی تحقیق حضرت مولانا سے مراجعت کے بعد فرمادیں، انتظار ہے، اب تک کبیری وغیرہ ہی پر عامل تھا، مگر فتاویٰ کی عبارت سے تردد میں پڑ گیا، السائل محمد زکریا کاندھلوی،



**الجواب**: مکرمی المحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بجواب مسئلہ عرض ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں کی عبارت میں نے دیکھی، اس میں بھی آگے چل کر دوسرے ہی قول کو صحیح لکھا ہے، جیسا کہ کبیری وطحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں ہے، قال قاضی خان وقال الفقیہ ابو جعفر والشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضلؒ فی التراویح ینوب الاربع عن تسلیمۃ واحدۃ وہو الصحیح لان القعدۃ علی رأس الثانیۃ فرض فی التطوع فاذا ترکہا کان ینبغی ان تفسد صلوٰتہ اصلا کما ہو وجہ القیاس وانما جاز استحسانا فاخذنا بالقیاس وقلنا بفساد الشفع الاول واخذنا بالاستحسان فی حق بقاء التحریمۃ واذا بقیت التحریمۃ صح شروعہ فی الشفع الثانی وقد اتمہا بالقعدۃ فجاز عن تسلیمۃ واحدۃ وعن ابی بکر الاسکاف الخ فذکر نحوہ، ص ۱۱۵، میں نے یہ عبارت حضرت مولانا کو بھی دکھلائی فرمایا کہ میرا معمول تو عرصے سے دوسرے ہی قول پر فتویٰ دینے کا ہے، کہ یہ چار قائم مقام دو کے ہوں گی، جیسا کہ کلام مشائخ سے اس کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے، لیکن امداد الفتاویٰ کا جواب غالباً اس بنا پر ہے کہ آجکل طبائع میں کسل غالب ہے، اگر چار کو قائم مقام تسلیمۃ واحدۃ کے مان کر دو رکعت کا اعادہ کیا جائے گا تو وہ اعادہ مع اس مقدار قرآن کے ہوگا، جو اُن رکعتوں میں پڑھا گیا ہے، اور بعض دفعہ اُن دو رکعتوں میں بہت زیادہ مقدار تلاوت کی جاچکتی ہے، ان کا اعادہ مع مقدارِ تلاوت نمازیوں پر بہت گراں ہوتا ہے حتی کہ فرماتے تھے کہ میں نے بعض جگہ اس پر لڑائی ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اس لئے تسہیل عوام کے لحاظ سے امداد الفتاویٰ میں فقیہ ابو اللیث کے قول پر میں نے اکتفا کیا، کہ جب مسئلہ میں دو قول موجود ہیں، اور ایک قول میں عوام کو سہولت ہے تو اسکو اس جہت سے ترجیح ہے، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا، گو قواعد کے لحاظ سے دوسرا ہی قول صحیح ہے ہذا واللہ اعلم، پس جس جگہ دوسرے قول پر فتویٰ دینے سے لوگوں میں توحش اور تنگی کا

اندیشہ ہو وہاں میرے نزدیک پہلے ہی قول پر فتوٰی دینا چاہئے، واللہ اعلم، ۲۲ر رمضان ۴۲ھ

**حروف کاٹ کر تیز پڑھنے والے حافظ کے پیچھے نماز مکروہ ہے**

**سوال (۲)** ایسا حافظ جو سال بھر قرآن مجید کی تلاوت نہ کرتا ہو، اور حافظ بھی پختہ نہیں ہے، دنیادار ایسا کہ تین چار قسم کاروزگار کئے ہوئے ہے، مگر اتنا چاہتا ہے کہ سال بھر میں بذریعہ تراویح قرآن سناؤں، انداز اس کے سنانے کا یہ ہے کہ صاف لفظ نہیں ادا کرتا، کسی لفظ کا کوئی جزو پڑھا اور تیزی میں اس لفظ کا کوئی جزو چھوڑ دیا، اور اسی تیزی میں کبھی بلکہ آیت یا دو آیت یا کئی آیتیں چھوڑ گیا تو ایسے حافظ کے پیچھے نماز تراویح درست ہے یا نہیں؟

**الجواب:** ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا مکروہ ہے، ۱۴ر شوال ۴۲ھ

**ایک حافظ کا ایک رمضان میں تین چار جگہ قرآن ختم کرنا،**

**سوال (۳)** ایک حافظ ایک رمضان میں مثلاً تین عشرہ میں تین جگہ تراویح میں قرآن ختم کرتے ہیں اور ہر ایک جگہ مقتدی غیر ہوتے ہیں، اب سوال ہے کہ ایسے ختم و تراویح جائز ہے یا نہیں، اگر اس کے جواز کی ایک دلیل مرقوم ہو تو بہتر ہے؟

**الجواب:** جائز ہے قال فی نور الایضاح وشرحه وسن ختم القرآن فیها ای مرة فی الشهر علی الصحیح وهو قول الاکثر قال الطحطاوی ومرتین فضیلة وثلاثا فی کل عشر مرة افضل اه ص ۲۴۱، قلت والاطلاق یدل علی افضلیة الختم ثلاثا مطلقا سواء کان فی مسجد واحد او فی ثلاث مساجد فی کل مسجد مرة، اور فتاوٰی قاضی خان میں جس صورت کو مکروہ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ ایک مسجد میں پوری تراویح پڑھائے اور پھر وہی امام دوسری مسجد میں جا کر تراویح پڑھائے یہ مکروہ ہے، قال فی صفحه ۱۱۲ ج ۱ ولو صلی امام واحد التراویح فی مسجدین کل مسجد علی وجه الکمال اختلف المشائخ فیه حکی عن ابی بکر الاسکاف رح انه لا یجوز وقال ابو بکر سمعت ابا نصر انه قال یجوز لاهل المسجدین جمیعا کما لو اذن المؤذن واقام وصلی ثم اتی مسجدا اخر فاذن واقام وصلی معهم فانه لا یکره وانما یکره اذا اذن واقام ولا یصلی معهم کذلك فی التراویح الی ان قال هذا اذا ام للناس مرتین فان لم یکن اماما وصلی التراویح فی مسجد بجماعة ثم ادرك جماعة اخری فی مسجد اخر



فصلی لا بأس به، اھ، اور وجہ کراہت یہ ہو کہ جب ایک بار یہ شخص تراویح پڑھ چکا ہے، تو دوبارہ اس کی نماز نفل ہوگی اور مقتدیوں کی تراویح ہوگی تو امام کی نماز مقتدی سے اضعف ہوگی، وذا لا یجوز بخلاف اس کے ایک مسجد میں ختم کرکے دوسری مسجدوں میں ختم کرے، اور ہر جگہ امام و مقتدی کی نماز تراویح کی ہو اس میں کوئی حرج نہیں، واللہ اعلم، ۳ر شعبان

**روزہ اور تراویح لازم و ملزوم ہیں یا نہیں**

**سوال (۴)** نماز تراویح اور روزہ لازم و ملزوم ہیں یا نہیں، بے روزہ نماز تراویح ہرگز نہ پڑھے یا پڑھ لے؟

**الجواب:** روزہ اور تراویح لازم و ملزوم نہیں ہیں، اگر کوئی شخص عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے لیکن وہ تراویح پڑھ سکتا ہے تو اس کو تراویح پڑھنا چاہئے، ۲۱ر رمضان ۴۱ھ

**فصل کی کٹائی کی وجہ سے روزہ افطار کرنے والے کی اقتدار کا حکم،**

**سوال (۵)** فصل کٹائی یا کسی ایسے ہی سخت مشقت والے کام کے لئے روزہ کا افطار جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** اگر فصل کاٹنے میں تاخیر کرنے سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تب تو کاشتکار کو لازم ہے کہ فصل کو بعد رمضان کے کاٹے، اور اگر تاخیر سے زراعت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس لئے رمضان ہی میں کاٹنا پڑے، اور کٹائی کی حالت میں روزہ دشوار ہو تو کاشتکار کو اس حالت میں افطار جائز اور درست ہے، بعد رمضان کے ان ایام کی قضا کرے، کفارہ نہ ہوگا، قال فی الفتاوی الکاملیة سئلت عن حصاد لم یقدر علی حصاد زرعه مع الصوم واذا اخره یهلك هل یجوز له الافطار حینئذ فالجواب نعم یجوز له ذلك حینئذ فقد نقل المحقق ابن عابدین رحمه الله فی حواشیه علی الدر من الخیر الرملی مانصه وعلی هذا الحصاد اذا لم یقدر علیه مع الصوم ویهلك الزرع بالتاخیر لاشك فی جواز الفطر والقضاء اھ والله اعلم، ص ۱۶ و ۱۷، ۲۱ر رمضان ۴۱ھ

**نماز تراویح میں قرآن کی سورتوں کی ترتیب کا حکم**

**سوال (۶)** ایک شخص نماز تراویح کی چار رکعت کی نیت کرتا ہے اول رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتا ہے، دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھتا ہے، تیسری میں سورۃ الہمزہ اور چوتھی میں پھر سورۂ اخلاص پڑھتا ہے، اس صورت میں نماز تراویح ہوگی کہ نہیں، اگر ہوگی تو حوالۂ کتاب اور استدلالِ حدیث کی ضرورت ہے اور اگر نہیں ہوگی تو بھی دلائل کی ضرورت ہے، بہرحال ہر حالت میں ثبوت اور حوالہ

کتاب کی ضرورت ہے، ایسا کرنے والے کو کیا کرنا چاہیئے، اور اس کے لئے کیا حکم ہے، میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ نماز نہیں ہوگی، کیونکہ ترتیبِ قرآن ٹھیک نہیں، اور ہر نماز کے لئے ترتیبِ قرآن کا ہونا ضروری ہے، بہرحال اس مسئلہ کے لئے جو کچھ ضروری ہو تحریر فرمایئے،

(۲) ایک شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت کرتا ہے پہلی رکعت میں سورۃ والعصر پڑھتا ہے دوسری میں سورۃ الاخلاص اسی طرح وہ نماز تراویح کی بست رکعتیں ختم کرتا ہے، یا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں کے لئے دلائل کی ضرورت ہے،

**الجواب**؛ قال فی الخلاصہ رجل یصلی اربع رکعات بتسلیمۃ وقعد فی الثانیۃ قدر التشہد اختلف المشائخ فیہ اکثرہم علی انہ یجزیہ عن تسلیمتین اھ ص ۶۵ ج ۱، صورتِ مذکورہ میں نماز درست ہوجاوے گی، مگر تراویح میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا خلافِ سنت ہے، قال فی الخلاصۃ وان قرأ فی رکعۃ سورۃ وفی رکعۃ اخریٰ فوق تلک السورۃ او فعل ذلک فی رکعۃ مکروہ وان وقع ھذا من غیر قصدہ بان قرأ فی الرکعۃ الاولیٰ قل اعوذ برب الناس یقرأ فی الرکعۃ الثانیۃ ھذہ السورۃ ایضا وھذہ کلھا فی الفرائض اما فی النوافل لایکرہ اھ ص ۹۷ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ سورتوں کی ترتیب فرائض میں ضروری ہے، غیر ترتیب سے پڑھنے میں کراہت ہوگی، لیکن نوافل میں ہر طرح اختیار ہے گو..... نوافل میں بھی ترتیب کی رعایت افضل ہے، لیکن جو صورت سائل نے لکھی ہے اس میں تو کچھ بھی حرج نہیں، کیونکہ نوافل و تراویح کا ہر شفعہ صلوٰۃ مستقلہ ہے، اور ہر شفعہ کی قرأت میں الگ الگ رعایت ترتیب کی ہے، گو مجموعہ شفعتین میں ترتیب نہ رہی ہو اس کا مضائقہ نہیں، ۲۲ رمضان ۱۳۴۱ھ

| نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد دعاء مانگنے کا حکم، |
|---|

**سوال** (۷)......................... یہاں کی مسجدوں میں دستور یہ تھا کہ رمضان المبارک میں نماز تراویح کی ہر چہار رکعت کے بعد امام و مقتدی کچھ وظیفہ پڑھتے تھے، پھر وظیفہ کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگتا تھا، اور جملہ مقتدی آمین کہتے تھے، اس سال اتفاق سے مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً سے خطیب مسجد نبوی ایک مسجد میں تشریف لائے، اور وہ اس مسجد موصوف کے امام مقرر ہوئے، یہ مدنی امام حافظِ قرآن بھی تھے، لہٰذا اس سال رمضان المبارک میں آپ نے تراویح میں قرآن پاک پڑھا، لیکن ہمیشہ کے دستور کے خلاف ہر چار رکعت



تراویح کے بعد صرف ذکر و وظیفہ پر قناعت کی دعاء نہیں مانگی، البتہ بیس رکعت تراویح کے ختم پر ذکر کر کے دعاء مانگی، دوسرے روز جب اس واقعہ کی اطلاع دوسری مسجدوں میں ہوئی تو ایک مسجد میں اُس پر سخت اعتراضات کئے گئے، جب امام صاحب مدنی سے اس کی بابت دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں مسجد نبوی میں جس طریقہ سے تراویح پڑھی جاتی ہیں میں نے اسی طریقہ پر پڑھیں، چونکہ مدینہ پاک میں ہر چہار رکعت کے بعد دعاء نہیں مانگی جاتی ہے، لہٰذا اسی کے مطابق میں نے بھی کیا، مجھے یہاں کا دستور نہ تو معلوم تھا اور نہ یہاں کے رواج کی تقلید میرے ذمہ ضروری تھی، اُس دوسری مسجد والوں نے نفسانیت کی بناء پر ایک صاحب سے اپنی مسجد میں وعظ کہلایا، واعظ صاحب نے کھلم کھلا ہر چہار رکعت پر دعاء نہ مانگنے پر بہت کچھ اعتراضات کئے، اور اپنے نزدیک یہاں کے اعتبار سے اس جدید فعل کی پوری تردید کردی،

پس اب سوال یہ ہے کہ ہر چہار رکعت تراویح کے بعد صحابہ کرام رضؓ و ائمہ مجتہدین خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہ رحؒ کا عمل درآمد دعاء کے متعلق کیا تھا، اور اگر ان کا دستور العمل نہیں تھا، تو آیا یہ دعاء مانگنا بلا کراہت جائز ہے یا نہیں، اور یہ کہ محض جائز ہی ہے یا مستحب یا سنت، اور امام کو اس دعاء پر مجبور کرنا اور نہ کرنے پر شور و شر پھیلانا شرعاً درست ہے یا نہیں، در صورتِ جواز جب عوام کا اس قدر اصرار ہو کہ تارک کو موجبِ ملامت قرار دیں تو عوام کے عقیدے کی درستی کے لئے اس کا ترک کر دینا بہتر ہے یا نہیں؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہر چہار رکعت کے بعد دعاء مانگنا جائز بھی ہو تو بھی موجودہ حالات میں اس کا ترک کر دینا ضروری ہوگا، اس لئے کہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ جب کسی غیر ضروری فعل پر مداومت عقیدۂ عوام کے فساد کا باعث ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عقیدۂ عوام کی درستی کے لئے اس کو ترک کردیں، پس سوال مذکور کا مفصل جواب ارشاد فرمائیں،

**الجواب** واللہ الموفق للصواب؛ قال فی الدر یجلس ندبا بین کل اربعۃ بقدرھا وکذا بین الخامسۃ والوتر ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادی الخ قال العلامۃ الشامی تحت قولہ بین تسبیح قال القہستانی فیقال ثلث مرات سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والجبروت

الی قولہ لا الٰہ الا اللہ نستغفر اللہ نسألک الجنۃ ونعوذبک من النار کما فی منہج العباد اھ ص ۲۹، ج ۱، قلت وفی البدائع ومنہا ان الامام کلما صلی ترویحۃ قعد بین الترویحتین قدر ترویحۃ یسبح ویہلل ویکبر ویصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویدعو وینتظر ایضا بعد الخامسۃ قدر ترویحۃ لانہ متوارث من السلف اھ ص ۲۶۰، ج ۱، ولعل المراد بقولہ یدعوان یأتی بالادعیۃ المأثورۃ لا الدعاء برفع الیدین لان المتوارث من السلف فی ہذا الموضع انما ہو مطلق الانتظار سواء کان بالجلوس او بالقیام او بالسکوت او بالذکر ونحوہ قال فی شرح المنیۃ ولیس المراد حقیقۃ الجلوس بل المراد الانتظار وہو مخیر فیہ ان شاء جلس ساکتا وان شاء ہلل او سبح او قرأ او صلی نافلۃ منفردا وہذا الانتظار مستحب لعادۃ اہل الحرمین فان عادۃ اہل مکۃ ان یطوفوا بعد کل اربع اسبوعا ویصلوا رکعتی الطواف وعادۃ اہل المدینۃ ان یصلوا اربع رکعات، وقد روی البیہقی باسناد صحیح انہم کانوا یقومون علی عہد عمرؓ یعنی بین کل ترویحتین اھ (ص ۳۰۶)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ ہر ترویحہ کے بعد مستحب مطلق انتظار ہے جس میں امام و مقتدین کو اختیار ہے کہ خواہ خاموش بیٹھے رہیں یا اذکار وغیرہ میں مشغول رہیں، اور دعاء بہیئت متعارفہ خصوصیت کے ساتھ نہ درمیانی ترویحوں میں مسنون ہے نہ آخری ترویحہ میں، لیکن اس میں شک نہیں کہ مطلق سکوت سے ذکر وادعیہ میں مشغول ہونا بہتر ہے، پس اگر جائز وامر اختیاری سمجھ کر تمام ترویحوں میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر صرف ترویحۂ خامسہ میں دعاء کی جائے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں، اور اگر کسی ترویحہ میں بھی دعاء نہ کریں یہ بھی جائز ہے، یہ تو اصل حکم ہے، لیکن ایک عارض پر نظر کر کے اولیٰ یہ ہے کہ درمیانی ترویحوں میں دعاء نہ کی جائے، وہ یہ کہ ہر ترویحہ کے بعد بطریق متعارف دعاء کرنا موجب ثقل علی القوم ہوتا ہے اگر تسبیحات وتہلیلات کے بعد خشوع کے ساتھ دعاء کی جائے گی تو اس میں ضرور کچھ دیر ہوگی، اور اگر بدون خشوع وحضور قلب کے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر منہ کو مل لئے تو ایسی دعاء سے دعاء نہ کرنا بہتر ہے، ان اللہ لا یقبل الدعاء من قلب لاہ، اور فقہاء نے امام تراویح کو تعلیم فرمائی ہے کہ صلوٰۃ تراویح میں بعد تشہد کے صرف اللہم صل علی محمد کہہ کر سلام پھیر دیا کرے، ادعیہ ماثورہ نہ پڑھے، مخافۃ الثقل علی القوم، تو جب دعاء مسنون کو فقہاء نے ترک کرنے کی تعلیم کی ہے تاکہ قوم



پر ثقل نہ ہو تو دعاء ترویحہ جو کہ مسنون بھی نہیں بلکہ جائز اور غایت سے غایت مستحب ہے اس کو ترک کرنا ثقل سے بچنے کے لئے کیوں افضل واولیٰ نہ ہوگا، ویأتی القوم والامام بالثناء فی کل شفع ویزید الامام علی التشہد الا ان یمل القوم فیاتی بالصلوات ویکتفی باللہم صل علی محمد لانہ الفرض عند الشافعی ویترک الدعوات ویجتنب المنکرات اھ کذا فی الدر علی الشامیۃ (ص ۴۰، ج ۱) اور ہر چند کہ اصل حکم تخییر پر نظر کرتے ہوئے ترویحۂ خامسہ میں بھی دعاء بطریق متعارف کو کچھ ترجیح معلوم نہیں ہوتی مگر ایک علت پر نظر کر کے ترویحہ خامسہ میں دعاء کرنا مستحب واولیٰ ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ ترویحۂ خامسہ میں حزب قرآن پورا ہو جاتا ہے، اور بعد تلاوت حزب قرآن کے دعاء کرنا مستحب ہے، اور وہ وقت اجابتِ دعاء کا ہے، قال فی الاحیاء فی بیان آداب التلاوۃ الثامن ان یقول فی مبتدأ قراءتہ اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم، الی ان قال ولیقل عند فراغہ من القراءۃ صدق اللہ تعالیٰ وبلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہم انفعنا بہ وبارک لنا فیہ الحمد للہ رب العلمین استغفر اللہ الحی القیوم اھ (ص ۲۴۹، ج ۲) وقال فی الحصن فی احوال اجابۃ الدعاء ما نصہ وعقیب تلاوۃ القرآن ولا سیما الختم طموص خصوصا من القاری، ت ط اھ (ص ۳۰ و ۳۱) وفی الاتقان للسیوطی ناقلا عن الشعب من حدیث انس مرفوعا من قرأ القرآن وحمد الرب وصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستغفر ربہ فقد طلب الخیر مکانہ اھ (ص ۱۱۶، ج ۱)، غرض تلاوتِ قرآن سے فارغ ہو کر دعاء کرنا مستحب ہے، اور یہ وقت قبولِ دعاء کا ہے، اس لئے ترویحہ خامسہ میں دعاء کرنا مستحب وافضل واولیٰ ہوگا، اور ہر ترویحہ میں دعاء کرنا ایسا ہوگا، جیسے کوئی شخص تلاوت قرآن کے وقت ہر رکوع یا ہر ربع پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کیا کرے، اور یقیناً یہ صورت مستحدث ہے، سلف صالحین صرف فراغت عن الحزب کے وقت دعاء کیا کرتے تھے، اور یہی منصوص بھی ہے، وسطِ قرأت یا تلاوت میں دعاء کرنا ثابت نہیں، لہذا گاہے گاہے تو مضائقہ نہیں، مگر اس پر مواظبت بدعت ہے، اور اگر مواظبت سے گذر کر اس کے خلاف سے مزاحمت ہونے لگے تو یقیناً یہ فعل ممنوع ہوگا، کیونکہ اصولِ شرع میں یہ بات متقرر ہو چکی ہے کہ امر مباح ومستحب بلکہ

سنت کو بھی اگر اس کی حد سے بڑھا دیا جائے اور اس کے تارک پر ملامت ہونے لگے تو ایسے وقت میں اس مباح یا مستحب یا سنت کا ترک عوام و خواص سب پر ضروری ہو جائے گا، ہذا واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ

ایک مسجد میں قرآن ختم کرنے کے بعد دوسری مسجد میں قرآن مجید سنانے کا حکم اور اس پر ایک شبہ کا جواب

**سوال (۸)** اس مسئلہ میں مدت سے شبہ ہے لہذا حضرت والا سے استفتاء کرتا ہوں، امید ہے کہ جواب سے تشفی خاطر فرمادینگے ایک حافظ قرآن نے رمضان کے عشرۂ اولیٰ میں ایک مسجد میں چند مقتدیوں کو ایک ختم لوجہ اللہ سنایا، پھر عشرۂ ثانیہ میں دوسری مسجد میں دوسرے مقتدیوں کو جنھوں نے ختم سنا نہیں ان کو دوسرا ختم سنایا، اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں بناء قوی علی الضعیف لازم آتا ہے، کیونکہ دوسرے مقتدیوں کو ایک ختم سننا سنتِ مؤکدہ ہے، اور حافظ صاحب کو دوسرا ختم سنانا مستحب ہے، یہ تو بندہ کا شبہ ہے، باقی جو حضرت کی مرضی ہو وہی صواب ہے؟

**الجواب:** بناء القوی علی الضعیف یہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز سے اضعف ہو اور یہاں ایسا نہیں، کیونکہ عشرۂ ثانیہ میں تراویح کی نماز امام و مقتدی دونوں پر علی السواء سنتِ مؤکدہ ہے، اس لئے یہ صورت جائز ہے، دوسرے یہ بھی مسلّم نہیں ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کی قرأت سے اس صورت میں اضعف ہے، کیونکہ گو نماز شروع کرنے سے پہلے تو امام پر قرأت واجب و سنت نہ تھی، بلکہ نفل تھی، لیکن نیت و افتتاحِ صلوٰۃ کے بعد اس پر قرأت بقدر صحت صلوٰۃ فرض ہو گئی، اور اب وہ جتنی بھی قرأت کرے گا، سب فرض میں داخل ہو گی، اگرچہ سارا قرآن ہی ایک نماز میں پڑھ جائے یہ سب فرض ہی میں داخل ہو گی، ۹ شعبان ۱۳۴۲ھ

فاسق امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھانے کا حکم اور اس کی تفصیل

**سوال (۹)** ........................ بعض بعض حفاظِ قرآن مجید بعد گذر جانے ماہِ رمضان المبارک کے تارک الصلوٰۃ ہو جاتے ہیں، اور بعض پنجوقتہ نمازیں سے ایک دو وقت کی نماز گاہے بگاہے ادا کرتے ہیں، یا ڈاڑھی بالکل منڈواتے ہیں، یا نہایت مبالغہ کے ساتھ کتر واتے ہیں کہ ایک انگشت کے برابر بھی نہیں چھوڑتے، جب ماہِ مبارک آتا ہے تو ایسے حافظ نماز تراویح میں امام بن کر کلام پاک سناتے ہیں تو ایسے حفاظ کے پیچھے نماز... یا تراویح ... پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تنزیہی ہے یا تحریمی، اور مکروہ تحریمی کی



۱۶

کسی آیت قرآنی یا حدیث صحیح سے تشریح فرمادیجئے، اور نیز مکرر یہ ہے کہ مرتکب مکروہ تحریمی کا گنہگار ہوتا ہے یا نہیں، اور نماز بکراہت تحریمی ادا کی ہوئی واجب الاعادہ ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

**الجواب:** اگر یہ لوگ رمضان میں گذشتہ گناہوں سے توبہ کرلیں اور نماز پنجوقتہ کی پابندی شروع کردیں، اور ڈاڑھی منڈانا یا کتروانا چھوڑ دیں تب تو ان کے پیچھے تراویح مکروہ نہیں، اور اگر رمضان میں بھی وہ اپنے افعال فسقیہ پر باقی ہوں تو ان کے پیچھے نماز مکروہ ہے، اور اس میں اختلاف ہے کہ کراہتِ تنزیہی ہے یا تحریمی، شرنبلالی اور زیلعی نے کراہتِ تحریمیہ کو ترجیح دی ہے، اور طحطاوی بھی اسی طرف مائل ہیں، باقی علماء نے تنزیہی کہا ہے، مگر یہ کراہت اُس وقت تک ہے جبکہ کوئی امام نیک دستیاب... ہو سکے، اور اگر بجز فاسق کے کوئی حافظ نہیں ملتا، تو اہلِ محلہ کو چاہئے کہ اس صورت میں ختمِ قرآن کی طمع نہ کریں، کسی ناظرہ خواں نیک آدمی کو امام بنا کر الم ترکیف سے تراویح ادا کرلیں، اگر اہلِ محلہ ایسا نہ کریں اور حافظ فاسق ہی کو امام بناویں تو پھر جو کچھ گناہ ہو گا، اوّل امام بنانے والوں کو ہوں گا، دوسرے لوگوں کو بلا کراہت اس کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے، مگر اپنے افعال و اقوال سے اس امام کی عظمت و تعظیم نہ کریں، اور اگر محلہ میں کوئی دوسری مسجد ایسی ہو جہاں نیک امام تراویح پڑھاتا ہو تو وہاں جاکر تراویح پڑھنا چاہئے، فاسق کے پیچھے نہ پڑھنا چاہئے، اور اگر نیک امام کوئی نہیں ملتا، نہ حافظ نہ ناظرہ خواں تو پھر فاسق کی اقتداء بلا کراہت جائز ہے، قال فی نور الایضاح وکرہ امامۃ العبد الیٰ قولہ وکرہ امامۃ الفاسق اھ قال الطحطاوی افاد الحموی ان کراھۃ الاقتداء بالعبد وما عطف علیہ تنزیھیۃ ان وجد غیرھم والا فلا اھ وسیاتی ما یفید ان امامۃ الفاسق مکروھۃ تحریما اھ ص ۱۷۵) قال فی نور الایضاح وکرہ امامۃ الفاسق العالم[ع] لعدم اھتمامہ بالدین فتجب اھانتہ شرعا فلا یعظم بتقدیمہ للامامۃ (قال الطحطاوی قولہ فتجب الخ تبع فیہ الزیلعی ومفادہ کون الکراھۃ فی الفاسق تحریمیۃ اھ) واذا تعذر منعہ ینتقل عنہ الیٰ غیر مسجدہ للجمعۃ وغیرھا وان لم یقم

[ع] قلت فامامۃ الفاسق الجاھل بالاولیٰ الوجود السببین للنع فیہ ۱۲ منہ

الجمعۃ الا ھو تصلی معہ اھ قال الطحطاوی وفی السراج ھل الافضل ان یصلی خلف ھؤلاء ام الانفراد قیل اما فی الفاسق فالصلوٰۃ خلفہ اولی وھذا انما یظھر علی ان امامتہ مکروھۃ تنزیھا اما علی القول بکراھۃ التحریم فلا واما الآخرون فیمکن ان یقال الانفراد اولی لجھلھم بشروط الصلوٰۃ ویمکن اجراءھم علی قیاس الصلوٰۃ خلف الفاسق وجزم فی البحر بان الاقتداء بھم افضل من الانفراد اھ (ص ۱۷۶) قلت بشرط ان لا یکون الامام لحانا یفسد الصلوٰۃ بلحنہ والا فالانفراد اولی بل ھو المتعین اذ لم یجد اماما غیرہ، واللہ اعلم،

تنبیہ: چونکہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہونے میں دو قول ہیں، ایک قول میں کراہت تنزیہی ہے دوسرے تحریمی ہے؛ اس لئے اس میں شر و فساد نہ بڑھانا چاہئے، اگر سہولت کے ساتھ ایسے امام سے علیحدگی ممکن ہو تو خیر ورنہ اگر فتنہ یا عداوت کا اندیشہ ہو تو اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، دوسرے امام کی طرف منتقل ہونے کی سعی نہ کریں، البتہ اگر امام فاسق ہونے کے ساتھ جاہل بھی ہو اور قرآن بھی غلط سلط پڑھتا ہو جس سے فسادِ نماز کا احتمال قوی ہو تو پھر اس کے پیچھے نماز نہ پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم، ۱۶ / رمضان ۴۲ھ

| نابالغ بچے کے پیچھے تراویح کا حکم اور اس سلسلہ میں ایک حدیث کا جواب | سوال (۱۰) ..................... |
|---|---|

... ایک لڑکا نابالغ حافظِ قرآن تراویح میں قرآن سنادے، اور پیش امام مقرر شدہ الم ترکیف سے پڑھانے والا حاضر ہے تو آیا امام مقرر شدہ کی حاضری میں لڑکے نابالغ حافظ کے پیچھے اقتدا، بالغ مقتدیوں کی جائز ہے یا نہیں، حالانکہ پیش امام مقرر شدہ کی ناراضگی بھی نہ ہو، اور نابالغ لڑکے کے پیچھے قرآن سنانے کی حالت میں تراویح بہتر ہے یا کہ پیش امام مقرر شدہ کے پیچھے الم ترکیف سے بہتر ہے، مفصل جواب آنا چاہئے؛ بالغ حافظ نہ ہونے کی وجہ سے ضرورۃً بھی نابالغ حافظ کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں؛ ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا ہے اور حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے، وہ پرچہ بھی ہمراہ اس سوال کے ہے، آیا یہ حدیث اس موقع پر ہے یا کہ اور موقع پر، اس کا خلاصہ فرماکر ارسال فرمادیں،

(نقل فتویٰ) نابالغ لڑکے کے پیچھے تراویح ہوتی ہے، جیسے حدیث محمد بن مقاتل



سے واضح ہوتا ہے، حدیث ھکذا ان امامۃ الصبی فی التراویح تجوز لان الحسن بن علی رضی اللہ عنھما کان یؤم عائشۃ رضی اللہ عنھا وکان صبیا حدیث کو ترجیح ہوتی ہے فقہ پر، اگر نفل نابالغ کے پیچھے ضعیف ہوتی تو عائشہ رض حضرت حسن بن علی رض کے پیچھے کیوں تراویح پڑھتیں، باقی غایۃ الاوطار والے کو حدیث مذکور نہیں ملی، اگر ملتی تو اختلاف بیان نہ کرتا، قاعدہ بناء قوی علی الضعیف یہاں پر معتبر نہیں، دیکھو تراویح میں اگر پیش امام باوجود قدرت کھڑے ہونے کے بیٹھا ہو اور مقتدی کھڑے ہوں تو ثواب تراویح میں کچھ فرق نہیں آتا، حالانکہ بناء قوی علی الضعیف پائی جاتی ہے، قاعدہ کا ثواب نصف ہی قائم ہے،

الجواب: نابالغ کی اقتدا، نہ فرض میں جائز ہے نہ نفل میں، نہ تراویح میں، پس مقتدیوں کو لازم ہے کہ جب بالغ حافظ نہ ہو تو الم ترکیف ہی سے تراویح کسی ناظرہ خواں بالغ کے پیچھے پڑھ لیں نابالغ حافظ کے پیچھے نہ پڑھیں، ہذا ہو الصحیح المفتی بہ وما جوزہ مشایخ بلخ ضعیف لا یلتفت الیہ واللہ اعلم، اور ایک جواب جو دوسرے پرچہ پر لکھا ہوا ہے، جس میں حدیث محمد بن قاتل سے نابالغ کی امامت کو جائز کیا گیا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال ہے کہ یہ حدیث محمد بن مقاتل کس کتاب میں ہے اور اس کی سند کیسی ہے، جب تک سند حدیث معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ قابلِ احتجاج نہیں، اور امامت نابالغ کی ممانعت نصوصِ صریحہ سے ثابت ہے، قال صلی اللہ علیہ وسلم الامام ضامن والمؤذن مؤتمن اخرجہ البزار ورجالہ موثقون واخرجہ الطبرانی الامام ضامن فما صنع فاصنعوا واسنادہ حسن (اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۳۴) وظاھر ان الضامن لابد ان یکون اقوی من المضمون لہ وقال صلی اللہ علیہ وسلم ولیؤمکما اکبرکما اخرجہ الشیخان وعن ابن مسعود قال لا یؤم الغلام حتی تجب علیہ الحدود وعن ابن عباس قال لا یؤم الغلام حتی یحتلم رواھما الاثرم فی سننہ کذا فی النیل (ص ۳۴۳ ج ۳) والاثران لیسا بانزل من الحسن والا لما سکت عنھما الشوکانی واللہ اعلم، پس ان نصوص کے ہوتے ہوئے نابالغ کی امامت جائز نہیں ہو سکتی، ۱۹ / رمضان ۴۲ھ

| تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں امام عاصم کی تقلید کی جائے یا امام ابو حنیفہ رح کی؟ | سوال (۱۱) ..................... |
|---|---|

............ نماز تراویح میں بسم اللہ شریف امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک سراً یا جہراً ہر سورۃ

کے شروع میں پڑھنا جائز ہے یا ناجائز، یا تمام قرآن شریف میں امام موصوف کے نزدیک صرف ایک ہی مرتبہ پڑھنا سراً یا جہراً کافی ہے، پھر ان میں کونسا عمل امام موصوف کے نزدیک اَولیٰ ہے، اور نماز تراویح میں قاری کو کس امام یا راوی کی تقلید ضروری ہے، اور اگر نماز تراویح میں قرآن کے اندر قاری امام ابوحنیفہ صاحبؒ کی تقلید کرے تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن تو پڑھا جاتا ہے راوی حفصؒ کی روایت میں پھر امام موصوف کی تقلید کس طرح کرے گا، اور کیونکہ امام صاحبؒ کی تقلید کے موافق یعنی ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ شریف نہ پڑھی جائے تو حفصؒ کی روایت کے مطابق قرآن مجید پورا نہیں ہوتا، کیونکہ بسم اللہ شریف کو آپ نے ہر سورۃ کا جزء فرمایا ہے، لہذا نماز تراویح میں قاری کو ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور کس کی تقلید ضروری ہوگی؟ بینوا توجروا۔

**الجواب**: امام عاصمؒ یا حفص کی تقلید صرف قرآن کی تلاوت اور وجوہِ قرأت میں کی جاتی ہے، باقی احکامِ صلوٰۃ میں ان کی تقلید نہ ہوگی، بلکہ اس میں فقہاء کی تقلید ہوگی، سو ابوحنیفہؒ کے نزدیک بسم اللہ صرف ایک مرتبہ پڑھنا ختمِ قرآن کے لئے ضروری ہے اگر ایک دفعہ کسی سورۃ پر بسم اللہ پڑھ دی گئی تو قرآن پورا ہوگیا، اور بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ تراویح میں اس آیت کو جہراً پڑھا جائے، جیسا کہ تراویح میں سارا قرآن جہر سے پڑھا جاتا ہے، اگر امام کسی جگہ بھی بسم اللہ کو جہر سے نہ پڑھے، بلکہ کسی ایک جگہ سراً پڑھ لے تو امام کا ختم تو پورا ہوجائے گا، لیکن سامعین کے ختم میں ایک آیت کی کمی رہے گی، باقی سب سورتوں کے اول میں بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا امام صاحبؒ کے نزدیک مکروہ ہے، اور ہر سورۃ کے اول میں سراً پڑھنا جائز ہے، بلکہ اگر مقتدیوں پر تطویل کا خوف نہ ہو تو مستحب ہے، واللہ اعلم، ۲ر جمادی الاولیٰ ۴۵ھ

**سوال** (۱۲) ............ یہاں کے پیش امام نماز تراویح میں چار رکعت و دس رکعت کے بعد تمام جماعت کو مع امام مسجد کے برآمدے میں بلاکر چائے پلواتے ہیں، اور جب ان کو کہا گیا کہ یہ فعل اچھا نہیں ہے، تو یہ جواب دیتے ہیں کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ایسا ہی ہوتا ہے، اور کتاب شامی اور درمختار میں یہ مسئلہ موجود ہے، علمائے کرام سے ہم مسلمانوں کی التجا ہے کہ اگر یہ فعل واقعی جائز ہے تو بھی اور اگر ناجائز

| |
|---|
| تراویح کے ترویحہ میں تمام جماعت کو چائے وغیرہ پلوانا خلاف سنت و بدعت ہے |



ہو تو بھی مع سند و مہر کے فی سبیل اللہ لکھ کر روانہ فرماویں نماز تراویح سے چھوٹی چھوٹی سورۃ سے پڑھی جاتی تھی،

**الجواب**: قال فی الدر یجلس ندبا بین کل اربعۃ (الاوضح قول الکنز بعد کل اربعۃ ۱۲ ش) بقدرھا وکذا بین الخامسۃ والوتر (والاستراحۃ علی خمس تسلیمات اختلف المشایخ فیہ واکثرھم علی انہ لا یستحب وھو الصحیح اھ مرادہ بخمس تسلیمات خمس اشفاع ای علی الرکعۃ العاشرۃ کما فسر بہ فی شرح المنیۃ ۱۲ ش) ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادیٰ (وفی النھر واما الصلوٰۃ فقیل مکروھۃ وقیل سنۃ وھو ظاھر ما فی السراج واھل مکۃ یطوفون واھل المدینۃ یصلون اربعا اھ ۱۲ ش) ص ۳۸، و ۳۹ ج ۱

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ چار رکعت کے بعد تراویح میں قدرے استراحت و انتظار مستحب ہے، جس میں تسبیح و قراءت و سکوت کا اختیار دیا گیا ہے، اور بعض نے منفرداً نماز پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے، اور بعض نے اس سے منع کیا ہے، لیکن کھانے پینے کا اختیار کسی نے نہیں دیا، اس لئے اکل و شرب کو اس جلسہ میں معمول قرار دے لینا یقیناً بدعت ہے، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ کسی نمازی کو پیاس لگے تو وہ بوقت جلسہ پانی پی لے یا کوئی شخص کبھی ضرورت کی وجہ سے چائے پی لے، لیکن اس جلسہ کو چاء نوشی کا جلسہ قرار دے لینا کہ سب نمازی مع امام کے چاء نوشی میں مشغول ہوجائیں، خلاف سنت اور طریقۂ بدعت ہے، اور اہل مکہ و مدینہ کا فعل زمانۂ خیریت میں تو بوقت جلسہ ترویحہ طواف و صلوٰۃ تھا، اگر اس زمانہ شر میں یہ معمول بدل گیا ہو تو ہمیں اس کا علم نہیں، اور نہ اُن کا یہ فعل حجت ہے، واللہ اعلم، ۲۲ر شوال ۴۴ھ

**سوال** (۱۳) تراویح میں جبکہ ہر چہار رکعت کے بعد آرام کے لئے بیٹھتے ہیں امام کو کس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، یعنی امام کو قبلہ رُخ بیٹھکر آرام لینا چاہئے، یا کہ فجر عصر کی فرض نماز کے بعد امام مقتدیوں کی طرف مُنہ کرکے بیٹھتا ہے اس ہیئت سے بیٹھنا چاہئے، سنت کے مطابق بہتر طریقہ ارشاد فرماویں،

| |
|---|
| نماز تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد امام کس ہیئت سے بیٹھے؟ |

**الجواب**: تراویح کے درمیان بیٹھنے کی کوئی خاص کیفیت منقول نہیں ہے، مگر فقہاء کے قول سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام کو تھوڑی دیر بیٹھنا ہو جتنی دیر بعد نماز کے دعا کرنے میں عموماً ہوتی ہے تو اتنی دیر نمازیوں کی طرف پشت کرکے بیٹھنے کا مضائقہ نہیں،

اور اگر اس سے زیادہ دیر بیٹھنا ہو تو دائیں یا بائیں انحراف کرکے بیٹھنا چاہئے، واللہ اعلم
قال الحافظ ویحتمل ان قصر زمان ذلک ان یستمر مستقبلا للقبلة من اجل انها الیق بالدعاء ویحتمل الاول علی مالو طال الذکر والدعاء، واللہ اعلم اھ
(ص ۲۷۰ ج ۲ فتح الباری) قلت وقواعدنا لاتاباہ فقط
الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۵ ذی القعدہ ۴۳ھ، عبد الکریم عفی عنہ ۵ ذی قعدہ ۴۳ھ

نماز تراویح میں دو دو رکعت افضل ہیں یا چار چار رکعت،

**سوال** (۱۴) حضور نے بہشتی زیور کے دوسرے حصہ میں تحریر فرمایا ہے کہ تراویح کی نماز اگر دو دو رکعت یا چار چار رکعت کی نیت باندھے دونوں طرح جائز ہے، لیکن کوئی عالم کہتا ہے کہ عرب سے عجم تک کوئی دیار میں نہیں دیکھا جاتا ہے، لہذا چار رکعت کی نیت ترک کرکے دو دو رکعت کی نیت کرنا افضل ہے اور چار رکعت کی نیت کرنا مکروہ کس کتاب میں اس کی دلیل ہے، اطلاع فرماویں؟

**الجواب**: فی البدائع (ص ۲۸۹ ج ۱) ومنها رای من السنن) یصلی کل رکعتین بتسلیمة علیحدة ولو صلی ترویحة بتسلیمة واحدة وقعد فی الثانیة قدر التشهد لاشک انه یجوز علی اصل اصحابنا ان صلوات کثیرة تتادی بتحریمة واحدة بناء علی ان التحریمة شرط ولیست برکن عندنا خلافا للشافعیؒ لکن اختلف المشایخ انه هل یجوز عن تسلیمتین اولا یجوز الاعن تسلیمة واحدة قال بعضهم لایجوز الاعن تسلیمة واحدة لانه خالف سنته المتوارثة بترک التسلیمة والتحریمة والثناء والتعوذ والتسمیة فلایجوز الاعن تسلیمة واحدة وقال عامتهم انه یجوز عن تسلیمتین وهو الصحیح اھ،
وفی نور الایضاح وتنویر الابصار وهی عشرون رکعة بعشر تسلیمات وفی السراجیة کل ترویحة اربع رکعات بتسلیمتین وفی الوقایة والقدوری لکل ترویحة تسلیمتان وفی بحر الرائق (ص ۶۷ ج ۲ مثل ما فی البدائع ....
وفی البحر ایضا (ص ۷۵ ج ۲) وفی المحیط وانما اخترنا فی التراویح مثنی مثنی لانها تؤدی بالجماعة واداؤها علی الناس مثنی مثنی اخف والیه وفی ....... فتح القدیر تحت قول الهدایة (ولهما الاعتبار بالتراویح) فان الاجماع علی الفصل فیها وفی العنایة تحت قول الهدایة (والتراویح



تؤدی بجماعة) جواب عن اعتبارها بالتراویح فیراعی فیها جهة التیسیر بالقطع بالتسلیم عن رأس الرکعتین لان ما کان ادوم تحریمة کان اشق علی الناس اھ فتح القدیر (ص ۳۹۲ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ تراویح میں دو دو رکعت پڑھنا سنت ہے، لیکن چار چار پڑھنا بھی بناء بر مذہب صحیح جائز ہے، گو خلاف متوارث ہونے کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہو، البتہ بحر الرائق وہدایہ کی تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم یعنی دو دو کا افضل ہونا جماعت کے ساتھ خاص ہے، پس ممکن ہے کہ منفرد کے لئے اصل قاعدہ یعنی امام صاحبؒ کے نزدیک چار چار نوافل افضل ہونے کی بناء پر تراویح بھی چار چار افضل یا کم از کم مساوی ہوں (وفیه ان الحکم لاینتفی بانتفاء التعلیل فابقاء الروایة علی العموم اولی للتوارث ویمکن ان یجاب بان التوارث ثابت فی الجماعة واما اذا صلی منفردا فلا دلیل علی توارثه فافهم[عه]) اور بہشتی زیور کی مخاطب مستورات ہیں، جو نماز تنہا پڑھتی ہیں، اس لئے بہشتی زیور پر شبہ نہ کیا جاوے، ونیز بہشتی زیور کی عبارت یہ ہے (چاہے دو دو رکعت کی نیت باندھے چاہے چار چار رکعت کی) اور اس میں یہ تصریح نہیں کہ دونوں فضل میں مساوی ہیں، بلکہ دونوں کے جواز پر بھی یہ عبارت محمول ہو سکتی ہے، فلا اشکال علیہ باتی حال،

جماعتِ ثانیہ تراویح کی ایک صورت

**سوال** (۱۵) ہمارے یہاں رمضان المبارک کے شروع سے یہ طریقہ ہو رہا ہے کہ ایک قرآن شریف بعد نمازِ عشاء تراویح میں سنایا جا رہا ہے، اور سامع جو کلام مجید سنتا ہے اپنی چار رکعت تراویح باقی رکھ لیتا ہے، یعنی امام کے ساتھ سولہ رکعت تراویح پڑھتا ہے، بقیہ چار رکعت تراویح اسی مسجد میں امام ہو کر جس میں ایک یا دو پارہ سناتا ہے پوری کرتے ہیں، مقتدی کل تراویح بعد نماز عشاء ختم کر لیتے ہیں، جو مقتدی سننے کے شائق ہیں اُن کو گھر جا کر جگانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے، جو قریب ۱۴، ۱۵ کے ہو جاتے ہیں، ان مقتدیوں میں بعض کی نیت نفل نماز کی اور بعض کی

---

[عه] اشارة الی ان لقائل ان یقول ان الثابت امران اداء التراویح بالجماعة واداءه مثنی مثنی ولا یتوقف سنیته احدهما علی الآخر ۱۲ منه

تہجد کی ہوتی ہے، ایسی صورت میں یہ جماعت بلاکراہت جائز ہے یا نہیں، اگر نہیں تو اور کونسی صورت درست ہونے کی ہو سکتی ہے؟

**الجواب**: جیساکہ وہ حافظ صاحب، چار رکعت تراویح میں شامل نہیں ہوتے اسی طرح وہ مقتدی بھی چار رکعت میں شامل نہ ہوا کریں، اور پھر چار رکعت جماعت سے پڑھ لیں، کما ہو الظاہر، لیکن احتیاطاً جگہ بدل دیں، یعنی جہاں پہلی جماعت ہوئی تھی اس جگہ سے الگ پڑھ لیں، کما سیأتی، اور پھر اس تراویح کی جماعت میں کچھ مقتدی نفل پڑھنے والے بھی شامل ہو جائیں تو مضائقہ نہیں، لانہ اقتداء المتطوع بمن یصلی السنۃ وانہ جائز الخ، بدائع ص ۲۰۹ ج ۱)

کیا ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت مکروہ ہے؟

**سوال** (۱۶) ایک مسجد میں دو مرتبہ تراویح کی جماعت مکروہ ہے؟

**الجواب**: تراویح کے تکرار فی المسجد کے متعلق کوئی جزئیہ نہیں ملا، دوسری جگہ تحقیق کر لیا جاوے، محض رکن الدین پر اعتماد نہ کیا جاوے، البتہ مزید احتیاط کی بناء پر جگہ بدل لیا کریں، تاکہ تکرار مکروہ ہونے کی صورت میں بھی کراہت مرتفع ہو جاوے، اور باوجود تبدیل ہیئت تکرار جماعت فرض تو مکروہ ہے، لیکن تراویح میں بناء بر قول ابو یوسفؒ تبدل ہیئت سے تکرار مکروہ نہ رہے گا، عن ابی یوسفؒ انہ اذا لم تکن الجماعۃ علی الھیئۃ الاولیٰ لا تکرہ والا تکرہ وھو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ کذا فی البزازیۃ اھ (شامی ص ۵۷۸ ج ۱) اور امام ابو یوسفؒ کا قول مذکور گو عام ہے لیکن فرائض میں اس پر فتویٰ نہیں دیا جاتا، اور تراویح میں فرائض سے توسع ہے اس لئے تراویح میں اس پر عمل کی گنجائش ہے، اور یہ کلام اس تکرار میں ہے جو امام آخر اور مقتدین آخرین کے ساتھ ہو، اور اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی ہی تکرار کریں تو وہ مطلقاً مکروہ ہے، خواہ مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں، ہو صرح بہ فی البدائع (ص ۲۰۹ ج ۱) عبدالکریم عفی عنہ، ۸ رمضان ۴۶ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ

بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ متعلق تقدیم وتر علی التراویح پر شبہ کا جواب۔

**سوال** (۱۷) بہشتی گوہر ص ۳۹ میں تراویح کا بیان مطالعہ کر رہا تھا، وقت تراویح کے متعلق یہ عبارت دیکھی گئی کہ وتر کا بعد تراویح کے پڑھنا بہتر ہے، اگر پہلے پڑھ لے تب بھی درست ہے (مراقی الفلاح ص ۲۴۰) اس سے مجھے شبہ پیدا ہوا، اس لئے کہ میرے علم میں اس کے برعکس ہے، یعنی وتر کا پہلے تراویح سے پڑھنا بہتر ہے، اگر بعد کو پڑھے تب بھی درست ہے، لیکن چونکہ حوالہ موجود تھا، خیال ہوا ممکن ہے کہ میری ہی معلومات غلط ہوں، دفع شبہ کے لئے مراقی الفلاح



نکالی گئی اس میں یہ عبارت ملی ہے کہ (وقتہا) ما (بعد صلوٰۃ العشاء) علی الصحیح الی طلوع الفجر (و) لتبعیتہا للعشاء (یصح تقدیم الوتر علی التراویح وتاخیرہ عنہا) وھو افضل الخ پھر حاشیہ طحطاوی میں لکھتے ہیں کہ (قولہ ویصح تقدیم الوتر علی التراویح الخ) وقیل وقتہا بعد العشاء وقبل الوتر وبہ قال عامۃ المشائخ بخاریٰ،

اس سے میری معلومات کی تائید ہوتی ہے، تاہم چونکہ میں ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں کہ ارجاع ضمیر میں غلطی ہو، بنابریں آپ سے درخواست ہے کہ مراقی الفلاح کی عبارت کا وہی مطلب ہے جو بہشتی گوہر میں مندرج ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو معلوم کروں گا کہ یہ کاتب ہی کی غلطی ہے، صحیح کر لیا جائے گا، انشاء اللہ، اور اگر بہشتی گوہر کی عبارت کی تائید کرتا ہو، تو میں اپنے کو اس شبہ سے بچا لوں گا،

**الجواب**: بہشتی گوہر کا مسئلہ درست ہے، مراقی الفلاح میں وھو افضل کا مرجع تاخیرہ عنہا ہے، اور طحطاوی میں قول مشائخ بخاریٰ لبعد العشاء وقبل الوتر کو قیل سے تعبیر کرنا خود اس کے ضعف کی علامت ہے، فافہم، ۲۷ رجب ۴۶ھ

جماعت ثانیہ تراویح کی ایک صورت کا حکم

**سوال** (۱۷) یہاں پر تین چار سال سے متواتر رمضان شریف میں بعد نصف شب کے اس طرح سے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے کہ امام جو بعد نصف شب کے قرآن شریف سناتا ہے، اول شب کی تراویح میں بجائے بیس رکعت کے ۱۶ رکعت پڑھتا ہے، چار رکعت تراویح میں بعد نصف شب قرآن شریف سناتا ہے، لیکن کُل مقتدی تہجد کی نیت باندھتے ہیں، جن کی تعداد دس پندرہ کے قریب ہوتی ہے، اور ان میں سے بعض بعض کو بلانا اور جگانا بھی پڑتا ہے، کیونکہ اس جماعت میں جواز کی صورت تھی، اس لئے یہ عمل دوسرے قرآن شریف کا ثواب حاصل کرنیکے واسطے کیا جاتا تھا، کیونکہ تنہا پڑھا نہیں جاتا، اگر ایسا نہ کیا تو اس ثواب سے محروم رہیں گے، لیکن اس کے ساتھ حسب ذیل مفسدات بھی نظر آتے ہیں، یہ جماعت اس نام سے موسوم ہے کہ (تہجد میں قرآن شریف ہوتا ہے) دوسری مسجد والوں نے ہماری جماعت دیکھ کر تہجد کی نوافل میں جماعت شروع کر دی، جو مکروہ تحریمی ہے، یہ غلط فہمی جماعت مذکورہ بالا کی وجہ سے ہوئی، دوم ایک ہی مسجد میں ایک پوری جماعت تراویح کی ہو کر دوسری جماعت تراویح کی ہوئی، اور مقتدیوں میں کوئی تراویح پڑھنے والا نہیں ہوتا جو امور مختلف فیہ میں سے ہے،

سوئم جو مقتدی اخیر شب کو قرآن شریف سنتے ہیں، اور رات کو زیادہ جاگنے کے عادی نہیں ہیں ان کو جگایا جاتا ہے، بعض کی صبح کی نماز یا صرف جماعت جاتی رہتی ہے، ممکن ہے اس جماعت کی وجہ سے صبح کی نماز یا جماعت فوت ہوئی ہو، چہارم قصداً بیس رکعت ایک ساتھ نہیں پڑھی بلکہ سولہ رکعت اور چار رکعت کے درمیان وقفہ دیا گیا، پنجم جہاں تک خیال ہے سلف میں بھی ایسا عمل نہ ہوا ہوگا، ایسی صورتوں کا خیال کرتے ہوئے کہ مفسدات بھی نظر آتے ہیں اور پابندی کے ساتھ کئی سال سے جماعت ہو رہی ہے، جناب والا سے گذارش ہے کہ جناب ایسی جماعت کے واسطے اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟

**الجواب:** قال الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح وکرہ ان یؤم فی التراویح مرتین فی لیلۃ واحدۃ وعلیہ الفتوی لان السنۃ لا تتکرر فی الوقت الواحد فتقع الثانیۃ نفلاً مضمرات بخلاف ما لو صلاھا ماموما مرتین حیث لا یکرہ کما لو ام فیھا ثم اقتدی بآخر فی تلک الصلوٰۃ وکما لو صلی العشاء اماما او مقتدیا ثم اقیمت ثانیا فانہ لا یکرہ لہ ان یدخل فیھا ثانیا بل یستحب لہ اھ (ص ۲۳۹) یہ صورت عمل فی نفسہ تو جائز تھی، جیسا کہ عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا، مگر ان مفاسد کے انضمام سے جو سوال میں ہیں کہ عوام اس کو جماعت تراویح نہیں بلکہ جماعت تہجد سمجھتے ہیں، اور دوسرے لوگوں نے اس کو دیکھ کر جماعت نوافل محضہ بھی شروع کر دی، یہ قابل ترک بلکہ واجب الترک ہے، فان المباح والمستحب اذا ادی الی مفسدۃ یجب ترکہ صرح بہ الفقہاء قاطبۃ، واللہ اعلم، غرہ رمضان ۴۵ھ

تراویح کی بیس رکعت ہونے کے دلائل

**سوال (۱۹)** رمضان کی بیس تراویح کی اصل حدیث سے تحریر فرمائیں، اور ایک حدیث سے نہیں بلکہ کئی ایک حدیثیں تحریر فرما دیں، کیونکہ اس جگہ پر آٹھ تراویح پڑھی جاتی ہیں، ان کو بیس تراویح کا ثبوت اور یقین دلانا بھی ضروری ہے اور اس کے اندر اور بات خیال نہ فرما دیں،

**الجواب:** عن[1] یزید بن حفیفۃ عن السائب بن یزید رضی اللہ عنہ قال کانوا یقومون علی عھد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فی شھر رمضان بعشرین رکعۃ، رواہ البیہقی واسنادہ صحیح، وعن[2] یزید بن رومان انہ قال کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ رواہ النسائی رواہ



مالک واسنادہ مرسل قوی، وعن[۳] عبد العزیز بن رفیع قال کان ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدینۃ عشرین رکعۃ ویوتر بثلث اخرجہ ابو بکر بن ابی شیبۃ فی مصنفہ واسنادہ مرسل قوی اھ من آثار السنن للنیموی ص ۵۵ ج ۲، ان سب احادیث سے تراویح کی بیس رکعات کا ثبوت ظاہر ہے اور آثار السنن میں ان کے علاوہ اور بھی بہت احادیث مذکور ہیں، اور اگر ان احادیث میں حضور کا عمل مذکور نہیں بلکہ صحابہ کا عمل مذکور ہے، مگر ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے متبع تھے، پس ان کا ایسا عمل جس پر بعد میں سب نے اتفاق کر لیا ہو یقیناً حجت ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پاس اس عمل کی کوئی دلیل ضرور موجود تھی، قال ابن قدامۃ فی المغنی ولنا ان عمر رضی اللہ عنہ لما جمع الناس علی ابی ابن کعب کان یصلی لھم عشرین رکعۃ وعن علی انہ امر رجلاً یصلی بھم فی رمضان عشرین رکعۃ وھذا کالاجماع الی ان قال ما فعل عمر واجمع علیہ الصحابۃ فی عصرہ اولی بالاتباع اھ (ص ۸۰۳ ج ۱)

پس ان آثار موقوفہ سے اس حدیث مرفوع کی تقویت ہوگئی جس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے، حدثنا یزید بن ھارون قال انا ابراھیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر اھ (من آثار السنن ص ۵۶ ج ۲) وابراھیم بن عثمان جد الامام ابی بکر بن ابی شیبۃ ضعیف، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بنفس نفیس بیس رکعت پڑھنا معلوم ہوا، مگر اس میں صرف ایک راوی ضعیف ہے جس کا ضعف آثار قویہ مذکورۂ سابقہ سے منجبر ہوگیا، واللہ اعلم، ۲۲ رمضان شریف ۴۵ھ

المفاتیح لابواب التراویح
بجواب اشتہار
التحقیق فی اعداد التراویح

**سوال (۲۰)** بعد الحمد والصلوٰۃ، غیر مقلدین کی طرف سے ایک اشتہار[ع] شائع ہوا ہے، جس میں تراویح کی گیارہ[۱] رکعت کے سنت ہونے پر زور دیا گیا ہے، اور بیس[۲] رکعات کی سنیت سے انکار کیا گیا ہے، اور ستم ظریفی دیکھو کہ حاشیہ اشتہار میں حنفیہ کو

ع اشتہار کا عنوان "التحقیق فی اعداد التراویح" تھا، اور مشتہر کا نام حافظ محمد عمر ٹھیکہ دار لوہا منڈی اکبرآباد لکھا ہوا تھا، یہ بوالعجبی دیکھئے کہ ٹھیکہ دار بھی مجتہد بننے کا دعوی کرتے ہیں، کیونکہ حدیث سے ایک مسئلہ کو ثابت کرنا اور دوسرے عالموں کے مسئلہ کو رد کرنا مجتہد ہی کا تو کام ہے ۱۲ منہ

اعلان دیا ہے کہ جو کوئی حدیث صحیح جو اپنے معنی میں صریح ہو پیش کردے اس کو دس روپیہ انعام فی حدیث دیا جائے گا"

اس کے جواب میں مجھے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پہلے جماعت غیر مقلدین "حدیث صحیح" کی تعریف کسی حدیث ہی سے بیان کردیں، اور حدیث رسول ہی سے یہ ثابت کریں کہ حدیث حسن اور ضعیف و مرسل و معضل و معلل و شاذ و منکر و مدلس وغیرہ کی یہ تعریف ہے، اور ان میں سے فلاں قابلِ قبول ہے اور فلاں قابلِ قبول نہیں، بلکہ قابلِ رد ہے، تو ہم اُن کو فی حدیث مرفوع بجائے دس کے دہ چند دینے کو تیار ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قولِ صریح سے ان امور کو ثابت نہ کرسکیں تو پھر وہ ہم کو بتلائیں کہ "حدیث صحیح" کے معنی جو کچھ بھی اُن کے نزدیک ہیں انھوں نے کہاں سے اخذ کئے، کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے تو یقیناً ماخوذ نہیں، پھر کہیں قیاس و اجماع سے تو ماخوذ نہیں، جس سے غیر مقلدین کوسوں دُور بھاگتے ہیں، اگر قیاس و اجماع سے ماخوذ ہے تو براہِ کرم یہ بھی بتلادیں کہ قیاس و اجماع صحابہ کا ہے یا تابعین کا، اور تابعین میں سے فقہاء کا ہے یا محدثین کا یا دونوں کا، اور یہ کہ فقہاء یا محدثین کا قیاس و اجماع غیر مقلدوں کے نزدیک اس بارے میں حجت کیونکر ہوگیا، جن کے یہاں تقلیدِ علماء شرک ہے، کیا براہِ عنایت وہ کسی آیت یا حدیث سے یہ ثابت کریں گے کہ حدیث کی تعریف و تصحیح و تضعیف وغیرہ میں فقہاء یا محدثین کا قیاس و اجماع حجت ہے، اور اس کی تقلید حنفیہ اور غیر مقلدین سب پر فرض ہے، اور باقی مسائل میں تقلید حرام اور شرک ہے، جب تک جماعت غیر مقلدین ان سب مسائل کو حدیث ہی سے ثابت نہ کردیں اُس وقت تک اُن کو کسی مسئلہ میں نہ خود حدیث صحیح پیش کرنے کا حق ہے نہ حنفیہ سے مطالبہ کا حق ہے، کیونکہ جو حدیث وہ پیش کریں گے ہم کو ان سے اس سوال کا حق ہے کہ اس حدیث کا صحیح ہونا ... کتاب اللہ سے معلوم ہوا یا سنتِ رسول سے یا قیاس سے یا اجماع سے، الی آخر السوالات التی ذکرناہا،

نیز ہم کو یہ بھی سوال کرنے کا حق ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ قبولِ حدیث و ردِ حدیث میں بخاری و مسلم و ترمذی و احمد وغیرہ کی تقلید تو حجت اور واجب یا جائز ہو، اور فہم معانی حدیث میں ابوحنیفہ و مالک و شافعی رحمہم اللہ کی تقلید ناجائز و حرام ہو، کما ہو زعم الطائفۃ الغیر المقلدین،



اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ غیر مقلد مشتہر نے جس قدر حدیثیں اپنے اشتہار میں گیارہ رکعت تراویح کے متعلق درج کی ہیں، اور ان کی صحت کا دعوی کیا ہے اس نے اپنے اس دعوے کی صحت پر کوئی دلیل کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ سے قائم نہیں کی، پھر وہ کیونکر ان کو صحیح کہتا اور اُن کے تسلیم کو ہم پر لازم بتاتا ہے، اور اگر اقوالِ علماء سے اُن کی صحت ثابت کرنے کا مدعی ہے، تو وہ اُن علماء کا نام لے جنھوں نے اُن کو صحیح کہا ہے، اور بتلائے کہ اس معاملہ میں وہ ان کی تقلید کیوں کرنے لگا، نیز ہم کو ان کی تقلید پر کس دلیل سے مجبور کرسکتا ہے

اب میں اس کی پیش کردہ احادیث کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، اس نے سب سے پہلے بخاری و مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہ رض کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے اھ

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر مقلد کو صلوٰۃ اللیل کی کیفیت و کمیت کے متعلق حضرت عائشہ رض کی تمام روایات کو دیکھنا چاہئے تھا، جو بخاری و مسلم و سننِ اربعہ میں مذکور ہیں، اگر وہ سب روایتوں کو دیکھ لیتا تو ہرگز اس کو دلیل میں پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، کیونکہ حضرت عائشہ رض سے کسی روایت میں تو یہ منقول ہے کہ آپ گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے، نہ رمضان میں نہ رمضان کے علاوہ، اور بعض روایات میں بخاری کی یہ ہے کہ آپ تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، اور بعض روایاتِ مسلم میں یہ ہے کہ آپ وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر بھی پڑھتے تھے، تو کل مقدار رکعات پندرہ ہوئیں، اور بعض روایات سے سترہ رکعتوں کا ثبوت ہوتا ہے، اسی لئے امام قرطبی شارح مسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رض کی روایات میں بہت سے اہلِ علم کو اشکال و خلجان ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے ان کی حدیث کو مضطرب کہا ہے، دیکھو فتح الباری (ص ۷، ج ۳) قال القرطبی اشکلت روایات عائشۃ علی کثیر من اہل العلم حتی نسب بعضہم حدیثہا الی الاضطراب اھ

اور جس نے اصولِ حدیث پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ حدیثِ مضطرب سے استدلال و احتجاج صحیح نہیں، جب تک اضطراب رفع نہ ہو، پس اول غیر مقلد مشتہر اس حدیث کے اضطراب کو رفع کرے، اس کے بعد اس سے احتجاج کرے اور اضطراب کو رفع کرتے ہوئے یہ بھی سوچ لے کہ حنفیہ پر اس کی بیان کردہ تاویل و تقریر حجت نہ ہوگی، ممکن ہے

کہ وہ کسی دوسری تقریر سے اضطراب کو رفع کریں، نیز یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہ رض کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اور دنوں سے زیادہ عبادت کرتے تھے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ ہی رکعتیں پڑھتے ہوں، اور یہ احادیث ہم آئندہ بیان کریں گے،

اس کے بعد اس نے صحیح ابن خزیمہ وابن حبان کے حوالہ سے حضرت جابر رض کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو رمضان میں آٹھ رکعت نماز اور وتر پڑھائی اھ" اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے غیر مقلد کو شرمانا چاہئے، کیونکہ ابتک لوگ تراویح کی جماعت کو سنتِ نبویہ نہ کہتے تھے، بلکہ الگ الگ تراویح پڑھنے کو سنتِ نبویہ اور جماعتِ تراویح کو سنتِ عمر یہ کہتے تھے، اب وہ وقت آگیا کہ غیر مقلدین بھی جماعت تراویح کو سنتِ نبویہ ماننے لگے، صرف عدد میں اختلاف رہ گیا، سو انشاء اللہ کچھ دنوں میں یہ اختلاف بھی رفع ہو جائے گا،

اب سنئے کہ اس حدیث سے غیر مقلد نے بیس رکعت تراویح کی نفی پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس سے بیس۲۰ کی نفی کسی طرح بھی نہیں ہوئی، کیونکہ ایک عدد کا ثبوت دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں، البتہ اگر غیر مقلد اس بات کو ثابت کر دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی ہر رات میں تراویح کی جماعت کا اہتمام کرتے تھے، اور صحابہ کو عام طور پر اس کی اطلاع تھی، اور حضرت جابر رض تراویح کی جماعت میں شروع سے آخر تک شریک تھے، تو بیشک اس سے بیس رکعت کی نفی ہو جائے گی، ورنہ یہ احتمال باقی رہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ تراویح آٹھ رکعت سے زیادہ پڑھی ہوگی، اور صحابہ کو بوجہ خوف فرضیت کے جمع نہیں کیا، اور اس لئے عام طور پر سب کو اطلاع نہیں کی، پھر کیفما اتفق جس کو جس وقت خبر ملی آکر شریک ہو گیا، منجملہ ان کے حضرت جابر رض بھی تھے جن کو آٹھ رکعت ملی، اور اس احتمال کی تائید حضرت عائشہ رض کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری (صفحہ ۱۵۲ ج ۱) میں مذکور ہے، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی ذات لیلۃ فی المسجد فصلی بصلوتہ ناس ثم صلی القابلۃ فکثر الناس ثم اجتمعوا من الثالثۃ فلم یخرج الیھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال لم یمنعنی من الخروج الیکم الا انی خشیت ان یفرض علیکم الحدیث



اس کے بعد غیر مقلد مشتہر نے امام محمد مروزی کے قیام اللیل سے حضرت جابر رض کی یہ حدیث بلا سند نقل کی ہے کہ "حضرت ابی بن کعب رض صحابی رمضان میں آپ کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہ آج رات مجھ سے کچھ ہو گیا ہے، فرمایا بیان کرو، کہا میرے محلہ کی عورتوں نے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتے ہیں، ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھیں گے، تو میں نے ان کو آٹھ رکعت نماز پڑھائی، اور وتر پڑھائے، آپ سنکر خاموش ہو گئے"، الخ

اس کے متعلق عرض ہے کہ غیر مقلد نے اس حدیث کی سند نقل نہیں کی، اور نہ کسی امام کے قول سے اس کی تصحیح بیان کی، اور بدون اس کے اس کو استدلال کا کیا حق ہے، افسوس! غیر مقلد ہم سے تو حدیث صحیح ونص صریح کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود مطلق العنان ہو کر احادیث نقل کرتے ہیں، گویا حدیث کے صحیح کرنے کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو چاہیں گے صحیح کر دیں گے، پس اول غیر مقلد اس حدیث کی صحت ثابت کرے، اور اس کے بعد یہ بتلائے کہ اس سے بیس۲۰ کی نفی کیونکر ہوئی، کیا یہ احتمال نہیں کہ حضرت ابی بن کعب رض نے بارہ رکعت تراویح حضور کے پیچھے مسجد میں یا تنہا پڑھ لی ہوں، اس کے بعد گھر پہونچے اور عورتوں کے اصرار پر آٹھ رکعت اُن کو پڑھا دی ہوں؟

اس کے بعد مشتہر نے مؤطا امام مالک رح ومصنف ابن ابی شیبہ رح وسنن سعید بن منصور رح سے سائب بن یزید کا یہ اثر بیان کیا ہے کہ "امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب وتمیم داری رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں" الخ

سو مشتہر کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اثر صحیح نہیں ہے، گو راوی سب ثقہ ہیں، مگر یہ مضطرب المتن ہے، محمد بن یوسف راوی پر اس میں اختلاف ہوا ہے، مالک اور یحییٰ قطان اور عبدالعزیز بن محمد نے محمد بن یوسف سے گیارہ رکعت روایت کی ہیں، اور قیام اللیل مروزی میں محمد بن اسحٰق نے محمد بن یوسف سے تیرہ رکعت روایت کی ہیں، اور مصنف عبدالرزاق میں داؤد بن قیس وغیرہ نے انہی محمد بن یوسف کے واسطہ سے سائب بن یزید سے اکیس۲۱ رکعت بیان کی ہیں، دیکھو فتح الباری (ص ۲۱۹ ج ۲) و (عمدۃ القاری ص ۳۵۷ ج ۵) اور حافظ ابن عبدالبر رح نے گیارہ رکعت کی روایت کو راوی کا وہم بتلایا ہے، دیکھو زرقانی شرح مؤطا (ص ۲۱۵ ج ۱) اور سائب بن یزید سے محفوظ اور صحیح روایت وہ ہے جس کو مالک اور بیہقی نے یزید بن خصیفہ کے واسطہ سے

سائب بن یزید سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیس رکعت (تراویح) اور وتر کے ساتھ قیام رمضان ہوتا تھا، دیکھو (التعلیق الحسن ص ۵۰، ج ۲) اور (فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۴) اور اس کے محفوظ اور صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں راویوں نے اختلاف نہیں کیا، دوسرے اس کے مؤیدات بہت زیادہ ہیں،

منجملہ ان کے وہ ہے جو مالکؒ نے مؤطا میں یزید بن رومان سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ رمضان میں تیئیس رکعت کے ساتھ قیام کرتے تھے، (مراد تراویح ہے) اور ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں یحییٰ بن سعیدؒ سے روایت کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائے، اور ابن ابی شیبہؒ نے عبدالعزیز بن رفیع سے روایت کیا ہے کہ ابی ابن کعبؓ رمضان میں مدینے کے لوگوں کو بیس رکعت (تراویح) اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے، اور ان تینوں کی سند صحیح ہے، (دیکھو مؤطا اور تعلیق حسن) البتہ یہ مؤیدات مرسل ہیں، مگر مرسل کے سب راوی ثقہ ہوں تو وہ ہمارے نزدیک مثل موصول کے ہے، اگر غیر مقلد اس کے ضعیف ہونے کا دعویٰ کریں تو کتاب وسنت سے دلیل لائیں، کسی عالم کا قول بیان نہ کریں، کیونکہ کسی عالم کا قول جب خود اُن کے اوپر حجت نہیں تو دوسروں پر اس سے حجت قائم کرنے کا ان کو کیا حق ہے، دوسرے اگر وہ دو عالموں کا قول اپنی تائید میں لائیں گے تو ہم دس کا قول اس کے خلاف دکھلا سکتے ہیں،

مشتہر نے حافظ ابن حجرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا عدد گیارہ رکعت کا رسولِ خدا صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے موافق ہے،، اھ، اس کے متعلق صرف ہم یہ چاہتے ہیں کہ اوّل مشتہر یہ بتلائے کہ کیا وہ حافظ ابن حجرؒ کا مقلد ہے، یا ان کی تقلید کو دوسروں پر واجب سمجھتا ہے،

دوسرے فتح الباری کی عبارت بعینہ مع حوالہ صفحہ وسطر کے شائع کرے، کیونکہ ہم کو مشتہر کی فہم کا چند مواقع کے مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کچھ کا کچھ سمجھ جاتا ہے، یا مخلوق کو دھوکہ دینا چاہتا ہے ہم اس کو متنبہ کرتے ہیں کہ یہ قول حافظ ابن حجر کا نہیں، بلکہ ابن اسحٰق صاحب مغازی کا ہے، اور گیارہ کے متعلق نہیں بلکہ تیرہ کے متعلق ہے، اس کے بعد اس نے علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل تسعہ کے حوالہ سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے گیارہ رکعت کو زیادہ محبوب بتلایا ہے، اور یہ کہ یہی مقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تھی، اور فرمایا کہ میں اسکی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے اور کیوں پیدا ہو گئیں اھ ملخصاً،



۱۷

اس کے متعلق بھی ہم سوالاتِ مذکورہ کا اعادہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ بالفرض اگر یہ قولِ امام مالکؒ سے کسی نے نقل بھی کیا ہو تو اس کی سند دیکھنا ضروری ہے، ورنہ امام مالکؒ کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں ہو سکتی، کیونکہ مدونہ مالک میں جو سحنون مالکی ثقہ کی روایت ابن القاسم مالکی ثقہ سے ہے، اور ابن قاسم بلاواسطہ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اس کے خلاف یہ مرقوم ہے،

قال مالك بعث الى الامير واراد ان ينقص من قيام رمضان الذى كان يقومه الناس بالمدينة قال ابن القاسم وهو تسعة وثلاثون ركعة ست وثلاثون ركعة والوتر ثلاث قال مالك فنهيته ان ينقص من ذلك شيئا وقلت له هذا ما ادركت الناس عليه وهذا الامر القديم الذى لم تزل الناس عليه (ص ۱۹۳ ج ۱)،

جس میں صاف تصریح ہے کہ امام مالک کے نزدیک تراویح چھتیس رکعت ہیں، اور وہ اس سے کم کرنے کو منع کرتے ہیں اور اس کو عمل قدیم سمجھتے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ امام مالک گیارہ رکعت سے زیادہ پر تعجب ظاہر کرتے ہوں، اور یوں کہیں کہ میں اس کی وجہ نہیں جانتا کہ یہ زیادہ رکعتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں،

اس کے بعد مدونہ میں نافع اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے چھتیس رکعت کی روایت نقل کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے پاس عمل اہل مدینہ کے علاوہ روایت بھی گیارہ رکعت سے زیادہ کے ثبوت میں موجود ہے،

اس کے بعد مشتہر نے علامہ عینی حنفی کی شرح بخاری سے یہ نقل کیا ہے کہ بعض ائمہ کا مذہب گیارہ رکعت تراویح کا ہے، اور اسی کو امام مالک نے اپنے نفس کے لئے پسند فرمایا الخ اس کے متعلق ہم کو مشتہر کے انصاف کی داد دینا ضرور ہے، کہ علامہ عینی حنفی نے جس عدد کو جمہور صحابہ اور جمہور علماء سے نقل کیا تھا، اور جس کی تائید میں بہت سے آثار نقل کئے تھے اس کو تو چھوڑ دیا اور جس قول کو سب سے اخیر میں تضعیف کے صیغہ سے نقل کیا تھا اس پر زور دینے لگا، دوسرے ہم اس کے متعلق بھی تصحیح سند کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ امام مالکؒ کا قول مدوّنہ میں اس کے خلاف مذکور ہے، اور مدوّنہ فقہ مالکی کا فتاویٰ معتبر ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی روایت امام مالک کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی، اگر امام مالکؒ کے نزدیک گیارہ رکعت مختار ہوتیں تو مدوّنہ میں ضرور اس کا ذکر ہوتا، قاضی ابن رشد نے بھی بدایۃ المجتہد میں امام مالک سے ایک روایت تو بیس رکعت کی جمہور کے موافق نقل کی ہے، اور دوسری روایت چھتیس رکعت

کی نقل کی ہے گیارہ کا کوئی ذکر نہیں، پس گیارہ کی روایت مالک سے یقیناً ضعیف ہے،

اور شیخ ابوبکر بن اعربی ائمہ مجتہدین میں سے نہیں ہیں، بلکہ خود مقلد ہیں، ان کا قول مقلدین پر حجت ہے، اور غیر مقلدین سے حیرت ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ وشافعی ومالک واحمد کی تقلید سے تو عار کرتے ہیں اور ان کے مقلدوں کی تقلید کو تیار ہیں، کہیں حافظ ابن حجر کا نام لیتے ہیں کہیں حافظ ابوبکر بن عربی کا،

اس کے بعد مشتہر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ماثبت بالسنۃ اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ کے حوالے سے اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح روایت وہ ہے جسکو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے گیارہ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ آپ کی قیام اللیل میں عادت تھی اور نقل کیا گیا ہے کہ بعض سلف امیرالمؤمنین عمر بن عبدالعزیز کی خلافت میں گیارہ رکعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت کی نیت سے پڑھتے ہیں، اھ،

اس عبارت کے نقل کرنے میں مشتہر نے بڑی چالاکی سے کام لیا ہے، کیونکہ اس نے اس قول کو جو شیخ عبدالحقؒ نے محدثین سے نقل کیا تھا خود شیخ کا قول بتا کر حنفیہ کو دھوکا دیا ہے کہ دیکھو شیخ عبدالحق حنفی بھی گیارہ رکعت کے قائل ہیں، حالانکہ شیخ کی عبارت اس طرح ہے فعندنا ھی عشرون رکعۃ لما روی البیہقی باسناد صحیح الی ان قال وروی ابن عباسؓ انہ صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ فی رمضان واوتر بعدھا بثلث لکن المحدثین قالوا ان ھذا الحدیث ضعیف والصحیح ما روتہ عائشۃ انہ صلی احدی عشرۃ رکعۃ الخ جس کو ذرا بھی عربی سے مس ہوگا وہ سمجھ جائے گا کہ گیارہ رکعت کے عدد کو ترجیح شیخ عبدالحقؒ خود نہیں دے رہے، بلکہ محدثین کا قول نقل کر رہے ہیں، اور خود شیخ کے نزدیک تو راجح بیس ہی کا عدد ہے، جسکو سب سے اول بیہقی کی سند صحیح کے حوالہ سے لکھا ہے، اور خلافت عمر بن عبدالعزیزؒ میں جن بعض سلف کا فعل بیان کیا جاتا ہے اس کی کوئی سند نہیں، نہ یہ معلوم کہ یہ بعض سلف کون ہیں، کہیں محمد بن اسحٰق صاحب مغازی اور واقدی تو نہیں! اور ایسی بے سند بات سے استدلال کرنا غیر مقلد کی اتباعِ حدیث صحیح کی کافی دلیل ہے، اس کے بعد مشتہر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول مبدأ ومعاد سے نقل کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ مشابہت کرنا چاہئے، اگرچہ بحسب ظاہر کیوں نہ ہو، الخ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ہر حنفی کا ایمان ہے، اور تمام مقلدین خواہ حنفی ہوں



یا شافعی تراویح کی بیس رکعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کا اتباع کر کے پڑھتے ہیں، اور ہم اوپر محدثین ہی کے قول سے بتلا چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی وہ روایت جس میں گیارہ کا ذکر ہے مضطرب ہے، اور جب تک اضطراب رفع نہ ہو اس وقت تک وہ حدیث حجت نہیں،

- اس کے بعد مشتہر نے علامہ ابن ہمام کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے کہ حاصل احادیث وآثار صحابہ سے از روئے دلیل یہ ہے کہ تراویح سنت گیارہ رکعت مع وتر بجماعت ہیں الخ مشتہر نے علامہ ابن ہمام کی عبارت میں ایسی کانٹ چھانٹ کی ہے، جس نے اس کی دیانت کی قلعی کھول دی، علامہ ابن ہمام کی عبارت سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، کہ تراویح بیس رکعت سنتِ نبویہ نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ بیس رکعت تراویح اور وتر میں سے گیارہ رکعت تو سنتِ نبویہ ہے، اور باقی بارہ رکعتیں سنت خلفائے راشدین ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سنتِ خلفاء کے اتباع کی بھی دعوت دی ہے، اپنے ارشاد علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین (اخرجہ الترمذی وقال حسن صحیح) اھ میں،

بتلائیے اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ تراویح بیس نہ پڑھنا چاہئے بلکہ گیارہ پڑھنا چاہئے یا یہ کہ بیس رکعت سنت نہیں، بلکہ علامہ تو بیس کو سنت مان کر یہ تفصیل کرتے ہیں، کہ ان میں سے گیارہ رکعت سنتِ نبویہ ہے، اور باقی سنت خلفاء ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بیس سنتوں میں سے گیارہ بہت زیادہ مؤکد ہیں، اور باقی ان کے برابر مؤکد نہیں اور سننِ مؤکدہ میں باہم فرق مراتب ہو سکتا ہے، جیسا کہ سنتِ فجر تمام سننِ مؤکدہ سے آکد ہے اگر کسی کے نزدیک علامہ ابن ہمام کی عبارت کا یہ مطلب نہیں تو ہمارے اوپر غیر مقلدین کی فہم حجت نہیں، کیونکہ علماءِ حنفیہ کے اقوال کا مطلب وہ ہم سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے، اور بعد تسلیم کے ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہے کہ امام ابن ہمام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ سنتِ نبویہ کو نہیں سمجھ سکتے تو جب امام ابوحنیفہ نے بیس رکعات کو سنتِ مؤکدہ فرمایا ہے، اُن کے مقابلہ میں ابن ہمام کا قول کوئی چیز نہیں، حنفیہ نے امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کی تقلید کا التزام کیا ہے، ابن ہمام کی تقلید کا التزام نہیں کیا، پس اگر غیر مقلد کو اقوالِ علماء بیان کرنے سے حنفیہ پر الزام قائم کرنا مقصود ہے تو وہ امام ابوحنیفہؒ یا صاحبین کا کوئی

قول پیش کریں، جن میں انھوں نے صرف گیارہ رکعت کو سنت فرمایا ہو اور بیس کو خلافِ
سنت کہا ہو، کیونکہ اصلی اکابر حنفیہ یہی حضرات ہیں، ان کے مقابلہ میں سب اکابر مشائخ
اصاغر ہیں، اور ہم عنقریب احادیث و آثار صحابہ ہی سے بیس رکعات تراویح کی مسنونیت
کا ثبوت دینے والے ہیں، ناظرین منتظر رہیں،

اس کے بعد مشتہر نے بحر الرائق و طحطاوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ تحقیق ثابت
ہوتی ہے تعداد گیارہ رکعات مع وتر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں، تو اس صورت میں ہمارے
مشائخ حنفیہ کے اصول پر از روئے دلیل آٹھ ہی رکعت ہیں، اھ

یہاں بھی مشتہر نے دھوکا دیا ہے، کیونکہ بحر الرائق و طحطاوی وغیرہ نے علامہ ابن ہمام
ہی کا قول فتح القدیر سے نقل کیا ہے، خود صاحبِ بحر و طحطاوی نے اپنی ذاتی رائے بیان
نہیں کی، پس اس کو صاحبِ بحر و طحطاوی کا قول بنا کر نقل کرنا عجیب حرکت ہے نیز
مشتہر نے بحر و طحطاوی کی عبارت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے اس کو لازم ہے کہ اصل عبارت
پیش کرے، اور علامہ ابن ہمام کا مطلب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اسی جواب کا یہاں بھی
اعادہ کر لیا جائے،

اس کے بعد مشتہر نے فتح المعین شرح کنز کی ایک عبارت نقل کی ہے، چونکہ فتح المعین
میرے پاس نہیں ہے، اس کے متعلق میں تفصیل کے ساتھ مشتہر کی دیانت کو ظاہر نہیں کر سکتا
ہاں اجمالاً اتنا کہتا ہوں کہ یہ قول شارح کنز کا نہیں ہے، بلکہ غالباً اس نے محدثین کا قول نقل
کیا ہے، اور مشتہر کی عادت ہے کہ وہ ہر منقول کو ناقل کا قول بنا دیتا ہے، جیسا کہ شیخ
عبد الحقؒ کی عبارت میں وہ ایسا کر چکا ہے،

اس کے بعد مشتہر نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ
حق الصریح کے حوالہ سے علامہ قدوری حنفی کا قول نقل کیا ہے کہ تراویح آٹھ رکعت سنت
مؤکدہ ہیں، اس کے بعد خود مولانا گنگوہی کا قول نقل کیا ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت
اور مؤکد تر ہے، الخ،

سو ہم نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا رسالہ حق الصریح اب تک نہیں سنا،
شاید اس نام کا کوئی رسالہ مشتہر کے گھر بیٹھ کر مولانا نے تصنیف کیا ہو، ہاں الرائی النجیح
فی عدد رکعات التراویح مولانا کا رسالہ ہم نے ضرور دیکھا ہے، اس میں تو ان باتوں میں سے



ایک کا بھی پتہ نہیں جو مشتہر نے نقل کی ہیں، نہ اس میں علامہ قدوری کا قول مذکور ہے، نہ
خود مولانا گنگوہی کا یہ قول ہے کہ گیارہ رکعت تراویح ثابت اور مؤکد تر ہیں، بلکہ اس
میں تو مشتہر کے خلاف مولاناؒ نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی وہ حدیث جس میں
فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ رمضان وغیر رمضان
میں نہیں پڑھتے تھے، الخ تراویح کے متعلق نہیں بلکہ صرف تہجد کے متعلق ہے، یعنی آپؐ
تہجد میں اس سے زیادہ غالب اوقات میں نہ پڑھتے تھے، کیونکہ تہجد میں بھی یہ حدیث
کلی نہیں بلکہ اکثری ہے، خود حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات سے گیارہ پر زیادت
اور عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ کی روایات سے اس سے زیادہ رکعات تہجد میں ثابت ہیں،
ملاحظہ ہو (ص ۸ و ۹)

اس کے بعد مشتہر نے سیدی مرشدی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر
مدنی کا یہ قول براہین قاطعہ سے نقل کیا ہے کہ سنتِ مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو
بالاتفاق ہے، انتہیٰ،

واقعی مشتہر کو عبارت کی قطع و برید اور مبتدا کو خبر سے جدا کر دینا خوب آتا ہے،
کیوں نہ ہو، دھوکا دہی کا فن اسی طرح سیکھا جاتا ہے، اب سنئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس
مقام پر انوار ساطعہ کے اس قول کو رد کر رہے ہیں کہ وہ تراویح کو جڑ ہی سے بدعت کہتا
تھا، اور اس نے حضرت عمر رضؓ کے قول نعم البدعۃ ہذہ سے استدلال کیا تھا اس کے جواب
میں مولانا فرماتے ہیں کہ فخر عالمؐ خود فرما چکے ہیں، سننت لکم قیامہ الحدیث من
قام رمضان ایمانا و احتسابا، اور اس کا فعل ابتداعی کر دکھایا تو اب فعل اور
مطلق قول سے جس قدر امور صلوٰۃ تراویح کے متعلق ہیں، سب ثابت ہو گئے، اس کے بعد
فرماتے ہیں کہ اور سنت مؤکدہ ہونا آٹھ رکعت تراویح کا تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو
بیس میں ہے الخ یعنی پھر تمہارا اصل تراویح کو بدعت کہنا خلافِ اجماع ہے، کیونکہ اس
کا کوئی بھی قائل نہیں، نہ مقلد نہ غیر مقلد، نہ سنی نہ وہابی، یہ تم نے تیسری شاخ کہاں سے
نکالی، کہ تراویح اصل ہی سے بدعت ہے، یہ مطلب تھا مولانا کا جس پر نہ معلوم.....
غیر مقلد کیوں اچھل رہا ہے، مولانا نے اس میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ بیس رکعت کے سنت
ہونے میں حنفیہ کو بھی اختلاف ہے، بلکہ صرف مؤلف انوار ساطعہ کی حماقت ظاہر

کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی فرقہ مبتدعہ کو تراویح کی سنت موکدہ ہونے میں اختلاف ہے تو وہ گیارہ سے زیادہ میں ہے، ورنہ اصل تراویح کو سب کے سب بالاتفاق سنت مانتے ہیں، اسکو کوئی بدعت نہیں کہتا،

یہ تو معترض کے دلائل کا جواب تھا جس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشہر اور اس کی جماعت غیر مقلدین کے پاس کوئی دلیل صحیح اور صریح ایسی نہیں جس سے بیس رکعات تراویح کی نفی ہوتی ہو، بلکہ جو حدیث مرفوع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور جو اثر سائب بن یزیدؓ کا حضرت عمرؓ سے گیارہ رکعت تراویح کے متعلق وہ پیش کرتے ہیں وہ دونوں مضطرب ہیں، اور دلالت معنویہ بھی اُن کی صریح نہیں،

اس کے بعد میں جمہور علماء مجتہدین وفقہاء حنفیہ وغیرہ کے دلائل بیان کرتا ہوں جن سے بیس رکعت تراویح کا سنت ہونا معلوم ہوگا،

حدیث اوّل: اخرج ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ حدثنا یزید بن ھارون قال اخبرنا ابراھیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر واخرجہ الکشی فی مسندہ والبغوی فی معجمہ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی سننہ اھ (التعلیق الحسن ص ۵۶ ج ۲)

(ترجمہ) "عبداللہ بن عباس (صحابی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، اس کو ابن ابی شیبہ وبیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں تمام راوی ثقہ ہیں"، مگر شاید کوئی غیر مقلد ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے سند پر کچھ کلام کرے تو اس کو تہذیب التہذیب میں حافظ ابن عدی کا یہ قول دیکھ لینا چاہئے، لہ احادیث صالحۃ وھو خیر من ابراھیم بن ابی حیۃ اھ، اس کی یعنی ابراہیم بن عثمان کی احادیث عمدہ ہیں، اور وہ ابراہیم بن حیہ سے بہتر ہے، اب ذرا ابراہیم بن ابی حیہ کو بھی لسان المیزان میں دیکھ لو تو اس کے متعلق یحییٰ بن معین امام جرح وتعدیل کا یہ قول ہے، نقل عثمان الدارمی عن یحییٰ بن معین انہ قال شیخ ثقۃ کبیر، یعنی عثمان دارمی نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ابراہیم بن ابی حیہ کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ شیخ ثقہ ہے بزرگ ہے"، اب بتلاؤ جو شخص ایسے ثقہ



شیخ کبیر سے بھی بہتر ہو وہ کیا کچھ ہوگا، پھر ابراہیم بن عثمان کی عدالت وغیرہ کی تعریف امام یزید بن ہارون، محدث حنفی نے کی ہے جو ابراہیم مذکور کے کاتب ومنشی زمانۂ قضاء میں رہ چکے ہیں، اس لئے ہم اس کو ضعیف ماننے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کی تعریف ایک حنفی محدث اور حافظ ابن عدی نے کی ہے، ہمارے لئے تو ایک محدث حنفی کی تعریف ہی راوی کے معتبر ہونے کو کافی تھی، خواہ سارے محدثین اس کو ضعیف کہتے ہوں چہ جائیکہ اس کے ساتھ ابن عدی جیسا امام جرح وتعدیل مسلّم فریقین بھی اس کی احادیث کو عمدہ کہتا ہے، تو اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم ابراہیم بن عثمان کی حدیث کو ضعیف مانیں، اور اگر غیر مقلد اس حدیث کو ضعیف ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ اوّل حدیث کے ردّ وقبول کے اصول کتاب وسنت سے بیان کرے، پھر اس حدیث کو ضعیف ثابت کرے، اور جو چاہے انعام ہم سے لیلے، بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ کی تقلید نہ کرے، کیونکہ تقلید اسکے نزدیک جائز نہیں، اور اگر وہ بخاری ومسلم وغیرہ کی تقلید کرکے ایک حدیث کو ضعیف کہے گا تو یاد رکھے کہ حدیث کے ردّ وقبول کے اصول وقواعد فقہاء حنفیہ نے بھی بیان کئے ہیں ہم ان کے مقابلہ میں یہ اصول پیش کرکے غیر مقلد سے سوال کریں گے کہ تم کتاب وسنت سے اس کا ثبوت دو کہ حدیث کے ردّ وقبول میں بخاری ومسلم کی تقلید واجب ہے اور ابو حنیفہ کی جائز نہیں،

نیز غیر مقلد کو معلوم ہونا چاہئے کہ کسی راوی میں کسی محدث کے طعن وجرح سے اگر وہ راوی ضعیف یا اس کی احادیث ضعیف ہوجایا کریں تو خود امام بخاری بھی ضعیف اور انکی احادیث بھی ضعیف ہوجائیں گی، کیونکہ امام بخاری پر بھی امام محمد بن یحییٰ ذہلی نے جرح کی ہے، دیکھو مقدمۂ فتح الباری، نیز بخاری کے بہت سے راویوں پر بعض محدثین نے جرح وطعن کیا ہے، جیسا کہ مقدمۂ فتح الباری کے مطالعہ سے واضح ہوگا، پس اگر بعض محدثین کا طعن بوجہ دوسرے محدثین کی توثیق وتعدیل کے امام بخاری میں اور انکی احادیث میں موثر نہیں ہوسکتا تو ابراہیم بن عثمان میں بھی کسی کا طعن حافظ ابن عدی کی تعدیل اور یزید بن ہارون کی تعریف کے بعد مؤثر نہ ہونا چاہئے، لہٰذا کسی کا منہ نہیں جو اس حدیث کو ضعیف کہہ سکے، اور اگر علماء حنفیہ میں سے بھی کسی نے بعض محدثین کی تقلید کرکے اس کو ضعیف کہہ دیا ہو تو ان کا قول ہم پر حجت نہیں، کیونکہ اس وقت اصولی گفتگو ہو رہی ہے، تقلیدی گفتگو نہیں ہے،

دوسری حدیث قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجتھد فی رمضان مالا یجتھد فی غیرہ رواہ مسلم فی صحیحہ،

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں (عبادت کے لئے) زیادہ مشقت کرتے تھے کہ غیر رمضان میں اس قدر مشقت نہ کرتے تھے، اس کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے،

وعنہا قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل العشر (الاخیر ۱۲ فتح) شد مئزرہ واحیی لیلہ وایقظ اھلہ، اخرجہ البخاری)

حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے کہ جب رمضان کا اخیر عشرہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے اور رات بھر جاگتے اور گھر والوں کو جگاتے تھے، اس کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے،

وعنہا مرفوعاً کان اذا دخل شھر رمضان شد مئزرہ ثم لم یأت فراشہ حتی ینسلخ واسنادہ حسن رواہ البیہقی فی شعب الایمان قالہ العزیزی فی شرح الجامع الصغیر للسیوطیؒ، حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب رمضان آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور بستر پر نہ لیٹتے تھے یہاں تک کہ رمضان ختم ہو جاتا، اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے، اور اس کی سند حسن ہے (عزیزی)

وعنہا مرفوعاً قالت کان اذا دخل رمضان تغیر لونہ وکثرت صلوتہ و ابتھل فی الدعاء واشفق لونہ اخرجہ البیہقی فی الشعب (عزیزی) حضرت عائشہ رضؓ ہی سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب رمضان داخل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز (پہلے سے) زیادہ ہو جاتی اور دعا میں زیادہ عاجزی کرنے لگتے، اور آپکا رنگ سُرخ ہو جاتا، اس کو بھی بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے،

یہ چار احادیث صاف طور سے اس بات کو بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرتے اور زیادہ نماز پڑھتے تھے، گو انمیں بیس رکعات تراویح کا صاف ذکر نہیں، مگر یقیناً ان سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضؓ کی وہ حدیث جو بواسطہ ابو سلمہ کے شیخینؒ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے الخ اس کا وہ



مطلب نہیں جو غیر مقلدوں نے سمجھا ہے کہ حضور رمضان کی راتوں میں بھی تہجد وغیرہ ملا کر صرف گیارہ ہی رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ یہ مطلب حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات کے بالکل خلاف ہے، بلکہ تمام روایات کو ملا کر اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں آپؐ کا معمول غالب گیارہ رکعت ہی کا تھا، رمضان میں بھی تہجد کی مقدار اکثر یہی تھی، باقی یہ کہ تہجد کے علاوہ بھی آپؐ رمضان کی راتوں میں کچھ نماز نہ پڑھتے تھے، اس سے یہ گیارہ والی روایت ساکت ہے، اور حضرت عائشہ رضؓ کی دوسری روایات بتلاتی ہیں کہ آپؐ تہجد کے علاوہ رمضان میں اور نماز بھی پڑھتے تھے، جسکو ابن عباسؓ کی روایت نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ آپؐ رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، پس یہ چار احادیث بالاجمال حدیث ابن عباس کی مؤید ہیں،

اور اگر غیر مقلد ہماری اس تقریر کو تسلیم نہ کرے تو ہم کہیں گے کہ اچھا تم کسی دوسری تقریر سے حضرت عائشہ رضؓ کی روایات کا اختلاف رفع کر دو، مگر اختلاف رفع کرنے سے پہلے تم کو گیارہ رکعت والی حدیث سے استدلال کا کیا حق تھا؟

عن السائب بن یزید الصحابی قال کانوا یقومون علی عھد عمر رضی اللہ عنہ بعشرین وعلی عھد عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہما مثلہ رواہ البیہقی باسناد صحیح (عینی شرح بخاری، ص ۵۹۸ ج ۳) سائب بن یزید صحابیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بیس رکعات (تراویح) پڑھا کرتے تھے،

قال الحافظ ابن عبد البر روی الحارث بن عبد الرحمن بن ابی ذباب عن السائب بن یزید قال کان القیام علی عھد عمر بثلاث وعشرین رکعۃ قال ابن عبد البر والثلاث للوتر اھ (عینی شرح بخاری، ص ۳۵۷ ج ۵) حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ حارث ابن عبد الرحمن نے سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں قیام رمضان (تراویح) تئیس ۲۳ رکعت تھا، حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ تین رکعت وتر کی ہیں،

وکیع عن حسن بن صالح عن عمرو بن قیس عن ابی الحسناء عن علی رضی اللہ عنہ انہ امر رجلا یصلی بھم رمضان عشرین رکعۃ اخرجہ فی مسندہ (عینی ص ۳۵۷ ج ۵)

حضرت علی رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں بیسؔ رکعت (تراویح) پڑھادیا کریں، اس کو وکیع نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اسکی سند حسن ہے،

و اخبرنا یحیی بن یحیی اخبرنا حفص بن غیاث عن الاعمش عن زید بن وھب قال کان عبد اللہ بن مسعود یصلی لنا فی شھر رمضان فینصرف وعلیہ لیل قال الاعمش کان یصلی عشرین رکعۃ ویوتر بثلاث، رواہ محمد بن نصر المروزی (عینی صفحہ مذکور) زید بن وہب رحؒ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رمضان کے مہینہ میں ہم کو نماز پڑھاتے اور ایسے وقت فارغ ہوتے کہ کچھ رات باقی رہتی، اعمش راوی کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضؓ بیس رکعت اور وتر کی تین رکعت پڑھایا کرتے تھے اس کو محمد بن نصر مروزی نے روایت کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سند صحیح ہے، اور تین مرسل آثار ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، جن میں حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح پڑھے جانے کا ثبوت ہے،

اب ان سب احادیث کو ملاؤ تو معلوم ہوگا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھنا ثابت ہے، اور حضورؐ کے بعد حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں عام طور پر صحابہ بیس رکعت اور تین وتر پڑھتے تھے، اور حضرت علیؓ نے بھی اسی کا حکم دیا ہے، اور عبد اللہ بن مسعود رضؓ بھی بیس رکعت اور تین رکعت وتر پڑھتے تھے، اور اس کے خلاف کسی صحابی سے ثابت نہیں، اور جو روایت مؤطا کی گیارہ رکعت کی مشہر نے بیان کی تھی ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مضطرب ہے، اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں،

ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے، اور کوفہ والے اور امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء اسی کے قائل ہیں، اور ابی بن کعب سے بھی صحیح طور پر یہی ثابت ہے، اور اس کا خلاف صحابہ سے ثابت نہیں، دیکھو (عینی ص ۳۵۷ ج ۵)

اور حافظ ابن قدامہ مغنی میں فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل کے نزدیک (جو محدثین کے امام ہیں) تراویح میں بیس رکعت ہی مختار ہیں، اور سفیان ثوری وابوحنیفہ اور شافعی بھی اسی کے قائل ہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے جب سب آدمیوں کو ابی بن کعب کے پیچھے جمع کیا ہے، تو وہ اُن کو بیسؔ رکعت ہی پڑھاتے تھے، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے،



اور سائب بن یزید نے بھی ایسے ہی روایت کیا ہے، جو متعدد طرق سے اُن سے مروی ہے، اور امام مالکؒ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں صحابہ رضؓ رمضان میں تیئیس رکعت سے قیام کرتے (یعنی تراویح پڑھتے تھے، اور حضرت علی رضؓ نے بھی ایک شخص کو رمضان میں بیس رکعت پڑھانے کا حکم کیا، اور یہ اجماع کے مثل ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضرت عمر رضؓ نے کیا جس پر ان کے زمانہ میں حضرات صحابہ رضؓ نے اجماع کرلیا ہے وہی اتباع کے زیادہ لائق ہے، اھ (ص ۸۰۳ ج ۱)

اب غیر مقلد بتلائیں کہ وہ اس اجماع کی مخالفت کرکے کہاں رہیں گے، اخیر میں ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضؓ کے یہ تمام آثار اور ان کا بیس رکعات تراویح پر اجماع واتفاق کرنا یہ سب حضرت ابن عباس رضؓ کی اس حدیث کی تائید کررہا ہے جو ابن ابی شیبہ نے مرفوعًا ان سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے،

اب اس حدیث کے صحیح ہونے میں کچھ شک نہیں، کیونکہ حدیث کی صحت کی یہ بھی دلیل ہے کہ امت نے اس کی تلقی بالقبول کی ہو، قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں منتقی کی پہلی ہی حدیث کی شرح میں یہ قاعدہ بیان کیا ہے (ص ۱۵ ج ۱) اور اس سے بڑھکر تلقی کیا ہوگی کہ خلفائے ثلثہ کے عہد میں صحابہ نے بیس رکعت تراویح پر اجماع واتفاق کیا، اور ان کے بعد سے اب تک تمام امت کا اس پر اتفاق چلا آرہا ہے، اگر کسی نے بیس پر زیادتی کی ہو تو کی ہو بیس سے کمی کسی نے نہیں کی، سوائے غیر مقلدوں کے اور ہم ان کے تمام دلائل کا ضعیف ہونا اوپر ظاہر کرچکے پس حدیث مرفوع صحیح بالتلقی وحسن بالسند اور آثار کثیرہ واجماعِ صحابہ کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کو جس کے دل میں خدا کا خوف ہو یہ حق نہیں کہ وہ بیس رکعات تراویح کا انکار کرے، یا اس کو خلافِ سنت کہے، اور گیارہ رکعت کا رواج دے، خدا ایسی سستی اور کاہلی سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، آمین، وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، ۱۹ رمضان ۱۳۴۶ھ

نماز تراویح میں کسی بھی ایک سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا بآواز بلند علاوہ سورۂ نمل مسنون ہے یا واجب؟

**سوال** (۲۱) کیا کسی سورۃ کے اول میں ایک مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بآواز بلند تراویح میں پڑھنا مسنون یا واجب ہے؟ یعنی علاوہ سورۃ نمل کے (وانہ بسم اللہ

الرحمن الرحیم)۔

**الجواب:** ہاں ختم قرآن تراویح میں کسی ایک سورۃ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا جہر کرنا چاہئے، ورنہ ختم ناقص رہیگا، قال فی نور الانوار والاصح انہا ای التسمیۃ من القرآن الخ قال المحشی فالقرآن عبارۃ عن مأۃ واربعۃ عشرۃ سورۃ وایۃ وھی التسمیۃ فلابد فی ختم القرآن من قراءۃ التسمیۃ مرۃ (ای جہرا) علی صدر ایۃ سورۃ کانت وھذا کلہ عندنا علی المختار وعند الامام الشافعی ھی جزء من کل سورۃ سوی براءۃ فلو ترکت فی صدر سورۃ ما ماحصل الختم ثم ھذا الاختلاف فی غیر البسملۃ التی فی النمل فھی بعض ایۃ اتفاقا اھ (ص ۹) وانما قیدنا قراءتہا بالجہر لان الامام لو قرأھا سرا تم ختمہ دون ختم السامعین واللہ اعلم، ۱۳ رشوال ۴۶ھ

**سوال (۲۲)** ............ نابالغ بچے اور اجرت پر قرآن پاک سنانے والے کے پیچھے نماز تراویح کا حکم، ............

............ ہمارے محلہ میں تین حافظ ہیں، جو محلہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، ایک صاحب بوجہ ضعف عمری تراویح میں کلام پاک سُنانے سے معذوری ظاہر فرماتے ہیں، اور شاید کسی وجہ سے معذور ہوں، دوسرے صاحب بوجہ کریہ الصوت کہے جانے کے سُنانا نہیں چاہتے، البتہ ایک حافظ جو ہنوز بالغ نہیں ہوئے، مگر قریب البلوغ کے ہے، یعنی جس کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہے وہ سنا سکتا ہے؛ اور شہر میں کوئی حافظ نہیں ہے، ایسی صورت میں دوسرے شہر سے مثلاً لکھنؤ، سندیلہ یا بریلی سے اجرت پر حافظ بلوا کر تراویح سُنی جاوے یا اس نابالغ کے پیچھے سننا مناسب ہے، شریعت کا جو حکم ہو اس سے اطلاع بخشی جاوے جو لوگ نابالغ کے اقتداء کے قائل نہیں وہ احادیث پیش کرتے ہیں، ایک بخاری شریف میں دوسری مشکوٰۃ میں، ان احادیث کا جواب کیا ہے، اشعۃ اللمعات میں حضرت شیخ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن سلمہؓ کی حدیث پر شافعیہ کا عملدرآمد ہے، ایسی حالت میں جبکہ فرض پر استدلال ہے تو نفل اور سنت مؤکدہ پر عدم وجوہ بھی رقم فرمائے جائیں، نابالغ حفاظ کے پیچھے کوئی تراویح نہیں سنتا ہے، اس سے وہ کلام پاک



بھولتے جارہے ہیں، اور لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ بچوں کے حفظِ قرآن کرانا ایک فضول چیز ہے، کیا کیا جاوے، اللہ کے واسطے معہ دلائل مرحمت فرمائیں، سننے میں آیا ہے کہ علماءِ فرنگی محل اور علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اس کے موافقین قولِ امام یا حدیث جو اس کے خلاف ہو طلب فرماتے ہیں، اگر ممکن ہو تو بہت ہی اچھا ہے، ورنہ ہم کو تو صرف آپ کا فتویٰ درکار ہے،

**الجواب:** اس صورت میں یا تو حافظ کریہہ الصوت کا قرآن نماز میں سُن لیا جاوے بشرطیکہ سب اس پر آمادہ ہوں، اور اس حافظ کی خوشامد کرلی جائے، ورنہ حافظ ضعیف العمر کے پیچھے الم ترکیف سے تراویح پڑھ لی جائے، اجرت پر اور نابالغ حافظ کے پیچھے بھی تراویح نہ پڑھی جائیں گو امام شافعیؒ کے مذہب میں جائز ہے، مگر امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں، نہ فرائض میں نہ نوافل میں، اور تراویح سال بھر میں ایک دفعہ نصیب ہوتی ہے، ایسی عبادت کو اختلاف ڈالنا سخت محرومی کی بات ہے اور حدیثوں سے شوافع نے استدلال کیا ہے، حنفیہ اور مالکیہ نے ان کے شافی کافی جواب دیدیئے جو مطولاتِ فقہ میں مذکور ہیں، مقلد کو اُن کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں اور محققین کے نزدیک مانعین کے دلائل مجوزین کے دلائل سے اقویٰ ہیں، کما ذکر فی الاعلاء اور نابالغ حافظوں کے قرآن پختہ کرنے کی یہ صورت ہے کہ نوافل میں مغرب کے بعد یا بعد تراویح کے اس نابالغ حافظ کو امام اور دوسرے نابالغ حافظوں کو مقتدی بنا کر اس کا قرآن سُن لیا جائے، اگر سامع نابالغ نہ ملے تو دو چار رکعت میں کوئی بالغ حافظ ہی اس نابالغ کا مقتدی کا بن کر قرآن سُن لیں، اور گو اس صورت میں بھی ان نوافل کی صحت مقتدی بالغ کے حق میں مختلف فیہ ہوگی، مگر چونکہ یہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہیں ہوں گی، بلکہ زائد نفلیں ہوں گی، ان کو اختلاف کی صورت سے ادا کرنے میں بضرورت حفظِ قرآن مضائقہ نہیں، لیکن تراویح جو سنتِ مؤکدہ ہے اور سال بھر میں ایک دفعہ رمضان میں ہی نصیب ہوتی ہے، اختلاف میں ڈالنا سخت بُری بات ہے، علماء ماوراء النہر نے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، اور علماء فرنگی محل اور علماء بلخ نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ خروج من الخلاف عبادت میں اہم ہے، واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۷ رشعبان ۴۷ھ

دو مسجدوں میں جماعتِ تراویح کرانے کا حکم ۔

**سوال (۲۳)** ...... از زید ایک مسجد میں بیس رکعت تراویح پڑھانے کے بعد دوسری مسجد میں بھی بیس رکعت پڑھاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس دوسری مسجد میں مقتدیوں کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اگر نہیں ہے تو کوئی صورت جواز کی ہوسکتی ہے؟

**الجواب**: ہمارے نزدیک دوسری مسجد کے مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی، اور صورتِ جواز نکالنے کی ضرورت کیا ہے، ۱۲ رمضان ۴۷ھ

چار رکعت تراویح کی نیت باندھی اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہا تو اس کو کیا کرنا چاہئے ؟؟ ؟

**سوال (۲۴)** ...... اگر تراویح چار رکعت شروع کی جاویں، اور چوتھی رکعت پر بیٹھنا یاد نہ رہے، تو اب کیا صورت کی جاوے گی؟

**الجواب**: تراویح دو دو رکعت ہی سنت ہے، اس کے خلاف کرنا اور چار چار رکعت پڑھنا مکروہ ہے، اور جو شخص چار چار پڑھتا ہو وہ اگر چوتھی رکعت پر بیٹھنا بھول جاوے تو اس کو پانچویں کے سجدہ کرنے سے پہلے قعدہ کی طرف لوٹ آنا اور سجدہ سہو کر لینا چاہئے، اور قعدہ کر کے کھڑا ہوا ہو تو چھ رکعت پوری کر کے سلام پھیر دے، قال فی مراقی الفلاح وھی عشرون بعشر تسلیمات یسلم علی رأس رکعتین فاذا وصلھا وجلس علی کل شفع فالاصح انه ان تعمد ذلک کرہ وصحت واجزأته عن کلھا اھ (ص ۲۳۰) ۱۲ رمضان ۴۷ھ

دو مسجدوں میں جماعتِ تراویح کرانے کا حکم ؟ ؟ ؟

**سوال (۲۵)** ...... قصبہ ہذا میں کئی مسجدوں پر بوجہ عدم موجودگی حفاظ کئی سال سے ختم قرآن مجید نہیں ہوتا تھا اور وہاں کے مصلیان اس کے ثواب سے محروم رہتے تھے، امسال ایک حافظ صاحب نے قبل رمضان شریف یہاں کی یہ حالت سن کر یہ نیت کیا تھا کہ اگر میں یہاں رمضان شریف میں رہا تو جو مسجدیں خالی رہیں گی اگر وہاں کے مصلی سنیں گے تو بلا معاوضہ ختم سناؤں گا، چنانچہ چاند رات ہی سے دو مسجدوں پر وہاں کے مصلیان کی خواہش سے تراویح بکمالہ (یعنی بست رکعت ہر دو مسجد) پڑھانا شروع کر دیا، بعض لوگوں نے حافظ صاحب کے اس طرز عمل پر اعتراض کیا، حافظ صاحب نے اپنے عمل کے ثبوت جواز



میں فتاویٰ مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی کی اس تحریر کو پیش کیا، اور خود کو ناذر قرار دیا

والتحریر ھذا، جواز التراویح بنیة مطلقة ونیة النفل کما حققه ابن الھمام وفی الثانی ھو اداء التراویح من المقتدی خلف من یصلی التطوع الا انه لا یخلو عن کراھة لمخالفة السلف والملخص فی ھذا ان ینذر الامام الذی صلی التراویح ویوجب علی نفسه قدر ما یرید ان یؤدیه مع الجماعة الثانیة فیکون ذلک علیه واجبا ویخرج عن شبھته الخ ص ۲۵۲ جلد ۱ مطبوعہ یوسفی، طبع شدہ ۱۳۲۱ھ

(ثبوت ۲) وقال قاضی خان وقال ابوبکر سمعت ابا نصر انه قال یجوز لاھل المسجدین جمیعا الخ ص ۱۱۲ ج اول باب التراویح،

(ثبوت ۳) (حدیث مشکوٰۃ) عن جابر قال کان معاذ بن جبل یصلی مع النبی صلی اللہ علیه وسلم ثم یأتی قومه فیصلی بھم متفق علیه وعنه قال کان معاذ یصلی مع النبی صلی اللہ علیه وسلم العشاء ثم یرجع الی قومه فیصلی بھم العشاء وھی له نافلة، ص ۱۰۳ باب من صلی صلوٰۃ مرتین،

(۱) اب سوال یہ ہے کہ ان مقتدیوں کی اقتداء امام ناذر مذکورہ صحیح ہوتی یا نہیں، اور تراویح دوسری مسجد والے مصلیوں کی ادا ہوئی؟ اور سورۂ تراویح سے یہ صورت ان کے لئے افضل ہے یا نہیں؟

(۲) جناب نے استفتاء سابق میں مولانا عبد الحی صاحب کے فتویٰ محولہ کو تسلیم کرتے ہوئے عند الضرورۃ کی قید لگائی ہے، یہ قید ان کی کس عبارت سے مفہوم ہوتی ہے، براہ کرم نقل فرماویں، اور لفظ "ضرورت" سے جناب کی کس قسم کی ضرورت مراد ہے، کیا حالات موجودہ مذکورہ بالا ضرورت کے لئے کافی ہوسکتے ہیں؟ ......

بینوا توجروا وبرھنوا علی اقوالکم،

**الجواب**: جن معترضوں نے حافظ صاحب موصوف کے طرزِ عمل پر اعتراض کیا ہے، ان کا اعتراض غلط نہیں، کیونکہ مولانا عبد الحی صاحب نے اس کے متعلق قاضی خاں کا قول نقل فرمایا ہے، "الاصح انه لا یجوز" اور صدر شہید سے نقل کیا ہے، امام یصلی التراویح فی مسجدین علی الکمال لا یجوز، اور امام قاسم بن قطلوبغا محدث وفقیہ

الحنفیہ کا قول نقل فرمایا ہے، الاصح انہ لا یصح وھو مکروہ، اور نصاب الفقہ سے نقل
کیا ہے لا یجوز لہ ان یفعل لان التراویح سُنّۃ والسنن لا یتکرر فی الوقت
الواحد فاذا فعل ذلک لا یکون سنۃ والفتوی علی ذلک اھ، اور یہ الفاظ وہ
ہیں جو لفظ فتویٰ اور اصح سے مؤید ہیں، ان کے خلاف جو قول ہوگا وہ ضعیف ہے، جیسا
کہ لفظ قیل، وقال بعضہم و ینبغی ان یقول کے عنوانات اس کے ضعف پر دال ہیں، اور
ضعیف روایت پر فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، مگر سخت ضرورت کے وقت مثلاً صورتِ
مسئولہ میں کوئی حاکم مسلم اس حافظ کو یہ حکم کرتا کہ دو تین مسجدوں میں علی الکمال تراویح
پڑھاوے، اور مقتدیوں کو سننے کا امر کرتا، اور تخلف میں خطرہ ہوتا تو ہم اس وقت ضعیف
روایت کو اخذ کر کے فتویٰ جواز کا دیدیتے، کیونکہ جب تک شریعت میں کچھ بھی وسعت ہو تو
مسلمانوں کو خطرہ میں ڈالنا مناسب نہیں، ہاں وسعت نہ ہو تو گنجائش نہ دی جاوے گی،
بلکہ اس وقت حاکم کو دبایا جاوے گا، ونحو ذلک من الضرورات التی یعرفہا العلماء، اور
ایسی ہی ضرورت کے وقت اس مخلص سے کام لیا جاوے گا، جو مولانا عبد الحی صاحبؒ
والمخلص فی ہذا ان ینذر الامام میں بیان کیا ہے، اور گو مولانا عبد الحی صاحبؒ نے اس کو
ضرورت سے مقید نہیں کیا، مگر ہم نے اُن کے کلام کو صحیح کرنے کے لئے یہ محمل بیان
کردیا، ورنہ بظاہر ان کا قول صحیح نہیں، کیونکہ وہ خود اوپر عالمگیریہ سے نقل کرچکے ہیں،
کہ تراویح مفترض کے پیچھے صحیح نہیں، بوجہ مخالفتِ سلف کے (حالانکہ نافلہ مطلقہ
خلف المفترض صحیح ہے) پھر وہ ناذر کے پیچھے کس دلیل سے تراویح کو جائز کرتے ہیں، کیا
اس میں سلف کی مخالفت نہیں ہے، کیا سلف نے کبھی نذر کر کے ایسا کیا ہے، اور اگر ناذر
کے پیچھے تراویح بلا کراہت جائز ہے تو مفترض کے پیچھے بھی جائز ہونا چاہئے، غرض مخلص
مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے محض اپنی رائے سے بیان فرمایا ہے، جو عالمگیریہ کے جزئیہ کے
مصادم ہے، لہٰذا اگر اس کو کوئی رد کردے تو اس کو حق ہے مگر ہم نے ادباً یہ لکھدیا تھا
کہ وہ ضرورت کے وقت پر محمول ہے، اور صورت مسئولہ میں کوئی ضرورت نہیں، اس
لئے حافظ صاحب موصوف کو اپنے طرز عمل کو اس طرح بدل دینا چاہئے، کہ ایک مسجد
میں آٹھ رکعتوں میں یا دس میں سیپارہ سُنادیں، بقیہ کو وہ لوگ الم ترکیف سے پورا
کرلیں، اور دوسری مسجد میں اُن کے جانے تک دس یا آٹھ رکعتیں الم ترکیف سے



۱۸

پڑھی جائیں، بقیہ کو مع وتر کے سیپارہ کے ساتھ حافظ صاحب پڑھادیں، بلکہ اس طرح
حافظ صاحب چاہیں تو پانچ مسجدوں میں ایک ساتھ ختم سنا سکتے ہیں، کہ ایک ایک مسجد
میں چار چار رکعتوں میں سیپارہ سنادیا کریں، اور بقیہ رکعتیں دوسرا شخص چھوٹی چھوٹی سورتوں
سے پڑھاوے، اور اگر مولانا عبد الحی صاحبؒ کے مخلص کو ضرورت کے ساتھ مقید
نہ کیا گیا بلکہ مطلق رکھا گیا تو اس سے وہ حفاظ بہت زیادہ کام لیلیں گے جو معاوضہ
ختم سناتے پھرتے ہیں کہ وہ چالیس رکعتوں میں دس جگہ دس قرآن شروع کر کے معقول
رقم جمع کرلیا کریں گے، اس کو مولانا عبد الحی صاحب بھی کبھی جائز نہیں کہہ سکتے تھے
معلوم ہوا کہ یہ مخلص عام نہیں،

اور اس کے بعد جو حافظ صاحب نے دوسرا ثبوت قاضی خاں سے دیا ہے اس کا
جواب یہ ہے کہ قاضی خاں ہی میں اس سے پہلے ابوبکر اسکاف کا قول لا یجوز مذکور ہے،
اس کے بعد ابوبکر کے واسطے سے ابونصر کا قول نقل کیا گیا ہے، یجوز لاہل المسجدین جمیعا
اور قاعدہ اصولیہ یہ ہے کہ جس روایت کی مخالفت خود راوی کرے وہ روایت قابلِ
احتجاج نہیں رہتی، پس ابونصر کا قول قابلِ اخذ نہ رہا، کیونکہ اس کے راوی ابوبکر نے
خود اس کی مخالفت کی ہے، (وھذا انما اذا کان ثبوت قول المروی عنہ موقوفا علی روایۃ الراوی
بخلاف ما اذا اشتہر عنہ ولم یکن موقوفا علی روایۃ الراوی کمذھب ابی حنیفۃ فانہ معروف بروایۃ الموافق و
المخالف فی اکثر المسائل فلا یقدح فیہ مخالفۃ الرواۃ عنہ فی بعض
المسائل ۱۲) اور اگر ابونصر سے اس قول کی روایت کو صحیح مان بھی لیا جاوے تو خود اس روایت
کو بوجہ ضعف دلیل کے ضعیف کہا جاوے گا، کیونکہ اس کے خلاف جو اقوال ہیں وہ لفظ فتویٰ
وغیرہ سے مؤکد و مؤید ہیں، جو اُن کی قوتِ دلیل پر دال ہے،

اور حدیث معاذ کو جو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، یہ نہایت ہی عجیب ہے، کیونکہ
حدیث معاذ تکرار تراویح کے متعلق نہیں، بلکہ اگر اس کا مطلب وہی مان لیا جاوے،
جو حافظ موصوف سمجھے ہیں تو اس سے تکرارِ فرض لازم آوے گا، کہ ایک شخص فرض نماز
پڑھ کر وہی فرض دوسری جگہ جاکر مقتدیوں کو پڑھاوے، اور اس کو حنفیہ میں سے
کسی نے بھی جائز نہیں کیا، نہ متقدمین میں سے نہ متاخرین میں سے، نہ مولانا عبد الحیؒ
صاحب نے، پس ان کا حنفیہ کے نزدیک وہ مطلب نہیں جو ظاہراً مفہوم ہوتا ہے، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذؓ حضورؐ کے پیچھے نفل کی نیت کرتے اور اپنی مسجد میں فرض کی نیت کرتے تھے اور دوسری روایت جو ھی لہ نافلۃ آیا ہے اس میں تصریح نہیں کہ یہ قول کس کا ہے، حضرت جابرؓ کا ہے یا اُن کے نیچے کے راوی کا، اگر نیچے کا راوی کا ہے تو حجت نہیں، اور حضرت جابرؓ کا ہے تو اس حالت میں حجت ہے کہ انھوں نے حضرت معاذؓ سے سنکر ایسا فرمایا ہو محض ظن اور تخمین سے نہ فرمایا ہو، اور اس میں اس قدر احتمالات ہیں تو احتمالات کے ساتھ استدلال ساقط ہے، اور بعد تسلیم کے یہ اُس وقت پر محمول ہے جبکہ تکرار فرض و وتر جائز تھا، بعد میں جب حضورؐ نے لا تصلوا بعد صلوٰۃ مثلہا ولا وتران فی لیلۃ فرماکر اس سے منع فرمادیا تو اب یہ صورت ممنوع ہوگئی،

یہ تو دلائلِ خصم کا جواب ہے، اور حنفیہ کی اصل دلیل جس کی بناء پر وہ بناء قوی علی الضعیف کو جائز نہیں کہتے حدیث الامام ضامن ہے، جو صحیح حدیث ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام مقتدی سے کم نہ ہونا چاہیے کیونکہ ادنیٰ اعلیٰ کا ضامن نہیں ہوسکتا، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ ر رمضان ۱۳۴۷ھ، الجواب صحیح، اشرف علی

تتمہ سوال وجواب مندرجہ بالا: (۱) آپ نے فتوی نمبر ۶ میں جس کے سائل احمد مکرم صاحب ہیں اور جس کی نقل ارسالِ خدمت ہے فرمایا ہے کہ اگر جواز سے مراد صحتِ صلوٰۃ ہے تو مسلّم اور اگر صحت بلاکراہت ہے تو مسلّم نہیں للدلائل التی قد ذکرناہا اولا، اور اسی فتوی کے سوال نمبر ۴ میں لکھتے ہیں کہ صحتِ صلوٰۃ میں کلام نہیں، بلکہ اس میں کلام ہے کہ صحت مع الکراہت ہے یا بلاکراہت، تو اس سے صحتِ صلوٰۃ تراویح متنازعہ فیہ مراد ہے یا نفل، اگر تراویح مراد ہے تو کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی اور اس مکروہ صورت پر عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں..... ہر جزو کا جواب صاف اور صریح قابلِ عمل دیا جاوے،

(۲) اور اسی فتوے کے سوال نمبر ۵ کے جواب میں آپ نے قاسم بن قطلوبغا کی عبارت کا جو مطلب بیان کیا ہے اسے مدلل ارشاد فرمائیے، مجوزینِ فریق کا خیال ہے کہ یہ جواب بغیر دلیل قابلِ وقعت نہیں، اس لئے اسے جواز ہی پر محمول کیا جاتا ہے؛ ضرورت اس کی ہے کہ آپ بادلیل اور بالتشریح صحیح مطلب بیان فرمائیں، اور جائز مع الکراہت کی صورت میں افضلیت ختم قرآن فی التراویح متنازعہ پر ہے



یا صورۃ تراویح کو، اسے بھی ضرور ارقام فرمائیے، اور اس میں قابلِ عمل طریقہ کونسا ہے، یا بالکل اس پر عمل کی اجازت ہی نہیں ہوسکتی،

(۳) اور آپ نے فتویٰ نمبر ۷ پر سائل محمد ایوب اسروی کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "ہمارے نزدیک دوسری مسجد میں مقتدیوں کی تراویح درست نہیں ہوتی"، اور دوسرا فتوی نمبر ۱۵ (جس کا سائل بھی محمد ایوب اسروی ہی ہے) اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اور مولانا عبد الحی صاحب نے اس صورت کو مکروہ لکھا ہے وہی صحیح ہے"۔ فتویٰ نمبر ۷ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تراویح درست ہی نہیں، اور فتویٰ نمبر ۱۵ سے ظاہر ہے کہ جائز مع الکراہتہ ہے، لہٰذا اس تعارض کو رفع فرماکر صحیح اور قابلِ عمل جواب ارقام فرمائیے؛

**الجواب**: (۱) صحت سے مراد صحتِ صلوٰۃ بطور نفل محض ہے، اور تراویح اس صورت سے ادا نہ ہوگی،

(۲) دلیل اس کی یہ ہے کہ قاضی خاں کا اس صورت (تکرار تراویح) کے متعلق قول یہ ہے، "الاصح انہ لایجوز" اور صدر شہید کا قول ہے "امام یصلی التراویح فی مسجدین علی الکمال لایجوز" اور نصاب الفقہ میں ہے "لایجوز لہ ان یفعل لان التراویح سنۃ والسنن لایتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لایکون سنۃ والفتویٰ علیٰ ذلک اھ" اور عالمگیریہ میں ہے "لو صلی التراویح مقتدیا بمن یصلی مکتوبۃ او وترا او نافلۃ الاصح انہ لایصلح الاقتداء بہ لانہ مکروہ ومخالف لعمل السلف ذکر العبارات کلہا مولانا عبد الحی فی فتاوٰہ صفحہ ۱۷۰ ج ۱ تا صفحہ ۱۷۱ ج ۱ مع الخلاصہ"

ان عبارات میں تکرار تراویح بمسجدین کا عدمِ جواز وعدمِ صحت مصرح ہے، اور علامہ قاسم بن قطلوبغا نے بھی اختلاف نقل کرنے کے بعد یہی فرمایا ہے "والاصح انہ لایصح وہو مکروہ"۔ پس اس میں لایصح کے معنی وہی ہیں جو عالمگیری اور نصاب الفقہ اور قاضی خاں وغیرہ کی عبارات میں لایجوز کے معنی ہیں، یعنی کہ تراویح مسنونہ کے طور پر یہ نماز درست اور صحیح نہ ہوگی، ہاں نفلاً صحیح ہے، اور نفل جماعت سے مکروہ ہے، اس لئے یہ نماز نفلاً مکروہ بھی ہے، قال فی جامع المضمرات قوم صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلوہا بعد ذلک یصلون فرادیٰ لانہ تطوع وصلوٰۃ التطوع بجماعۃ لیست بمستحبۃ اھ

فتاویٰ عبدالحی قلت وھو یعم الامام والمقتدی جمیعا فان الجماعۃ فی التطوع بکرہ مطلقا للامام والمقتدی فافہم،

(۳) میں نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کے قول کو غیر مقلدوں کے قول کے مقابلہ میں صحیح کہا ہے، اور اس کے اوّل و آخر میں تصریح کر دی ہے کہ مولانا کا قول بھی سلف کے خلاف ہے، سلف نے اس صورت کو غیر جائز اور غیر صحیح لکھتے ہوئے مکروہ فرمایا ہے جس کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، کہ تراویح تو درست و صحیح نہیں، ہاں نفل بکراہت صحیح ہی، میرے سب اقوال کو جمع کرنے اور غور کرنے کے بعد یہ مراد واضح ہے مخفی نہیں، اور اس باب میں صاحب نصاب الفقہ کا یہ قول "ان التراویح سنۃ والسنن لا یتکرر فی الوقت الواحد فاذا فعل ذلک لا یکون سنۃ" سب سے اقویٰ ہے، تمام فقہاء اس پر متفق ہیں، کہ اگر کوئی شخص سنتِ فجر کو دوبارہ پڑھے یا سنتِ ظہر و مغرب و عشاء کو مکرر پڑھے تو سنت صرف اوّل ہے ثانی سنت نہیں، بلکہ نفل محض ہے، اور سنتِ مؤکدہ واجب کے قریب ہی تو جب امام تراویح کا تکرار کر رہا ہے اور ثانی سنتِ مؤکدہ نہیں تو اس کے پیچھے قوم کی تراویح ادا نہ ہوگی، ہمارے نزدیک یہی راجح اور صحیح ہے، گو مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر فتویٰ اسی پر ہے اور اصح یہی ہے، اور جن فقہاء نے اسی صورت میں تراویح کو مع الکراہۃ جائز کہا ہے، ان کی مراد کراہت تحریمیہ ہی، کیونکہ اطلاقِ کراہۃ بلا قید اسی کو مقتضی ہی واللہ اعلم، ۲۱ ر ذیقعدہ ۴۷ھ

| تراویح میں ختمِ قرآن کا ثبوت | **سوال** (۲۶) ختمِ قرآن تراویح رمضان میں یا غیر اس کے |
|---|---|

نبی آخر الزمانؐ یا زمان شیخان رض (علیہم الصلوٰۃ والرضوان) میں ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہی تو ترتیبِ عثمانی پر یا کسی اور طرح پر؟

**الجواب**، تراویح میں ختمِ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً ثابت نہیں، اور نہ حضرتِ صدیق رضؓ سے صراحۃً ثابت ہی، ہاں حضرت عمر رضؓ سے ثابت ہے، کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعبؓ کو بلایا کہ سب لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے، میں چاہتا ہوں کہ تم سب کو رمضان کی راتوں میں نماز پڑھا دیا کرو، اور ظاہر ہے کہ صحابہ میں کوئی شخص بھی قدر قلیل قرآن سے عاری نہ تھا، پس اس کے معنی سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ لوگ پورا قرآن نہیں پڑھ سکتے، نیز حضرت عمر رضؓ و حضرت عثمانؓ کے



زمانہ میں تراویح اتنی دیر میں ختم ہوتی تھی کہ بعض لوگ لاٹھی پر سہارا لیتے اور سحری کے فوت ہو جانے کا اندیشہ کرتے تھے، اور بعادتِ غالبہ اتنی دیر جب ہی ہو سکتی ہے کہ امام قرآن ختم کرنا چاہتا ہو، اور حضرت عائشہ رضؓ کا غلام رمضان کی راتوں میں قرآن دیکھ کر نماز پڑھاتا تھا، (یعنی نماز سے پہلے یا نماز کے بعد قرآن دیکھ لیا کرتا تاکہ نماز میں بھول نہ ہو ۱۲) اور یہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ ختمِ قرآن کا اہتمام ہو، ورنہ وہی سورتیں پڑھتا جو خوب یاد تھیں، یہ تمام دلائل اس امر کے ہیں کہ صحابہ کو تراویح رمضان میں ختمِ قرآن کا اہتمام تھا صحابہ کے اس اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رمضان میں قرآن ختم کرتے ہوں گے، گو صراحۃً حدیثوں میں اس کا ذکر نہیں، بہرحال مسئلہ ظنیہ میں دلالت ظنیہ بھی کافی ہے، گو معارض پر حجت نہ ہو، خصوص جبکہ اس کے پاس بھی دلائل ہوں، پھر امام ابو حنیفہؒ نے ایک ختم کو سنت فرمایا ہے، اور وہ تابعی ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سلف کو اس کا اہتمام کرتے دیکھا اور سنا ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم، والبسط فی رسالتنا اعلاء السنن، ۵ ر شوال ۴۷ھ

| تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت | **سوال** (۲۷) تراویح میں حضورؐ کا ایک دو دفعہ مسجد میں |
|---|---|

آنا معلوم ہے، اور آٹھ تراویح پڑھانا، ایا باقی تمام رمضان گھر میں گذارا تھا؟ اور بیس کا ثبوت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے یا نہیں؟

**الجواب**؛ ہاں حضورؐ نے جماعت کے ساتھ صلوٰۃ تراویح بجز معدودے چند راتوں کے نہیں پڑھیں، اور اس کی وجہ بھی بتلا دی کہ یہ نماز اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہی، مجھے اس کا التزام کرنے میں اندیشہ ہے کہ یہ فرض نہ ہو جائے، پس ہر شخص اپنے گھر میں پڑھ لیا کرے، اس سے ظاہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر میں ضرور پڑھتے ہوں گے، اور ابن عباس رضؓ سے صاف طور سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں بیس رکعات پڑھتے تھے، رواہ ابن ابی شیبہ وسندہ حسن کما ذکرتہ فی الاعلاء، واللہ تعالیٰ اعلم ۵ ر شوال ۴۷ھ،

| نماز تراویح میں ایک غلطی کا حکم | **سوال** (۲۸) اگر کوئی شخص دو رکعت نماز تراویح کی نیت |
|---|---|

باندھے اور بھول کر تین رکعت پڑھ گیا تو اس کو نماز دہرانی چاہیے؟ ایسی حالت میں کہ سجدۂ سہو بھی نہ کیا ہو اور تین رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا، اور اوّل ارادہ کیا تھا کہ دو پڑھوں گا،

(۲) اگر تین پڑھنے کے بعد یاد آیا کہ پڑھنی تھی دو اور تین پڑھ چکا اور پھر وہ چار پوری کرے تو اس کی چار رکعتیں ہوئیں یا نہیں، مفصل طریق سے آگاہی بخشیں ۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

**الجواب**: (۱) جو شخص تراویح میں بھول کر تین رکعت پڑھ جاوے، اور سجدہ سہو نہ کرے اس کو دوبارہ دو رکعت تراویح کا اعادہ کر لینا چاہئے،؟

(۲) اگر دوسری رکعت پر قعدہ کیا تھا تب تو یہ چاروں رکعت تراویح شمار ہوں گی، اور اگر دو رکعت پر قعدہ نہیں تو یہ چاروں رکعت فقط دو رکعت کے قائم مقام ہوں گی، کما فی العالمگیریہ (ص ۵، ج ۱) فان اضاف الیہا رکعۃ اخریٰ کانت ھذہ الاربعۃ عن تسلیمۃ واحدۃ وان قعد فی الثانیۃ قدر التشھد اختلفوا فیہ فعلیٰ قول العامۃ یجوز عن تسلیمتین وھو الصحیح ھکذا فی فتاویٰ قاضی خان،

احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۰ر رمضان المبارک ۴۵ھ

بشرط ختم قرآن ماہِ رمضان میں نماز پنجگانہ پڑھانے کے لئے امام کے تقرر کا حکم،

**سوال** (۲۹) ایک صاحب نے ایک مستند عالم سے بذریعۂ تحریر دریافت کیا کہ تراویح ماہ رمضان میں قرآن باجرت پڑھوانا اور سماعت کرنا ایسے قرآن کے متعلق علماء کا کیا حکم ہے، عالم موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اجرت پر تراویح میں قرآن پڑھوانا اور سماعت کرانا جائز ہے، مگر امام مسجد اجرت پر مقرر کر کے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، اب اُن صاحب نے جنھوں نے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا بمشورۂ دو تین اصحاب کے جن میں سے کوئی شخص عالم نہیں ہے، اپنی رائے سے حسبِ فتویٰ آخر الذکر یعنی تقرر امام کے ایک حافظ کو پچیس روپے اجرت پر صرف ماہِ مبارک کے واسطے یعنی رویتِ ہلال ماہِ رمضان سے رویتِ ہلال ماہ شوال تک بہ حیثیت امام مقرر کیا کہ وہ پانچوں وقت کی نماز بہ حیثیت امام مسجد پڑھایا کریں، لیکن نماز تراویح میں ایک یا سوا پارہ پڑھا کریں حافظ نے اس شرط کو منظور کر لیا، یہ جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: جب تراویح میں قرآن شریف پڑھانا مشروط ہے تو جواز کی گنجائش کس طرح ہو سکتی ہے، اگر یہ شرط نہ ہوتی بلکہ فقط امام مسجد مقرر کرتے اور قرآن شریف اپنی خوشی سے بلا کسی معاوضہ کے پڑھاتے تو جائز ہو سکتا تھا، احقر عبد الکریم عفی عنہ



**نوٹ**: یہ جواب اس وقت ہو کہ یہ شرط صلب عقد اجارہ میں ہو، اور اگر خارج عقد محض وعدہ ہے تو مضائقہ نہیں، فقط الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۱۵ر رمضان ۴۸ھ

تراویح میں تکرار قل ھو اللہ الخ

**سوال** (۳۰) تراویح میں ایک رکعت میں تین مرتبہ سورۂ قل ھو اللہ احد مع بسم اللہ ختم قرآن شریف پر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**، تکرار قل ھو اللہ ختم کے وقت فی نفسہ تو مباح ہے، مگر جہاں اس کو لازم سمجھتے ہوں کہ اس کے بغیر ختم کو ناقص سمجھتے ہوں وہاں نہ کرنا چاہئے، ۲۸ر رمضان ۴۶ھ

## فصل فی ادراکِ الفریضۃ

ادراکِ فریضہ کے متعلق بہشتی گوہر کے ایک مسئلہ پر شبہ کا جواب

**سوال** (۱) بہشتی گوہر میں جماعت میں شامل ہونے کے مسائل ہیں، اس میں مغرب کے وقت دوسری رکعت کا سجدہ کر لیا ہو تو دو رکعت پہ سلام پھیر دے، مگر عالمگیریہ و در مختار میں لکھا ہے کہ نماز کو پوری کر لے؟

**الجواب**: صحیح یہی ہے کہ اگر مغرب کی دوسری رکعت کا سجدہ کر چکا ہو تو سلام نہ پھیرے، بلکہ نماز تنہا ہی پوری کرے، اور جماعت میں شامل نہ ہو کما فی الشامی ص ۴۵ ج ۲ وان فی غیر رباعی قطع واقتدیٰ مالم یسجد للثانیۃ فان سجد اتم ولم یقتد اھ وھکذا فی العالمگیریۃ، اور بہشتی گوہر میں جو اس کے خلاف ہے وہ دراصل اس کے ماخذ یعنی علم الفقہ کی غلطی ہے، اور سوال میں جو عبارت بہشتی گوہر کی طرف منسوب کی ہے وہ عبارت اس کی نہیں ہے، نقل میں احتیاط لازم ہے، فقط احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ، ۹ر شوال ۴۳ھ

## فصل فی قضاءِ الفوائت

ایک دن رات اگر بیہوش رہے تو نمازوں کی قضا واجب نہیں

**سوال** (۱) زید اگر اچھا خاصا کسی وجہ سے ایک دن رات سے زیادہ بیہوش ہو جاوے تو نماز قضا پڑھنا واجب ہے یا نہیں، اور اس بیہوشی کی حالت میں کوئی کام خلافِ شریعت ہو جاوے تو زید کو ایسی حالت میں گناہ ہوا یا نہیں؟

**الجواب**: اگر ایک دن رات سے زیادہ بیہوش رہے تو ان نمازوں کی قضا واجب نہ ہوگی، اور بیہوشی کی حالت میں اگر کوئی کام خلافِ شرع ہو جاوے گناہ بھی نہ ہوگا، واللہ اعلم، ۲۶ رجب

**حکم قضا نماز صد سالہ بطریقۂ خاص**

**سوال** (۲) ایک رسالہ میں لکھا ہے جس کی سَو سال کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں تو پانچ رکعت بڑھے، بعد سورۂ فاتحہ کے سورۂ اخلاص سات بار پڑھے تو نماز اس کی سَو سال کی ادا ہو جاوے گی، یہ صحیح ہے یا کہ نہیں؟

**الجواب**، بالکل غلط ہے، ۲۷ رشوال سنہ ۴۴ھ

**بغیر وصیت کے کوئی وارث اپنے مال سے قضا نمازوں کا فدیہ ادا کرے تو میت کے ذمہ سے نمازیں ساقط ہو جاویں گی یا نہیں؟**

**سوال** (۳) میت کے بغیر وصیت اگر کوئی وارث اپنے مال سے اس کے روزے اور نمازوں کا فدیہ ادا کر دے تو کیا میت کے ذمہ سے وہ ساقط ہو جاوینگے،

**الجواب**: ہاں اللہ تعالیٰ سے امید یہی ہے کہ معاف فرما دیں گے، ۲۴ ر ج ۲ سنہ ۴۷ھ

**استفسار متعلق فدیہ نماز**

**سوال** (۴) زید کا لڑکا عمرو انتقال کر گیا جس کے ذمہ کچھ نمازیں قضا تھیں، اب زید پچیس روپے ان نمازوں کے فدیہ میں دینا چاہتا ہے فدیہ ادا ہو جاویگا یا نہیں، اور اس فدیہ کے دینے کا کیا طریقہ ہوگا، یعنی ایک محتاج کو اگر کُل پچیس روپے دیدیئے جاویں جسکو سخت حاجت ہے، تو فدیہ ادا ہو جاوے گا یا نہیں، یا ضروری ہے کہ ایک صاع گیہوں کی قیمت روزانہ ایک فقیر کو یا پچیس روپے میں جتنے صاع بن سکیں، اتنے فقیروں کو ایک ہی روز میں دیا جاوے، غرض کہ ادائیگی کی کیا صورتیں ہوں گی، اور کونسی بہترین صورت ہوگی، بینوا توجروا؟

**الجواب**: اگر پچیس روپے کی رقم کفارہ کُل صلوات کے لئے کافی ہے تو اس رقم کو فقراء میں تقسیم کر دیا جاوے، جس میں روایات مختلف ہیں، ایک یہ کہ ایک مسکین کو سب دیدینا بھی جائز، اور ایک یہ کہ ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دینا جائز نہیں، ای لایجزیہ الاعن صوم او صلوٰۃ وحدہما، اسی طرح ایک مسکین کو نصف صاع سے کم دے تو جائز ہے یا نہیں اس میں بھی اختلاف ہے، پس احوط تفریق ہے اور تفریق میں بھی احوط یہ ہے کہ ایک مسکین کو نصف صاع سے کم نہ دے نہ زائد دے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسکین کو روزانہ ایک صلوٰۃ یا ایک صوم کا فدیہ دیتا رہے، اس طرح وہ مسکین واحد بحکم متعدد ہو جاوے گا،

قال ابن عابدین فی رسالۃ قولہ وبلا تعدد فقیر ای بخلاف نحو کفارۃ الیمین



للنص فیہا علی التعدد فلو اعطی ہنا مسکینا صاعا عن یومین جاز لکن فی البحر عن القنیۃ ان عن ابی یوسف فیہ روایتین وعند ابی حنیفۃ لایجزیہ کما فی کفارۃ الیمین وعن ابی یوسف لو اعطی نصف صاع من بر عن یوم واحد لمساکین یجوز قال الحسن وبہ ناخذ اھ ومثلہ فی القہستانی (ص ۲۱۷)

اور اگر پچیس روپے کفارہ کو کافی نہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مسکین سے کہا جائے کہ اس رقم میں سے کچھ تم کو بھی دیا جائے گا بشرطیکہ تم اس کُل روپے کو فدیہ میں لے کر پھر ہم کو ہبہ کر دو، اور اسی طرح بار بار فدیہ میں لیتے رہو، اور ہبہ کرتے رہو، مگر اس کے لئے فہیم شخص کی ضرورت ہے، جو فدیہ میں لے کر اپنے کو مالک صحیح سمجھ لے، پھر خوشی سے ہبہ کر دے اسی طرح جب وہ ہبہ کرتا رہے اور آپ فدیہ میں دیتے رہیں تو شمار کثیر کے بعد دیکھ لیا جائے کہ مسکین کے پاس بقدر کفارہ رقم پہونچ گئی یا نہیں، جب پہونچ جائے تو پھر اخیر میں اس سے بطور ہبہ کے یہ رقم لے کر بطریق مذکور تقسیم کر دی جائے، فعلنا بالضرورۃ علی احدی الروایتین وعلی الثانیۃ فیما لاضرورۃ فیہ الی اعطاء الواحد کلہ، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲ ر ذی قعدہ سنہ ۴۷ھ

**جس کے ذمہ چھ یا اس سے زائد نمازیں ہوں تو اس پر ترتیب واجب نہیں،**

**سوال** (۵) اگر کسے را نماز یکماہ یا زیادہ فوت شود، ترتیب در فوائت ساقط شود یا نہ، یعنی ایں قضاء فوائت در وقت معین نیست بجز اوقاتِ مکروہہ ہرگاہ خواہد در یک روز یا چند روز از ذمۂ خود فوائت را قضا کند بلا رعایت تقدیم و تاخیر در فوائت، چنانچہ نوشتہ لیس للقضاء وقت معین بل جمیع اوقات العمر وقت لہ، وبعض گویند از فوائت مذکورہ اولاً فجر یکماہ پس ظہر پس عصر پس مغرب پس عشاء، وگرنہ ادا نخواہد شد وبعض گویند ہر یکے را از فوائت بوقت ادا کردہ باشد تا دشوار نگردد، حکمش چیست؟

**الجواب**: صحیح یہی ہے کہ جس کے ذمہ چھ نمازیں یا اس سے زائد قضا ہوں اس کو ان کی قضا میں تقدیم و تاخیر وغیرہ کا اختیار حاصل ہے، ہاں بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے ادا کرے باقی یہ ضرور نہیں کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ہی نماز پڑھے، بلکہ اگر سب ایک ہی وقت یا ایک ہی دن میں پڑھ سکے، تو جتنی جلدی فارغ ہو جائے وہی اچھا ہے، ۶ ر رمضان سنہ ۴۸ھ

**قضا نماز و روزہ کا کفارہ اور فوت شدہ نمازوں کی تعیین کا حکم جبکہ صحیح تعداد معلوم نہ ہو**

**سوال** (۶) میت نے وصیت کی ہے کہ روزہ اور نماز کا کفارہ دیدیا جاوے، مگر تعداد روزہ تو معلوم

ہے، قضا نمازوں کی تعداد یاد نہیں، میت کا بیٹوں پر تبرعاً کفارہ دینا چاہئے اور اپنے پاس سے نہ کہ ترکہ متوفی سے کہ ضرورت اجازت ورثاء ہو، عمر میت ۵۴ سال تھی، اب یہ دریافت طلب ہے کہ کس قدر غلہ یا نقد کفارہ میں مساکین کو دیا جائے، واضح باد کہ مسماۃ تارک نماز نہیں تھی مگر کبھی قضا ہو جاتی تھی۔

الجواب: میت نے وصیت کی ہے تو میت کے مال میں سے کفارہ ادا کیا جاوے ترکہ کی تہائی تک تو کفارہ میں بدون کسی وارث کی اجازت کے دے سکتے ہیں، اور تہائی ترکہ میں ادا نہ ہو سکے، تو اس سے زائد بالغ ورثہ کی اجازت سے اُن کے مال میں سے دیویں، نابالغ وارث کے مال میں سے ہرگز نہ دیں، اور مقدار کفارہ کی ہر روزہ کے عوض صدقہ فطر کے برابر ہے، اور اسی طرح ہر نماز کے لئے صدقۂ فطر کے برابر غلہ وغیرہ دیا جاوے، اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاویں، پانچ فرض اور ایک وتر، اور نمازوں کی تعداد میں ظن غالب کا اعتبار ہے۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفی عنہ ۱۲ صفر ۴۵ھ

**میت کی طرف سے قضا نمازیں ادا کرنے کا حکم**

**سوال** (۷) ایک شخص نے ایک بیٹا چھوڑ کر انتقال کیا، اور دس وقت نماز قضا کیں، اب یہ بیٹا نماز پڑھ کر ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نمازیں قضا کر دینے سے فرض نمازیں میت کے سر سے نہ اتریں گی البتہ فدیہ دیدیا جاوے، یعنی ہر روز کی پانچ نمازوں اور ایک وتر کی بابت تین صاع فدیہ دیدیں تو امید ہے کہ قبول ہو جاوے گا، اور اگر فدیہ کی میت نے وصیت کی ہو تو ثلث ترکہ میں سے جس قدر فدیہ نکل سکے اس کا نکالنا واجب ہے، والسلام کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد عفی عنہ ۱۵ رج ۲ ۴۵ھ

**قضا نماز جماعت سے ہو سکتی ہے یا نہیں**

**سوال** (۸) اگر چند شخصوں کی کوئی نماز قضا ہو جائے تو جماعت سے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: قضا میں بھی جماعت ہو سکتی ہے، اور یہ قضا نماز جہریہ کی ہے تو جہر کرنا ضروری ہے، اور سریہ کی ہے تو قرأت سراً پڑھنا لازم ہے، مثلاً عشاء کی نماز اگر دن کو قضا پڑھے تب بھی امام کو جہر کرنا چاہئے، کما فی العالمگیریہ (ص ۷۵ ج ۱) اذا ترك صلوٰة الليل ناسيا فقضاها فى النهار وام فيها وخافت كان عليه السهو وان ام ليلاً فى صلوٰة النهار يخافت ولا يجهر فان جهر ساهيا كان عليه السهو كذا فى فتاوىٰ قاضى خان فى سجود السهو، اگر قصداً اس کے خلاف کیا تو نماز کا اعادہ واجب ہے، اور



سہواً کیا تو سجدۂ سہو واجب ہے، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۳ شعبان ۴۵ھ

# فصل فی سجود السہو

**سلام پھیر دینے کے بعد سجدۂ سہو یاد آیا تو کیا کرے؟**

**سوال** (۱) ایک شخص کی نماز میں سہو واقع ہوا، اور اُسے پھر اُس کا خیال نہ رہا اور سلام پھیر دیا، سلام کے بعد ہی پھر اُسے خیال آیا تو اس نے سجدۂ سہو کا اعادہ کیا، اس صورت میں اس کی نماز درست ہوئی یا نہیں، اور نیز اس کا سجدۂ سہو؟

الجواب: اگر سلام کے بعد بات چیت کرنے اور مسجد سے نکلنے سے پہلے سجدۂ سہو کر لیا تو نماز درست ہوگئی، اور اگر مسجد سے نکل کر یا کلام کر کے سجدۂ سہو کیا، تو نماز دوبارہ پڑھنی چاہئے، قال فی الخلاصة وان سلم وهو لا يريد ان يسجد لسهوه لم يكن تسليمه ذلك قطعاً حتى لو بدأ..... له ان يسجد وهو فى مجلسه ذلك قبل ان يقوم وقبل ان يتكلم فانه يسجد سجدتى السهو فان تكلم او خرج من المسجد لا ياتى بهما (ص ۷۳ ج ۱) والله اعلم، ۶ جمادی الاولی ۴۰ھ

**القول الحری فی مسئلۃ السجود والتحری (بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر اشکال کا جواب)**

**سوال** (۲) ان حكمكم بعدم وجوب سجود السهو على من تحرى عند كثرة شكه فى تعداد الركعات فعمل بما يوافقه التحرى من الصواب قد اشتبه علينا امره فان هذا الحكم مخالف للكتب الموجودة عند الفقير كالمختصر القدورى حاشية القدورى وكنوز الحقائق شرح كنز الدقائق وشرح منية المصلى المسمىٰ بالكبيرى وكتاب الآثار وعبارته هكذا محمد قال اخبرنا ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم فيمن نسى الفريضة فلا يدرى اربعا صلى ام ثلثا قال ان كان اول نسيانه اعاد الصلوٰة وان كان يكثرة النسيان يتحرى الصواب وان كان اكبر رايه انه اتم الصلوٰة سجد سجدتى السهو وان كان اكبر رايه انه صلى ثلثا اضاف اليها واحدة ثم سجد سجدتى السهو قال محمد وبه ناخذ وهو قول ابى حنيفة وهكذا عبارة بذل المجهود فى حل ابى داؤد وناطقة بوجوب السجود على من يعمل بالظن ولما نقل عبارة لضيق

المقام ومعنیٰ ان العمل بالظن عند عروض الشک انقص من العمل بالیقین عند عدم عروضہ والنقصان فی الفرائض والواجبات موجب لسجود السہو فان الواجب علینا ان نخرج عن عہدۃ الفرض والواجب علی سبیل التیقن حق الامکان والامصیرنا الی جابر یمکن فما وجہ قولکم بعدم وجوب السجود علی من یعمل بالظن فی بہشتی زیور وعبارتہ ھکذا،

"اگر شک کرنے کی عادت ہو اور اکثر ایسا شبہ پڑجاتا ہے تو دل میں سوچ کر دیکھے کہ دل زیادہ کدھر جاتا ہے، اگر زیادہ گمان تین رکعات پڑھنے کا ہو تو ایک اور پڑھ لے اور سجدۂ سہو واجب نہیں، الی آخرہ فالمرجو من الحضرۃ العالیۃ ان تمن بالجواب الشافی والوجہ الکافی،

الجواب المجمل؛ بہشتی زیور میں جو عمل بالتحری کی حالت میں عدم وجوب سجدۂ سہو مذکور ہے، اس کی دلیل شامی (ص ۹۰، ج ۱) باب سجود السہو کے اخیر میں اور بدائع (ص ۱۶۴ و ۱۶۵ ج ۱) و بحر (ص ۱۱۱ ج ۲) اور عالمگیری مصطفائی (ص ۸۴ ج ۱ سطر ۶) میں مسطور ہے، اس صورت میں اس کو حکم سے تعبیر کرنا جو رمحض ہے جس سے احتیاط لازم ہے، ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل بالتحری مطلقاً موجب سجود سہو نہیں بلکہ جب بقدر ادار کن تاخیر کو مستلزم ہوجائے، اس وقت موجبِ سہو ہے اور اس قدر تاخیر کی صورت میں سجدۂ سہو کا واجب ہونا بحالتِ تحری بہشتی زیور میں بھی باب سجدۂ سہو مسئلہ عاشرہ میں مذکور ہے، اور بذل المجہود میں بھی (ص ۱۴۹ ج ۲) کے اندر بدائع سے یہی نقل کیا ہے، اگو اولاً نووی وغیرہ سے اطلاق نقل کیا ہے، اور کبیری و کتاب الآثار میں جو عمل بالتحری کو مطلقاً موجبِ سہو لکھا ہے، اس کا مبنی یہ ہے کہ عروضِ شک کے بعد تحری کرنا عادۃً تاخیر قدر رکن کو موجب ہو ہی جاتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اگر تاخیر نہ ہو جب بھی سجدۂ سہو واجب ہی، کیونکہ فکرِ قلیل سے احتراز غیر ممکن ہے، تو دفع حرج کے لئے فکرِ قلیل کا عفو ہونا لازم ہے، ۲۹ ربیع الاول ۳۵ھ

الجواب المفصل؛ (اقول وباللہ التوفیق) قال فی الدر واعلم انہ اذا شغلہ ذلک الشک فتفکر قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقراءۃ ولا تسبیح وجب علیہ سجود السہو فی جمیع صور الشک سواء عمل بالتحری



اوبنی علی الاقل فتح لکن فی السراج انہ یسجد للسہو فی اخذ الاقل مطلقاً (ای سواء تفکر قدر رکن اولا ۱۲ شامی) وفی غلبۃ الظن ان تفکر قدر رکن اھ، قال الشامی قولہ لکن فی السراج الخ استدراک علی ما فی الفتح من لزوم السجود فی الصورتین[عہ] وھذا التفصیل ھو الظاھر لان غلبۃ الظن بمنزلۃ الیقین فاذا تحری ............ وغلب علی ظنہ شیء لزمہ الاخذ بہ ولا یظہر وجہ لایجاب السجود علیہ الا اذا طال تفکرہ علی التفصیل المار بخلاف ما اذا بنی علی الاقل لان فیہ احتمال الزیادۃ کما افادہ فی البحر اھ (ص ۴۹۰ ج ۱) وتعقب علیہ فی التحریر المختار بان کلام الفتح فی وجوب سجود السہو للتفکر قدر اداء رکن ولا شک انہ فی جمیع صور الشک، وان کان یجب السجود اذا بنی علی الاقل مطلقا لا لخصوص الشغل بل لہ ان وجد ولاحتمال الزیادۃ اھ (ص ۱۰۳ ج ۱) قلت کون کلام الفتح مقید بالقید التفکر قدر اداء رکن انما یظہر من کلام الدر واما کلامہ فی فتح القدیر فمطلق عنہ ونصہ قالوا اذا شک فی الفجر ان التی ھو فیہا اولی او ثانیۃ تحری فان وقع تحریہ علی شیء اتم الصلوٰۃ علیہ وسجد للسہو وکذا فی جمیع صور الشک اذا عمل بالتحری او بنی علی الاقل یسجد اھ (ص ۴۵۳ ج ۱) ولذا قال فی البحر ولم یذکر المصنف سجود السہو فی مسائل الشک تبعا لما فی الھدایۃ وھو مما لا ینبغی اغفالہ فانہ یجب السجود فی جمیع صور الشک سواء عمل بالتحری او بنی علی الاقل کذا فی فتح القدیر وترک المحقق قیداً لابد منہ مما لا ینبغی اغفالہ وھو ان یشغلہ الشک قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقراءۃ ولا تسبیح کما قدمناہ اول الباب لکن ذکر فی السراج ان فی فصل البناء علی الاقل یسجد للسہو (مطلقا) وکانہ فی فصل البناء علی الاقل حصل النقص مطلقاً باحتمال الزیادۃ فلابد من جابر وفی الفصل الثانی النقصان بطول التفکر لا بمطلقہ اھ ملخصاً (ص ۱۱۱ ج ۲) والعجب من مؤلف العالمگیریۃ انہ کیف نقل عن البحر کلام الفتح وترک القید الذی نبہ علیہ مؤلف البحر وزادہ علی کلام الفتح مع انہ نقل عن

عہ ای التحری والبناء علی الاقل ۱۲

المحیط بعد ذلک ما یفید اعتبار هذا القید ونصه واذا شک فی صلوته فلم یدر اثلاثا صلی ام اربعا وتفکر فی ذلک کثیرا ثم استیقن انه صلی ثلث رکعات فان لم یکن تفکره شغل عن اداء رکن بان یصلی ویتفکر فلیس علیه سجود السهو وان طال تفکره حتی شغله عن رکعة او سجدة او یکون فی رکوع وسجود فیطول تفکره فی ذلک وتغیر عن حاله بالتفکر فعلیه سجود السهو استحسانا هکذا فی المحیط اھ (ص ۱ ج ۸۴) وهذا کله یدل علی ان التحری لا یوجب السجود ما لم یطل التفکر، فان التحری ای غلبة الظن له حکم الیقین فی العملیات وعلیه بناء وجوب العمل بخبر الواحد المفید للظن وبالقیاس فیما لا نص فیه وهذا ظاهر لمن نظر فی الاصول فاندحض به قول السائل ان العمل بالظن عند عروض الشک انقص من العمل بالیقین عند عدم عروضه والنقصان فی الفرائض والواجبات موجب لسجود السهو الخ فانا لا نسلم ان مطلق النقصان موجب لسجود السهو والا فلا شک ان الصلوٰة الخالیة عن الوساوس والخطرات اکمل مما اشتمل علیها فهل یجب سجود السهو من عروض الوسوسة والخطرة فی الصلوٰة لکونها انقص مما لا تشتمل علیها کلا، بل النقصان الموجب له ما کان من جنس ترک الواجب او تاخیره عن محله ولیس فی العمل بالظن ترک الواجب ولا تاخیره ولا یجب علینا ان نخرج عن عهدة الفرض والواجب علی سبیل التیقن فانه لا سبیل الی ذلک اصلا بل غلبة الظن به کاف فان التیقن بطهارة الماء الذی یتوضأ به والمکان الذی یصلی فیه والثوب الذی یستر به البدن متعذر عسیر جدا وکذا التیقن بصحة صلوٰة ادیناها قبل الصلوٰة التی نحن فیها لا یتیسر اصلا وصحة البعدیة متوقفة علی صحة القبلیة فلو کان الخروج عن عهدة الفرض علی سبیل التیقن واجبا لم نقدر علی اداء صلوٰة اصلا فالواجب انما هو الخروج عن العهدة علی سبیل الظن الراجح لا غیر،

وبعد ذلک فنقول ان مسئلة بہشتی زیور متأیدة بقول الدر والشامی (ص ۱ ج ۰۹،۰) وبقول البحر (ص ۱۱۱ ج ۲) وبما ذکر فی العالمگیریة عن المحیط



(ص ۱ ج ۸۴) ففی هذه الاقوال کلها تصریح بعدم ایجاب التحری السجود الا اذا طال التفکر فیه وقد صرح بذلک ای وجوب السجود فی التحری اذا طال التفکر فی بہشتی زیور ایضا فی المسئلة العاشرة من باب سجود السهو ونصه،

اگر بالکل اخیر رکعت میں التحیات اور درود پڑھنے کے بعد شبہ ہوا کہ میں نے تین رکعتیں پڑھی یا چار اسی سوچ میں خاموش بیٹھی رہی اور سلام پھیرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ اتنی دیر میں تین دفعہ سبحان اللہ کہہ سکتی ہے، پھر یاد آ گیا کہ میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں، تو اس صورت میں بھی سجدہ سہو کرنا واجب ہے (ص ۲۷۵ طحطاوی علی مراقی الفلاح)

ومعنی قول بہشتی زیور فی مسئلة الحادیة والعشرین، اگر زیادہ گمان تین رکعت پڑھنے کا ہو تو ایک رکعت اور پڑھ لے اور سجدۂ سہو واجب نہیں ہے، اور اگر زیادہ گمان یہی ہے کہ میں نے چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں تو اور رکعت نہ پڑھے اور سجدۂ سہو بھی نہ کرے، اھ یعنی جبکہ اس سوچنے میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، جس کی دلیل مسئلہ عاشر ہے کہ وہاں اتنی مقدار تفکر کو موجب سجدۂ سہو صراحۃ کہدیا گیا ہے، تو مسئلہ نمبر ۲۱ میں سجدۂ سہو کا واجب نہ ہونا اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ تفکر میں بقدر تین مرتبہ سبحان اللہ کے دیر نہ ہو، اور اس صورت میں تحری کا موجب سجود نہ ہونا، درمختار و شامی و تحریر مختار و بحر و عالمگیری کی تصریح سے ثابت ہو چکا، کما مر وهذا القدر کاف لصحة المسئلة المذکورة فیه لان المؤلف انما التزم فیه کون المسئلة منقولة عن کتاب معتبر من کتب الفقه لا غیر، واما ان ذلک معارض بما فی المعتصر الضروری حاشیة القدوری وکنوز الحقائق شرح کنز الدقائق وبذل المجهود فالجواب عنه ان هذه لیست من کتب الفتاوی المعول علیها فی الافتاء کما لا یخفی مع ان بذل المجهود فیه تصریح بعدم ایجاب التحری سجود السهو الا اذا طال التفکر فیه ونقل عن البدائع (ص ۱۴۹ ج ۲) ونص البدائع واما بیان سبب الوجوب فسبب وجوبه ترک الواجب الاصلی فی الصلوٰة او تغییره او تغییر فرض منها عن محله الاصلی ساهیا لان کل ذلک یوجب نقصا فی الصلوٰة فیجب جبره بالسجود ویخرج علی هذا الاصل مسائل الی ان قال وعلی هذا اذا شک فی شیء من صلاته فتفکر فی ذلک حتی استیقن وهو علی وجهین اما ان طال تفکره بان کان مقدار

مایمکنه ان یؤدی فیه رکنا من ارکان الصلوٰۃ کالرکوع والسجود اولم یطل فان لم یطل تفکرہ فلا سهو علیه لانه اذا لم یطل لم یوجد سبب الوجوب الاصلی وهو ترک الواجب او تغییر فرض او واجب عن وقته الاصلی ولان الفکر القلیل مما لا یمکن الاحتراز عنه فکان عفوا دفعا للحرج وان طال تفکرہ فکذلک فی القیاس وفی الاستحسان علیه السهو وجه القیاس ان الموجب للسهو تمکن النقصان فی الصلوٰۃ ولم یوجد لان الکلام فیما اذا تذکرها انه اداها نبقی مجرد الفکر وانه لا یوجب السهو کالفکر القلیل وجه الاستحسان ان الفکر الطویل مما یؤخر الارکان عن اوقاتها فیوجب تمکن النقصان فی الصلوٰۃ فلابد من جبرہ بسجدتی السهو بخلاف الفکر القصیر اھ ملخصا (ص ۱۶۴ و ۱۶۵ ج ۱)

قلت وهذا نص صریح فی ان التفکر والعمل بالظن الغالب لا یوجب سجود السهو کما فی بہشتی زیور الا اذا طال التفکر قدر ما یمکن فیه اداء رکن قال سیدی الخلیل دام علاہ فی بذل المجهود والحدیث (ای حدیث ابی سعید وابن مسعود عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا کنت فی صلوٰۃ فشککت فی ثلاث او اربع واکبر ظنک علی اربع تشهدت ثم سجدت سجدتین وانت جالس قبل ان تسلم ثم تشهدت ایضا ثم تسلم) وان کان مطلقا لکنه مخصوص ببعض الصور وقد ثبت عنه صلی اللّٰه علیه وسلم انه لبس الخمیصة التی لها اعلام فقال اذهبوا بها الی ابی جهم واتونی بانبجانیته فانها الهتنی وفی بعض الروایات شغلتنی عن صلوٰتی وروی عن عمر بن الخطاب عند البیهقی انی لاحسب جزیة البحرین وانا قائم فی الصلوٰۃ (وعلق عنه البخاری اجهز جیشی وانا فی الصلوٰۃ ۱۲) فوقع التفکر فی هذہ الصور ولم یثبت انهما سجدا فدل ذلک علی ان مطلق التفکر لا یوجب السجود اھ بمعناہ (ص ۱۴۹ ج ۲) وحاصله ان ما ورد فی الحدیث من الامر بسجود السهو عند العمل باکبر رأیه مطلقا لیس علی اطلاقه بل مقید بطول التفکر فیه لتعذر الاحتراز عن قلیله والحرج مدفوع بالنص ولعل وجه ورود الحدیث علی صیغة الاطلاق ان عروض الشک فی مقدار الرکعات وتحری بالصواب فیه



لا یخلو فی العادة الغالبة عن طول التفکر قدر ما یؤدی فیه رکن وقصرہ نادر والنادر کالمعدوم فبنی الکلام علی العادة الغالبة وامر بالسجود عند التحری مطلقا لاسیما اذا نظرنا الی الاختلاف الواقع بین الائمة فی تحدید ادنی زمان یمکن فیه اداء رکن فعند الامام مقدار سبحان اللّٰه مرة لکونه قدر آیة قصیرة وهی ثم نظر قال الطحطاوی علی الدر قوله قدر اداء رکن ظاهرہ ولو بلا سنة وهو مقدر بسبحان اللّٰه اھ (ص ۳۰۵ ج ۱)

وقال الطحطاوی ایضا فی حاشیته علی مراقی الفلاح قوله زمن یسع اداء رکن والمراد انه یسعه بسنته وهو قدر ثلث تسبیحات وهذا مذهب الثانی وهو المختار کما فی الدر اھ (ص ۱۹۶) ولا یخفی ان الشک وتحری الصواب فیه لا یخلو عن التفکر بقدر سبحان اللّٰه مرة غالبا فیجب السجود عند الامام وعلیه یحمل ما فی کتاب الآثار والطحاوی والکبیری من ایجاب السجود عند العمل بالتحری مطلقا لکونه لا یخلو عن التفکر والاشتغال بقدر سبحان اللّٰه ولکن لما کان هذا القدر قلیلا لا یمکن التحرز عنه عادة والحرج مدفوع بالنص لم یأخذ به المشایخ واختاروا فی تقدیر الرکن قول ابی یوسف وهو قدر ثلث تسبیحات وتفصیل ذلک فی الضمیمة الثالثة للجلد الثانی لبہشتی زیور المطبوعة اخرا فلیراجع واللّٰه اعلم، ۲۹ ربیع الاول ۴۵ھ

سجدۂ سہو میں تسبیح پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

**سوال** (۳) سجدۂ سہو میں تسبیح سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب صاف طور سے تحریر فرمادیں۔

**الجواب**: سجدۂ سہو میں بھی سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنا چاہئے، اور سجدوں کی طرح اس میں بھی تسبیح مذکور سنت ہے، واللہ اعلم، ۵ ربیع الثانی ۴۵ھ

قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد اور رکعت اولیٰ وثالثہ میں جلسۂ خفیفہ سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے یا نہیں

**سوال** (۴) تکرار تشہد فی القعدۃ الاخیرۃ کا مسئلہ مزید اطمینان کے لئے منو[عہ] جاکر دوسری کتابوں میں دیکھا، عالمگیری میں تبیین سے منقول ہے، لا سهو علیه بحر الرائق میں بھی تصریح موجود ہے کہ سجدۂ سہو واجب نہیں، و نیز بحر میں لکھا ہے کہ طحاوی کے نزدیک دونوں قعدہ میں تکرار تشہد موجب سہو نہیں، مگر قعدۂ اُولیٰ کے باب میں طحاوی کے قول پر اعتماد نہیں،

عہ ایک شہر کا نام ہے ۱۲

نہ فتویٰ ہی، فتویٰ وجوب پر ہے، اور قعدۂ ثانیہ کے باب میں اختلاف منقول نہیں، اور اگر ہوا بھی تو اس پر اعتماد نہیں، احقر نے اور برادر مولوی عبدالغفار صاحب نے بھی تحقیق کی ہے مسئلہ عدم سہو صحیح تھا، احقر کو بھی اطمینان ہوگیا، محض اطلاعاً گذارش کیا گیا، حضور نے تو پہلے ہی اطمینان فرمالیا، اور جلوس بمقدار جلسۂ استراحت فی الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ کے باب میں حضور نے تحریر فرمایا "میں بمجرد جلوس سجدۂ سہو کرتا ہوں، لا لانہ ترک السنۃ بل لان فیہ التاخیر من القیام"، اس میں غور کیجئے، غور کرنے سے قلب میں یہ بات آئی کہ حضرت امام ابوحنیفہ قعدۂ اولیٰ میں درود شریف بمقدار اللّٰھم صل علیٰ محمدؐ کو موجب سہو فرماتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے، یعنی لا لان الصلوٰۃ علی النبی یوجب السہو بل لان فیہ التاخیر من القیام، واقعی فرق تو معلوم ہوتا ہے، لیکن غالباً صاحب ردالمحتار نے تاخیر کے دو درجہ قائم کئے، ایک بمقدار جلسۂ استراحت اتنی تاخیر عندالحنفیہ خلاف سنۃ ہے، نہ خلاف واجب، اور دوسرا درجہ بمقدار اللّٰھم صل علیٰ محمدؐ اتنی تاخیر خلاف واجب اور موجب سہو ہے، یا یوں کہا جاوے کہ نہوض علی القدمین عندالحنفیۃ سنت ہے، نہ واجب فمن جلس مقدار جلسۃ الاستراحۃ ولم ینہض علیٰ قدمیہ خالف السنۃ عندنا ولا سہو علیٰ من ترک السنۃ، اب کی مرتبہ انشاء اللہ متوجہ ہوکر فتح القدیر اور بحرالرائق وغیرہ دیکھونگا جو نکلے گا انشاء اللہ عرضِ خدمتِ عالی کروں گا، پھر جو حضور فرمادیں گے اس پر عمل کروں گا، یوں تو تقلیداً اب بھی عمل کرسکتا ہوں، لیکن تحقیق کے بعد اور اچھا ہوگا غالباً،

الجواب، اقول وباللہ التوفیق، رکعت اول وثالثہ میں شامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بمجرد جلوس بمقدار جلسۂ خفیفہ سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، بلکہ جلسۂ طویلہ سے واجب ہوتا ہے، ونصہٗ - وکذا القعدۃ فی اخر الرکعۃ الاولیٰ او الثالثۃ فیجب ترکہا ویلزم من فعلہا ایضاً تاخیر القیام الی الثانیۃ او الرابعۃ عن محلہ وھذا اذا کانت القعدۃ طویلۃ اما الجلسۃ الخفیفۃ التی استحبہا الشافعی فترکہا غیر واجب عندنا بل ھو الافضل کما سیاتی اھ (ص ۴۸۹ ج ۱) وقال فی الدر ویکبر للنہوض علیٰ صدور قدمیہ بلا اعتماد وقعود استراحۃ ولو فعل لاباس بہ اھ قال الشامی قال فی الکفایۃ اشار بہ الی خلاف الشافعی فی موضعین احدھما یعتمد بیدیہ علیٰ رکبتیہ عندنا وعندہ علی الارض والثانی الجلسۃ



الخفیفۃ قال شمس الائمۃ الحلوانی الخلاف فی الافضل حتیٰ لو فعل کما ھو مذھبنا لاباس بہ عند الشافعی ولو فعل کما ھو مذھبہ لاباس بہ عندنا کذا فی المحیط قال فی الحلیۃ والاشبہ انہ سنۃ او مستحب عند عدم العذر فیکرہ فعلہ تنزیہاً لمن لیس بہ عذر اھ وتبعہ فی البحر والیہ یشیر قولہم لاباس فانہ یغلب فیما ترکہ اولیٰ اقول ولاینافی ھذا ما قدمہ الشارح فی الواجبات حیث ذکر منہا ترک قعود قبل ثانیۃ ورابعۃ لان ذاک محمول علی القعود الطویل ولذا قیدت الجلسۃ ھنا بالخفیفۃ تامل اھ (ص ۵۳۶/ج ۱) ھذا واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۳ر شعبان ۴۳ھ

واما مسئلۃ تکرار التشہد فتحقیق السائل فیہ صحیح انہ یجب سجدۃ السہو لو کرر فی القعدۃ الاولیٰ ولا تجب لو فی الاخیرۃ قال فی شرح المنیۃ لو قرأ التشہد مرتین فی القعدۃ الاخیرۃ او تشہد قائماً ای فی الاخریین او فی الاولیٰ قبل الفاتحۃ ۱۲) او راکعاً او ساجداً لاسہو علیہ کذا فی المختار ولو زاد فی التشہد فی القعدۃ الاولیٰ علی التشہد شیئاً یجب علیہ سجود السہو وان المعتبر مقدار ما یؤدی فیہ رکن اھ ملخصاً (ص ۴۳۴) واللہ اعلم

۲۸ر شعبان ۴۳ھ

## سوال (۵)

مغرب کی نماز میں امام کا بھول کر چوتھی رکعت کے لئے قیام کرنا،

امام نے مغرب کی تینوں رکعتیں پڑھیں، اور قعدۂ اخیرہ بھی کرلیا، مگر بھول کر کے امام نے یہ سمجھا کہ دو رکعتیں ہوئی ہیں، اب امام پھر چوتھی رکعت کے لئے کھڑا ہوگیا، اور نہ کسی مقتدی نے بتلایا، اور سب مقتدی بھی امام کے ہمراہ کھڑے ہوگئے، مگر ایک مقتدی امام کے ساتھ نہیں کھڑا ہوا بلکہ قعدہ ہی میں بیٹھا رہا، جب امام نے چوتھی پڑھ لی اور سجدۂ سہو بھی کرلیا، اب امام کے ساتھ اس آدمی نے بھی سلام پھیرا، جو چوتھی رکعت کے واسطے نہیں کھڑا ہوا تھا، اب اس صورت میں اس آدمی کی نماز ہوجاویگی یا نہیں؟ کیونکہ اس نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت میں اتباع نہیں کی ہے، فقط بینوا توجروا؟

الجواب، فی الدرالمختار (وان قعد فی الرابعۃ) مثلاً قدر التشہد

(ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح ثم الاصح ان القوم ینتظرونہ فان عاد تبعوہ وان سجد للخامسۃ سلموا لانہ تم فرضہ اذ لم یبق علیہ الا السلام وقال الشامی (قولہ مثلا) ای قعد فی ثالثۃ الثلاثی او فی ثانیۃ الثنائی (قولہ ثم الاصح الخ) لانہ لا اتباع فی البدعۃ وقیل یتبعونہ مطلقا عاد اولا (قولہ فان عاد) ای قبل ان یقید الخامسۃ بسجدۃ تبعوہ ای فی السلام (ص ۴۸۲ ج ۱) وھکذا فی مراقی الفلاح مع الطحطاوی (ص ۲۷۲)

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حالت مذکورہ فی السوال میں اصح یہی ہے کہ امام کی اتباع چوتھی رکعت میں نہ کی جاوے، بلکہ منتظر بیٹھا رہے، اگر امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرنے سے پیشتر بیٹھ کر سلام پھیرے تو مقتدی اس کے ہمراہ سلام پھیرے ورنہ جب امام چوتھی رکعت کا سجدہ کرے اس وقت مقتدی خود سلام پھیر دے، پس اس بیٹھنے والے شخص نے یہ تو ٹھیک کیا کہ چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا، لیکن چوتھی رکعت میں سجدہ کرنے کے بعد امام کے سلام کا انتظار نہ کرنا چاہئے تھا، لیکن اس تاخیر سے نماز فاسد نہیں ہوئی، غایت مافی الباب قول اصح پر تاخیر سے سجدۂ سہو آتا، مگر چونکہ اس نے بعد میں سلام میں امام کا اتباع کیا ہے اس لئے اس کا وہی حکم ہے جو وجوب سجدۂ سہو بر مقتدی کا حکم ہے، اور جن لوگوں نے امام کے ساتھ چوتھی رکعت پڑھی ان کی نماز قول ثانی پر جو اصح کا مقابل ہے صحیح ہوگئی بشرطیکہ امام نے سجدۂ سہو کر لیا ہو، اور گو یہ روایت اصح نہیں مگر اس وقت عموم جہل و بلوی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دینا مناسب ہے، ورنہ بہت لوگوں کی نمازیں باطل ہوں گی، واللہ اعلم، ۲۲ جمادی الثانی ۴۳ھ

امام نے بدون وجوب کے سجدۂ سہو کیا تو نماز فاسد ہو جاوے گی یا نہیں،

**سوال** (۶) جس حالت میں سجدۂ سہو لازم نہ آوے اور سجدۂ سہو کر لیا گیا تو پھر نماز میں کچھ خلل تو نہیں آتا؟

**الجواب**: نماز ہو جاتی ہے، لیکن اگر امام نے ایسا کیا کہ وجوب سجدۂ سہو کے گمان پر سجدۂ سہو کر لیا اور بعد میں معلوم ہو گیا، کہ سجدۂ سہو واجب نہ تھا، تو اس صورت میں مسبوق کی نماز میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مسبوق پر اعادہ ہے، جبکہ اس نے سجدۂ سہو میں متابعت کی ہو، اور بعض کے نزدیک اعادہ نہیں، اور اعادہ واجب نہ ہونے پر فتویٰ ہے، اذا ظن الامام ان علیہ سھوا فسجد للسھو وتابعہ المسبوق فی ذلک



ثم علم ان الامام لم یکن علیہ سھو فیہ روایتان واختلف المشایخ لاختلاف الروایتین واشھرھما ان صلوٰۃ المسبوق یفسد وقال الامام ابو حفص الکبیر لا یفسد والصدر الشھید اخذ بہ فی واقعاتہ وان لم یعلم ان لیس علیہ سھو لم یفسد صلوٰۃ المسبوق عندھم جمیعا خلاصۃ الفتاویٰ (ص ۱۶۴ ج ۱)

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۱۲ ذیقعدہ ۴۲ھ　　کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ

تشہد میں سہواً بسم اللہ پڑھ لی تو سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا

**سوال** (۷) مغرب کی دوسری رکعت میں التحیات سے پہلے بسم اللہ شریف سہواً پڑھ جانے سے سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

**الجواب**: تشہد ابن مسعودؓ واجب نہیں بلکہ اولیٰ ہے، پس اگر تشہد دوسرے طرق مرویہ کے موافق پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے، اور بعض طرق میں بسم اللہ کی زیادت بھی ہے، لہٰذا سجدۂ سہو تو نہ ہوگا، مگر ایسا کرنا اچھا نہیں، اب اگر محض بسم اللہ زیادہ کیا تو یہ تو جائز ہے، "لکونہ واردًا" اور اگر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" زیادہ کیا تو اس میں کراہت تنزیہی ہوگی، "لکونہ غیر وارد" اور سجدۂ سہو نہ ہوگا، لکونہ زیادۃ فی التشہد لا علی التشہد واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ　الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۵ ذی الحجہ ۴۳ھ

تکرار اکثر فاتحہ اور اعادۂ تشہد سے سجدۂ سہو کا واجب ہونا

**سوال** (۸) نماز میں اوّل یا ثانی رکعت میں سورۂ فاتحہ میں کوئی کلمہ غلطی سے پڑھا گیا یا شک ہوا اس کلمہ میں غلط پڑھنے کے بعد قرأت کثیر سورۂ فاتحہ کا اعادہ کیا، قرأت کے ماقبل کلمہ مذکورہ سے واسطے تصحیح کلمۂ مذکورہ کے جس سے تکرار کثیر سورۂ فاتحہ کا لازم آیا کیا یہ تکرار جو واسطے تصحیح کلمۂ مذکورہ کے ہے عذر واسطے رفع کراہت تکرار کثیر سورۂ فاتحہ کے ہو سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں ہو سکتا تو ہر نماز کا اعادہ واجب ہوگا یا سجدہ سہو کا؟

اسی طرح قعدۂ اولیٰ میں تشہد کا کوئی کلمہ غیر صحیح پڑھا گیا یا شک ہوا کہ غیر صحیح پڑھا گیا، پھر چند کلمات کے ساتھ اس کلمہ کو تصحیح کے لئے اعادہ کیا، ماقبل اس کلمہ کے، کیا یہ اعادہ زیادتی فی التشہد کے حکم میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو پھر اعادۂ نماز ہوگا یا سجدۂ سہو؟

**الجواب**: فی العالمگیریۃ (ص ۸۰ ج ۱) ولو کررھا فی الاولیین یجب علیہ سجود السھو بخلاف ما لو اعادھا بعد السورۃ او کررھا فی الاخریین

کذا فی التبیین، ولو قرأ الفاتحۃ الا حرفًا او قرأ اکثرھا ثم اعادھا ساھیا فھو بمنزلۃ ما لو قرأھا مرتین کذا فی الظھیریۃ (۲) وفی الطحطاوی علی المراقی ص ۲۵۰، ولو شک فی تکبیرۃ الافتتاح فاعاد۔۔ التکبیر والثناء ثم تذکر کان علیہ السھو ولا یکون الثانیۃ استقبالًا وقطعًا للاولیٰ، (۳) وفی العالمگیریۃ (ص ۱۸۱ ج) ولو کرر التشھد فی القعدۃ الاولیٰ فعلیہ السھو،

روایت اولیٰ سے معلوم ہوا کہ اگر سورۃ سے قبل فاتحہ کا تکرار کیا جاوے تو موجب سہو ہے، اور بعد سورۃ کے اعادہ فاتحہ کا موجب سہو نہیں، ونیز یہ معلوم ہوا کہ اگر اکثر فاتحہ پڑھ کر اعادہ کیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور اگر اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا تو اعادہ سے سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا، باقی رہی یہ بات کہ سورۂ فاتحہ کل یا اکثر پڑھنے کے بعد کتنی فاتحہ کے اعادہ سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، سو اس کی تصریح نہیں ملی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بعض اقل فاتحہ پڑھ کر اس کا اعادہ موجب سہو نہیں، اسی طرح اکثر یا کل پڑھ کر بھی اقل کا اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، لیکن جزئیہ نہیں ملا، لیکن طحطاوی علی مراقی الفلاح کی اس عبارت سے متبادر یہ ہے کہ مطلقاً بعض فاتحہ کا تکرار بھی مثل کل فاتحہ کے تکرار کے موجب سہو ہے، لیکن اس بعض مطلق کو آیۃ واحدہ کے ساتھ مقید کیا جاوے گا، کیونکہ اس سے قلیل تو غیر معتبر ہے قال ولو کرر الفاتحۃ او بعضھا فی احدی الاولیین قبل السورۃ سجد للسھو اھ (ص ۲۶۷ ج ۱) وفی الدر فی بیان واجبات الصلوٰۃ وھی قرأۃ فاتحۃ الکتب فیسجد للسھو بترک اکثرھا لا اقلھا لکن فی المجتبیٰ یسجد بترک آیۃ منھا وھو اولیٰ قلت وعلیہ فکل آیۃ واجبۃ ککل تکبیرۃ عید واتیان کل وترک تکریر کل اھ (ص ۴۷۷ ج ۱) قلت فلما کان کل آیۃ منھا واجبا فتکرار آیۃ منھا یوجب سجود السھو لکونہ تاخیرا فی الواجب الثانی ای تاخیر للایۃ الثانیۃ عن محلھا واللہ اعلم وفی شرح المنیۃ وکذا لو قرأ الفاتحۃ الا حرفا ثم اعادھا لا سھو علیہ کذا فی الخلاصۃ (ص ۴۳۳) قال الشیخ وھذا راجح عندی ویمکن ارجاع کلام الطحطاوی الیہ قلت ولکن لم ینشرح بہ صدری[عہ] بعد ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا، واللہ اعلم ۱۲ ظ

عہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ،



اور روایت ثانیہ سے معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے اعادہ کی صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یاد آجاوے کہ پہلے صحیح پڑھا تھا تو وہ تکرار موجب سہو ہے ورنہ نہیں،

اور روایت ثالثہ سے تشہد کے اعادہ کا بھی موجب سہو ہونا معلوم ہوا، اور فاتحہ پر قیاس کر کے یہاں تفصیل مذکور ہوگی، ہر حال میں اعادہ موجب سہو نہ ہوگا، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ جب مقدار رکن کا اعادہ ہوجائے تو سجدۂ سہو ہوگا، واللہ اعلم، عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح ظفر احمد، عفا عنہ ۱۲ر رمضان ۴۴ھ

**سوال (۹)** ............ منفرد سجدۂ سہو کے لئے ایک طرف سلام پھیرے یا دونوں طرف؟

..... منفرد کو سجدۂ سہو لازم ہوا، تو ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرے یا دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرے، اس میں صحیح قول کونسا ہے، معلوم کرادیں، کیونکہ در مختار کی عبارت سے دو کے سلام کے بعد سجدۂ سہو نہ کرنے معلوم ہوتا ہے کہ دو سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو ساقط ہو جاتا ہے، نماز پھر ..... پڑھنے کو کہا جاتا ہے، اس واسطے آپکو تکلیف دی جارہی ہے، برائے کرم مہربانی فرما کر جواب جلد عنایت فرمائیے گا،

**الجواب**: در مختار میں ایک قول کی بناء پر یہ کہا ہے، کہ سجدۂ سہو کے لئے اگر دونوں طرف سلام پھیر دے تو پھر سجدۂ سہو ساقط ہے، مگر فتویٰ اس پر نہیں، بلکہ فتویٰ اس پر ہے کہ سجدۂ سہو کے لئے سلام تو ایک ہی طرف پھیرے، لیکن اگر دونوں طرف سلام پھیر دے تب بھی سجدۂ سہو ساقط نہیں ہوا بلکہ وہ سجدۂ سہو دونوں طرف

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) عہ ووجہ عدم الانشراح کون ما فی الظھیریۃ مخالفا صریحا کما مر ذکرہ فانہ اوجب السھو فی اعادۃ الفاتحۃ بعد قرأۃ اکثرھا وشارح المنیۃ لا یوجبہ ولو قرأ کلھا الا حرفا ولا شک ان الاحتیاط فی ایجاب السھو والذی یظھر لی ان ما فی الظھیریۃ ایضًا لا یوافق قول الامام بل ھو مبنی علی قولھما فان الواجب عندھما اکثر الفاتحۃ وعند الامام کل آیۃ منھا واجبۃ کما ذکرہ فی الدر فینبغی ایجاب السھو بتکرار آیۃ منھا کما یدل علیہ کلام الطحطاوی المار قد جعلت الشافعیۃ ترتیب آیات الفاتحۃ والموالاۃ بینھا شرطا وعدوا کل آیۃ منھا رکنا فالاحوط ما قالہ فی الدر ان کل آیۃ منھا واجبۃ واذا کان کذلک فتکرار آیۃ منھا یوجب التاخیر فی الثانیۃ وھی واجبۃ فیجب السھو لتاخیر الواجب ۱۲ ظ

سلام کے بعد بھی کر سکتا ہے اور اعادہ واجب نہیں، ووجهه ما فی رد المحتار وقیل یأتی بتسلیمتین وهو اختیار شمس الائمة وصدر الاسلام اخی فخر الاسلام وصححه فی الهدایة والظهیریة والمفید والینابیع وکذا فی شرح المنیة قال فی البحر وعزاه ای الثانی فی البدائع ای عامتهم فقد تعارض النقل عن الجمهور اھ (ص ۲ ج ۱۷۷) فاذا کان مختار هؤلاء الاعلام ان یأتی بسجود السهو بعد تسلیمتین لزم عدم سقوط السجود بهما ولکن الاحوط الاحتراز عن التسلیمتین خروجا من الخلاف فقد قال بعض من قال بتسلیمة واحدة فقط بسقوطه بهما قال الشامی قلت وعلیه فیجب ترک التسلیمة الثانیة اھ (ص مذکور) قلت ووجه جوازا لتسلیمتین اطلاق قوله صلی اللّٰه علیه وسلم سجدتا السهو بعد السلام وهو حسن والاطلاق ما فی الصحیح انه صلی اللّٰه علیه وسلم سها فلما قضی صلاته سلّم ثم سجد وسلّم والمطلق ینصرف الی المعهود منه والبسط فی الاعلاء، واللّٰه اعلم، ۳ رجمادی الثانی ۴۶ھ

شبہ ترکِ واجب پر سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟

**سوال** (۱۰) نماز میں ترک واجب کے شبہ پر ترکِ واجب نہ ہونے کا ظن غالب ہوتے ہوئے احتیاطاً سجدۂ سہو کرلینا جائز ہے یا نہیں، جبکہ ایسے شبہات اکثر ہوتے ہوں؟

**الجواب**: جب ظن غالب عدمِ ترکِ واجب کا ہے تو سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں، لیکن اگر احتیاطاً کرلے تو منفرد کے لئے تو حرج نہیں، لیکن امام کو بلاضرورت احتیاطی سجدہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے مسبوق کی نماز پر فساد لازم آئے گا، علی قول البعض والخروج من الخلاف اسلم، ۲۶ رشعبان ۴۶ھ

فرض اور نفل کے قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد پر وجوبِ سجدۂ سہو کے متعلق بہشتی زیور اور الامداد کی عبارتوں میں اختلاف کی تطبیق

**سوال** (۱۱) الامداد بابت ذی الحجہ ۴۳ھ کے صفحہ ۴ میں بعنوان تصحیح مسئلہ حاشیہ پر یوں درج ہے، "الامداد بابت ذیقعدہ صفحہ ۱۸، س ۱۱ تا ۱۸ میں جو ایک سوال کے جواب میں لکھا ہوا ہے کہ التحیات کے مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم ہوگا، طحطاوی



شرح مراقی الفلاح سے یہ جواب غلط ثابت ہوا ہے، اس جواب سے رجوع کرتا ہوں، صحیح جواب یہ ہے "قعدۂ اولیٰ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم ہے، اور قعدۂ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں،" تمام ہوئی یہ عبارت، بہشتی زیور جدید حصہ دوم صفحہ ۵۴ میں آخری مسئلہ ہے، نفل نماز میں دو رکعت نماز پڑھ کر التحیات کے ساتھ درود شریف بھی پڑھنا جائز ہے، اس لئے کہ نفل ہے، درود شریف کے پڑھنے سے سجدۂ سہو نہیں ہوتا، البتہ اگر دو دفعہ التحیات پڑھ جاوے تو نفل میں بھی سجدۂ سہو واجب ہے، تمام ہوئی عبارت بہشتی زیور کی،

وجہ تطبیق دونوں مسئلوں کی کس طرح ہے، وجہ اشتباہ یوں ہے کہ بہشتی زیور کی عبارت سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعت کے بعد التحیات کو مکرر پڑھ جانے سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، اور نفل کی ہر دو رکعت کا قعدہ حکم میں مثل اخیری قعدہ کے ہے اور الامداد کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں التحیات مکرر پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں، حالانکہ تاخیرِ سلام سے بھی سہو کا سجدہ واجب ہے،

اس لئے دونوں کی وجہ تحریر فرمائی جاوے، تاکہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہوجاوے.....

.....................................

**الجواب**: قعدۂ اخیرہ میں تکرار تشہد سے سجدۂ سہو واجب نہ ہونا، جیسا کہ حاشیہ الامداد میں طحطاوی سے لکھا ہے، عالمگیریہ اور منیہ میں بھی موجود ہے، بلکہ طحطاوی نے منیہ ہی سے نقل کیا ہے، باقی رہا یہ شبہ کہ تاخیرِ سلام سے سجدۂ سہو واجب کیوں نہیں ہوا اس کا جواب بھی طحطاوی سے معلوم ہوتا ہے، ونصه هکذا وان قرأ بعد التشهد فان کان فی الاول فعلیه السهو لتاخیر الواجب وهو وصل القیام بالفراغ من التشهد وان کان فی الاخیر فلا سهو علیه لعدم ترک واجب لانه موضع له فی الدعاء والثناء بعده فیه والقراءة تشتمل علیهما ولو قرأ التشهد مرتین فی القعدة الاخیرة او تشهد قائما او راکعا او ساجدا لا سهو علیه، منیة المصلی طحطاوی (ص ۲۶۷)، اس سے معلوم ہوا کہ قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد قرآت سے سجدۂ سہو واجب نہ ہونے کی وجہ قرآت کا ثناء ودعاء پر مشتمل ہونا ہے، اور تشہد ثناء ودعاء پر مشتمل ہے، اس لئے اس سے بھی سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا، چنانچہ منیہ کی عبارت مذکورہ

قراءۃ التشہد الخ کے تحت میں شارح منیہ کبیری میں لکھتے ہیں واما التشہد فلانہ ثناء والقیام والرکوع والسجود محل الثناء، پس تاخیرِ سلام موجب سہو وہ ہی جو بغیر الدعاء والثناء ہو، سوال کے ایک جزو کا جواب تو ہو چکا، اب دوسرے جزو کا جواب معروض ہے، وہ یہ کہ بہشتی زیور میں جو نفل کے قعدۂ اولیٰ میں تکرار تشہد سے وجوب سجدۂ سہو لکھا ہے، اس کو خاکسار نے بہت تلاش کیا، مطبوعہ جدید میں جو حوالہ لکھا گیا ہے اس کو بھی دیکھا، اس جزو کے متعلق اس مقام پر کچھ نہیں ملا، غالباً فرض پر قیاس کرکے اس کو لکھ دیا گیا اور اس پر جو آپ نے محذور بیان فرمایا ہے، وہ تو متوجہ نہیں ہوتا، کیونکہ نفل میں قعدہ فرض ہے، جس پر نماز ختم کی جاوے، جیسا کہ درمختار میں ہے (او) صلی اربعا فاکثر ولم یقعد بینہما) استحساناً لانہ بقیامہ جعلہا صلوٰۃ واحدۃ فتبقی واجبۃ والخاتمۃ ھی الفریضۃ (شامی، ص ٢٨، ج ١) لیکن یہ شبہ ہے کہ نفل کے قعدۂ اولیٰ میں جب درود شریف کی اجازت ہے، تو تکرار تشہد کو فرض پر قیاس کرکے وجوب سجدہ کس طرح ہوگا، اس لئے جب تک کوئی صریح جزئیہ نہ مل جاوے تکرار تشہد سے نوافل کے قعدۂ اولیٰ میں سجدۂ سہو کو واجب نہ کہا جاوے گا واللہ اعلم، کتبہ احقر عبدالکریم عفی عنہ ١٦؍ صفر ۴۵ھ

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو حوالہ جات میں نے لکھے ہیں اپنے مسودہ کو اس مقام پر میں نے دیکھا تو وہاں تصریح موجود ہے، کہ نفل کے قعدۂ اولیٰ میں تکرار تشہد سے وجوب سجدۂ سہو کا جزئیہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، اور بظاہر یہ قواعد کے بھی خلاف ہے، کیونکہ نوافل میں ہر شفعہ مستقل نماز ہے، اور اس کا قعدۂ اولیٰ بحکم قعدۂ اخیرہ ہے، البتہ سنن مؤکدہ اور وتر کا حکم مثل فرائض کے ہے، نہ معلوم کیا غلطی ہوئی کہ میری اس تحریر کے بعد بھی بہشتی زیور کے مسئلہ میں ترمیم نہ ہوئی نہ میری عبارت لکھی گئی، صرف حوالہ جات ہی لکھ دیئے گئے، النور میں اس غلطی کی اطلاع کردی جاوے گی، اور آئندہ طبع میں انشاء اللہ اصلاح بھی ہوجاوے گی، فقط ١٩؍ صفر ۴۵ھ از تھانہ بھون،

| مسبوق نے نماز مغرب میں درمیانی قعدہ ترک کر دیا تو اس پر سجدۂ سہو ہے یا نہیں؟ |

**سوال** (١٢) مغرب کی ایک رکعت امام کے ساتھ ملی، دو رکعت پوری کرنے میں درمیان کا قعدہ رہ گیا، تو سجدۂ سہو کرے یا نہیں، اگر قصداً قعدہ چھوڑ دے تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟



**الجواب**، یہ قعدہ قول معتمد پر واجب ہے، اس کو قصداً ترک نہ کیا جاوے، البتہ اگر سہواً رہ گیا تو سجدۂ سہو واجب نہیں، فی الشامی (ص ٦٢٤ ج ١) قال فی شرح المنیۃ ولو لم یقعد جاز استحساناً لا قیاساً ولم یلزمہ سجود السہو لکون الرکعۃ اولیٰ من وجہ ١٥؍ رمضان ۴۸ھ

| امام دعاء قنوت چھوڑ کر رکوع کو جائے تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ |

**سوال** (١٣) اگر وتر کی جماعت میں امام بجائے تکبیر کے رکوع میں چلا جائے یعنی دعاء قنوت سے قبل والی تکبیر اور دعاء قنوت دونوں بھول گیا، رکوع میں چلا گیا، تو امام کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؟

**الجواب**، اس وقت رکوع کو پورا کرے، اور پھر سجدہ وغیرہ کرکے بعد سجدۂ سہو کرے، رکوع سے کھڑا ہوکر قنوت نہ پڑھے، احقر عبدالکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا اللہ عنہ ٥؍ شوال ۴۸ھ

| وتر میں سہو کی ایک صورت کا حکم |

**سوال** (١۴) نماز وتر میں ایک دفعہ اس طرح سہو ہوا کہ دو رکعت کے بعد قعدہ میں خیال ہوا کہ شاید تیسری رکعت کے قیام میں دعاء قنوت نہیں پڑھی تھی، اس لئے سجدۂ سہو کرلیا، مگر پھر یاد آگیا کہ ابھی تک ایک رکعت باقی ہے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے تیسری رکعت پوری کرلی، اور دو سجدۂ سہو کرکے سلام پھیرا گیا اس طرح یہ نماز درست ہوگئی، کیا سجدۂ سہو کے بعد پھر سہو ہوجاوے تو اس کے لئے دوسرا سجدۂ سہو کرلینا درست ہے،

**الجواب**، ہاں نماز درست ہوگئی، اور اس حالت میں سجدۂ سہو دوبارہ کرنا ضروری ہے، پہلا سجدہ جو کیا تھا وہ بے موقع تھا، فی الدرالمختار ردا اصلی رکعتین وسہا فیہما فسجد لہ بعد السلام ثم اراد بناء شفع علیہ لم یکن لہ ذلک البناء ای لہ تحریما لئلا یبطل سجودہ بلا ضرورۃ (بخلاف المسافر) اذا نوی الاقامۃ لانہ لو لم یبن بطلت (ولو فعل ما لیس لہ) من البناء (صح) بناءہ لبقاء التحریمۃ ویعید) ہو والمسافر سجود السہو علی المختار لبطلانہ بوقوعہ فی خلال الصلوٰۃ وفی الشامی (قولہ بخلاف المسافر الخ) ای لو کان مسافراً فسجد للسہو ثم نوی الاقامۃ فلہ ذلک لانہ لو لم یبن وقد لزم الاتمام بنیۃ الاقامۃ بطلت صلوٰتہ وفی البناء نقض لہ وہو ادنیٰ فیتحمل دفعاً للاعلیٰ (بحر ص ٤٨٣) قلت والصورۃ

المسئولۃ نظیر صلوٰۃ المسافر کما لا یخفی وفی الشامیۃ ایضا رص ۵۰۰ عن التتارخانیۃ ان السہو ان وقع فی اصل الصلوٰۃ اوجب فسادھا وان فی وصفہا فلا فالاول کما اذا سلم علی الرکعتین علی ظن انہ فی الفجر او الجمعۃ او السفر والثانی اذا سلم علیہما علی ظن انہا رابعۃ اھ، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۱ر شوال ۵۸ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

**قعدۂ اُولیٰ یا ثانیہ میں قبل تشہد یا اس کے بعد فاتحہ وغیرہ پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟**

سوال (۱۵) اگر قعدۂ اُولیٰ یا ثانیہ میں تشہد سے پہلے یا بعد میں فاتحہ، قرآن کی ایک آیت یا دو آیت پڑھ جائے تو سجدۂ سہو لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: قعدۂ اُولیٰ میں بہرحال لازم ہے، اور ثانیہ میں تشہد سے پہلے پڑھے تو واجب ہے ورنہ نہیں، قال الطحطاوی فی حاشیۃ مراقی الفلاح ولو قرأ آیۃ فی الرکوع او السجود او القومۃ فعلیہ السہو (وفی البحر عن البدائع لا سجود علیہ قال صاحب البحر ولکن ما فی الظہیریۃ ان علیہ السہو اولیٰ) ولو قرأ فی القعود ان قرأ قبل التشہد فعلیہ السہو لترک الواجب وھو الابتداء بالتشہد اول الجلوس وان قرأ بعد التشہد فان کان فی الاول فعلیہ السہو لتاخیر الواجب وھو وصل القیام بالفراغ من التشہد وان کان فی الاخیر فلا سہو علیہ لعدم ترک واجب لانہ موسع لہ فی الدعاء والثناء بعدہ فیہ والقراءۃ تشتمل علیہما اھ ص ۲۶۷ واللہ اعلم، ۱۲ر شوال ۵۸ھ

# فصل فی سجود التّلاوۃ

**نماز میں سجدۂ تلاوت کے بجائے رکوع کا کافی ہوجانا اور اس کی شرائط،**

سوال (۱) سجدۂ تلاوت کی بجائے نماز میں رکوع کافی ہے؟ اور سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بلا کچھ آگے قرأت کئے ہوئے رکوع جائز ہے؟

الجواب: نماز میں سجدۂ تلاوت کے بجائے رکوع کافی ہے بشرطیکہ رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت بھی کرلے، اور سجدۂ نماز میں بدونِ نیت کے بھی کافی ہے، مگر رکوع و سجود صلوٰۃ اسی وقت سجدۂ تلاوت کے بجائے کافی ہیں جبکہ آیت سجدہ کے بعد فوراً یا ایک دو آیت پڑھ کر رکوع کردے، اگر سجدہ کی آیت کے بعد تین آیتیں پڑھ کر رکوع کیا تو سجدۂ تلاوت ادا نہ ہوگا، اور سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بدون کچھ آگے قرأت کئے رکوع کردینا مکروہ ہے، اور ظاہر کراہت تحریمیہ ہے، قال فی مراقی الفلاح ویجزی عنہا ای عن سجدۃ التلاوۃ رکوع الصلوٰۃ ان نواہا ای نوی اداءھا فیہ نص علیہ محمد رای علی اشتراط النیۃ ط) ویجزی عنہا ایضا سجودھا ای سجود الصلوٰۃ وان لم ینوھا ای التلاوۃ اذا لم ینقطع فور التلاوۃ (مرتبط فی الرکوع والسجود جمیعا ط) وانقطاعہ بان یقرأ اکثر من آیتین بعد آیۃ سجدۃ التلاوۃ بالاجماع وقال شمس الائمۃ الحلوانی لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلاث آیات قال الکمال ان قول شمس الائمۃ ھو الروایۃ (وقال ط والاول اصح من جہۃ الدرایۃ لانہ احوط کما ذکرہ المؤلف ۱۲) اھ وفیہ ایضا واذا کانت آیۃ السجدۃ آخر تلاوتہ ینبغی ان یقرأ ولو آیتین من سورۃ اخری بعد قیامہ منہا حتی لا یصیر بانیا الرکوع علی السجود ولو رکع بمجرد قیامہ منہا کرہ اھ قال ط اطلق فی الکراہۃ وظاہرہ التحریم ویحرر اھ (ص ۲۸۲ مع الطحطاوی) ۲۴ر شعبان ۴۲ھ

**تحقیق محلِ سجدہ سورۂ صٓ**

سوال (۲) سورۂ صٓ میں سجدہ اَنَابَ پر ہے یا مَاٰبْ پر؟

الجواب: سورۂ صٓ میں سجدہ حسن مآب پر ہے، کذا فی مراقی الفلاح وقال ھو الاولیٰ مما قالہ الزیلعی یجب عند قولہ تعالیٰ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ، الخ (ص ۲۴۹ مع الطحطاوی)

**نماز میں سجدۂ تلاوت کو مقام سے مؤخر کرنیکا حکم**

سوال (۳) اگر نماز میں آیت سجدہ پڑھکر سجدہ نہ کرے، بلکہ ایک دو آیت بعد کرلے تو نماز میں نقصان آئے گا یا نہیں؟

الجواب: نماز میں سجدۂ تلاوت کو مقامِ تلاوت سے مؤخر کرنے میں اقوال مختلف ہیں، بعض نے مکروہ لکھا ہے، اور بعض نے بلا کراہت جائز کہا ہے، بشرطیکہ نماز ہی میں سجدہ ادا کرے، اور اشبہ بالصواب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ جتنی تاخیر سے فوریت منقطع نہ ہو (وہو قدر آیتین او ثلاث کما سیاتی) اتنی تاخیر کا مضائقہ نہیں، اور جس تاخیر سے فوریت منقطع ہوجائے وہ مکروہ ہے، قال فی نور الایضاح وشرحہ وھو واجب علی التراخی ان لم تکن وجبت بتلاوتہ فی الصلاۃ لانہا صارت جزءًا من

الصلوٰۃ لا یقتضی خارجہا فتجب فوریۃ فیہا وفی غیرہا تجب موسعا اھ (ص ۲۷۸)
قال الطحطاوی حتیٰ لو اطال التلاوۃ تصیر قضاء ویاثم فیکرہ تحریما
تاخیر الصلاتیۃ عن وقت القراءۃ افادہ فی الشرح وھذا ینافی ما ابداہ
فی حاشیۃ الدر من قولہ ویجوز ان یقال تجب الصلاتیہ موسعا بالنسبۃ
لمحلہا کما لو تلاہا فی اول صلوٰتہ وسجدہا فی اٰخرہا اھ،

وفی نور الایضاح الصامع الشرح ویجزی عنہا ای عن سجدۃ
التلاوۃ رکوع الصلوٰۃ ان نواہا وسجودہا وان لم ینوہا اذا لم ینقطع فور التلاوۃ
وانقطاعہ بان یقرأ اکثر من اٰیتین بعد اٰیۃ السجدۃ بالاجماع وقال
شمس الائمۃ الحلوانی لا ینقطع الفور ما لم یقرأ اکثر من ثلث اٰیات وقال
الکمال قول شمس الائمۃ الحلوانی ھو الروایۃ اھ قال الطحاوی والحاصل
ان الفور لا ینقطع باٰیۃ واٰیتین اتفاقا وینقطع باربع اتفاقاً واختلف فی الثلاث
فقیل ینقطع واختارہ خواھر زادہ وقیل لا واختارہ الحلوانی وھو اصح من
جہۃ الروایۃ کما فی الحلبی والاوّل اصح من جہۃ الدرایۃ لانہ احوط
اھ (ص ۲۸۲) قلت وانما کان التاخیر مکروھا لوجوب السجدۃ فوریۃ
فیہا فاذا لم ینقطع الفور باٰیۃ واٰیتین اتفاقاً وبثلث اختلافا لم یوجد
علۃ الکراھۃ واللہ اعلم ثم رأیت الشامی صرح بما فہمتہ نقلا عن الحلیۃ
بما لفظہ فان کانت صلوٰتیۃ فعلی الفور ثم تفسیر الفور عدم طول المدۃ بین
التلاوۃ والسجدۃ بقراءۃ اکثر من اٰیتین او ثلث کما سیاتی حلیۃ اھ (ص
۸۰۶ ج ۱) پس سجدۂ تلاوت کو قیام سجدہ سے بقدر ایک دو آیت کے مؤخر کرنے سے نماز میں
نقصان نہ آئے گا، اور بقدر تین آیت کے مؤخر کرنے کی بھی گنجائش ہے گو خلاف احتیاط
ہے، اور بقدر چار آیت یا زائد کے مؤخر کر دیا، تو اگر عمداً کیا تو اس سے توبہ کرے اور نماز
میں نقصان رہا اور نماز کا اعادہ اس لئے واجب نہیں، کہ اس واجب فوت شدہ
کی تلافی نہیں ہو سکتی، اور اگر سہواً اتنی تاخیر ہوئی تو اخیر میں سجدۂ سہو لازم ہے، صرح
بوجوبہا الشامی فی (ص ۷۷۴، ج ۱، باب سجود السہو) نقلاً عن الخلاصۃ قال وصححہ فی
الولو الجیۃ ایضاً، ۱۸؍ رمضان ۱۳۴۲ھ،



**اقترب للناس کے دوسرے سجدہ تلاوت پر سجدہ کرنے کا حکم**

**سوال (۴)** نماز تراویح میں اقترب للناس کے دوسرے سجدۂ تلاوت پر جو امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک واجب ہے سجدہ کیا تو نماز میں کوئی نقص تو نہیں آیا،

**الجواب:** کچھ نقص نہیں آیا، اگر یہ سجدہ کرنے والا عالم ہو اور اس کو دلیل سے امام شافعی کے قول کی قوت معلوم ہو گئی ہو، اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر اس سجدہ سے اس شخص پر سجدۂ سہو لازم آوے گا، کیونکہ اس کے امام کے نزدیک اس جگہ سجدہ نہیں تو اس نے نماز میں بلا ضرورت ایک سجدہ بڑھا دیا، جس سے تاخیر رکن لازم آئی، جو موجب سجدۂ سہو ہے، ۱۸؍ ذلقعدہ ۱۳۴۵ھ

**حکم سجدۂ تلاوت بغیر تلاوت آیت سجدہ**

**سوال (۵)** نماز تراویح میں سورۂ انشقاق شروع کی اور فما لھم لا یؤمنون پر ختم کر کے سجدہ کر لیا، پھر سجدے سے اٹھ کر سجدہ کی آیت چھوڑ کر بقیہ سورۃ ختم کر کے رکعت پوری کر لی، یعنی سجدۂ تلاوت ہوا اور سجدہ کی آیت تلاوت نہیں ہوئی، ایسی حالت میں نماز صحیح رہی یا نہیں، یہ غلطی سہواً ہوئی ہے؟

**الجواب:** اس صورت میں سجدۂ سہو لازم تھا، سجدۂ تلاوت جو بدون آیت سجدہ کے کیا گیا ہے، عمل زائد ہوا جس سے واجب میں تاخیر ہوئی، ۱۸؍ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

**نماز عیدین میں دوسری رکعت میں قرأت آیت سجدہ پر ختم ہو گئی، تو رکوع یا سجدہ میں سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا یا تکبیرات رکعت ثانیہ کا فصل مانع ہے؟**

**سوال (۶)** سجدۂ تلاوت صلاتیہ کا مسئلہ ہدایہ میں تو ہے نہیں، مگر مجھے یہ یاد ہے کہ ختم آیت سجدہ پر اگر نیت کرے تو رکوع میں تداخل ہو جاتا ہے، اور بلا نیت کے سجدۂ صلوٰۃ میں تداخل ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ آیت سجدہ کے متصل ہی رکوع کر لے، اگر آیت سجدہ کے بعد کچھ اور پڑھ گیا، تو تداخل درست نہ ہوگا، بلکہ سجدۂ تلاوت علیحدہ ادا کرنا ہوگا، اس میں یہ دریافت طلب ہے کہ صلوٰۃ عیدین میں اگر رکعت ثانیہ میں آیت سجدہ پر قرأت ختم کرے تو سجدہ کا تداخل (بہ نیت) رکوع میں اور (بلا نیت) سجدۂ صلوٰۃ میں ہو جائے گا یا نہیں؟ وجہ شبہ یہ ہے کہ آیت سجدہ اور رکوع میں تکبیرات زوائد نے فاصلہ کر دیا ہے،

**الجواب**: قال فی مراقی الفلاح ویجزئ عنها رکوع الصلوٰۃ ان نواها و ینبغی ذلک للامام حال کثرۃ القوم ویجزئ عنها سجودها ایضا وان لم ینوها اذا لم ینقطع فور التلاوۃ وانقطاعه بان یقرأ اکثر من آیتین وقال الحلوانی ما لم یقرأ اکثر من ثلث آیات قال الکمال وھو الروایۃ اھ (ص ۲۸۲ ملخصا)

اس سے معلوم ہوا کہ بقدر آیتین یا ثلث آیات کے ... فصل سے فور منقطع نہیں ہوتا، اور تکبیرات ثلث عید آیتین کے برابر اور تین آیات سے کم ہیں، اس لئے صلوٰۃِ عید کی رکعتِ ثانیہ میں بھی آیتِ سجدہ پر قرأت ختم کرکے رکوع یا سجدہ میں سجدۂ تلاوت ادا ہوجائیگا، ۲۲ شعبان ۴۲ھ

احکام سجدۂ تلاوت بر تالی و سامع

**سوال** (۷) ایک طالب علم بغرض حفظ آیت سجدہ کو ایک ہی جلسہ میں باربار تلاوت کرتا ہے، اس کا استاد جو اسی مجلس میں بیٹھا سنتا ہے اس پر ایک ہی سجدہ ہوگا یا متعدد؟

(۲) قرأت سکھانے میں ایک مرتبہ قاری آیتِ سجدہ پڑھتا ہے اور دوبارہ متعلم بغرض مشق اس کا اعادہ کرتا ہے، جلسہ ایک ہی رہتا ہے تو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو؟

(۳) تالی بغرض حفظ ایک ہی مجلس میں باربار ایک ہی آیتِ سجدہ پڑھتا ہے، اور سامع اسے دور سے دوسری مجلس میں سن رہا ہے تو اس سامع پر کتنے سجدے واجب ہونگے؟

(۴) تالی تو ایک ہی مجلس میں اعادہ و تکرار آیتِ سجدہ کر رہا ہے، مگر سامع کی مجلس بدلتی رہی تو اُسے کتنے سجدے کرنے ہوں گے؟

(۵) دو یا چند طالب علم ہم سبق ایک ہی آیتِ سجدہ کو پڑھتے ہیں تو سامع کو ایک سجدہ کرنا ہوگا یا دو، مجلس ایک ہی رہی؟

**الجواب** (۱ و ۲) ان صورتوں میں طالب علم اور استاد دونوں پر ایک ہی سجدہ واجب ہے،

(۳) سامع کی مجلس اگرچہ مجلسِ تالی سے متحد نہ ہو مگر جب کہ سامع کا سماع متحد ہے، بوجہ اتحاد آیت و اتحادِ مکان سماع کے تو اس پر ایک ہی سجدہ واجب ہوگا،

(۴) اس صورت میں قول مفتی بہ پر سامع کے ذمہ سجدات متعددہ ہوں گے،

(۵) اس صورت میں سامع پر ایک ہی سجدہ ہوگا،

**الدلائل**: قال فی الدر ولو کررھا فی مجلسین تکررت وفی مجلس واحد لا بل کفته واحدۃ



۲۰

والاصل ان مبناھا علی التداخل دفعا للحرج بشرط اتحاد المکان والآیۃ اھ قال الشامی ای بان یکون المکرر آیۃ واحدۃ فی مجلس واحد فلو تلا آیتین فی مجلس واحد او آیۃ واحدۃ فی مجلسین فلا تداخل، ولم یشترط اتحاد السماع لانه انما یکون باتحاد المسموع فیغنی عنه اشتراط اتحاد الآیۃ واشار الی انه متی اتحدت الآیۃ والمجلس لا یتکرر الوجوب وان اجتمع التلاوۃ والسماع ولو من جماعۃ ففی البدائع لا یتکرر ولو اجتمع سببا للوجوب وھما التلاوۃ والسماع بان تلاھا ثم سمعھا او بالعکس او تکرر احدھما اھ وفی البزازیۃ سمعھا من آخر من آخر ایضا وقرأھا ایضا کفت سجدۃ واحدۃ فی الاصح لاتحاد الآیۃ والمکان اھ وفیه ایضا قبله لو تلا سجدات القرآن کلھا او سمعھا فی مجلس او مجالس وجبت کلھا اھ (ص ۸۱۱ و ۸۱۲ ج ۱) ای لاختلاف التلاوۃ والسماع باختلاف المتلو والمسموع، قال فی الدر کما تتکرر لو تبدل مجلس سامع دون تال کما لو کررھا راکبا یصلی وغلامه یمشی تتکرر علی الغلام لا الراکب ولا تتکرر ای علی السامع ۱۲ شامی فی عکسه وھو تبدل مجلس التالی دون السامع علی المفتی به اھ (ص ۸۱۴)

**تنبیه**: یختلف المکان حقیقۃً بالانتقال منه الی آخر باکثر من خطوتین کما فی کثیر من الکتب او باکثر من ثلاث کما فی المحیط ما لم یکن للمکانین حکم الواحد کالمسجد والبیت والسفینۃ ولو جاریۃ والصحراء بالنسبۃ للتالی فی الصلوٰۃ راکبا (فان الصلوٰۃ تجمع المتفرق فکان الصحراء کله مکانا واحدا للمصلی راکبا) وحکما وذلک بما یعد فی العرف قطعا لما قبله والمسجد ولو کبیرا مکان واحد وکذا البیت الا اذا کانت الدار کبیرۃ کدار السلطان اھ حلیه وظاھرہ ان الدار التی دونھا لھا حکم البیت وان اشتملت علی بیوت ثم قال فی الحلیۃ ثم الاصل علی ما فی الخانیۃ والخلاصۃ ان کل موضع یصح الاقتداء فیه بمن یصلی فی طرف منه یجعل کمکان واحد ولا یتکرر الوجوب

فیہ وما لا فلا اھ شامی (ص ۸۱۳ ج ۱) قلت فلینظر السائل فی الجواب الرابع ھل اختلف مجلسہ بمثل ھذا الاختلاف الذی لایصح فیہ الاقتداء بمن یصلی فی طرف منہ ام لا واللہ اعلم، ۲۶ محرم ۴۷ھ

آیت سجدہ کا ترجمہ پڑھنے سے وجوب سجدہ کا حکم

**سوال** (۸) رسالہ النور بابت ماہ جمادی الاول صفحہ ۴ ومن آیاتہ اللیل الخ پر سرخی دے کر حاشیہ میں لکھا ہے، یہ سجدہ کی آیت ہے، اس کو پڑھ کر ناظرین پر سجدہ واجب ہوجائے گا بشرطیکہ آیت یا ترجمہ کو زبان سے پڑھیں، اور صرف دیکھ لینے سے سجدہ واجب نہ ہوگا ۱۲ مدیر (سوال) آیت سجدہ کا ترجمہ زبان سے پڑھنے سے سجدہ واجب ہوگا یا نہیں، محقق قول کونسا ہے؟

**الجواب**: جو النور میں لکھا ہے کہ آیت یا ترجمہ کو زبان سے پڑھیں تو سجدۂ تلاوت واجب ہے، یہ صحیح ہے کما فی العالمگیریۃ (ص ۸۵ ج ۱) واذا قرأ آیۃ السجدۃ بالفارسیۃ فعلیہ وعلی من سمعھا السجدۃ فھم السامع او لا اذا اخبر السامع انہ قرأ آیۃ السجدۃ وعندھما ان کان السامع یعلم انہ یقرء القرآن یلزمہ والا فلا کذا فی الخلاصۃ وقیل تجب بالاجماع وھو الصحیح، کذا فی محیط السرخسی، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۸ صفر ۴۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۹ صفر ۴۵ھ

نماز میں سورۃ انشقاق پڑھی جائے تو سجدۂ تلاوت ضروری ہے یا نہیں؟

**سوال** (۹) فرضوں میں سورۃ اقرأ، سورۃ انشقاق یعنی سجدہ والی سورۃ ارادۃً پڑھنی کیسی ہے اور انکے پڑھنے سے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟

**الجواب**: سورۃ انشقاق میں آیت سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ کیا جاوے اور بعد سجدہ کے سورۃ پوری کرکے رکوع کریں، البتہ اگر آیت سجدہ پر قراءۃ ختم کردی جاوے تو تلاوت کا سجدہ مستقلاً کرنا ضروری نہیں، بلکہ نماز کا سجدہ ہی اس کی طرف سے کافی ہوجاوے گا، مگر ایسا کرنا بہتر نہیں ہے، کیونکہ سورۃ کو درمیان میں چھوڑ دینا خلاف اولیٰ ہے، ہاں اگر سورۃ علق وغیرہ (جن کے بالکل اخیر میں آیت سجدہ ہے یا آیت سجدہ کے بعد ایک یا دو ہی آیتیں ہوں) پڑھ کر اگر سجدۂ تلاوت نہ کیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں نماز کا سجدہ کرنے سے سجدۂ تلاوت خود بخود ادا ہوجاوے گا،

**تنبیہ**: اس صورت اخیرہ میں اگر رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرلے کہ اس سجدۂ تلاوت کی طرف سے بھی یہ رکوع کرتا ہوں، تب بھی سجدۂ تلاوت ادا ہوجاتا ہے، لیکن امام کو ایسا نہ کرنا



کیونکہ اگر اس نے رکوع میں نیت کرلی اور مقتدیوں کو پتہ نہ لگا، اس واسطے انہوں نے نیت نہ کی تو ان کے ذمہ سجدۂ تلاوت باقی رہ جاوے گا، واللہ اعلم احقر عبدالکریم، ۱۴ ربیع ۲ ۴۶ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ

## فصل فی صلوٰۃ المریض والمسافر

دو جگہ کے وطن میں قصر کرے یا نہیں؟

**سوال** (۱) ........ زید مع اہل وعیال سسرال میں آیا جو مقدار مسافت قصر پر ہے، زید اور اس کی بیوی قصر کرے یا نہیں؟

دیگر زید نے وطن اصلی چھوڑ کر دوسرا وطن اصلی بنالیا ہے، جہاں پر اس کی زمینات ہیں اور اس کی نگرانی دوسرے قرابت داروں کے ماتحت کیا ہے، کیا قدیم وطن اصلی کو جہاں زمینات اور دیگر قرابت دار ہیں جیسے ہمشیرہ واخ وبہنوئی آدے تو قصر پڑھے یا نہیں؟

**الجواب**: جس شہر میں انسان اپنا نکاح کرے وہ بھی مثل وطن کے ہوجاتا ہے، لہذا شوہر کو سسرال میں قصر نہ کرنا چاہئے، نماز پوری پڑھے، اسی طرح عورت بھی، قال فی الدر الوطن الاصلی ھو موطن ولادتہ او تاھلہ او توطنہ اھ ص ۸۲۹ ج ۱ قلت وھذا لایصح مطلقا بل فیہ تفصیل کما سیأتی،

(۲) دوسری صورت میں دونوں وطن اصلی ہیں، قدیم وطن میں جب جاوے نماز پوری پڑھے، قال فی العالمگیریۃ ولو انتقل باھلہ ومتاعہ الی بلد وبقی لہ دور وعقار فی الاول قیل بقی الاول وطنا لہ والیہ اشار محمد رح فی الکتاب کذا فی الزاھدی اھ ص ۹۱ ج ۱، واللہ اعلم، ۲۲ ربیع الاول سنہ ۴۰ھ

وطن اصلی کے متعدد ہونے اور وطن زوجہ کا وطن اصلی ہونے کی تحقیق ،،،

**سوال** (۲) کبیری شرح منیہ ص ۵۹۲ میں ہے، لو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ بہ قیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وھو الاوجہ لما مر من حدیث عثمان رض رویٰ الامام احمد وابوبکر بن ابی شیبۃ وابو عمر بن عبد البر والطحاوی ان عثمان رض صلی بمنی اربع رکعات فانکر الناس علیہ فقال ایھا الناس انی تاھلت بمکۃ منذ قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من تاھل فی بلد فلیصل صلوٰۃ المقیم ولو کان لہ اھل ببلدین فایتھما دخلھا صار مقیما وان ماتت زوجتہ فی احدھما

ویقی له فیها دور وعقار قیل لا تبقی وطنا له اذ المعتبر الاهل دون الدار کما لو تاهل ببلدة واستقرت سکنی له ولیس له فیها دور وقیل تبقی اھ۔

حافظ عبد اللطیف صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر زوجہ مستقل قیام (جیسا کہ نکاح سے پیشتر تھا) اپنے والدین کے وطن میں رکھے، جب تو خاوند کے لئے سسرالی وطن بن جاوے گا اور اگر (ہمارے دیار کی طرح) مستقل قیام خاوند کے وطن میں کرلیوے، اور والدین کے ہاں محض ملاقات کو آیا کرے تو خاوند سسرال میں مسافر رہے گا۔ (بلکہ عورت بھی اس حالت میں قصر کرے گی، کما ہو مصرح فی بہشتی زیور) احقر کی فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ عورت کا جس جگہ مستقل قیام ہو وہ خاوند کا وطن اصلی قرار دیا جاوے گا، اور اذ المعتبر الاہل دون الدار الخ سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور اس توجیہ پر خاوند کا تابع للزوجہ ہونے کا اشکال بھی نہیں ہوتا، البتہ یہ سوال ہوگا کہ وطن قدیم وطن رہے گا یا نہیں، اگر نہیں جب تو کچھ اشکال نہیں، اور اگر وہ بھی وطن رہے گا تو دو وطن ہوجائیں گے، حالانکہ الوطن الاصلی یبطل بمثلہ کے موافق وطن اصلی متعدد نہیں ہوسکتے، اور متعدد اہلیہ ہونے کی صورت میں بھی یہی اشکال ہے، مسئلہ کی تحقیق فرماکر حدیث کا محمل بھی بیان فرمادیجئے، یعنی اگر قصر در سسرال علی الاطلاق نہیں تو حضرت عثمان رضی کا استدلال کس طرح صحیح ہوگا؟ عبد الکریم گمتھلوی

**الجواب**: قال فی البحر والوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذها دارا وتوطن بها مع اهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها بل التعیش بها وهذا الوطن یبطل بمثله لا غیر وهو ان یتوطن فی بلدة اخری وینقل الاهل الیها فیخرج الاول من ان یکون وطنا اصلیا حتی لو دخله مسافرا لا یتم قیدنا بکونه انتقل عن الاول باهله لانه لو لم ینتقل بهم ولکنه استحدث اهلا فی بلدة اخری فان الاول لم یبطل ویتم فیهما، وفی المحیط ولو کان له اهل بالکوفة واهل بالبصرة فمات اهله بالبصرة وبقی له دور وعقار بالبصرة قیل البصرة لا تبقی وطنا له لانها انما کانت وطنا بالاهل لا بالعقار الا تری انه لو تأهل ببلدة لم یکن له فیها عقار صارت وطنا له وقیل تبقی وطنا له لانها کانت وطنا له بالاهل والدار جمیعا فبزوال احدهما لا یرتفع الوطن کوطن الاقامة یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ (ص ۱۶۳ ج ۱) ۱۲



وفی المجتبی نقل القولین فیما اذا نقل اهله ومتاعه وبقی له دور وعقار ثم قال وهذا جواب واقعة ابتلینا بها وکثیر من المسلمین المتوطنین فی البلاد ولهم دور وعقار فی القری البعیدة منها یصیفون بها باهلهم ومتاعهم فلابد من حفظها انهما وطنان له لا یبطل احدهما بالآخر اھ بحر، ص ۱۳۶ ج ۲ وفی البدائع ثم الوطن الاصلی یجوز ان یکون واحدا او اکثر من ذلک بان کان له اهل ودار فی بلدتین او اکثر ولم یکن من نیة اهله الخروج منها وان کان هو ینتقل من اهل الی اهل فی السنة حتی انه لو خرج مسافرا من بلدة فیها اهله ودخل فی ای بلدة من البلاد التی فیها اهل فیصیر مقیما من غیر نیة الاقامة اھ، ص ۱۰۴ ج ۱

وفی مراقی الفلاح واذا لم ینقل اهله بل استحدث اهلا ایضا ببلدة اخری فلا یبطل وطنه الاول وکل منهما وطن اصلی له اھ قال الطحطاوی وکذا لو استحدث اهلا فی ثلاث مواضع فالحکم واحد فیما یظهر اھ، ص ۲۴۹ وفی فتح القدیر وطن اصلی وهو مولد الانسان او موضع تاهل به ومن قصده التعیش به لا الارتحال ولو تزوج المسافر فی بلد لم ینو الاقامة فیه قیل یصیر مقیما وقیل لا اھ، ص ۱۶ ج ۲ وفی الکفایة ولو کان له اهل ببلدة واستحدث فی بلدة اخری اهلا آخر کان کل واحد منهما وطنا اصلیا له روی انه کان لعثمان اهل بمکة واهل بالمدینة وکان یتم الصلوٰة بهما جمیعا اھ ص ۱۷ ج ۲۔

وفی الخلاصة المسافر اذا جاوز عمران مصره فلما سار بعض الطریق تذکر شیئا فی وطنه فعزم الرجوع الی الوطن لذلک ان کان ذلک وطنا اصلیا بان کان مولده فیه او لم یکن مولده لکن تاهل فیه وجعله دارا یصیر مقیما بمجرد العزم الی الوطن اھ ص ۱۹۸ ج ۱ وفیه ایضا ص ۱۹۹ ج ۱ ما نصه وانما یصیر المسافر مقیما اما بدخوله مصره له فیه اهل او بان بدا له لعوده الیه الخ وفی الفتاوی السراجیة اذا دخل المسافر بلدة له فیها اهل صار مقیما نوی الاقامة اولا اھ ص ۶۲ ج ۱،

ان نصوص فقہیہ سے چند امور مستنبط ہوئے:- (۱) وطن اصلی وہ ہے جس میں تعیش مع الاہل ہو، اور وہاں سے ارتحال ونقل اہل کا قصد نہ ہو (۲) جب کسی دوسرے مقام میں

توطن کا ارادہ ہو تو بدونِ نقلِ اہل کے پہلا وطن باطل نہ ہوگا، (۳) وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی شخص چار نکاح چار شہروں میں کرے اور ہر بیوی کو اسی کے شہر میں رکھے تو اس شخص کے چار وطن اصلی ہو جائیں گے، (۴) جس شہر میں کسی شخص کے اہل وعیال کا مستقل قیام ہو خواہ کرایہ کے مکان میں یا ذاتی مکان میں وہاں جب مسافر ہو کر پہنچے گا تو قصر باقی نہ رہے گا، بلکہ اتمام ضروری ہوگا، جیساکہ بعض ملازمانِ سرکاری اپنے اہل وعیال کو جائے ملازمت میں مستقل طور پر رکھتے ہیں، پھر وہاں سے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں، یہ لوگ جب اپنے اہل وعیال کی قیام گاہ پر پہونچیں گے مقیم ہو جاویں گے، یدل علیہ جزئیۃ السراجیۃ والمجتبیٰ، (۵) کسی شہر میں محض نکاح کر لینے سے وہ وطن اصلی نہیں ہو جاتا، بلکہ اہل کا وہاں رکھنا، اور وہاں سے منتقل نہ کرنا شرط ہے، چنانچہ عبارتِ بحر میں وتوطن بہا مع اہلہ ولیس من قصدہ الارتحال عنہا بل التعیش بہا، اور عبارت فتح میں او موضع تاہل بہ ومن قصدہ التعیش بہ لا الارتحال، اور عبارتِ خلاصہ میں اولم یکن مولدہ ولکن تاہل فیہ وجعلہ دارا، تاہل کے ساتھ قصد تعیش وجعل دار کی قید صاف مذکور ہے، اور حضرت عثمانؓ کے قصہ میں بھی اُن کے اتمام کا سبب محض تزوج نہ تھا، بلکہ تزوج کے بعد اہل کا مکہ میں رکھنا اس کا سبب تھا، چنانچہ کفایہ کی عبارت میں اس کی تصریح ہے روی انہ کان لعثمانؓ اہل بالمدینۃ واہل بمکۃ وکان تم بہما جمیعا اھ، اور حدیث من تاہل ببلدۃ فلیصل فیہا صلوٰۃ المقیم کا بھی یہی محمل ہے، یعنی من تاہل ببلدۃ واسکن اہلہ فیہا ولم ینقلہا عنہا، کیونکہ اگر مطلق تزوج ببلدۃ موجب قصر ہو جاوے خواہ زوجہ کو وہاں رکھے یا نہ رکھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قصر نہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے مکہ میں نکاح کیا تھا، اور حضرت سودہ کے باپ کا گھر وہاں موجود تھا، اُن کے بھائی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے، نیز حضرت میمونہؓ نے آپؐ سے مکہ ہی میں نکاح کیا تھا، اور ان کا خاندان مکہ میں تھا، مگر صحیحین سے ثابت ہے کہ آپؐ نے مکہ میں قصر کیا ہے، اور بعد نماز کے فرماتے تھے یَا أَھْلَ مَکَّۃَ اَتِمُّوْا صَلٰوتَکُمْ فَاِنَّا قَوْمٌ سَفْرٌ، وفی الفتح ص۴۷۰ ج۲ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسافر بزوجاتہ وقصر، اور یہ بھی صحاح میں ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں تمام ازواج کو ساتھ لائے تھے، جن میں بعض کا پہلا وطن مکہ میں تھا، لیکن بااینہمہ حضورؐ نے قصر کیا ہے،

پس صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں نکاح کرکے زوجہ کو وہاں



نہ رکھے بلکہ اپنے شہر میں لے آئے تو زوجہ کا وطن شوہر کا وطن اصلی نہ ہوگا، شوہر جب وہاں مسافر ہو کر گذرے تو قصر کرے گا، اور اگر زوجہ کو اسی کے وطن میں رکھے تو اس کا وطن زوج کا وطن ہو جائے گا، خواہ زوج کا مستقل قیام اپنے وطن میں رہتا ہو یا دونوں جگہ رہتا ہو، اس پر غالباً سائل کو کبیری کے اس جزئیہ سے اشکال پیش آئے گا، لو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وہو الاوجہ لما مر من حدیث عثمان اھ یہی جزئیہ فتح القدیر میں بھی ہے کما مر، مگر موجبِ اشکال کچھ نہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسافر نے ایک شہر میں نکاح کیا، اور اس کا ارادہ بنفسہ وہاں قیام کرنے کا نہیں (لیکن زوجہ کو وہیں رکھنے کا ارادہ ہے) تو اوجہ یہ ہے کہ وہ مقیم ہو جائے گا، جیساکہ حدیث عثمانؓ سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت عثمانؓ باوجودیکہ مکہ میں مقیم نہ تھے، اور نہ اُن کو مکہ میں اقامت جائز تھی، قال فی الفتح ان الاقامۃ بمکۃ علی المہاجرین حرام کما سیأتی، اھ، ص۴۷۰، ج۲، لیکن پھر بھی انھوں نے قصر نہ کیا، کیونکہ ان کی ایک اہل مستقل طور پر مکہ میں مقیم تھی، اس سے معلوم ہوا کہ شوہر کا مستقل قیام گو اپنے وطن میں ہو، لیکن جب اس کی بیوی کا مستقل قیام دوسری جگہ ہوگا تو شوہر وہاں جا کر مقیم ہو جائے گا، کما مر عن السراجیۃ اذا دخل المسافر بلدۃ لہ فیہا اہل (ای مقیمۃ) صار مقیما نوی الاقامۃ اولا، اور جن قائلین نے اس صورت میں شوہر کو مقیم نہیں مانا، جیساکہ کبیری میں دوسرا قول مذکور ہے، انھوں نے اس پر نظر کی ہے، کہ جب شوہر کا قیام زوجہ کے بلد میں نہیں رہتا اور نہ وہ اقامت کا وہاں قصد کرتا ہے تو پھر اس کو مقیم نہ کہنا چاہیے مسافر ہی ماننا چاہیے، اور حدیثِ عثمانؓ کو نیت اقامۃ پر حمل کرتے ہیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ مرد کا زوجہ کو مستقلاً کسی مقام پر رکھنا یہ عملاً اقامت ہے، لانہ لایخلو عن نوع تعیش بہ وتاہل، لہٰذا اس صورت میں نیت عدمِ اقامت کا اعتبار نہ ہوگا، لاسیما وقد تأید بحدیث عثمان وانہ اتم بمکۃ مستدلا بہ مع انہ لم یقم بہا البتۃ فافہم،

فائدہ، حدیثِ عثمانؓ جس سے کبیری میں احتجاج کیا ہے محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، قال الحافظ فی الفتح والاول وان کان نقل واخرجہ احمد والبیہقی من حدیث عثمان انہ لما صلی بمنیٰ اربع رکعات انکر الناس علیہ فقال انی تاہلت بمکۃ لما قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من تاہل ببلدۃ فانہ یصلی صلوٰۃ مقیم فہذا الحدیث لایصح لانہ منقطع

وفی روایۃ من لا یحتج بہ اھ ص ۴۷۰ ج ۲ وفی عمدۃ القاری قلت ھذا منقطع اخرجہ البیہقی من حدیث عکرمۃ بن ابراھیم وھو ضعیف عن ابن ابی ذباب عن ابیہ اھ ص ۵۳۳ ج ۳ قلت لم ینسبہ احد الی الکذب قال النسائی ضعیف وقال العقیلی فی حدیثہ اضطراب وقال النسائی فی التمییز لیس بثقۃ وقال یعقوب بن سفیان منکر الحدیث وقال البزار لین الحدیث وقال ابو حامد الحاکم لیس بالقوی اھ لسان المیزان ص ۱۸۱ و ۱۸۲ ج ۴ ویظہر من التقریب وشرحہ التدریب ان قولہم لین الحدیث من ادنی مراتب الجرح وھو قریب من التعدیل وقولہم لیس بالقوی یکتب حدیثہ ایضا ولا یطرح بل یعتبر بہ ص ۱۲۶ و ۱۲۷ فعکرمۃ ھذا لیس ممن یترک حدیثہ وقال السیوطی فی خطبۃ کنز العمال وکل ما کان فی مسند احمد فہو مقبول فان الضعیف الذی فیہ یقرب من الحسن اھ والحدیث رواہ احمد فی مسندہ ص ۶۲ ج ۱ وعلۃ الانقطاع لا تضر عندنا واللہ اعلم، ۲۷ ج ۲ سنہ ۴۱ھ

معذور کیلئے استقبالِ قبلہ کی شرط کا ساقط ہوجانا

**سوال** (۳) ............... جو شخص ایسا مجبور ہو کہ رُو بقبلہ ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا، نہ اس طریق سے نماز پڑھ سکا جو طریق صاحبِ فراش کے لئے فقہاء نے تحریر فرمایا ہے ایسی مجبوری میں جس طریق سے اور جس پہلو سے نماز ادا ہو سکے پڑھ لی، اکثر نمازیں مجبوراً مشرق کو مُنہ کر کے چارپائی پر پڑے پڑے ادا کی گئی ہیں' آیا یہ نمازیں صحیح اور درست ہیں یا قابلِ اعادہ ہیں، اور جو شخص بمجبوری قبلہ کو مُنہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے، اس کو غیر قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنا چاہئے، یا وقت مجبوری تک نماز موقوف رکھنا چاہئے یا اس کو مجبوری کی حالت میں جس طرح بن پڑے ادا کرے، پھر بعد مجبوری ان نمازوں کو ادا کریں، مسئلہ شرعی بیان فرما کر اجر اللہ سبحانہ سے حاصل فرمادیں،

**الجواب**؛ قال فی مراقی الفلاح وقدمنا جواز التوجہ لما قدر علیہ بلا عسر وسقوط التوجہ الی القبلۃ بعذر المرض ونحوہ اھ ص ۲۵۱ وفی العالمگیریۃ فان کان یعرف القبلۃ ولکن لا یستطیع ان یتوجہ الی القبلۃ ولم یجد احدا یحولہ الی القبلۃ فی ظاہر الروایۃ انہ یصلی کذلک ولا یعید فان وجد احدا یحولہ الی القبلۃ ینبغی ان یامرہ حتی یحولہ فان لم یامرہ وصلی علی غیر القبلۃ لا یجوز



اھ، ص ۸۸ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ جب مریض استقبالِ قبلہ پر قادر نہ ہوا اور نہ کوئی قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود ہو تو اس کو غیر قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھنی چاہئے اور نماز کو مؤخر نہ کرے، اور ان نمازوں کا اعادہ بھی نہیں، لیکن اگر قبلہ کی طرف متوجہ کرنے والا موجود تھا اور اس سے بدون کہے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی، تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر کہا لیکن اس نے کہنے پر عمل نہ کیا تو نماز درست ہوگئی، واللہ اعلم، ۲۲ رجب سنہ ۴۱ھ

اس سفر کا حکم جس کے درمیان میں وطنِ اقامت واقع ہو،

**سوال** (۴) ایک شخص تھانہ بھون میں مقیم ہے اور سہارنپور کسی غرض سے آیا، اور سہارنپور سے دہلی جانے کا قصد کر کے تھانہ بھون سے گذرا، اور اسباب وغیرہ اس کا تھانہ بھون ہی میں موجود ہے، پس ایسی حالت میں وہ تھانہ بھون میں قصر کرے گا یا اتمام اور اسباب عام ہے، یا ضروریہ کی تخصیص ہے؟

**الجواب**؛ صورتِ مذکورہ میں یہ شخص جب سہارنپور سے بہ نیت سفر دہلی چل کر تھانہ بھون میں داخل ہوگا تو تھانہ بھون میں اتمام کرے گا، کیونکہ اس صورت میں انشاء سفر من وطن الاقامۃ نہیں ہوا، بلکہ انشاء سفر من موضع غیرہ ہوا ہے، اور جب انشاء سفر موضع اقامت سے نہ ہو، بلکہ دوسرے موضع سے ہو تو وطن اقامۃ کے باطل ہونے کی شرط یہ ہے، کہ اثناءِ سفر میں اس پر مرور نہ ہو، یا اگر مرور ہو تو بعد مسافت ثلثہ ایام قطع کر چکنے کے بعد مرور ہو، اگر مسافت ثلثہ ایام قطع کرنے سے پہلے وطنِ اقامۃ پر گذر ہوا (یعنی اس میں داخل ہوا) تو اتمام کریگا بلکہ اس صورت میں وہ سہارنپور سے چل کر مسافر ہی نہیں ہوا جبکہ اس کا ارادہ درمیان میں وطنِ اقامۃ میں داخل ہونے کا ہے، قال العلامۃ الشامی والحاصل ان انشاء السفر یبطل وطن الاقامۃ اذا کان منہ اما لو انشاءہ من غیرہ فان لم یکن فیہ مرور علی وطن الاقامۃ او کان ولکن بعد سیر ثلثۃ ایام فکذلک ولو قبلہ لم یبطل الوطن بل یبطل السفر لان قیام الوطن مانع من صحتہ واللہ اعلم اھ وفیہ ایضا قال فی الفتح ان السفر الناقض لوطن الاقامۃ ما لیس فیہ مرور علی وطن الاقامۃ او ما یکون فیہ المرور بہ بعد سیر مدۃ السفر اھ، ص ۸۳۰ ج ۱،

اب یہ صورت باقی رہی کہ اگر کوئی شخص مسافۃ ثلثہ ایام قطع کرنے کے بعد وطن اقامۃ پر گذرا، مگر وہاں قیام کا ارادہ نہیں، بلکہ آگے جانے کا ارادہ ہے، اور وطنِ اقامۃ میں اس کا اسباب وغیرہ موجود ہے، اس صورت میں یہ شخص وطنِ اقامۃ میں قصر کرے یا اتمام؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب مسافتِ سفر قطع کرنے کے بعد وہ وطن اقامت میں داخل ہوا، اور اس کے بعد بھی مسافتِ سفر کا ارادہ ہے تو اب یہ اس کا وطن اقامۃ باقی نہیں رہا، سفر سے اس کی وطنیت باطل ہوگئی، اور اسباب کا باقی رہنا بطلانِ وطنیت بالسفر کو مانع نہیں، ہاں اگر وطنِ اقامۃ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ وطنِ اقامۃ بنانا چاہے اور ان دونوں کے درمیان مدّتِ سفر نہ ہو تو پہلا وطن محض انتقال سے باطل نہ ہوگا، بلکہ انتقال بنفسہ وانتقال بالمتاع کے مجموعہ سے باطل ہوگا حتیٰ کہ اگر دوسرے موضع میں نیت اقامۃ کرے اور موضع اوّل میں اس کا اسباب باقی ہے اور متاع سے مراد متاع ضروری ہے، الذی یعد الرجل ببقائہ مقیما عرفا کاثاث البیت الذی لا بد منہ والدار والعقار، پس بقاء متاع انشاءِ سفر کی صورت میں مانع بطلانِ وطنیت نہیں بلکہ نیت اقامۃ بموضع آخر کی صورت میں بقاءِ متاع بطلان وطنیت موضع اوّل کے لئے مانع ہے قال فی البحر کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع اٰخر اھ ص ۱۳۶ ج ۲ وفی العالمگیریۃ ووطن الاقامۃ ووطن الاقامۃ یبطل بوطن الاقامۃ وبانشاء السفر وبالوطن الاصلی ھکذا فی التبیین وفی الکفایۃ ومن حکم وطن السفر انہ ینتقض بالوطن الاصلی لانہ فوقہ وینتقض بوطن الاقامۃ لانہ مثلہ وینتقض بانشاء السفر لانہ ضدہ اھ ص ۱۷۱ ج ۲) البتہ اگر وطن اقامۃ میں اس شخص کے اہل وعیال کا مستقل قیام ہو تو وہاں جا کر یہ شخص معاً مقیم ہو جاوے گا، گو نیت اقامت نہ ہو۔ لما قدمنا فی السوال السابق عن السراجیۃ مسافر دخل بلدۃ فیہا اہلہ یصیر مقیما وان لم ینو الاقامۃ اھ

ایک صورت اور باقی ہے وہ یہ کہ کسی شخص نے وطن اقامۃ سے سفر کا قصد نہیں کیا، بلکہ وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا، اور وہاں سے سفر کا قصد کیا، اور مسافتِ سفر قطع کر کے وطن اقامۃ میں داخل ہوا مگر نیتِ قیام نہیں، آگے جانے کا ارادہ ہے، لیکن آگے جس جگہ جانے کا ارادہ ہے وہ موضعِ وطنِ اقامت سے مدّتِ سفر پر نہیں ہے، اس صورت میں وطنِ اقامت پر پہونچ کر اس شخص کو اتمام کرنا چاہئے، فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح وبقی ما اذا خرج منہ علی نیۃ السفر الاولیٰ ثم جاوزہ بمدۃ سفر منہ ار من الاصلی ولم یقم فی غیرہ ثم مرّ بہ ھل تیمم وظاھر کلامھم نعم لانہ لم یدخل الاصلی ولم یقم فی غیرہ ولم ینشئ سفرا بعدہ وحررہ اھ ص ۲۴۹،



خلاصہ یہ ہوا کہ وطن اقامت سے اگر انشاءِ سفر کا قصد کیا جاوے، اس صورت میں تو خروج من العمران کے بعد ہی وطنِ اقامۃ باطل ہو جائے گا، قال الشامی وافاد قولہ واما المکی الخ ان انشاء السفر من وطن الاقامۃ مبطل لہ وان عاد الیہ ولذا قال فی البدائع لو اقام خراسانی بالکوفۃ نصف شہر ثم خرج منہا الی مکۃ، فقبل ان یسیر ثلاثۃ ایام عاد الی الکوفۃ لحاجۃ فانہ یقصر لان وطنہ قد بطل بالسفر اھ ص ۸۳۰ ج ۱، اور اگر انشاءِ سفر وطنِ اقامت سے نہ ہو تو بطلانِ وطنِ اقامت کی شرط یہ ہے کہ اثناءِ سفر میں وطنِ اقامت میں دخول نہ ہو، یا اگر دخول ہو تو بعد قطع مسافت ثلاثہ ایام ہو اور آگے جس جگہ کا ارادہ ہے وہ بھی وطنِ اقامۃ سے مسافتِ سفر پر ہو، اگر قطعِ مسافتِ سفر کے بعد وطنِ اقامت میں داخل ہوا اور آگے جہاں جانے کا قصد ہے وہ وطنِ اقامت سے مسافتِ قصر پر نہیں تو وطنِ اقامت باطل نہ ہوگا، اور اس شخص کو اتمام کرنا لازم ہوگا، واللہ اعلم، ۲ / شعبان ۱۳۴۱ھ

**بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے لئے رکوع کرنے کا طریقہ**

**سوال** (۵) اگر آدمی معذور ہو اور بیٹھ کر نماز پڑھے تو رکوع کے وقت سُرین اٹھائے یا نہیں؟

**الجواب**: قال فی مراقی الفلاح وفی الحموی فان رکع جالسا ینبغی ان تحاذی جبہتہ رکبتہ لیحصل الرکوع اھ ولعل مرادہ انحناء الظہر عملا بالحقیقۃ لانہ یبالغ فیہ حتیٰ یکون قریبا من السجود اھ، ص ۱۳۲،

اس سے معلوم ہوا کہ بحالتِ جلوس رکوع کرتے ہوئے صرف اتنا ضروری ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے، اس سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں، نہ سُرین اٹھانے کی ضرورت ہے، واللہ اعلم، ۱۸ / شوال ۱۳۴۱ھ

**کشتی اور جہاز کے ملّاحوں کے لئے نمازِ قصر پڑھنے کی تحقیق، نیز فناءِ مصر کی تعریف، اور بندرگاہ پر نیتِ اقامت کا حکم**

**سوال** (۶) تمہید مسائل ذیل: رسالہ الامداد ۱۳۳۴ھ کے جمادی الاولیٰ کے نمبر میں ایک فتویٰ محررہ حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب دام مجدہم، متعلق مسافر سفینہ کے شائع ہوا تھا، ایک صاحب نے رنگون سے اس پر کچھ شبہات معہ اپنی تحقیق کے لکھ کر بھیجے، یہاں سے ان شبہات کا جواب اور اس تحقیق پر تنقید لکھی گئی، جو ذیل میں اس ترتیب سے منقول ہیں، اوّل خط، ثانیاً

دہ تحقیق بصورتِ فتویٰ، ثالثاً دہ تنقید،

خطِ آمدہ از رنگون! .....................

..................... حضرت والا آپ کا فتویٰ مندرجہ رسالہ الامداد ماہ
جمادی الاول ۱۳۴۳ھ احقر کی نظر سے گذرا، آپ نے جو جواب ارقام فرمایا ہے اس کے متعلق عاجز کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہوگئے ہیں، امید کہ آپ تشفی فرما کر ممنون فرمائیں گے،
آپ تحریر فرماتے ہیں کہ خلاصہ جواب یہ ہوا کہ کشتی وجہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، جب تک کہ اس کے کھڑے ہونے کی جگہ موقع آبادی سے متصل نہ ہو" یہ تو آپ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ کشتی وجہاز میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے، لیکن جب کشتی آبادی کے متصل کھڑی ہو تو نیتِ اقامت درست فرماتے ہیں، اب گذارش یہ ہے کہ آپ نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے، (۱) اگر آپ نے فناءِ مصر پر قیاس کیا ہے تو قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فناءِ مصر محلِ اقامت ہے، لہٰذا اس کو مصر کے ساتھ ملحق کردیا گیا، لیکن جب کشتی وجہاز اقامت کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور دریا محلِ اقامت نہیں ہے تو آبادی کے قرب کی وجہ سے اُن میں کیونکر صلاحیت پیدا ہوگی؟

(۲) اگر آپ نے فقہاء کی تصریح اس بارہ میں دیکھی ہے تو اس سے مطلع فرمائیے تاکہ دفعِ خلجان ہو،

(۳) اس بارے میں آپ نے جو عباراتِ فقہیہ تحریر فرمائی ہیں ان سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ جب کشتی آبادی کے متصل ہو تو نیتِ اقامت درست ہے، ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ دریا کا کنارہ جبکہ سلسلہ آبادی کا وہاں تک متصل چلا گیا ہو فناءِ مصر میں داخل ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دریا بھی فناءِ مصر میں داخل ہے،

(۴) جب مصر اور فناءِ مصر کے درمیان کوئی باغ یا بڑا میدان یا جنگل حائل ہو اس وقت وہ مصر کے حکم سے خارج ہوجاتا ہے، تو جہاز اور کشتی جو دریا میں لنگر انداز ہوتی ہے اس میں بہ تبعیتِ مصر کیونکر اقامت درست ہوسکتی ہے، حالانکہ فناءِ مصر اور باغ اور میدان وجنگل کے درمیان قطع مسافت ہی، کوئی شئ مانع نہیں ہے، اور جہاز اور خشکی کے مابین پانی کا حصہ آمد ورفت سے مانع ہے، اور بغیر حیلہ وعلاج کے عبور عادۃً ناممکن ہے،



(۵) جب یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ بحر وکشتی محلِ اقامت نہیں ہے تو جب تک اس کے خلاف فقہاء کی کوئی تصریح نہ ملے اس کے خلاف حکم دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

(۶) عالمگیری سے بحوالہ عتابیہ آپ نے جو عبارت نقل کی ہے وہ تو اس شخص کے حق میں ہے کہ جو اپنے وطنِ اصلی سے سفر کرتا ہو، ظاہر ہے کہ کشتی لوٹنے کے بعد وہ اپنے وطن اصلی میں پہنچ گیا ہے، پس اس کی اقامت بسبب وطن اصلی کے ہے فقط، فی الحقیقت یہاں ان لوگوں کے متعلق بحث ہے جو مسافتِ بعیدہ سے آکر یہاں کام کرتے ہیں، جو دریا کے متصل کسی قریہ یا آبادی میں مقیم نہ ہوں' ان لوگوں کے متعلق نہیں ہے، جو کسی مصر یا قریہ میں مقیم ہونے کے بعد جہاز میں ملازم ہوئے ہوں، کیونکہ ان کی اقامت کی صحت وطن اصلی یا وطنِ اقامت کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل فتویٰ میں جو اس کے ساتھ منسلک ہے موجود ہے،

(۷) دریا فناءِ مصر میں شامل ہے کہ نہیں؟

(۸) بحر الرائق کی اس عبارت (لان نیۃ الاقامۃ لاتصح فی غیرہما فلا تصح فی مفازۃ ولاجزیرۃ ولاسفینۃ اھ) سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اور کشتی محلِ اقامت نہیں، شامی وغیرہ کی عبارت میں بھی بحر کو سفینہ پر عطف کیا گیا ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کشتی اگرچہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہے، بحر پر سفینہ کا عطف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں سے دو چیزیں مراد ہوں، کیونکہ بحر میں بجز کشتی کے اقامت کی کوئی صورت نہیں، پس اس پر سفینہ کو عطف کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سفینہ سے یہ مراد ہو کہ جب وہ کنارہ پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تو بھی اس میں اقامت درست نہیں ہے حقیقت سے مجاز کی طرف رجوع کرنا بدون قرینہ صارفہ کے صحیح نہیں ہے، فی الجملہ فقہاء کی تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ بحر اور سفینہ محلِ اقامت نہیں ہے، پس اس کے حکم کے خلاف حکم دینے کے لئے صریح دلیل کی ضرورت ہے، دست بستہ عرض ہے کہ ان شبہات کے دفعیہ کی طرف توجہ مبذول فرمادیں، جناب کا وہ فتویٰ جو رسالہ الامداد ماہ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ میں مندرج ہے دستیاب ہونے سے قبل میں نے یہ فتویٰ لکھا تھا، اگر قبل اس کے آپ کا فتویٰ ملتا تو بغیر جواب تحریر کئے محض شبہات کو آپ کی خدمت میں بھیجدیتا، اب گذارش ہے کہ ازراہ نوازش جواب تحریر فرماکر تسکین فرمائیں،

## تحقیق صاحب خط

کیا فرماتے ہیں علمائے دین رحمکم اللہ تعالیٰ، ان جہاز رانوں، اور کشتی بانوں کے حق میں کہ جن کے جہاز اور کشتی اپنے بنادر اور قرارگاہوں سے کہیں دور دراز فاصلہ اور مسافتِ طویلہ میں جاتے ہیں جس سے مقدارِ مدتِ سفر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اکثر مقاماتِ قریبہ و مضافاتِ غیر بعیدہ میں روزانہ دورہ کرتے رہتے ہیں، اور عموماً رات کو بعد اختتامِ کام حسبِ معمول اپنی اپنی قرارگاہ میں آکر لنگر انداز ہوتے ہیں، مندرجہ بالا جہاز اور کشتی کے ملازمین داہل کار جو غیر ممالک کے باشندے ہوتے ہیں انھیں جہاز اور کشتیوں میں رہتے ہیں، ان کا کھانا پینا، سونا و دیگر حوائج ضروریہ کے لئے پورا انتظام جہاز اور کشتی ہی میں ہوتا ہے، تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق الذکر جہاز اور کشتی کے ملازمین داہل کار تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ کہ اپنے وطن سے آکر شہر یا گاؤں میں اولاً کوئی جگہ اقامت کی نیت کرکے مقیم ہوجاتے ہیں، پھر کچھ دنوں کوشش و تلاش کے بعد کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہوجاتے ہیں، دوسرے وہ کہ وطن سے آکر بحیثیت ملازم قدیم براہِ راست اپنی منصب پر مامور ہوجاتے ہیں اور انھیں کسی غیر جگہ پر اقامت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، تیسرے وہ کہ بجستجوئے ملازمت کسی شہر یا گاؤں پر بلا نیت اقامت تا حصولِ ملازمت ٹھہر جاتے ہیں اور بعدہٗ ملازم ہوکر کسی جہاز یا کشتی میں جاکر اپنے کام میں مصروف ہوجاتے ہیں، پس ایسے لوگوں کو پوری نماز پڑھنی چاہیے یا قصر؟ اس بارے میں حکم شرع کیا ہے؟

**الجواب واللہ الموفق للصواب** اول الذکر لوگوں کو پوری نماز ادا کرنی ہوگی، کیونکہ بوجہ نیت اقامت و عدم موانع حکم سفر ان کا باطل ہوگیا، اور وہ لوگ مقیم ہوگئے لما فی الکبیری ثم لایزال المسافر علی حکم السفر حتی یدخل وطنہ او ینوی اقامۃ خمسۃ عشر یوما بموضع واحد من مصر او قریۃ وفی البحر عن المجتبیٰ لایبطل السفر الابنیۃ الاقامۃ او دخول الوطن او الرجوع قبل الثلاثۃ اھ، اگرچہ یہ لوگ جہاز ہی میں رہتے ہیں، اور دوسرے کسی مسکن سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، مگر بسبب اس کے کہ اقامۃ ان کی صحیح اور ثابت ہوگئی ہے، تا وقتیکہ مدتِ سفر کی مسافت میں نہ جائیں اقامت اُن کی باطل نہ ہوگی وہ ہمیشہ مقیم کہلائیں گے، ہاں اگر کبھی تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطنِ اقامت اُن کا باطل ہوجائیگا پھر بعد مراجعت بدون نیتِ اقامت کے مقیم نہیں ہوسکتے ہیں، عالمگیری میں ہے وطن الاقامۃ



یبطل بوطن الاقامۃ بانشاء السفر وبالوطن الاصلی الخ، وفی شرح الوقایۃ واما وطن الاقامۃ فانہ یبطل بوطن الاقامۃ الی قولہ لم یبق الموضع الاول وطن الاقامۃ حتی لو دخلہ لایصیر مقیما الا بالنیۃ وکذا ان سافر عنہ الخ فی الجملہ ان کا مقیم کہلانا از جہت صحت اقامت فی السفن کے نہیں ہے بلکہ بسبب اس اقامت ثابتہ کے ہے جو قبل ملازمت کسی شہر یا گاؤں میں جو لبِ دریا آباد ہیں، وقوع میں آئی ہے، کما یدل علیہ ما فی العالمگیریۃ ولا یصیر مقیما بنیۃ الاقامۃ فیہا وکذلک صاحب السفینۃ والملاح الا ان تکون السفینۃ بقرب من بلدتہ او قریتہ فحینئذ یکون مقیما باقامتہ الاصلیۃ، اھ،

دوسرے اور تیسرے قسم کے لوگوں کو تا بقائے قیام فی السفن نماز قصر کرنی ہوگی، کیونکہ قبل اس کے کہ وہ لوگ کسی جہاز یا کشتی میں ملازم ہوں شہر یا گاؤں میں کسی جگہ مقیم نہیں ہوئے اس لئے مسافرت ان کی باطل نہیں ہوئی، جب تک نیتِ اقامت بمحل صالح اقامت ان سے وقوع میں نہ آئے، حکمِ سفر اُن پر ہمیشہ جاری رہیگا، کما فی الوقایۃ ولو رخص تدوم وان کان عاصیا فی سفرہ حتی یدخل بلدہ او ینوی اقامۃ نصف شہر ببلدۃ او قریۃ اھ وفی الھدایۃ ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ خمسۃ عشر یوما الخ، جہاز اور کشتی موضع صالح اقامت نہیں ہے، جو شرط ہے صحتِ اقامت کے لئے لہٰذا اس میں نیتِ اقامت کرنے سے بھی اقامتِ شرعی ثابت نہیں ہوتی،

بناءً بریں متذکرہ بالا تین قسم کے لوگوں میں سے قسم دوم و سوم کے ملازمین کا شمار ہمیشہ مسافرت ہی میں رہے گا، اس لئے اُن کے حق میں صلوٰۃ رباعیہ میں قصر واجب ہے، درمختار میں ہے والحاصل ان شروط الاتمام ستۃ، النیۃ والمدۃ واستقلال الرائی وترک السیر واتحاد الموضع وصلاحیتہ اھ، وفی العالمگیریۃ ونیۃ الاقامۃ انما تؤثر بخمس شرائط ترک السیر حتی لو نوی الاقامۃ وھو یسیر لم تصح وصلاحیۃ الموضع حتی لو نوی الاقامۃ فی بر او بحر او جزیرۃ لم تصح والمدۃ اتحاد الموضع والاستقلال بالرائی اھ

مندرجہ بالا دلائل سے ثابت و روشن ہے کہ جہاز اور کشتی قابلِ اقامت اور صالح سکونت نہیں ہے، اس لئے نیت اقامۃ شرعاً اس میں صحیح نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص

معہ اپنے اثاث البیت اور اہل و عیال کے جہاز یا کشتی میں سکونت اختیار کرے تو بھی وہ شخص شرعاً مقیم نہیں ہو سکتا ہے بہ سبب نیت اقامت کے کما فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (قولہ لا تصح نیۃ الاقامۃ فی مفازۃ) مثلها الجزیرۃ والبحر والسفینۃ والملاح مسافر وسفینتہ لیست بوطن الا عند الحسن الخ وکما فی رد المحتار قال فی المجتبیٰ والملاح مسافر الا عند الحسن وسفینتہ ایضاً لیست بوطن اھ بحر وظاهرہ ولو کان مالہ واہلہ معہ فیها ثم رأیتہ صریحاً فی المعراج اھ وفی البحر وقید بالبلد والقریۃ لان نیۃ الاقامۃ لا تصح فی مفازۃ ولا جزیرۃ ولا بحر ولا سفینۃ اھ

نوٹ؛ وہ لوگ جو قبل ملازمت جہاز کے کسی گاؤں یا شہر میں مقیم ہو جاتے ہیں اور اقامت کی نیت کر لیتے ہیں، اور بعد قیام ملازمتِ جہاز اختیار کر کے تین روز سے کم کی مسافت میں سفر کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو نماز پوری پڑھنی ہوگی، خواہ وہ جہاز ہی میں رہتے ہوں البتہ اگر کبھی تین روز یا اس سے زیادہ کی مسافت میں سفر کریں تو وطن اقامۃ ان کا باطل ہو جائے گا، بعد مراجعت بدون نیت اقامت کے مقیم نہیں ہو سکتے، جب تک جہاز میں رہیں نماز... قصر کرنی ہوگی، جو لوگ وطن سے آکر سیدھے جہاز میں قیام کرتے ہوں یا پندرہ یوم سے کم کسی گاؤں یا شہر میں بغیر نیت اقامت ٹھہر کر جہاز میں نوکری اختیار کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے قصر واجب ہے، واللہ اعلم وعلمہ احکم، نمقہ محمد یعقوب غفرلہٗ

## الکلام علی الجواب المذکور اجمالاً من جامع امداد الاحکام

سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جہاز رانوں اور ملاحوں کے لئے بنادر اور قرارگاہیں متعین ہیں، جہاں وہ رات کو عموماً دورہ ختم کر کے لنگر انداز ہوتے ہیں، پس یہ بنادر ان لوگوں کے حق میں ایسے ہیں جیسے ملازمانِ ریلوے کے لئے اسٹیشن، تو اگر یہ بنادر کسی شہر یا قریہ کے متصل ہیں، یا متصل نہیں، مگر حوائج بلد یا قریہ کا تعلق اس سے ہے تب تو یہ بمنزلہ فنائے مصر یا متعلقاتِ قریہ ہونے کے موضعِ اقامت ہونے کے قابل ہیں، اور اگر کسی مصر یا قریہ کے متصل نہیں، نہ اُن کے حوائج کا بنادر سے تعلق ہے، تو چونکہ اہلِ جہاز کے مصالح ان بنادر سے متعلق ہیں، اس لئے یہ اُن کے حق بمنزلہ صحراء کے ہیں رعاۃ کے لئے، لہٰذا بنادر



۲۱

کو ان کے لئے موضعِ اقامت کہنا صحیح ہے، بشرطیکہ بنادر پر انھوں نے خیمے اور جھونپڑے وغیرہ قائم کر لئے ہوں، یا کوئی عمارت اُن کی ضروریات کے واسطے بنی ہوئی ہو، پس یہ جہاز ران اور ملاح جس وقت بنادر پر پہونچیں گے مقیم ہوں گے، اور جب بنادر سے انتقال کریں گے تو اگر تین دن کی مسافت یا زیادہ کا قصد کریں تو وقتِ سیر سے مسافر ہو جائیں گے، (یعنی جبکہ اپنے بندر کی حد سے نکل جائیں) اور جب بندر پر واپس ہونگے مقیم ہو جائیں گے، اس حکم میں تینوں قسم کے آدمی برابر ہیں جن کا ذکر سوال میں ہے، اور ان لوگوں کا کشتی میں رہنا مانع عن الاقامۃ نہیں، کیونکہ فقہاء کے کلام سے یہ بات صراحۃ مفہوم ہوتی ہے کہ سفینہ جب موضع اقامت میں پہونچے تو راکب سفینہ مقیم ہو جائے گا، اور یہ جو فقہاء نے فرمایا ہے کہ سفینہ صالح للاقامۃ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ سفینہ سائرہ محلِ اقامۃ نہیں، یعنی سفینہ سائرہ میں ۱۵، ۲۰ دن یا زیادہ قیام کی نیت سے راکب مقیم نہ ہوگا، قال فی العالمگیریۃ ولا یصیر مقیماً بنیۃ الاقامۃ فیها وکذلک صاحب السفینۃ والملاح الا ان تکون السفینۃ بقرب من بلدتہ او قریتہ فح یکون مقیما باقامۃ الاصلیۃ کذا فی المحیط وفی الولوالجیۃ افتتح الصلوٰۃ فی السفینۃ حال اقامتہ فی طرف البحر فنقلها الریح وهو فی السفینۃ فنوی السفر تیم صلوٰۃ المقیم عند ابی یوسفؒ وفی الحجۃ الفتوی علی قولہ احتیاطاً وفی العتابیۃ ولو کان مسافراً وشرع فی الصلوٰۃ فی السفینۃ خارج المصر فجرت السفینۃ حتی دخل المصر تیم اربعاً اھ ص $\frac{92}{1}$ ج

واللہ اعلم، ۱۱ رجب سنہ ۴۲ھ

## الکلام علیہ تفصیلاً

**تنبیہ**؛ اس جگہ چند امور محتاجِ دلیل ہیں:- (۱) یہ کہ جب بندر ساحل بحر متصل کسی شہر یا قریہ کے ہو تو وہاں نیتِ اقامت جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ موضع صالح للاقامۃ ہے یا نہیں؟ (۲) کشتی اور جہاز جب بندر پر کھڑا ہو اور بندر قریب شہر یا قریہ کے ہے تو اس حالت میں خود کشتی یا جہاز موضعِ اقامۃ ہے یا نہیں؟ (۳) اگر بندر متصل شہر و قریہ کے نہیں اس حالت میں اس کا صالح للاقامۃ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے، اور کیا وہ مطلقاً صالح للاقامۃ ہے یا بندر پر خیمے اور جھونپڑے

وغیرہ نصب کرنا بھی شرط ہے،

**جواب اول**: بندر جب متصل شہر و قریہ کے ہو اس طرح کہ آبادی کا سلسلہ وہاں تک ممتد ہو یا متصل نہ ہو مگر آبادی والے وہاں کپڑے وغیرہ دھوتے ہوں یا ان کے اور حوائج بندر سے متعلق ہوں اس صورت میں وہ بحکم فناء مصر و فناء قریہ کے ہے، اور فناءِ مصر و فناء قریہ کا حکم وہی ہے جو خود مصر و قریہ کا حکم ہے، اس لئے وہاں اقامت کی نیت درست ہوگی،

قال فی الدر او فنائہ وھو ما حولہ اتصل بہ اولا لاجل مصالحہ اھ قال الشامی نص الائمۃ علی ان الفناء ما اعد لدفن الموتی وحوائج المصر کرکض الخیل و الدواب وجمع العساکر والخروج للرمی وغیر ذلک وای موضع یحد بمسافۃ یسع عساکر مصر ویصلح میدانا للخیل والفرسان ورمی النبل والبندق والبارود واختبار المدافع وھذا یزید علی فراسخ اھ وفیہ ایضا اعتبر بعضھم (فی تعریف الفناء) الاتصال وقد خطأہ صاحب الذخیرۃ قائلا فعلی قول ھذا القائل لا تجوز اقامۃ الجمعۃ ببخاری فی مصلی العید لان بین المصلی وبین المصر مزارع ووقعت ھذہ المسئلۃ مرۃ وافتی بعض مشائخ زماننا بعدم الجواز ولکن ھذا لیس بصواب فان احدا لم ینکر جواز صلوٰۃ العید فی مصلی العید ببخاری لا من المتقدمین ولا من المتأخرین وکما ان المصر او فناءہ شرط لجواز الجمعۃ فھو شرط جواز صلوٰۃ العید اھ، (ص، ۸۳ ج ۱) غرض فناء کے لئے اتصالِ آبادی بھی شرط نہیں، بلکہ اس کے متعلقات بلد وحوائج مصر ہونا کافی ہے، اسی طرح قریہ کے متصلات میں شمار ہونا بس ہے، اور یقیناً جب فناء بحکم مصر و قریہ ہے تو ان کی طرح یہ بھی ضرور صالح للاقامت ہوگا، کیونکہ جمعہ اسی موضع میں جائز ہے، جو صالح للاقامت ہو، مفازہ وبریہ میں اتفاقاً جمعہ صحیح نہیں باقی جواز قصر کے لئے مجاوزتِ فناء کا شرط نہ ہونا دوسری وجہ سے ہے، اس کا مبنی یہ نہیں کہ فناء صالح للاقامت نہیں، قال فی الکفایۃ فان قیل فناء المصر فی حکم المصر فی حق صلوٰۃ الجمعۃ و العیدین حتی جازت الصلوٰۃ فیہ مع کون المصر شرطا لجواز ھذہ الصلوٰۃ فکیف اعطی الفناء حکم غیر المصر فی حق القصر للمسافر قلنا فناء المصر انما یلحق بالمصر فیما کان من حوائج اھل المصر وصلوٰۃ الجمعۃ والعیدین من حوائج اھل المصر فاما قصر الصلوٰۃ فلیس من حوائج اھل المصر فلا یلحق



الفناء بالمصر فی حق ھذا الحکم اھ (ص ۱۹۵ ج ۱)

پس صلاحیتِ نیت اقامت کے لئے فناء کی وہ تعریف لی جائے گی، جو صحت صلوٰۃ جمعہ کے لئے فناءِ مصر کی تعریف عند الحنفیہ ہے، یا فناء قریہ کی تعریف عند الشافعیہ ہے کیونکہ دونوں کے نزدیک صحتِ جمعہ کے لئے اس کا موضع صالح للاقامت ہونا شرط ہے، اور وہ معنی فناء کے نہ لئے جائیں گے جس کی مجاوزت سے قصر صحیح ہو جاتا ہے، فافہم،

وفی الاملاء عن ابی یوسفؒ ان نزلوا (عسکر المسلمین) بساتینھم واکنافھم (ای البغاۃ) وللمسلمین منعۃ صحت اقامتھم ولا یصح اذا نزلوا علیھم فی خیامھم (بنایہ ص ۹۶۸ ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بساتین بلد و جوانب بلد محل اقامت ہیں حالانکہ مسافر کو قصر کے لئے مجاوزت بساتین شرط نہیں، پس جب بندر سے مصالح مصر و قریہ کا تعلق ہو گو اتصال نہ ہو وہ موضع صالح للاقامت ضرور ہوگا،

**جوابِ شق دوم**: جب کشتی یا جہاز بندر پر کھڑا ہو، اور بندر فناءِ شہر یا قریہ ہو تو اس صورت میں کشتی یا جہاز کا بھی وہی حکم ہے جو ساحل بحر کا حکم ہے، جس طرح ساحل بحر موضع صالح للاقامۃ ہے اسی طرح کشتی یا جہاز واقف و مشدود بالساحل بھی صالح للاقامۃ ہے، قال فی الدر والمربوطۃ فی الشط کالشط فی الاصح اھ قال الشامی و ان کان الامام فی سفینۃ واقفۃ والمقتدون علی الشط فان بینھما طریق او قدر نھر عظیم لم یصح بحر اھ (ص ۹۸، ج ۱) اس سے معلوم ہوا کہ اگر درمیان میں طریق وقدر نہر عظیم نہ ہو تو اقتداء صحیح ہے، اور یقیناً اقتداء کے لئے اتحاد موضع امام و مقتدی شرط ہے، معلوم ہوا کہ سفینہ واقفہ کا حکم مثل ساحل کے ہے، لہٰذا اگر ساحل موضع صالح للاقامت ہو تو سفینہ واقفہ مشدودہ بھی محلِ اقامت ضرور ہے، لاتحادہ بالساحل فافہم،

وفی العتابیۃ ولو کان مسافرا شرع فی الصلوٰۃ فی السفینۃ خارج المصر فجرت السفینۃ حتی دخل المصر تیمم اربعا اھ عالمگیری (ص ۹۲ ج ۱) قلت ومعناہ فجرت السفینۃ حتی دخل المصر وھو فیھا، کیونکہ صورتِ مفروضہ یہ ہے کہ وہ شخص نماز شروع کرنے کے وقت مسافر تھا، اور نماز شروع کرنے کے بعد اثناء صلوٰۃ میں کشتی مصر میں پہونچ گئی، تو یہ شخص کشتی کے اندر ہی مقیم ہو گیا، پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ کشتی سے اتر کر شہر میں داخل ہو جائے تو مقیم ہوگا، کیونکہ اثناءِ صلوٰۃ میں اس عمل کثیر کی

کوئی گنجائش نہیں، پس ثابت ہوا کہ دریا کا وہ حصہ جو متصل بلد یا داخل بلد ہو وہ حکم بلد میں ہے، اور کشتی کا اس موضع میں پہونچ جانا اقامت کے لئے سبب ہوسکتا ہے، پس اسی طرح جو لوگ بندر پر مقیم ہیں اور بندر بوجہ فناء مصر یا فناء قریہ ہونے کے صالح للاقامۃ ہے تو جب وہ لوگ کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے بندر پر پہونچ جائیں اور کشتی یا جہاز بندر پر لنگر انداز ہوجائے تو یہ لوگ مقیم ہوجائیں گے، کیونکہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ سفینہ مشدودہ بالشط بحکم شط ہے، قال فی العالمگیریۃ واذا وقف علی الاطلال یقتدی بالامام فی السفینۃ صح اقتداءہ الا ان یکون امام الامام کذا فی المحیط اھ (ص ۱۹۲ ج ۱)

الغرض سفینہ کی چار حالتیں ہیں، واقف علی الشط، واقف فی لجۃ البحر، سائر بقرب الشط، سائر فی لجۃ البحر (یعنی بعیدا عن الشط) پس واقف علی الشط بحکم شط ہے، اور جب شط صالح للاقامۃ ہو سفینہ بھی صالح للاقامۃ ہے، اور واقف فی لجۃ البحر بحکم بحر ہے، وہ صالح لنیۃ الاقامۃ نہیں، یعنی انشاء اقامت کا محل نہیں، گو بقاءِ اقامۃ کا محل ہوسکتا ہے مثلاً پہلے سے شہر یا قریہ میں مقیم ہے، اور کشتی میں سوار ہوکر نہ سفر کی نیت کی، نہ تین دن کی مسافت قطع کی، یہ شخص سفینۃ واقفۃ فی لجۃ البحر باقامۃ سابقہ مقیم رہے گا، اور سائر لقرب الشط یا بعیداً عن الشط بھی موضع انشاء اقامت نہیں، البتہ جو شخص پہلے سے مقیم علی الشط ہو وہ کشتی میں بہ نیتِ سفر سوار ہوکر اس وقت مسافر ہوگا جبکہ سفینہ اس کے بندر کی حد سے نکل جاوے، قال فی البنایہ وان کان فی سفینۃ فحین یرکبہا ای یصیر مسافرا ابر کوبہا) الا ان یکون فی وسط المصر فیعتبر ان یجاوز البیوت اھ (ص ۹۶۳ ج ۱) قلت فلما کان سیر السفینۃ فی المصر لا یکفی لابتداء سفر اھلہ بدون المجاوزۃ عن البیوت فکذا سیرھا علی الشط لا یکفی لابتداء السفر لاھل الشط حتی یجاوز حدودہ فافہم ۱۲

پس فقہاء کا یہ قول فلا تصح نیۃ الاقامۃ فی مفازۃ ولا بحر ولا سفینۃ اھ اس میں اقامۃ فی البحر سے اقامت فی السفینۃ الواقفۃ فی لجۃ البحر مراد ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ بحر میں بجز سفینہ کے اقامت ممکن نہیں، اور اقامت فی السفینہ سے مراد اقامت فی السفینۃ السائرہ ہے، کیونکہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ سفینہ واقفہ علی الشط فقہاء کے نزدیک بحکم الشط ہے، پس اس سے مطلقاً یہ سمجھنا کہ سفینہ کسی حال میں محلِ اقامت نہیں، غلط ہے،



علاوہ ازیں ہم کو یہ بھی تسلیم نہیں کہ اقامت فی البحر بدون اقامت فی السفینہ کے مقصود نہیں بلکہ کرامت کے طور پر اقامت فی البحر بدون سفینہ کے ہوسکتی ہے، لان بعض الاولیاء یمشی علی وجہ الماء ویقیم فی البحر ایاما، اور فقہاء صور بعیدہ کا حکم بھی بیان فرمادیا کرتے ہیں، کما لا یخفی، پس مجیب سلمہ کا یہ استدلال کہ عطف بحر علی السفینۃ تغائر پر دلالت کرتا ہے، اور بحر میں بجز سفینہ کے اقامۃ کی کوئی صورت نہیں، پس سفینہ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کنارے پر آبادی کے متصل کھڑی ہو تب بھی اس میں اقامت درست نہیں الخ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، دوسرے سفینہ سے سفینۂ واقفہ علی الشط مراد لینا کیا یہ حقیقت کے موافق ہے، یقیناً یہ بھی مجاز ہے، تو اس مجاز کا کیا قرینہ ہے، بخلاف اس کے کہ سفینہ سے سفینۂ سائرہ اگر مراد لیا جائے تو یہ حقیقت کے قریب ہے کیونکہ متبادر اطلاق لفظ سفینہ سے باب مسافر میں یہی ہے، فافہم حق الفہم،

جواب شق سوم؛ اگر بندر فناء شہر و قریہ نہیں ہے اس صورت میں ظاہر روایت پر وہ صالح للاقامۃ نہیں، مگر ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک صالح للاقامۃ ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے جن کے حوائج و کاروبار بندر سے متعلق ہیں، پس اگر جہاز راں و ملاح وغیرہ کسی ایسے بندر پر جو فناء شہر و قریہ نہیں ہے خیمے یا جھونپڑے ڈال لیں، اور اس کو اپنی قرارگاہ و مرکز متعین کرلیں تو وہ ان کے لئے محلِ اقامت ہوجائے گا، اور اگر خیمے و جھونپڑے کچھ نہیں ڈالے، اس صورت میں کسی کے نزدیک انشاءِ اقامت کے لئے صالح نہ ہوگا، یعنی جو سفر کرکے وہاں پہونچے وہ اس حالت میں نیتِ اقامت سے مقیم نہ ہوگا، اور جو پہلے سے مقیم ہو وہ باقامتِ سابقہ مقیم رہیگا جب تک نیتِ سفر یا قطعِ مسافتِ سفر سے اقامتِ سابقہ باطل نہ ہو قال فی الکفایۃ قولہ حتی ینوی الاقامۃ فی بلدۃ او قریۃ الی قولہ وھو الظاھر ای الظاھر من الروایۃ وھذا احتراز عما روی عن ابی یوسفؒ ان الرعاۃ اذا نزلوا موضعا کثیرا الکلاء و الماء واتخذوا المخابز والمعالف والاواری وضربوا الخیام ونووا الاقامۃ خمسۃ عشر یوما والکلاء والماء یکفیھم لتلک المدۃ صاروا مقیمین وکذا التراکمۃ و الاعراب اھ (ص ۱۹۵ ج ۱) تراکمہ و اعراب جو کہ اہل خباء ہیں جن کا مسکن کوئی متعین نہیں ہوتا، ان کا حکم تو ظاہر ہے، مگر ابو یوسفؒ کے نزدیک رُعاۃ کا بھی یہی حکم ہے، اگر وہ جنگل میں خیمے ڈال کر قیام کرلیں، اور ظاہر ہے کہ رُعاۃ کا مسکن کسی بلد یا قریہ میں متعین ہوتا ہے، مگر چونکہ بوجہ شغل رعی کے ان کے حوائج صحرا سے بہت متعلق ہوتے ہیں اس لئے

ان کے حق میں بھی نیت اقامت فی الصحراء وہی حکم رکھتی ہے جو اہل خباء کے حق میں، پس اسی طرح گو وہ بندر جو فناءِ مصر و قریہ نہ ہو، عام لوگوں کے لئے محلِ اقامت نہیں، مگر ملازمانِ جہاز و سفینہ و ملاحین کے لئے محلِ اقامت ہوگا، اگر وہ وہاں خیمے وغیرہ قائم کرلیں ورنہ نہیں، اور چونکہ اہلِ خباء کے مسئلہ میں قول ابو یوسفؒ مفتی بہ ہے پس احوط یہ ہے کہ مسئلہ رعاۃ میں بھی ان کا ہی قول لیا جائے مگر ایسے ملازمان جہاز و ملاح جو ان بندروں پر مدتِ سفر سے آئے ہیں، اور یہاں نیتِ اقامت کرنے سے مقیم ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کے امام نہ بنیں جو اقامتِ سابقہ فی بلد یا اقامۃ فی قریہ کی وجہ سے مقیم ہیں، (یا بندر ہی پر مقیم ہیں) مگر ان کا وطن اصلی وہاں سے نزدیک ہے، مدتِ سفر کی مسافت پر نہیں، کیونکہ یہ خلافِ احتیاط ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، ۴ رجب ۱۳۴۲ھ

کشتی میں نماز پڑھنے کے متعلق عربی زبان میں ایک سوال اور اس کا جواب

**سوال** (۷) مایقول العلماء الکرام والفضلاء العظام فی الصلوٰۃ فی السفینۃ هل یجوز مطلقاً ام فیہ تفصیل بینوا توجروا؟

**الجواب**: اقول ان هذه المسئلة علی وجوه فنذکرها مع احکامه، الوجه الاول ان تکون السفینة مربوطة فی الشط فان کانت مستقرة علی الارض بحیث اتصل اسفلها بها فالصلوٰة فیها جائزة قائما لا قاعدا لانها فی حکم السریر علی هذا التقدیر والصلوٰة علی السریر انما تجوز قائما لا قاعدا فکذا هذا او ان کانت غیر مستقرة علی الارض فان امکنه الخروج منها یجب علیه الخروج للصلوٰة لکونها فی حکم الدابة علی هذا التقدیر وان لم یکن الخروج یصلی فیها قائما لان الصلوٰة فیها علی هذا التقدیر کالصلوٰة علی الشط والصلوٰة علی الشط لابد لها من القیام فکذا هذا، الوجه الثانی ان تکون مربوطة فی الوسط فان استقرت علی الارض فهی فی حکم السریر یصلی فیها قائما وان لم تستقر فان امکنه الخروج وهی ساکنة غیر متحرکة بالریح یصلی فیها قائما لانها فی هذه الصورة کالواقفة علی الشط وقد مر حکمها وان کانت متحرکة بالریح حرکة شدیدة تجوز الصلوٰة فیها قاعدا ایضا وان لم یحصل له دوران الرأس بالقیام عند ابی حنیفة رح لکن علی الاساءة وعندهما لایجوز قاعدا وان حصل دوران الرأس فیجوز قاعدا بالاتفاق من غیر اساءة لانها فی



هذه الصورة فی حکم السفینة السائرة الآتی حکمها، والوجه الثالث ان تکون سائرة فی البحر فان امکنه الخروج منها بوجه یجب علیه الخروج وان لم یمکنه الخروج تجوز فیها الصلوٰة فان حصل له دوران الرأس عند القیام یجوز قاعدا بالاتفاق من غیر اساءة وان لم یحصل دوران الرأس فعندهما یجب علیه القیام وعنده یجوز مع القعود ایضا مع الاساءة. فی الدر المختار صلی الفرض فی فلک جار قاعدا بلا عذر صح لغلبة العجز واساء وقالا لایصح الا بعذر وهو الاظهر برهان والمربوطة فی الشط کالشط فی الاصح والمربوطة بلجة البحر ان کان الریح یحرکها شدیدا فکالسائرة والا فکالواقفة ویلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وکلما دارت انتهی بلفظه قال فی رد المحتار قوله والمربوطة فی الشط کالشط فلا تجوز الصلوٰة فیها قاعدا اتفاقا وظاهر ما فی الهدایة وغیرها الجواز قائما مطلقا ای استقرت علی الارض اولا وصرح فی الایضاح بمنعه فی الثانی حیث امکنه الخروج الحاقا لها بالدابة نهر واختاره فی المحیط والبدائع، بحر وعزاه فی الامداد ایضا الی مجمع الروایات عن المصفی وجزم به فی نور الایضاح وعلی هذا ینبغی ان لا تجوز الصلوٰة فیها مع امکان الخروج الی البر وهذه المسئلة الناس عنها غافلون شرح المنیة انتهی بعبارته فقد علم بذلک ان ما یفعله کثیر من الناس حتی بعض الخواص ایضا من ینتسبون الی العلم انهم یصلون فی السفن المربوطة فی الشط مع انها غیر مستقرة علی الارض وهم قادرون علی الخروج منها وکذا یصلون فی السفن الجاریة حالة السیر وهم یستطیعون الخروج منها غلط عظیم نشأ من عدم تتبع کتب الفقه لابد لهم ان یخرجوا منها وان استثقلوا الخروج فعلیهم ان یوقفوها فی موضع تستقر علی الارض ثم یصلون قائمین فقط، والله اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب، حرره العبد الضعیف فیض الله عفی عنه، الجواب صحیح عزیز الرحمن مفتی دار العلوم دیوبند ۱۶ شعبان ۱۳۴۲ھ

الجواب صحیح محمد اعزاز علی غفرلہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا الله عنه از خانقاه امدادیہ تھانہ بھون

قلت اما اتصال اسفلها بالارض فلیس بشرط اتصال طرف منها بها یکفی کما یظهر من نور الایضاح

وحاشیۃ للطحطاوی ونصہ فان صلی فی المربوطۃ بالشط قائما وکان شئ من السفینۃ علی قراب الارض صحت الصلوٰۃ بمنزلۃ الصلوٰۃ علی السریر اھ (ص ۲۳۸) فقولہ شئ من السفینۃ یعمل الاسفل والمقدم وغیرھما سواء کان قلیلا او کثیرا ھذا واللہ اعلم، احقر ظفر احمد، ۱۹ صفر ۱۳۴۳ھ

جہاز کے ملازمین کے لئے قصر کا حکم

**سوال** (۸) جہاز کے ملازموں میں سے بعض لوگ کہیں باہر نہیں جاتے انہیں سے بہت سے لوگ نماز قصر پڑھتے ہیں، اور وہ یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ ہم لوگ جسکی نوکری کرتے ہیں نہ معلوم کب اس کی طرف سے ایسی خبر آجائے جس سے مسافت کی راہ کوچ کرنا پڑے، اور ہمارے جہاز کا پیندا یعنی نیچے کا حصہ مٹی سے یعنی کنارے سے ٹھیک لگی نہیں ہوتی، اگر جہاز کا حصہ کنارے سے لگا ہو تو پوری نماز پڑھنی ہوگی،

اور دوسری بات یہ کہ اپنی کمپنی سے خبر کب صادر ہوگی اس سے بھی واقف نہیں، اور نہ کمپنی نے ایسا کہا کہ فلانی تاریخ کو تمہیں فلانی جگہ جانا ہوگا، اور کمپنی کے دل میں کونسی بات گذرتی ہے اور کونسی بات گذرے گی، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے، اور اگر ایسا خیال ہے کہ ہر وقت آمد و رفت ہوتی ہو تو بلا تردد نماز قصر پڑھنی چاہئے. اب یہ لوگ کہتے ہیں ہماری کمپنی کے اس رنگون کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہ کارخانہ ہے، اس جگہ ایک دو بار گیا بھی تھا، اب کوئی متعین وقت جانے کے لئے نہیں اور نہ جانے کا ارادہ ہے، لیکن مالک کی کوئی خبر آئے گی کہ نہیں اس کا علم تو خدا کو ہے،

اب تیسری گذارش یہ ہے کہ ہم لوگ جہاز میں شب و روز رہتے ہیں، اور اسی میں خورد و نوش کا بھی انتظام ہے، بلکہ جہاز میں ہماری قیامگاہ ہے، اب اگر مالک کی طرف سے کوئی آرڈر ایسا آپڑے جس سے مسافرت کی راہ طے کرنی پڑے، تو اس حالت میں ہم لوگوں پر نماز قصر پڑھنی چاہئے یا نہیں، بشرطیکہ جہاز ہماری قیامگاہ ہے، اور مع جہاز کے جگہ میں پہونچ جاؤں گا، سو اس پر آپ کی کیا رائے ہے، اس مضمون پر خیال فرما کر نورِ ضیاء بخشئے، اور کتاب کا حوالہ بھی ضرور دیجئے، اور جو مضمون عربی زبان میں ہو اس کا ترجمہ اردو زبان میں تحریر کیجئے، اس مسئلہ کے بارے میں جہازی آدمیوں میں بڑا فساد برپا ہو رہا ہے، کوئی عالم کہتے ہیں کہ نماز قصر پڑھنی چاہئے، اور کوئی اس کے برخلاف، اب ہم لوگ حیران ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہیں،

**الجواب**: جو لوگ رنگون میں رہ کر قصر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں کہ



مالکِ جہاز کی طرف سے کب حکم آجاوے اس کا حکم یہ ہے کہ شرع میں وہم و خیال کا اعتبار نہیں، ظنِ غالب کا اعتبار ہے، اگر ان کو کمپنی کی طرف سے حکمِ سفر آنے کا ظنِ غالب ہو، جس کا معیار یہ ہے کہ اکثر ہر مہینے میں اُن کو حکمِ سفر آتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی ایسا موقع نہیں ملتا، کہ اپنے ارادہ و اختیار سے دس پندرہ دن قیام کرسکیں، یہ حالت ہو تو ان کا رنگون میں قصر کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ ان کا وطنِ اصلی نہ ہو، اور اگر ظنِ غالب نہیں محض خیال و وہم ہی ہے کہ شاید حکمِ سفر آجائے تو اس کا اعتبار نہیں، اس صورت میں اگر یہ لوگ رنگون میں نیتِ اقامت کرلیں، یا ظنِ غالب سے کبھی یہ معلوم ہو کہ پندرہ دن تک ابھی کہیں دور جانا نہیں ہے تو مقیم ہوجائیں گے، اور نماز پوری پڑھنا چاہئے، اور گذشتہ ایام میں اگر کبھی ایسا ہوا ہو کہ ظنِ غالب سے پندرہ دن تک کہیں جانا اُن کو متحقق نہ تھا، یا پندرہ دن ٹھیرنے کی نیت کرلی تھی اور ظنِ غالب سے نیت کے پورا ہونے کی امید تھی اور اس وقت میں غلطی سے یہ لوگ قصر کرتے رہے تو ان ایام کی نماز کا اعادہ ضروری ہے، قال فی الدر او دخل بلدۃ ولم ینوھا ای مدۃ الاقامۃ بل ترقب السفر غدا او بعدہ ولو بقی علی ذلک سنین (یقصر) الا ان یعلم تاخر القافلۃ نصف شہر کما مر اھ، قلت اشارۃ الی قولہ سابقا او ینوی اقامۃ نصف شہر حقیقۃ او حکما کما فی البزازیۃ لو دخل الحاج الشام وعلم انہ لایخرج الا مع القافلۃ فی نصف شوال اتم لانہ کناوی الاقامۃ اھ (ص ۸۲۳ ج ۱) قلت وقد تقرر ان غلبۃ الظن فی حکم العلم شرعا، واللہ اعلم ۳ رجمادی الاول ۱۳۴۳ھ

حکم سیلان زخمیکہ از خود پیدا کردہ شود یا مثل زخمے ہست کہ بآفتِ سماویہ پیدا شود؛

**سوال** (۹)........بندہ کے کمر میں بہت درد ہے، اور درد کی وجہ سے پیٹھ میں پیٹھ کی ہموار سطح سے چار انگشت چوڑا ایک انگشت اونچا بڑی انگلی سے ہوگیا ہے، حالانکہ وہ پھنسی بھی نہیں ہے، اور نہ پکتا ہے، اور کمر کے درد کی وجہ سے ایک بھرا ہوا لوٹا بھی اٹھانے میں سخت تکلیف ہوتی ہے، لہذا ہمارے یہاں کے لوگ مرض درد کے واسطے یہ علاج کرتے ہیں کہ نیم کے درخت کی ایک گولی لے کر گھٹنے کے تین انگشت نیچے یعنی پنڈلی کے اعلیٰ حصہ میں کاٹ کر زخم کرکے اس میں نیم کا درخت کی گولی رکھ دی جاتی ہے، اس کے اوپر تین انگشت چوڑا اور دو ہاتھ لمبا ایک کپڑا لپیٹ کر باندھ دیتے ہیں، نیم کی گولی کم از کم ڈیڑھ سال تک رکھی جاتی ہے

اس سے زیادہ بھی رکھتے ہیں، اس زخم سے ہمیشہ پیپ پانی اور خراب چیزیں نکلتی ہیں بعضوں کے بہت بدبو ہوتی ہے، اور بعضوں کے بدبو کم ہوتی ہے، بعضے احتیاطاً دھو دیتے ہیں اور بعضے نہیں دھوتے، مگر بندہ کے بدبو کم ہے، پس ہمارے پڑوسیوں کو دو تین آدمیوں کے استعمال سے مرض درد میں شفا ہوگئی ہے،

خدا کے حکم سے اگر کہیں بدن میں زخم ہوگیا ہے اس سے پیپ خون پانی وغیرہ نکلنے سے صحتِ صلوٰۃ کے لئے قدر درہم تک معاف ہے، اگر بعد وضو بھی وہ خون پیپ وغیرہ نکلے، نماز کے پورے وقت تک وضو باقی رہتا ہے، پس اس صورت بالا میں یعنی خود کردہ زخم کے پیپ پانی وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ بندہ نے چار ماہ ہوئے استعمال کیا ہے، درد میں کچھ تخفیف معلوم ہوتی ہے،

**الجواب:** اگر اس زخم میں روئی رکھنے یا اوپر سے پٹی باندھنے یا اور کسی طرح وقتِ صلوٰۃ میں سیلان بند ہو سکے، اور سہولت کے ساتھ بند ہو سکے تو ان طرق سے نماز کے وقت سیلان کو روکنا چاہئے، اور اگر بسہولت سیلان کو نہ روک سکے تو پھر یہ شخص معذور ہے اور اس کے لئے معذورین کا حکم ہے، اس میں خود کردہ اور خدا کردہ زخم برابر ہے، خود کردہ زخم بھی خدا ہی کا کیا ہوا ہے، خصوصاً جب کہ بضرورت علاج کیا گیا ہے، قال فی نور الایضاح وجرح لا یرقأ ولا یمکن حبسه بحشو من غیر مشقة ولا بجلوس اھ اما اذا کان یمکن رد سوجب رده وخرج عن ان یکون صاحب عذر اھ ط،

اور اس زخم سے جو ناپاکی نکلتی ہے، اگر وہ قدر درہم یا اس سے کم ہو تب تو عفو ہے، اور زائد ہو تو دھونا واجب ہے، بشرطیکہ دھونا مفید ہو کہ دھونے کے بعد دیر تک ناپاکی نہ لگتی ہو، اور اگر دھونا مفید نہ ہو تو پھر جب تک عذر باقی رہے اس کا دھونا بھی عفو ہے، قال فی حاشیة مراقی الفلاح وفی البدائع یجب غسل الزائد عن الدرهم ان کان مفیدا بان لا یصیبه مرة اخری حتی لو لم یغسل وصلی لا یجزیه وان لم یکن مفیدا لا یجب مادام العذر قائما وهو اختیار مشایخنا اھ (ص ۲۲ ج ۲) ۱۳۴۴ھ

رسالہ احکام القصر فی بعض احکام السفر یعنی بعض مسائل متعلق نمازِ قصر

**سوال (۱۰)** ملا جائے ملازمت گو وطن تو نہیں ہے لیکن وہاں پر اہل وعیال مقیم رہتے ہیں، تو کیا محض اہل وعیال کے مقیم ہونے کی بناء پر وہاں ہر حال میں نماز کا اتمام کیا جائے گا، خواہ مسافر ہی ہو،



اور اگر بوجہ مسئلہ اس کے خلاف جاننے کے ایسے مقام پر قصر ہی پڑھتا رہا تو کیا اعادہ ضروری ہوگا حالانکہ یاد نہیں کہ کتنی نمازیں ایسی پڑھی گئیں؟

(۲) اگر زوجہ کسی ایسے مقام پر مقیم ہو جو نہ اس کا وطن ہو نہ اس کے شوہر کی جائے ملازمت ہو، تو اس جگہ کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر زوجہ اپنے ماں باپ کے پاس گئی، اور وہ مقام ماں باپ کا وطن نہیں ہے، مگر ماں باپ وہاں مقیم ہیں تو اگر شوہر وہاں عارضی طور پر بحیثیت مسافر کے جائے تو وہ قصر کرے یا نہیں، اور اگر وہاں زوجہ بھی موجود ہو مگر وہاں اس کا مستقل قیام نہیں بلکہ بطور مہمان کے گئی ہے تو اس صورت میں شوہر مسافر قصر کرے یا اتمام؟

(۴) کیا زوجہ کے وطن میں بحالتِ عدم موجودگی زوجہ بھی یا بحالتِ موجودگیِ زوجہ جبکہ خود اس کا قیام مسافرانہ ہو مسافر شوہر اتمام کرے؟

(۵) دورہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مقامات دورہ تجویز کئے جاتے ہیں، اس صورت میں مجموعی مسافت کا اعتبار ہوگا یا صرف اس مقام کو جہاں کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت دیگر مقامات دورہ کے سب سے زیادہ ہو منتہیٰ سفر کا سمجھا جائے گا، اور جہاں سے فاصلہ کم ہونا شروع ہو جائے وہ سفرِ واپسی سمجھا جائے گا، اور اس کا اعتبار نہ کیا جائے، نیز اگر صورتِ دورہ اس طرح ہو جس میں مرکز سے چل کر مرکز ہی پر لوٹنے کا ارادہ ہے، اور کل مجموعہ مسافت مرکز سے مرکز تک ۴۸ میل ہے، اور درمیان میں جتنے مقامات ہیں وہ سب مقصود ہیں، قریب کا بھی ارادہ ہے بعید کا بھی تو اس صورت میں قصر ہوگا یا نہیں؟

(۶) صورتِ مذکورہ نمبر ۵ میں اگر اس طرح مقاماتِ دورہ تجویز کئے جائیں کہ کبھی تو مرکز سے زیادہ فاصلہ کے مقام پر پہنچے، اور کبھی کم فاصلہ کے مقام پر اور اس کے بعد پھر دور کے فاصلہ پر جس طرح کہ حسبِ ذیل نقشہ میں دکھلایا گیا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور آیا مرکز سے کسی مقام کی مسافت بخطِ مستقیم محسوب کی جائے گی، خواہ راستہ عام بخطِ مستقیم نہ ہو، بہر صورت؟
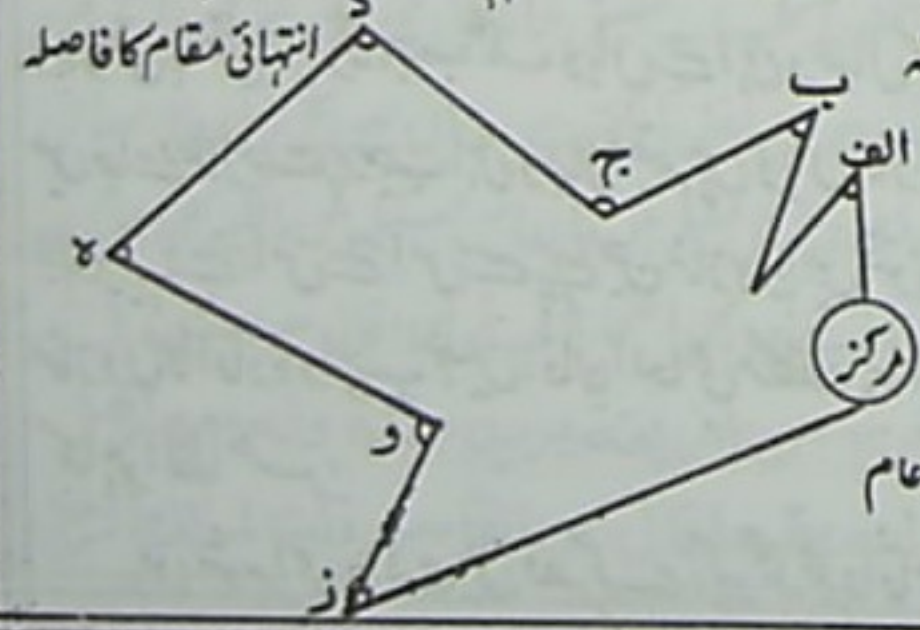
انتہائی مقام کا فاصلہ ہ — ب — الف — ج — ۴ — د — ز — مرکز

(۷) اگر ایک مقام براہِ راست تو حدِ مسافت پر نہیں ہے مگر پھیر کھا کر جاتا ہے، اور جس رستہ سے جاتا ہے اس سے مقدارِ مسافت قصر پر ہے تو کیا حکم ہے، مثلاً یہ صورت ہے جو ذیل میں دکھلائی گئی، یعنی براہِ راست تو صرف بارہ میل اور چکر کھا کر ۲۴ + ۲۴ = ۴۸ میل

(۸) امام مسافر ہے، لیکن مسافر مقتدی کو امام کا مسافر ہونا نہیں معلوم تھا، اس لئے اس نے چار کی تو کیا وہ پوری چار پڑھے یا امام کے ساتھ دو رکعت ہی پر سلام پھیر دے؟

الجواب: قال فی البحر عن المحیط لو کان لہ اھل بالکوفۃ واھل بالبصرۃ وبقی لہ دور وعقار بالبصرۃ قیل البصرۃ لا تبقی لہ وطنا لانھا انما کانت وطنا بالاھل لا بالعقار الا تری انہ لو تاھل ببلدۃ لم یکن لہ فیھا عقار صارت وطنا لہ وقیل تبقی وطنا لہ لانھا کانت وطنا لہ بالاھل والدار جمیعا فبزوال احدھما لا یرتفع الوطن کوطن الاقامۃ یبقی ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر اھ (ص ۱۳۶ ج ۲) الی ان قال وفی المجتبیٰ نقل القولین فیما اذا نقل اھلہ ومتاعہ وبقی لہ دور وعقار ثم قال وھذا جواب واقعۃ ابتلینا بھا وکثیر من المسلمین المتوطنین بالبلاد ولھم دور وعقار فی القری البعیدۃ یصیفون بھا باھلھم ومتاعھم فلابد من حفظھما انھما وطنان لہ لا یبطل احدھما بالآخر اھ وفی السراجیۃ اذا دخل المسافر بلدۃ لہ فیھا اھل صار مقیما نوی الاقامۃ او لا (ص ۶۲ ج ۱)

ان جزئیات سے خصوصاً مجتبیٰ کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر انسان مع اہل و عیال کے مقیم ہو گو قیام عارضی ہو کہ زمانۂ صیف ہی میں وہاں قیام کرتا ہو وہ اس کا وطن ہو جاتا ہے، اور جب تک وہاں اہل و عیال مقیم رہیں گے وطن رہے گا، تنہا اس کے سفر سے وہ وطن باطل نہ ہوگا جب تک وہاں سے اہل و عیال کو منتقل نہ کرے، پس صورتِ مسئولہ میں جائے ملازمت پر جب اہل و عیال مقیم ہیں وہاں نماز کامل پڑھنا چاہیے، اور چونکہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، اس لئے اس سے پہلے جن نمازوں میں فتویٰ آخر کی وجہ سے قصر کیا گیا ہے اُن نمازوں کا اعادہ واجب نہیں، فان العامی مکلف بما افتاہ بہ عالم وطاعتہ علیٰ قولہ صحیحۃ کما ھو الظاھر،

(۲) شوہر اس حالت میں قصر کرے، کیونکہ مجرد اقامت اہل توطن کو مستلزم نہیں، بلکہ



یا تو وہ جگہ بیوی کا وطن ہو اور بیوی وہیں رہتی ہو، یا شوہر نے مع اہل و عیال وہاں اقامت کر رکھی ہو اور اس کو اپنے اہل و عیال کا مسکن بنایا ہو خواہ عارضی ہی ہو، صرف بیوی کے عارضی قیام سے وہ جگہ شوہر مسافر کے لئے موجبِ اتمام نہ ہوگی ودلیل الاول مافی شرح المنیۃ لو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامۃ بہ فقیل یصیر مقیما وھو الاوجہ لما مر من حدیث عثمان انی تاھلت بمکۃ منذ قدمت وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تاھل ببلد فلیصل صلوٰۃ المقیم اھ ای من تاھل ببلد واتر اھلہ بہ لا بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم وازواجہ بمکۃ مع انہ تزوج بمکۃ ولکن لم یقر اھلہ بہ واما عثمان فقد کان لہ اھل بمکۃ مقیم لھا فصار بھا مقیما بمکۃ کلما اتی بھا وان لم ینو الاقامۃ بنفسہ بل کانت الاقامۃ لہ بھا حراما لکونہ مھاجرا،

(۳) اگر بیوی اپنے وطن میں نہیں رہتی بلکہ شوہر کے پاس رہتی ہے تو شوہر اور بیوی دونوں بحالتِ سفر وہاں قصر کریں گے، بدلیل قصرہ صلی اللہ علیہ وسلم واھلہ بمکۃ،

(۴) اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذرا، قال فی شرح المنیۃ ولو کان لہ اھل ببلدتین فایتھما دخلھا صار مقیما وان ماتت زوجتہ فی احدھما وبقی لہ فیھا دور وعقار قیل لا تبقی وطنا اذ المعتبر الاھل دون الدار کما لو تاھل ببلدۃ واستقرت سکنیٰ لہ ولیس لہ فیھا دور وقیل تبقی اھ، اس سے معلوم ہوا کہ محض تزوج ببلدۃ یا اقامت اہل ببلدۃ موجبِ اتمام نہیں بلکہ اس کے ساتھ استقرارِ سکونت زوجین بہا یا استقرار زوجہ وحدہا شرط ہے، اور صورتِ مسئولہ میں استقرارِ سکونت نہیں ہے، نہ زوج کے لئے نہ زوجہ کے لئے، بخلاف جائے ملازمت کے کہ وہاں استقرارِ سکونت ہے، کیونکہ وہاں زوج مکان کرایہ پر لیتا اور اسبابِ تعیش خانہ داری کے لئے مہیا کرتا ہے، پس وہ نظیر اس جزئیہ کی ہے، جو مجتبیٰ سے اوپر نقل کی گئی ہے، وہاں پہونچ کر زوج مسافر مقیم ہو جائے گا، جبکہ وہاں شوہر کے اہل و عیال مقیم ہیں، اور اس مسئلہ میں مالکیہ بھی ہمارے موافق ہیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے وہ بھی احتجاج کرتے ہیں، قال سحنون فی المدونۃ وقال مالک فی من خرج من افریقیۃ یرید بمکۃ ولہ بمصر اھل فاقام عندھم صلوٰۃ واحدۃ انہ یتمھا قال ابن القاسم قلت لمالک الرجل

المسافر یمر بقریة من قراہ فی سفرہ وھو لا یرید ان یقیم بقریتہ تلک الا یومہ ولیلتہ وفیہا عبیدہ[عہ] وبقرہ وجواریہ ولیس لہ بہا اھل ولا ولد قال یقصر الصلوٰۃ الا ان یکون نوی ان یقیم بہا او یکون فیہا اھلہ وولدہ فان کان فیہا اھلہ وولدہ اتم الصلوٰۃ، قلت ارایت ان کانت ھذہ القریة التی فیہا اھلہ وولدہ ثم (بعد) فی سفرہ وقد ھلک اھلہ وبقی فیہا ولدہ اتیم الصلوٰۃ ام یقصر قال یقصر قال انما حمل ھذا رای القصر بعد ھلاک الاھل عند مالک اذا کانت دار القریة بعد ھلاکہا مسکنا لہ اتم الصلوٰۃ وان لم تکن لہ مسکنا لم یتم الصلوٰۃ اھ (ص ۱۱۵) واما قبل ھلاکہا فہی مسکنا لہ البتة فان مسکن المرأة مسکن لہ کما دل علیہ حدیث عثمانؓ واتمامہ بمنیٰ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵ و ۶) قصر میں اعتبار اس مقام کا ہے جس کی نیت سے اس نے جائے اقامت سے خروج کیا ہے، پس صورتِ مسئولہ میں جو شکل بنائی گئی ہے اگر سائل نے مرکز سے سفر کرتے ہوئے یہ نیت کی ہے کہ وہ مقام ز پر جائے گا، مگر اپنی سہولت کے لئے اس نے مقام ز کا راستہ یوں اختیار کیا کہ مقام الف و ب و ج و د و ہ و و پر گزرتا ہوا جائے، اور اس رستہ سے مقام ز مرکز سے مسافت قصر ۴۸ میل یا تین دن کی مسافت پر ہے، تو اس کو نماز قصر کرنا چاہیئے، بشرطیکہ تین دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے مرکز پر درمیان میں لوٹنے کا ارادہ نہ ہو، پس اب اس شخص پر خروج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصدا مسیرۃ ثلاثۃ ایام صادق آگیا، اور یہی مدار ہے تحقق سفر کا اور چونکہ اس کا ارادہ ابتداء ہی سے مقام ز پر پہونچنے کا ہے، اس طرح کہ الف، ب، ج، د، ہ، و، کو اس کے لئے طریق بنائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ منتہائے سفر وہ مقام ہے جس کا فاصلہ مرکز سے سب سے زیادہ ہے، یعنی مثلاً د اور اس کے بعد ہ اور و کو سفر واپسی کا سفر بنایا جائے، بلکہ سفر واپسی اس وقت شروع ہوگا، جبکہ وہ ز سے مرکز کا ارادہ کرے گا، جو اس کے ارادہ میں منتہائے سفر ہے، البتہ اگر یہ شخص مرکز سے چلتے ہوئے مقام ز کا براہ الف و ب و ج و ہ و و قصد نہ کرے، بلکہ مقام د کا قصد کرے جو کہ ۱۸ میل نہیں ہے اور وہاں سے براہ ہ و و و ز مرکز پر لوٹنے کا قصد کرے، تو چونکہ مرکز سے چلتے ہوئے اس نے

عہ وہو موافق لما قال فی شرح المنیة اولاان المعتبر الاہل دون الدار وہو الاوجہ ۱۲ منہ



مسافتِ قصر کا ارادہ نہیں کیا، اس لئے مسافر نہ ہوگا، پس اس کو یہ مسافر خود دیکھ لے کہ اس کی نیت مرکز سے چلتے ہوئے مقام ز تک پہونچنے کی ہے، اور وہاں سے عود الی المرکز کا قصد ہے، یا مقام د تک پہونچنے کی ہے اور وہاں سے عود الی المرکز کا قصد ہے۔

صورتِ اُولیٰ میں جو جواب یہاں دیا گیا ہے، وہی امداد الفتاویٰ ص ۸۵ ج ۱ میں مرقوم ہے، قال فی الدر (المسافر) من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصدا مسیرۃ ثلثة ایام ولیالیہا بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادۃ ولو لموضع طریقان احدھما مدۃ السفر والاخر اقل قصر فی الاول دون الثانی اھ (ص ۸۲۰ و ۸۲۱ ج ۱)

قلت فمن خرج من مرکزہ قاصدا موضع ز بحیث یجعل مواضع الالف والباء والجیم والدال والھاء والواو طریقالہ فقد صدق علیہ انہ خرج من موضع اقامتہ قاصدا مسیرۃ ثلثة ایام ولا یجعل راجعا الی المرکز قبل بلوغہ موضع ز لکونہ منتہی سفرہ فی قصدہ وانما یجعل راجعا اذا خرج من موضع ز فان رجع من الطریق التی جاء منہا قصر حتما وان رجع من طریق اقل قصر ایضا حتی یدخل عمران مرکزہ ھذا ما علمتہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور نیت واپسی کی تحقیق بظاہر یہ ہے کہ جو مقام ارادۂ مسافر میں منتہی سفر ہے وہاں سے وطن یا مرکز اقامت کا قصد کرنا نیت واپسی ہے، پس جب تک منتہی سفر سے بارادۂ وطن یا مقامِ اقامت نہ لوٹے اس وقت تک رجوع کا تحقق نہ ہوگا نہ اس کو راجع کہا جائے گا، ہذا ما فہمتہ ولم ارہ صریحا ولا ارجو وجدان التصریح بہ۔

(۷) اس صورت میں بھی قصر لازم ہے فان العبرۃ للطریق التی سلکہا ولو کان اختار السلوک فیہ بلا غرض صحیح خلافا للشافعی کما فی البدائع شامی (ص ۸۲۱ ج ۱) وقد مر قول الدر ولو لموضع طریقان احدھما مدۃ السفر والاخر اقل قصر فی الاول دون الثانی اھ، اس کی مثال یہ ہے کہ تھانہ بھون سے دیوبند براہ راست ۱۲ کوس ہے اور براہ ریل مسافتِ قصر ہے، پس براہ ریل تھانہ بھون سے دیوبند جانے والا قصر کرے گا، اور یہ نہ کہا جائے گا کہ سہارنپور سے چل کر اب سفر واپسی شروع ہو گیا، کیونکہ سہارنپور انتہائی فاصلہ کا مقام ہے، اور اب سہارنپور سے دیوبند کی طرف جوں جوں قریب ہوں گے تھانہ بھون سے قرب ہوتا جائے گا، مثلاً نانگل جو درمیان دیوبند و سہارنپور ہے تھانہ بھون سے براہ راست

۱۵ کوس ہے، سو اس کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ سہارنپور سے دیوبند جاتے ہوئے بھی یہ سفر ہی کر رہا ہے، واپسی نہیں کر رہا، گو اس کا قصد دیوبند سے تھانہ بھون براہ راست ہی آنے کا کیوں نہ ہو، اس مثال سے صورتِ سابقہ (نمبر ۵ و ۶) کی بھی وضاحت ہوگئی، کہ جو شخص مرکز سے مقام تہ کا قصد کرکے چلا ہے وہ مقام تہ پر پہونچنے سے پہلے راجع نہیں ہے گو مسافت مقام د سے چل کر کم ہوتی جاوے، اور اگر کوئی شخص تھانہ بھون سے سہارنپور کا قصد کرکے چلا، اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ سہارنپور سے واپس تھانہ بھون اس طرح ہوگا کہ سہارنپور سے دیوبند جاکر دیوبند سے براہ راست براہ پیادہ آئے تو یہ شخص مسافر نہیں کیونکہ تھانہ بھون سے سہارنپور مسافت قصر نہیں، اور سہارنپور سے براہ دیوبند جو واپسی ہے وہ بھی مسافتِ قصر نہیں، اس لئے اتمام کرے گا، یہ اس کی مثال ہے جو جوابِ سابق میں مرکز سے بقصد چلنے کی اور وہاں سے براہ ط و د تہ مرکز پر واپس ہونے کے مرکوز ہی، فافہم، رہی یہ صورت کہ کوئی شخص مرکز سے مرکز ہی کی طرف عود کرنے کے ارادہ سے سفر شروع کرے، اور بصورت دائرہ سفر کرے، مثلاً ◯ مرکز، اور درمیان میں جتنے مواضع ہیں وہ سب مقصود ہیں، اور مرکز سے مرکز تک ۴۸ میل کی مسافت ہے، تو اس صورت میں یہ شخص مسافر نہ ہوگا، کیونکہ یہ خروج من عمارۃ البلد کے وقت مسافتِ قصر کا قاصد نہیں، اس لئے کہ مسافتِ قصر کا تحقق مرکز سے علاوہ نہیں، بلکہ مرکز کو داخلِ مسافت کرکے مسافتِ قصر کا تحقق ہوگا اور اس سے سفر کا وجود نہیں ہوسکتا، بلکہ وجودِ سفر کے لئے یہ لازم ہے کہ مقامِ اقامت سے نکل کر اس کے علاوہ کسی ایسے مقام کا قصد ہو کہ اس میں اور مقامِ اقامت میں مسافت ۴۸ میل کی ہو، اس راستہ سے جس کو اس نے اختیار کیا ہے، گو دوسرے راستہ سے مسافت کم ہو، اب اگر مقامِ اقامت سے علاوہ مسافتِ قصر نہیں تو یہ مقیم ہوگا اور اس سے علاوہ ۴۸ میل ہو تو مسافر ہوگا، قال مالک فی الرجل یدور فی القریٰ ولیس بین منزلہ وبین اقصاھا اربعۃ برد وفیما یدور من دورہ اربعۃ برد واکثر قال اذا کان فیما یدور فیہ ما یکون اربعۃ برد قصر الصلوٰۃ اھ مدونہ مالک (ص ۱۱۴/۱) قلت وقواعدنا توافقہ کما لا یخفی،

(۸) جس وقت امام نے خود دو رکعت پر سلام پھیرا اگر مسافر مقتدی کو معاً یہ خیال آگیا کہ امام مسافر ہے اور اس کے مقیم ہونے کا اور سہواً دو رکعت پر سلام پھیرنے کا شبہ نہیں ہوا



تب تو مقتدی کو دو رکعت پر سلام پھیر کر مطمئن رہنا چاہئے، اور اگر امام کے متعلق سہواً دو رکعت پر سلام پھیرنے کا شبہ ہوا تو مقتدی کو امام کے ساتھ نماز ختم کرکے اگر تحقیق سے مسافر یا مقیم ہونا معلوم ہوگیا ہو تو مسافر ہونے کی صورت میں نماز صحیح ہوگئی، اور مقیم ہونے کی صورت میں اعادہ کرے، جیسا جزئیہ آیت میں مذکور ہے، اور اگر تحقیق نہیں کی اور اسی شبہ کی حالت میں مقتدی نے دو رکعت پر اکتفاء کیا تو اس نماز کا اعادہ کرلے، والتفصیل فی بہشتی گوہر (ص ۵۷ و ۵۸) بحوالہ رد المحتار (ص ۸۲۷، و ۸۷۵ ج ۱) فقط ۱۰ رجب ۱۳۴۶ھ

22

بیوی ایک ماہ کیلئے وطن اصلی کے علاوہ کہیں اقامت اختیار کرے اور شوہر وہاں آئے تو اس کیلئے بھی وطن اقامت ہوجائے گا یا نہیں

**سوال** (۱۱) زوجہ اگر کہیں ماہ کے لئے مقیم ہوجاوے علاوہ وطن اصلی کے، تو شوہر اس کا اگر وہاں آوے جہاں زوجہ مقیم ہے تو کیا شوہر کے لئے بھی وطنِ اقامت ہوجاوے گا، شبہ یوں ہوا کہ خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ مولانا ظفر احمد صاحب نے میرٹھ کو صورۃً متذکرہ بالا میں وطن اقامت کا فتویٰ میرے لئے بھی دیا ہے، معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے؟

**الجواب**: خواجہ صاحب نے جو مسئلہ بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ وطنِ اقامت سفر سے باطل ہوجاتا ہے یہ مطلق نہیں، بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ وطنِ اقامت میں تنہا مرد کا قیام ہو، اور اگر وطنِ اقامت میں مرد کا قیام مع اہل وعیال کے ہو تو تنہا مرد کے سفر اور دورہ سے وطنِ اقامت باطل نہیں ہوا بلکہ وہاں اہل وعیال کا قیام حکماً اسی کا قیام ہے، پس اگر کوئی جگہ مرد کے لئے وطنِ اقامت نہ ہو بلکہ صرف بیوی کا وطنِ اقامت ہو کہ وہ اپنی ضرورت سے چند دن کو گئی ہو وہاں مرد مسافر ہو کر جائے گا، تو بیوی کے قیام سے مقیم نہ ہوگا خواجہ صاحب کو میرٹھ کے متعلق فتویٰ اس وقت دیا گیا تھا جبکہ وہ میرٹھ میں ملازم تھے، اور مع اہل وعیال کے مقیم تھے، فقط ۲۲ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ

مقیم ہونے کے لئے کسی خاص جگہ میں نیتِ اقامت ضروری ہے،

**سوال** (۱۲) ایک پیر ہے وہ منزلِ سفر طے کرکے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں پر اُن کے بہت سے مرید ہیں مگر آٹھ دس کوس کے گرد میں ہیں یا کم اگر وہ آٹھ دس کوس کے اندر نیتِ اقامت کرے تو جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**، آٹھ دس کوس کے اندر نیتِ اقامت معتبر نہیں، اس سے مقیم نہ ہوگا،

جب تک کسی خاص گاؤں یا قصبہ میں اقامت کی نیت نہ کرے اس طرح کہ رات کو وہیں لوٹ آئے گو دن میں اور جگہ پھرتا رہے،

# فصل فی الجمعۃ والعیدین

**دو ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ کا حکم**

**سوال** (۱) ایک موضع ہے جس میں چار مسجدیں ہیں اور اس میں بہت سے قسم کے لوگ آباد ہیں، اور بعض ضرورت کی چیزوں کی دکانیں بھی ہیں، مگر ترتیب بازار اور شہر کی نہیں، جیسا دیہاتوں میں دکان رکھنے کا دستور ہے، موضع خود ایک بڑا موضع ہے، اس کے علاوہ چھ موضع اور چھوٹے چھوٹے موضع مذکور کے متعلق ہیں، سب موضعوں کی معہ اس بڑے موضع کے مردم شماری غالباً دو ہزار کی ہے، آیا ایسی جگہ یعنی اس بڑے موضع میں باعتبار مذہب حنفیہ جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

**الجواب**: اس موضع میں بحالت مذکورہ جمعہ صحیح نہیں ہو سکتا،

**غیر عربی میں خطبہ دینے کے مسئلے میں امداد الفتاویٰ اور بہشتی گوہر کی عبارتوں میں تطبیق**

**سوال** (۲) بہشتی گوہر میں ہے کہ خطبہ علاوہ خطبۂ عربی کے پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور فتاویٰ اشرفیہ حصہ اوّل میں ہے کہ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جائز ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، صحیح کونسی عبارت ہے؟

**الجواب**: قال فی الدر کما صح لو شرع بغیر عربیۃ ای لسان کان الی ان قال وشرطا عجزہ وعلی ھذا الخلاف الخطبۃ وجمیع اذکار الصلوٰۃ اھ یعنی غیر القراءۃ فان العجز شرط فیہا اجماعاً کما نص علیہ فی الدر فیما بعد قال الشامی قولہ وشرطا عجزہ ای عن التکبیر بالعربیۃ والمعتمد قولہ طاھ وفیہ ایضا لکن سیاتی کراھۃ الدعاء بالاعجمیۃ اھ (ص ۵۰۴ ج ۱) وفیہ (ص ۵۴۴ ج ۱) والظاھر ان الصحۃ عندہ لا تنفی الکراھۃ اھ،

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کے نزدیک قرأۃ کے علاوہ بقیہ اذکار جن میں خطبہ بھی داخل ہے بلا عجز کے بھی جائز ہیں، اور صاحبینؒ کے نزدیک اگر عربی سے عاجز ہو تو جائز ورنہ نہیں، اور طحطاوی نے امام صاحبؒ کے قول کو معتمد قرار دیا ہے، مگر فصل دعاء میں علامہ شامی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جواز و صحت کراہت کے منافی نہیں،



پس قادر بالعربی کے لئے خطبہ عجمی میں جائز مگر مکروہ ہے، یہی صحیح ہے، پس بہشتی گوہر اور فتاویٰ اشرفیہ کی عبارت میں منافات نہیں، فتاویٰ میں جواز سے مراد صحت ہے، وہو المعتمد کما قالہ الامام، مگر صحت کراہت کے منافی نہیں، ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

**جمعہ کی نماز کے بعد احتیاط الظہر پڑھنے کا حکم**

**سوال** (۳) بہشتی گوہر میں مسئلہ ہے کہ بعض لوگ جمعہ کے بعد ظہر احتیاطی پڑھا کرتے ہیں، ان کو منع کرنا چاہئے، یہ کس حالت میں شرائط صحیح ہونے کی صورت میں یا عدم شرائط کی صورت میں؟

**الجواب**: اگر شرائطِ صحت موجود ہیں تب تو ظہر احتیاطی کی ضرورت نہیں اور اگر شرائطِ صحت موجود نہیں تو جمعہ پڑھنا جائز نہیں ظہر ہی پڑھنا جماعت کے ساتھ واجب ہے، اس لئے ظہر احتیاطی سے ہر حال میں منع کیا جاوے، واللہ اعلم، ۳ رمضان ۱۳۴۰ھ

**گاؤں میں جمعہ صحیح نہ ہونے کا بیان**

**سوال** (۴) چند مسئلے حسب ذیل ہیں امید کہ جواب باصواب عطا فرمایا جائے، اوّلاً یہ کہ وہ کون سی دلیل در بارۂ جواز جمعہ فی القریٰ حضرات شوافع و حنابلہ وغیرہم کی ہے، جس کی وجہ سے بجز امام ابو حنیفہؒ کے یہاں تک کہ غالباً ان کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہے، کہ ہر قریہ صغیرہ و کبیرہ میں جمعہ بلا دغدغہ و خرخشہ ہو سکتا ہے، اور یہ شرائط جو جماعت کے شافعیہ اور مالکیہ وغیرہ کے نزدیک لگائی گئی ہیں، کہ چالیس پچاس سے کم اگر آدمی ہوں تو جمعہ نہیں ہو سکتا، یہ تعداد کس حدیث سے ثابت کرتے ہیں، اور اگر کوئی حنفی المذہب علی الخصوص مسئلہ جمعہ میں شافعیہ وغیرہ کے مسئلہ پر متفق ہو کر وجوب جمعہ فی القریٰ کا عام اس سے کہ صغیرہ ہو یا کبیرہ قائل ہو اور ادا بھی کرے تو کیا عند اللہ ماخوذ و آثم ہوگا یا نہیں اور حنفیہ کے نزدیک کوئی ایسی دلیل دیکھی نہیں جاتی جس سے صریح ممانعت ادائے جمعہ فی القریٰ کی پائی جائے، اور ادھر ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں وہ یہ کہ "الجمعۃ علی کل مسلم وقریۃ"، بہرحال آپ تو ضرور واقف ہوں گے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اپنی دلیل میں اسی کو پیش فرما کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جس جگہ جماعت کثیر ہو جمعہ پڑھنا چاہئے، اگرچہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اور دوسرے اس وقت دور آخر میں جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے رسالہ فیوضِ قاسمیہ میں بہت بسط کے ساتھ غالباً تین ورق تک ایک خط کے جواب میں بعبارت فارسی جمعہ کی ادائیگی کے لئے ایک پُرزور تقریر تحریر فرمائی ہے، جس میں حنفیہ کو متعصب کا لفظ بھی فرمایا ہے، اور انہوں نے

گاؤں کے لوگوں کی رائے سے امام بنا کر جمعہ پڑھنے اور ادا ہونے کے لئے فرمایا ہے، آپ کے علوم ظاہری و باطنی سے غالباً ہر کس و ناکس اور نہ کہ ذی علم واقف نہ ہو، ملاحظہ فرمائیے فیض قاسمی اور ایسی ہی تقریر مولانا مولوی بحر العلوم صاحب لکھنوی نے بھی ایک چھوٹے سے رسالہ غالباً ارکانِ اربعہ میں عربی الفاظ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، مجھے عبارت بخوبی یاد نہیں، غرضکہ بہت سے احناف کا یہ مذہب ہے کہ جمعہ دیہات میں ہونا چاہئے، اور پڑھتے بھی ہیں، ان علماء کو میں کہتا ہوں جن کی گنتی اہلِ علم کے نزدیک بڑے ہونے کی کی جاتی ہے، اور پھر بھی تعریفِ مصر میں بہت بڑا اختلاف ہے، اور اس وقت بعض شرائط بھی نہیں پائے جاتے، تو جب چھ شرائط میں سے کوئی مفقود ہو تو پھر جمعہ کا وجوب اور ادائے جمعہ کے کیا معنی، چنانچہ بادشاہ یا نائب بادشاہ کا منجملہ شرائط میں سے ایک شرطِ وجوبِ ادا کے لئے ضروری ہے، مگر ہندوستان بھر میں بالکل یہ شرط عنقا صفت ہے، پھر اس کے نہ پائے جانے پر جمعہ جو لوگ شہروں میں ادا کرتے ہیں تو کیا جمعہ ادا ہوتا ہے، غالباً اسی وجہ سے لوگوں نے احتیاط الظہر کے مسئلہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، مگر قریب قریب ہر ایک میں خدشہ لازم آتا ہے، اور دلائل ایک نہ ایک وجہ سے مجروح پذیر ہیں، بہر حال للہ فللہ دربارۂ تحقیق جمعہ فی القریٰ و تحقیق شرائط و تعریفِ مصر کیسی براہینِ قاطعہ و ساطعہ کے ساتھ تحریر فرمائیے، تاکہ چاہِ شکوک سے نکل کر کنارۂ یقین پر فائز المرام ہوں، بینوا توجروا۔

**الجواب:** حنفیہ کے نزدیک صحتِ جمعہ کے لئے مصر شرط ہے، امام صاحبؒ اور صاحبینؒ سب اس میں متفق ہیں، باقی ائمہ کا اختلاف ہے، پس سائل کا یہ کہنا "یہاں تک کہ غالباً اُن کے شاگردوں کا بھی یہی مذہب ہے کہ ہر قریہ صغیرہ و کبیرہ میں جمعہ بلا دغدغہ و خرخشہ ہو سکتا ہے" الخ بالکل غلط ہے، صاحبینؒ قریۂ صغیرہ میں جمعہ کو ہرگز جائز نہیں کہتے، حنفیہ کی دلیل یہ حدیث ہے روی عبد الرزاق فی مصنفه اخبرنا معمر عن ابی اسحق عن الحارث عن علی رضی الله عنه قال لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع عمدة القاری (ص ۲۶۴ ج ۳) فان قلت فیه الحارث الاعور وقد کذبه الشعبی وغیره قلت قد وثقه ابن معین وغیره، ففی تهذیب التهذیب ج ۲ ص ۱۴۶ و قال الدوری عن ابن معین الحارث قد سمع من ابن مسعود ولیس به بأس وقال عثمان الدارمی عن ابن معین ثقة اھ وفیه ایضا ص ۱۴۷ ج ۲ و قال



ابن ابی خیثمه قیل لیحیی یحتج بالحارث فقال مازال المحدثون یقبلون حدیثه وقال ابن عبد البر فی کتاب العلم له لما حکی عن ابراهیم انه کذب الحارث اظن الشعبی عوقب بقوله فی الحارث کذاب ولم یبن من الحارث کذبه وانما نقم علیه افراطه فی حب علی وقال ابن شاهین فی الثقات قال احمد بن صالح المصری الحارث الاعور ثقة ما احفظه وما احسن ما روی عن علی و اثنی علیه قیل له فقد قال الشعبی کان یکذب قال لم یکن یکذب فی الحدیث انما کان کذبه فی رایه وقرأت بخط الذهبی فی المیزان والنسائی مع تعنته فی فی الرجال قد احتج به والجمهور علی توهینه مع روایتهم لحدیثه فی الابواب وهذا الشعبی یکذبه ثم یروی عنه والظاهر انه یکذب حکایاته لا فی الحدیث اھ فظهر بذلك ان الحارث لیس ممن اجمع علی ضعفه بل هو مختلف فیه ثقة بعضهم والاختلاف فی التوثیق لا یضر فان رجال الصحیحین ایضا لا یخلون من کلام، قال فی عمدة القاری وروی ایضا بسند صحیح حدثنا جریر عن منصور عن طلحة عن سعد بن عبیدة عن ابی عبد الرحمن انه قال قال علی رضی الله عنه لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع اھ ص ۲۶۴ ج ۳ وفی الدرایة لابن حجر وروی عبد الرزاق عن علی موقوفا لا تشریق ولا جمعة الا فی مصر جامع واسناده صحیح اھ ص ۱۳۱

اس تحقیق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ اس حدیث کے دو طریق صحیح ہیں، اور ایک طریق میں حارث اعور ہے، وہ بھی اگر صحیح نہیں تو حسن ضرور ہے، اور ایک طریق ابن ابی شیبہ کے نزدیک اور ہے: حدثنا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحق عن الحارث عن علی قال لا جمعة ولا تشریق ولا صلوٰة فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة اھ نصب الرایة ج ۱ ص ۳۱۳، وفیه الحجاج بن ارطاة مختلف فیه وثقه الثوری وقال ابو طالب عن احمد کان من الحفاظ وقال البزار کان حافظا مدلسا وکان معجبا بنفسه وکان شعبة یثنی علیه ولا اعلم احدا لم یرو عنه یعنی ممن لقیه الا عبد الله بن ادریس اھ کذا فی تهذیب التهذیب ص ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ ج ۲۔ وقال ابن القیم فی زاد المعاد وحدیثه لا ینزل عن درجة الحسن مالم ینفرد بشیئ او یخالف الثقات اھ قلت وهذا لیس مما تفرد به وافقه الثقات فی معنی

ماروا ہ فہو حسن وفی عمدۃ الرعایۃ وصححہ ابن حزم فی المحلی اھ، رہا یہ اعتراض
کہ یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں، اس کا جواب اصولِ حدیث جاننے والے پر ظاہر ہے کہ
قولِ صحابی مالا یدرک بالقیاس میں حکماً مرفوع ہوتا ہے قال السیوطی فی تدریب الراوی
ص ۶۳ ومن المرفوع ایضا ما جاء عن الصحابی ومثلہ لا یقال من قبل الرائے ولا
مجال للاجتہاد فیہ فیحمل علی السماع جزم بہ الرازی فی المحصول وغیر
واحد من ائمۃ الحدیث اھ، اور ظاہر ہے کہ صحتِ جمعہ وفطر واضحی کے لئے حضرت علیؓ
کا ایک ایسی شرط لگانا جو دوسری نمازوں کے لئے نہیں ہے، محض رائے اور قیاس سے
ممکن نہیں، پس یہ بھی قاعدہ محدثین پر مرفوع میں داخل ہے، دوسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے اخرج
البخاری عن عروۃ عن عائشۃ رضؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان الناس
ینتابون الجمعۃ (ویروی یتناوبون) من منازلہم والعوالی فیأتون فی الغبار
یصیبہم الغبار والعرق فیخرج منہم العرق فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
انسان منہم وھو عندی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو انکم تطہرتم لیومکم
ہذا الحدیث، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نماز جمعہ کے لئے عوالی وغیرہ سے نوبت
بہ نوبت آنا ثابت ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ واجب نہیں ہے، اور
نہ گاؤں میں جمعہ ادا ہوتا ہے، ورنہ جو لوگ عوالی میں رہتے تھے ان کو وہیں ادائے جمعہ کا حکم
ہوتا یا اُن سب کو مدینہ آنا واجب ہوتا، حالانکہ عوالی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
میں کسی وقت کسی جگہ کبھی جمعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا،

اور تیسری دلیل حنفیہ کی یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے فتح وبلاد کے ساتھ منابر اور مساجد
جامعہ کی تعمیر امصار میں ہی کی تھی، کسی گاؤں میں ہرگز صحابہؓ نے منبر اور جامع مسجد تعمیر
نہیں کی، اگر ایسا ہوتا تو اس کی ضرور احادیث میں کوئی اصل ملتی، ومن ادعی فعلیہ البیان،
قال المحقق ابن الہمام فی الفتح انہ لم ینقل عن الصحابۃ انہم حین
فتحوا البلاد واشتغلوا بنصب المنابر والجمع الا فی الامصار دون القری ولو کان
لنقل ولو احاداً اھ، لہٰذا ان دلائل سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حنفیہ کے پاس اس مسئلہ
میں دلیل نقلی صحیح وعقلی قوی موجود ہے، پس کسی حنفی المذہب کو چھوٹے گاؤں میں جمعہ
کی نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، اور یہ جو سائل نے لکھا ہے کہ اُدھر (یعنی امام شافعیؒ وغیرہ کی طرف



... ایک حدیث غالباً صحیح بخاری کی ہے مجھے بخوبی یاد نہیں وہ یہ ہے "الجمعۃ علی کل مسلم وقریۃ"
سو یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں، سائل کو حدیثِ نبویؐ کی نقل میں اٹکل پچو لکھنے سے احتراز
واجب تھا، بدون خود الفاظ دیکھے ہوئے یا کسی عالم سے پوچھے ہوئے غلط سلط الفاظ لکھنا
اس کو جائز نہ تھا، بخاری میں جو حدیث شافعیہ وغیرہ کی دلیل ہے وہ یہ ہے عن ابن عباسؓ
قال ان اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین، اس سے بعض ائمہ نے جوازِ جمعہ فی القریٰ
پر استدلال کیا ہے، مگر اس استدلال کا تمام ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے جواثی کا گاؤں ہونا
ثابت کیا ہو حالانکہ اب تک یہ بات ثابت نہیں ہوسکی جن لوگوں نے جواثی کو گاؤں کہا ہے
ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ بعض روایات میں اس کی نسبت قریۃ من البحرین کا لفظ آیا ہے لیکن
یہ دلیل کافی نہیں، کیونکہ اول تو لفظ قریہ کا اطلاق لغتِ عرب میں عام ہے، شہر کو بھی قریہ
کہدیتے ہیں، چنانچہ خود قرآن میں ہے وقالوا لولا نزل ہذا القرآن علی رجل من القریتین
عظیم، مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں قریتین سے مکہ وطائف مراد ہیں، پس ممکن ہے
کہ جواثی شہر ہو جس کو معنی لغوی عام کی بناء پر قریہ کہدیا گیا ہو، اور اس احتمال کی تائید ان
اقوال سے ہوتی ہے، حکی ابن التین عن الشیخ ابی الحسن انہا مدینۃ وفی الصحاح
للجوہری والبلدان للزمخشری جواثی حصن من البحرین وقال ابو عبید البکری
ھی مدینۃ بالبحرین لعبد القیس، ص ۲۶۳ ج ۳ عینی علی البخاری،
ان اقوال سے جواثی کا شہر ہونا معلوم ہوتا ہے، پس دیگر ائمہ کا استدلال ساقط ہے،
اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ جواثی گاؤں ہی تھا، اور وہاں صحابہؓ نے جمعہ پڑھا تو پھر بھی
اس حدیث سے استدلال کرنا اس پر موقوف ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو صحابہ کے اس فعل کی اطلاع بھی ہوئی اور آپؐ نے سکوت فرمایا، حالانکہ اطلاع نبویؐ
کا ثبوت اب تک کوئی نہیں ملا، پس ایسی کمزور دلیل سے جمعہ کا جواز گاؤں میں ثابت نہیں
ہوسکتا، کیونکہ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز پنجوقتہ نماز کی طرح ہر جگہ جائز نہیں
چنانچہ جنگل بیابان میں جواز جمعہ کا کوئی قائل نہیں، بلکہ ہر ایک امام نے کچھ نہ کچھ شرط
جوازِ جمعہ کیلئے ضرور لگائی ہے، شہر میں جوازِ جمعہ پر سب کا اجماع ہے، اور گاؤں میں جائز
ہونے کے لئے کوئی شافی دلیل ان کے پاس نہیں ہے، اس لئے محض مشکوک دلائل سے

گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہو سکتا، باقی سائل حجۃ اللہ البالغہ اور فیوض قاسمیہ و ارکان اربعہ کی عبارات کا جو حوالہ دیا ہے، سو ان کتابوں کی عبارات اس کو نقل کرنا چاہئے تھیں، یہ کتابیں میرے پاس موجود نہیں ہیں، باقی محض سائل کا لکھ دینا کافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، جیسا کہ حدیث بخاری کی نقل میں اس نے پہلے غلطی کی ہے، اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ سائل کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا بحر العلوم کو ہم امام شافعی و امام مالک و امام احمد بن حنبل کی خاک پا کے برابر بھی نہیں سمجھتے، تو جب ہم نے اس مسئلہ میں ان ائمہ ثلاثہ کے قول کے خلاف ابوحنیفہ کا قول اختیار کیا ہے، کیونکہ روایۃً و درایۃً ان کا قول ہمارے نزدیک صحیح ہے تو ہم ان متاخرین کے قول کو اس کے مقابلہ میں کب تسلیم کر سکتے ہیں، اُن کے اقوال کو ائمہ اربعہ کے اقوال سے کیا نسبت ہے؟ کچھ نہیں، اگر ان کی تحقیق امام ابوحنیفہ رحؒ کے خلاف ہی ہوا کرے ہم نے اُن کی تقلید کا التزام نہیں کیا، بعد میں فیوض قاسمیہ کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائل نے مولانا قاسم العلوم کا مطلب بالکل نہیں سمجھا، مولانا قاسم العلوم کی عبارت کا مطلب سمجھنے کے لئے بڑی عقل کی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ سائل نے مولانا کی کس عبارت سے یہ مطلب سمجھا ہے، کہ جمعہ کے لئے مصر و اذنِ سلطان وغیرہ شرط نہیں، وہ اس عبارت کو پھر لکھے، پھر جواب دیا جائے گا، رہا مصر کی تعریف میں فقہاء کا اختلاف ہونا، سو یہ اختلاف عنوان کا ہے حقیقت کا اختلاف نہیں، مراد سب کی ایک ہے، یعنی اتنی بڑی بستی جہاں انسانی تمام ضروریات مل جاتی ہوں، لیکن ہر زمانے میں ایسی بستیوں کی مختلف علامتیں رہی ہیں، اس لئے فقہاء کی عبارات میں مختلف الفاظ وارد ہو گئے، جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ مسلمانوں کی علامت یہ ہے کہ اُن کی داڑھی لمبی اور مونچھیں کتری ہوئی ہوں، اور نماز پڑھتے ہوں، ایک زمانہ ایسا آیا کہ مسلمانوں نے ان کاموں میں سستی کر دی، پھر کسی نے یہ تعریف کی کہ جن کے کرتے لمبے پائجامے ٹخنوں سے اوپر ہوں، کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں نے یہ وضع بھی ترک کر دی، تو اب یہ تعریف کی کہ جو ترکی ٹوپی پہنتے ہوں، تو اب ان مختلف تعبیروں کے بدلنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں کی حقیقت بدل گئی نہیں حقیقت ایک ہی ہے، لیکن ہر زمانہ کے اعتبار سے ان کی علامت جدا ہو گئی، اسی طرح شہر کے معنی سب لوگ جانتے ہیں گو اس کی علامتیں ہر زمانہ میں جدا ہوں،

رہا اذن سلطان یا سلطان کا شرط ہونا سو اس کے متعلق حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ اذنِ



سلطان اگر متعذر ہو تو عام مسلمان جس کو امام و خطیب مقرر کر لیں جائز ہے، قال فی الدر ونصب العامة الخطيب غير معتبر مع وجود من ذكر اما مع عدمهم فيجوز للضرورة اه ج ۱ ص ۸۴۲ قال الشامي تحته فلو الولاة كفارا يجوز للمسلمين اقامة الجمعة ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلما، اه

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اذنِ سلطان کی شرط موجودگی سلطان میں ہے، اور اگر سلطان نہ ہو تو یہ شرط نہیں، اور درحقیقت اذنِ سلطان کی شرط بھی شرطِ مصر کے تابع ہے، اصل شرط مصر ہے، لیکن چونکہ سلطان کو یہ اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی مصلحت کی وجہ سے گاؤں کو شہر بنا دے، یا شہر کو گاؤں بنا دے، تو سلطان کے ہوتے ہوئے اس کے اذن کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلطان کا ارادہ اس شہر کو شہر باقی رکھنے کا ہے گاؤں بنانے کا ارادہ نہیں ہے، فافہم، باقی تفصیل اس مسئلہ کی رسالہ "القول البدیع" مؤلفہ حکیم الامتؒ و "احسن القریٰ" مؤلفہ شیخ العالم دیوبندی قدس سرہٗ میں ملے گی، اس فتویٰ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں،

**غیر عربی زبان میں خطبہ کے متعلق بعض فقہاء کی عبارات کا مطلب**

**سوال (۵)** کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین اس بارہ میں کہ عبارتوں مندرجہ ذیل سے فقہاء کرام کی کیا غرضیں ہیں، اور کیا مطلب ہے، علامہ ملہم من اللہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں تحریر فرماتے ہیں؛ فينبغي للخطيب التنبيه عليها في خطبة الجمعة التي يليها العيد اه، علامہ فقیہ العصر ابن نجیم بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں زیر قول صاحب کنز ويعلم الاضحية الخ تحریر فرماتے ہیں فينبغي للخطيب ان يعلمهم احكامه في الجمعة قبل عيد الاضحى كما انه ينبغي ان يعلمهم احكام صدقة الفطر في الجمعة التي قبل عيد الفطر ليتعلموها ويخرجوها قبل الخروج الى المصلى ولم اره منقولا والعلم امانة في عنق العلماء ويستفاد من كلامهم ان الخطيب اذا راى بهم...... حاجة الى معرفة بعض الاحكام فانه يعلمهم اياها في خطبة الجمعة خصوصا في زماننا من كثرة الجهلة وقلة العلم فينبغي ان يعلمهم احكام الصلوة كما لا يخفى اه، اسی طرح درمختار و شامی مطبوعہ مصر، ص ۸۷۴ و ۸۷۵ ج ۱ میں بھی ہے، علامہ ابن عابدین نے ماتن کے کلام کا

تتمہ بحر الرائق ہی سے نقل کیا ہے، یہ تعلیم خطبۂ جمعہ میں کس طرح کی جاوے، اس تعلیم میں سامعین کو فائدہ پہنچانا ہے یا صرف خطیب کا ہی سمجھنا مقصود ہے، اور بقول ابن نجیم و ابن عابدین نماز وغیرہ کے احکام کی تعلیم کس طور ہو، ہمارے ائمہ کے فرمان تو صاف ہیں، مگر آپ جیسے ہمارے پیشواؤں سے حلِ عقد کرانا اندھیرے میں چراغ یا چراغ کو سلائی لگا دینا ہے، بلا سلائی لگائے چراغ سے غیر ممکن ہے، بینوا توجروا ؟

الجواب: خطیب کو چاہئے کہ خطبۂ عربیہ مختصر پڑھ کر ضروری احکام مناسب وقت میں اپنی زبان میں بیان کر دیا کرے، باقی تمام خطبہ کا عربی میں نہ ہونا خلاف سنت ہے، حضرات صحابہ نے بلادِ عجم میں بھی عربی ہی میں خطبہ پڑھا ہے، لیکن اس وقت اسلامی حکومت تھی تمام قضایا اور فیصلے عربی زبان میں لکھے جاتے تھے، اس لئے اہلِ عجم عموماً عربی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس وقت بھی مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنا چاہئے، تاکہ دین کی حفاظت رہے، خطبۂ عربی کو عوام کی سستی کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ بعد خطبۂ عربیہ کے اردو وغیرہ میں مسائل ضروریہ بیان کر دیئے جاویں،

نمازِ عیدین کا عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے،

**سوال** (۶) نمازِ عیدین مسجد میں ہی پڑھنی چاہئے یا جنگل میں اصل شرعی حکم کیا ہے؟ جو لوگ اپنی ضدِ نفسانیت سے عناداً جنگل میں نہ جائیں اور مسجد ہی میں پڑھیں، اور خطیب جامع مسجد دیگر لوگوں کے ہمراہ جنگل میں پڑھتا ہو، اور تھوڑے اپنی نفسانیت سے نہ جائیں، اور کوئی عذر شرعی بھی نہ ہو، تو ان کا کیا حکم ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب: نمازِ عیدین کا عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے، بلا وجہ اس سنت کا چھوڑنا بُرا ہے، لیکن اگر کوئی جماعت شہر ہی میں عید کی نماز بلا عذر پڑھ لے تو اس کو بھی ملامت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ صلوٰۃِ عید کا متعدد مواقع پڑھنا بالاتفاق جائز ہے، اور اگر کوئی جماعت بستی میں عید کی نماز اس لئے پڑھے کہ مثلاً عیدگاہ کا امام جاہل یا فاسق ہے تو یہ جماعت اس فعل میں معذور ہے قال فی الدر والخروج الیہا ای الی الجبانۃ لصلاۃ العید سنۃ وان وسعہم المسجد الجامع ہو الصحیح اھ قال الشامی قولہ وہو الصحیح قال فی الظہیریۃ وقال بعضہم لیس بسنۃ وتعارف الناس ذلک لضیق المسجد وکثرۃ ازدحام والصحیح ہو الاول اھ وفی الخلاصۃ والخانیۃ



السنۃ ان یخرج الامام الی الجبانۃ ویستخلف غیرہ لیصلی فی المصر بالضعفاء بناء علی ان صلوٰۃ العیدین فی موضعین جائزۃ بالاتفاق وان لم یستخلف فلہ ذلک اھ نوح ص ۸۶۷ ج ۱، والدلیل علی الجزء الاخیر کراہۃ الصلوٰۃ خلف الفاسق اتفاقاً لیکن دینی کاموں میں ضد اور نفسانیت کو کام میں لانا گناہ ہے، اگر کوئی غرض محمود ہو تو بستی میں بھی عید کی نماز جائز ہے،

عیدگاہ کو پختہ تعمیر کرنا جائز ہے

**سوال** (۷) عیدگاہ پختہ بنانا شرع شریف میں درست ہے یا نہیں؟ علامہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی حنفی رحمہ اللہ "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں جو زیریں بیان مصلی عید تحریر فرماتے ہیں، "مصلّے عید در زمانِ آں سرورؐ بنا نداشت، بلکہ از بنائے آں نہی فرمود" علامہ سمہودی وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ صفحہ ۸ میں لکھتے ہیں :-

ولم یکن المصلّی فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مبنیا بل کانت صحراء لابناء بہا ونہی صلی اللہ علیہ وسلم عن البناء بہا اھ، نیز صفحہ ۱۱ میں ہے: روی ابن شیبۃ عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الی المصلّی یستسقی فبدأ بالخطبۃ ثم صلّی وکبر واحدۃ افتتح بہا الصلوٰۃ وقال ہذا مجمعنا ومستمطرنا ومدعانا لعیدنا ولفطرنا واضحانا فلا یبنی فیہ لبنۃ علی لبنۃ ولا خیمۃ اسی طرح خلاصۃ الوفاء میں بھی ہے، اُن کی کیا غرض ہے؟ بینوا توجروا،

الجواب: عیدگاہ پختہ تعمیر کرنا جائز ہے، قال الشامی وفی الخلاصۃ عن خواہر زادہ ہذا ای بناءہ حسن فی زماننا اھ ص ۸۶۸ ج ۱ وفی البخاری عن ابی سعید رضی اللہ عنہ فیہ فلما اتینا المصلی اذا منبر بناہ کثیر بن الصلت اھ قلت ولم ینکر علیہ الصحابۃ واستمر ذلک بعدہ فکان اجماعا علی جوازہ قال الحافظ فی الفتح وقد وقع فی المدونۃ لمالک رواہ عمر بن شیبۃ عن ابی غسان عنہ قال اول من خطب الناس فی المصلی علی المنبر عثمان بن عفان کلمہم علی منبر من طین بناہ کثیر بن الصلت اھ وقال ایضا وفی ہذا الحدیث من الفوائد بنیان المنبر قال الزین بن المنیر وانما اختار وان یکون باللبن لا من الخشب لکونہ یترک بالصحراء فی غیر حرز فیؤمن علیہ النقل اھ قلت فلو احیط المنبر بالاسوار من الجدار ان لاجل صیانتہ وبقاءہ فلا باس بہ لانہ ادخل فی

الامن من النقل اھ،

اور جو احادیث سائل نے جذب القلوب اور سمہودی سے نقل کی ہیں جن میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلیٰ میں عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، ان کا مطلب بتقدیر صحت یہ ہے کہ میدانِ مصلےٰ میں کوئی شخص اپنا گھر نہ بنادے، بلکہ اس کو نماز عید کے واسطے وقف کر دینا ضروری ہے، کسی کو خاص اپنا قبضہ اس پر جمانا جائز نہیں، میں کہتا ہوں کہ اس مصلحت کے لئے بھی عیدگاہ کا پختہ بنا دینا اولیٰ ہے، تاکہ خالی زمین دیکھکر کوئی شخص اس پر قبضہ نہ کر بیٹھے، کیونکہ آجکل زراعت کرنے والے وقف کی زمین کو بھی تھوڑی بہت اپنی زراعت میں داخل کر لیں گے، پھر اُن سے مقدمہ لڑنا اور زمین عیدگاہ کو ان کے قبضہ سے نکالنا دردسری ہے، غالباً انہی مصلحتوں پر نظر کرکے متقدمین نے بناء عیدگاہ کو پسند کیا ہے، واللہ اعلم،

۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

| عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم |
|---|

**سوال** (۸) عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق کہی جاوے یا نہ، کیونکہ بعض علماء کو دیکھا ہے کہ نماز کے بعد فی الفور ہی تکبیر کہہ لیتے ہیں، جب خطبہ شروع کرتے ہیں، اور بعضوں کو دیکھا ہے کہ نماز پڑھتے ہی تکبیر نہیں کہتے بلکہ ممبر پر چلے جاتے ہیں اور خطبہ شروع کر دیتے ہیں، تو آیا ان دونوں صورتوں میں بہتر و فتویٰ کس پر ہے، بینوا توجروا،

**الجواب**: قال فی الدر ولا بأس به (ای التکبیر) عقب العید لان المسلمین توارثوہ فوجب اتباعهم وعلیه البلخیون اھ قال الشامی قوله فوجب الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح وفی البحر عن المجتبیٰ والبلخیون یکبرون عقب صلوٰۃ العید لانها تؤدیٰ بجماعة فاشبهت الجمعة اھ وهو یفید الوجوب المصطلح علیه ط اھ ص ۸۷۹ ج ۱،

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق باآواز بلند کہنا چاہیے واللہ اعلم، ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

| جمعہ میں ایک آدمی کو خطبہ اور دوسرے کو نماز پڑھانا |
|---|

**سوال** (۹)......................... نمازِ جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا نماز پڑھانا شرع شریف میں درست ہے یا نہ، اگر درست



ہے تو مع الکراہت ہے یا بلا کراہت، اگر مکروہ ہے تو تحریم ہے یا تنزیہی،

(۲) پیچھے تنہا ایک آدمی کھڑا ہو، نیت کرنے سے قبل آگے کی صف سے ایک آدمی کو کھینچ لیوے یا بعد نیت، از تحریر جواب سرفراز فرمائیں،

**الجواب**: جمعہ میں ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا اجازت خطیب سے نماز پڑھانا جائز ہے، مگر اس مسئلہ میں مشائخ کا اختلاف ہے، کہ بلا ضرورت ایسا کرنے کو بعض نے منع کیا ہے، لہٰذا اس سے احتراز اولیٰ ہے، (وفی السراجیة لو صلیٰ احد بغیر اذن الخطیب الا اذا اقتدیٰ به من له ولایة الجمعة (کذا فی الدر) وفی الشامیة شمل الخطیب الماذون وذلك لان الاقتداء به اذن دلالة بخلاف ما لو حضر ولم یقتد وعلیه تحمل عبارة الخانیة السابقة ثم اذا کان حضوره بدون اقتداء لم یعتبر اذنا یفهم منه انه لا یجوز خطبة غیره بلا اذن بالاولیٰ فافهم لکن فهم منه الجواز افاده ط (ص ۸۴۱ ج ۱)

(۲) پیچھے صف کے جو آدمی کھڑا ہو وہ تنہا کھڑا ہو جاوے اگلی صف میں سے کسی کو نہ کھینچے نہ بعد نیت کے نہ قبل نیت کے، قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاح والاولیٰ فی زماننا عدم الجذب والقیام وحده، واللہ اعلم ۲۴ر صفر ۱۳۴۱ھ

| نماز عیدین کے بعد رفع یدین کے ساتھ مناجات کا حکم |
|---|

**سوال** (۱۰)............................ بعد سلام نماز عیدین کے مناجات برفع یدین جائز ہے یا ناجائز، اگر جائز ہے تو کرنے والوں پر ثواب و برکات دارین کی امید ہے یا نہیں اور اس کے منکر یعنی نہ کرنیوالوں پر، اور دوسرے کو کرنے میں منع کرنے والوں پر شرعاً کیا حکم ہے؟

**الجواب**: نماز کے بعد دعاء کرنا مطلقاً جائز ہے، اور رفع یدین آدابِ دعاء سے ہے، لہٰذا بعد نماز عیدین کے دعاء برفع یدین جائز ہے، اور ثواب کی بھی امید ہے، مگر اس کو ضروری نہ سمجھا جاوے اور جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں، اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دعاء کرنا جائز ہی نہیں تب تو وہ غلط کہتے ہیں، اور مباح سے روکنے کے سبب لم تحرم ما احل اللہ لک کے مخاطب ہیں، اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس وقت دعاء برفع یدین ضروری نہیں تو ان کا قول بھی صحیح ہے، اُن سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، قال فی الحصن فی آداب الدعاء والصلوٰۃ عقب رحب مس وفی الحرز ای ...

الرکوع والسجود والمراد ان یقع الدعاء المطلوب بعدها فهی من باب تقدیم العمل الصالح والتوسل به اھ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نماز ذات رکوع وسجود کے بعد دعاء جائز ہے، وفیہ ایضا وبسط الیدین ت مس ور فجماع، واللہ اعلم،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا

**سوال** (۱۱) بوقت نماز جمعہ بوقت خطبہ عصا لینا جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب**: عصا لینا بوقت خطبہ سنت ہے، مگر سنت مقصودہ نہ سمجھے، گاہے ترک بھی کر دے، قال فی الدر ویکرہ ان یتکئ علی عصا او قوس اھ وفی الشامیۃ استشکلہ فی الحلیۃ بانہ فی روایۃ ابی داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای فی الخطبۃ متوکا علی عصا او قوس اھ ونقل القہستانی عن عین المحیط ان اخذ العصا سنۃ کالقیام اھ قلت وتحمل الکراھۃ اعتقادہ سنۃ مقصودۃ، واللہ اعلم

ضد وعداوت سے دوسری مسجد میں اقامت جمعہ کرنے کا حکم، جبکہ مسجد قدیم کو نقصان بھی پہنچتا ہو

**سوال** (۱۲) . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . بر و نجات شہر یعنی دیہات میں ادائے نماز جمعہ کا کیا حکم ہے، خصوصاً بستی سورۃ میانی جو بقدر دو میل کے فاصلہ پر ملتان شریف کے غرب کی طرف ہے اس بستی؎ میں عرصہ دراز سے کہنہ وجامع مسجد موسومہ مولوی گل محمد صاحب مرحوم والی جو مشہور ومعروف اور موجود ہے، اور آجتک بفضل خداوند اکبر آباد ہے، جس کی نو تعمیر کسی شخص کو خواہ طویل العمر اور سن رسیدہ بھی ہو کوئی حال معلوم نہیں کہ کس تاریخ یا کس زمانہ میں اس مسجد شریف کی تعمیر شروع ہوئی ہے، ہاں البتہ کچھ عرصہ دراز سے مرمت کی تاریخ اس مسجد شریف مذکور کی محراب پر لکھی ہوئی ہے، جس مرمت کو عرصہ ایک سو تیس سال کا گذر چکا ہے، شروع بنیاد کا کوئی حال معلوم نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس مسجد شریف مذکور کو تیار ہوتے ہی نماز جمعہ جاری یا کوئی زمانہ پیچھے شروع ہوئی ہے

؎ جس میں تقریباً دو سو مکانات ہیں جن میں سے تخمیناً ۵۰ مکانات اہل ہنود ہیں اور تخمیناً ایک سو مکانات اہل شیعہ ہیں اور تخمیناً ۵۰ مکانات اہل سنت ہیں اور متفرق تین جگہ پر بیس دو مکانات بھی ہیں ۱۲



ہاں البتہ اپنے بزرگان سے یہ سنا گیا ہے کہ بادشاہ نواب صاحب نے اپنی عملداری میں باتفاق تمام مسلمانان اس مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کی ہے، علی ہذا القیاس آباء واجداد سے یعنی قدیم الایام سے تاحال کے زمانہ تک نماز جمعہ جاری ہے، الحمد للہ، ونیز اس مسجد شریف کے گرد ونواح کی متفرق بستیوں میں بہت سی مساجد نو وکہنہ موجود ہیں، جنھوں نے آجتک ایسا کوئی موقع نہیں گذرا کہ ان مساجد میں بھی نماز جمعہ ادا کی گئی ہو، کیونکہ یہ مسجد شریف مذکورہ تمام گرد ونواح کی مسجد سے بڑی مسجد ہے، اور جامع مسجد ہے، اور تمام مساجد اس مسجد شریف سے چھوٹی ہیں، بلکہ چند مساجد غیر آباد بھی ہیں، تمام لوگ گرد ونواح کے باہمیں اتفاق سے جمع ہو کر اسی مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کرتے چلے آتے ہیں، بلکہ بہت سے علماء عظام واعظین وغیرہ خواہ ملتان شریف کے ہوں یا بیرونجات کے ہوں جو متفرق بستیوں میں وعظ فرمانے کو تشریف لاتے ہیں اور روز جمعہ کا ہوتا تھا، تو پہلے اسی مسجد شریف مذکورہ میں نماز جمعہ ادا کر کے پھر متفرق بستیوں کی مساجد میں وعظ بیان فرماتے چلے آئے ہیں، آجتک کسی عالم نے متفرق بستیوں کی مساجد میں نماز جمعہ ادا نہیں کی، خصوصاً اس مسجد شریف مذکورہ میں کوئی ایسا امر شرعیہ مانع نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے گرد ونواح کی مساجد متفرقہ میں بھی نماز جمعہ ادا کی جاوے،

جناب من آج عرصہ ڈیڑھ سال کا گذر چکا ہے کہ اقوام شیخان نے بسبب عداوت اور ضد کے اور واسطے آزار دینے اور بیرونق کرنے اس مسجد شریف مذکورہ کے اپنی مسجد کو جو بر فاصلہ ۵۰ یا ۶۰ قدم پر ہے خوب سنوار کر اور آراستہ کر کے بلکہ بعض بعض مردمان نماز خوانندگان کو رستہ سے روک کر اپنی مسجد شریف کی ترغیب دے کر ایک ملا نو تعلیم یافتہ غیر علاقہ کا بلا کر فی نماز جمعہ مبلغ ۶ یا عہ نقد دے کر نماز جمعہ جاری کر دی ہے، کیونکہ ان کی مسجد شریف کا خاص امام مقرر نہیں ہے، جو آگیا اس نے نماز پڑھا دی، بعض اوقات کوئی شخص نماز پڑھانے والا جو نہیں ہوتا، اکیلے نماز بھی پڑھی جاتی ہے، چند ذی فہم لوگوں نے کہا ہے کہ تم ضد اور عداوت کو چھوڑ دو، اور آپس میں اتفاق رکھ کر جس مسجد میں نماز ہوتی رہتی ہے وہاں پڑھو، ہرگز نہیں مانتے، بلکہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مسجد شریف بھی جامع مسجد ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے نماز جمعہ پہلے ادا کر لی اس کی نماز جمعہ درست ہے، اور جس نے پیچھے ادا کی اس کی نماز جمعہ ناجائز ہے، اس واسطے ہم

ان سے پہلے نمازِ جمعہ ادا کر لیتے ہیں، تاکہ ہماری نماز درست ہو جاوے اور ان کی نماز ناجائز ہو جاوے، ایا شرعاً اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے، بینوا و توجروا، جواب مع نقول کتب فتویٰ علیہ و مع مواہیر یا دستخط خود تحریر فرماویں، کہ عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں گے،

**الجواب**: صورتِ مسئولہ میں جن لوگوں نے محض عناد اور ضد کی وجہ سے دوسری مسجد میں جمعہ قائم کیا ہے وہ گنہگار ہیں قال العلامۃ عبد الحی فی فتاواہ قال البغوی وقال عطاء لما فتح اللہ علی عمر الامصار امر المسلمین ان یبنوا المساجد وامرھم ان لا یبنوا فی مدینتھم مسجدین یضار احدھما الآخر اھ ص ۲۰۶ ج ۱، پس اس صورت میں کہ سب لوگ مسجد قدیم میں جمعہ پڑھنے پر راضی ہیں اور وہاں جمعہ کا انتظام بھی ہمیشہ سے ہے، بلاضرورت بلاوجہ محض ضد و نفسانیت سے دوسری جگہ جمعہ قائم کرنا اور اس مسجدِ قدیم کے درپے تخریب ہونا سببِ گناہِ عظیم ہے، گو دوسری مسجد میں بھی جمعہ درست ہو جائے گا، مگر جو لوگ ضد و نفسانیت کی وجہ سے وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ بھی ہوگا، اور جو لوگ خالی الذہن ہو کر وہاں جمعہ پڑھیں گے ان کو گناہ تو نہ ہوگا مگر مسجد قدیم کے برابر ثواب نہ ملے گا، کیونکہ مسجد قدیم میں جدید سے زیادہ فضیلت و ثواب ہے، قال فی رد المحتار فی مسئلۃ تعدد الجمعۃ فی بلدۃ واحدۃ ما نصہ لان جواز التعدد وان کان ارجح واقوی دلیلا لکن فیہ شبھۃ قویۃ لان خلافہ مروی عن ابی حنیفۃ واختارہ الطحاوی والتمرتاشی وصاحب المختار وجعلہ العتابی الاظھر وھو مذھب الشافعی والمشھور عن مالک واحدی الروایتین عن احمد کما ذکرہ المقدسی فی رسالتہ نور الشمعۃ فی ظھر الجمعۃ بل قال السبکی من الشافعیۃ انہ قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددھا اھ وقد علمت قول البدائع انہ ظاھر الروایۃ وفی شرح المنیۃ عن جوامع الفقہ انہ اظھر الروایتین عن الامام قال فی النھر وفی الحاوی القدسی وعلیہ الفتویٰ وفی التکملۃ للرازی وبہ ناخذ اھ فھو حینئذ قول معتمد فی المذھب لا قول ضعیف ولذا قال فی شرح المنیۃ ھو الاحتیاط لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمہ قوی وکون الصحیح لجواز الضرورۃ للفتوی لا یمنع شرعیۃ الاحتیاط للتقوی اھ ص ۸۴۴ ج ۱ قلت وقد علمت من السوال ان لا ضرورۃ الی تعدد الجمعۃ فی الصورۃ الحاضرۃ



۲۳

وانما ھو بمحض العناد والحسد وذکر قاضی خان وصاحب منیۃ المفتی وغیرھما ان الاقدم افضل وان استویا فی القدم فالاقرب افضل اھ (ص ۲۰۶ ج ۱ فتاویٰ مولانا عبد الحی)۔ ۲۱ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۶ھ

وہ کارخانہ جو شہر سے متصل ہو اس میں نماز جمعہ کا حکم،

**سوال** (۱۳) جس دفتر میں خادم کام کرتا ہے وہ شہر سے قریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور اس علاقہ کو مغلپورہ کہتے ہیں اس کا ڈاکخانہ و تھانہ اور پولیس بھی شہر سے علیحدہ ہے، اور چنگی کی حد سے بھی باہر ہے، اور نہ ہی یہ گاؤں کی صورت میں ہے، بلکہ یہ ایک بڑا دفتر ہے اور اس کے ساتھ ہی جو کارخانے بنے ہوئے ہیں، جہاں دن کو بائیس تیئیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں، اور رات کو سوائے اُن چوکیداروں کے جو پہرہ پر مقرر رہیں، اور کوئی نہیں ہوتا، دفتر کے اِدھر اُدھر جگہ بجگہ انگریزوں کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں جو اس دفتر اور کارخانوں میں ملازم ہیں، کوٹھیاں بھی ایک جگہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی (دس پانچ) کئی جگہ بنی ہوئی ہیں، گویا کہ دفتر نہ شہر کے حکم میں ہے، اور نہ گاؤں کے یہاں کے ملازمین جمعہ کے دن کسی ایک کو مقرر کر کے دفتر میں ہی جمعہ پڑھ لیتے ہیں، آیا یہ جمعہ ہو جاتا ہے، یا نہیں، اگر نہیں تو خادم کو قریباً عرصہ تین سال کا ہو گیا ہے کہ انہی میں شامل ہو کر جمعہ پڑھ لیتا ہے اتنے عرصہ کی ظہر کی نمازیں قضاء پڑھ لے یا نہیں، اور چونکہ خادم گاؤں سے آتا ہے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خادم پر جمعہ واجب نہیں ہے کہ دفتر کو ہر حال میں چھوڑ کر شہر میں جا کر جمعہ پڑھے،

**الجواب**:۔ قال فی الدر او فناءہ بکسر الفاء وھو ما حولہ اتصل بہ اولا حررہ ابن الکمال وغیرہ لاجل مصالحہ کدفن الموتیٰ ورکض الخیل والمختار للفتویٰ تقدیرہ بفرسخ اھ قال الشامی اقول وبہ ظھر صحتھا فی تکیۃ السلطان سلیم بمسرجۃ دمشق وکذا فی مسجد بصالحیۃ دمشق فانھا من فناء دمشق بما فیھا من التربۃ بسفح الجبل وان انفصلت عنہ بمزارع لکنھا قریبۃ لانھا علی ثلث فرسخ من البلدۃ وان اعتبرت قریۃ مستقلۃ فھی مصر علی تعریف المصنف اھ، ص ۷۳۸ ج ۱،

قواعد سے مغلپورہ لاہور کا فناء معلوم ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ مغلپورہ میں رہتے ہیں اُن پر جمعہ فرض ہے، لہٰذا آپ نے جس قدر جمعے وہاں پڑھے ہیں وہ صحیح ہیں، آئندہ بھی

پڑھتے رہنا چاہئے، لیکن مزید احتیاط کے لئے جمعہ کے بعد چار سنتوں میں سنتوں کی نیت کے بجائے چار رکعت فرض ظہر کی نیت کرلی جائے، تاکہ فرض بالیقین ذمہ سے ادا ہو جائے، مگر جہلاء کو اس کی تعلیم نہ کی جائے وہ اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، واللہ اعلم،

**جزو سوال**؛ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا فتویٰ متعلق ظہر احتیاطی دیکھ کر ایک اور بھی شبہ پڑ گیا ہے کہ اس صورت میں لاہور میں کہیں بھی جمعہ صحیح نہیں ہوتا کیونکہ یہاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علیحدہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، اور کئی ایک بڑی مسجدوں میں بھی علیحدہ پڑھا جاتا ہے، حالانکہ اگر بادشاہی مسجد میں تمام شہر کے لوگ آکر جمعہ پڑھیں تب بھی سما جاویں اور فتویٰ اس پر ہے کہ شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھا جاوے،

**جواب**؛ نہیں فتویٰ اس پر ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے، لہٰذا لاہور شہر کے سب جمعے صحیح ہیں؛

**جزو سوال** (۲) کیا کتاب تنبیہ الغافلین کوئی معتبر کتاب ہے، اور اگر خادم اس کا مطالعہ کرے تو اجازت ہے؟

**جواب**؛ اس کتاب کا مصنف کون ہے، مصنف کا نام معلوم ہونے پر جواب دیا جا سکتا ہے،

**سوال** (۱۴۲) نماز عید کے بعد دعاء مانگنے کا حکم ..................................... عیدین میں ہاتھ اٹھا کر مناجات کرنا کیسا ہے، ایک مقام پر مدت سے لوگ ایک امام کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھتے آئے ہیں، اب عرصہ دو سال سے سابق امام نے بوجہ کبر سنی کے اپنے لڑکے کو جو کہ حافظ اور عالم ہیں اپنی جگہ پر امام مقرر کیا، اور لوگ اُن کے پیچھے عیدین کی نمازیں پڑھنے لگے، حال کے امام نے عید کی نماز کے بعد مناجات نہیں کی، عام لوگ امام سے معترض ہوئے اور کہا کہ آپ کے باپ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں آپ کیوں ترک کرتے ہیں، امام صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے باپ نے حدیث نہیں پڑھی ہے، اس لئے وہ اس مسئلے سے ناواقف ہیں، میں نے حدیث میں اس کی دلیل کہیں نہیں پائی، اس لئے میں ترک کرتا ہوں، اس پر جو عوام نے اصرار کیا کہ مناجات کرنا تو اچھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں عاجزی پسندی ہے، علاوہ اس کے ہمیشہ سے ہم لوگ کرتے آئے ہیں، یکایک ہم لوگوں کے لئے یہ ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے بہت سے لوگ ہماری عیدگاہ میں آنا چھوڑ دیں گے



اور جماعت کو نقصان پہونچے گا، امام صاحب نے فرمایا کہ میں خود یہاں کی امامت چھوڑ دوں گا مگر مناجات کرکے گنہگار نہ ہوں گا، اور اس کے بعد امام صاحب اور چند لوگوں نے مشورہ کرکے تمام بازار میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو شخص مناجات کرے گنہگار ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنی درست نہیں، اس بات سے عوام میں ایک نہایت بے قراری پھیل گئی ہے، اور دو جماعت ہو گئی ہیں، اور ان لوگوں کا ارادہ ہے کہ عید کے موقع پر ایک بڑا ہنگامہ برپا کریں گے چونکہ لوگ ہمیشہ سے مناجات کرتے آئے ہیں، اس لئے تین حصہ سے زائد لوگوں نے مناجات کرنے والوں کی طرف ہیں، اور ایک حصہ سے کم لوگ نہ کرنے والوں کی طرف ہیں، اس لئے عند اللہ و عند الرسول آپ اس کا فیصلہ بحوالہ کتب کر دیجئے، بینوا بالدلیل توجروا بالجزیل،

**الجواب**، طریقہ متعارفہ کے طور پر نماز عیدین کے بعد دعاء مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً واضحاً ثابت نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ بعض نسخ بخاری میں جو باب الدعاء فی العیدین وارد ہوا ہے، تو شارحین کو اس کے اثبات کے لئے تکلف و تجشم کرنا پڑا، قال العلامۃ العینی فی العمدۃ مطابقۃ للترجمۃ المرویۃ عن الحموی فی قولہ یخطب فان الخطبۃ مشتملۃ علی الدعاء کما انہا تشتمل علی غیرہ ام ص ۳۰۶ وقال الحافظ فی الفتح ویحتمل ان یوجہ بان الدعاء بعد صلوٰۃ العید یؤخذ حکمہ من جواز اللعب بعدہا بطریق الاولیٰ وقد روی ابن عدی من حدیث واثلۃ انہ لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم عید فقال تقبل اللہ منا ومنک فقال نعم تقبل اللہ منا ومنک وفی اسنادہ محمد بن ابراہیم الشامی وھو ضعیف وقد تفرد بہ مرفوعاً وخولف فیہ فروی البیہقی من حدیث عبادۃ بن الصامت انہ سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک فقال ذلک فعل اہل الکتابین واسنادہ ضعیف ایضاً وکانہ اراد لم یصح فیہ شیء وروینا فی المحاملیات باسناد حسن عن جبیر بن نضیر قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا التقوا یوم العید یقول بعضہم لبعض تقبل اللہ منا ومنک ام ص ۲۷۱ ج ۲،

پس حافظ کا حدیث تقبل اللہ منا ومنک سے اثبات ترجمہ کی طرف اشارہ کرنا بتلا رہا ہے کہ دعاء فی العیدین کے متعلق کوئی حدیث صریح نہیں ہے، اسی لئے بعض لوگوں نے

ان نمازوں کے بعد دعاء بطریق متعارف کو سنت نہیں سمجھا،

لیکن کسی خاص قضیہ کا حکم ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ احادیث میں اس کا نام بھی بالتعیین وارد ہوا ہو بلکہ عموماتِ حدیث سے بھی احکام بکثرت ثابت کئے جاتے ہیں، اگر عمومات سے حکم ثابت نہ ہوسکے تو پھر دنیا کی بہت سی چیزوں کا جواز و استحباب ثابت نہ ہوگا، مثلاً مدارس کا قائم کرنا تعلیم دین کے لئے مستحب ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا ہے، ریل میں سفر کرنا جائز ہے، حدیث میں اس کا نام کہاں وارد ہوا ہے، علیٰ ہذا، پس بعد عیدین کے ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا گو صراحۃً احادیث میں نظر سے نہیں گذرا مگر بعض احادیث سے ہر نماز کے بعد دعاء کا مستحب ہونا ثابت ہے، نیز احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھا کر دعاء کیا کرتے تھے، عن علیؓ قال حدثنی ابوبکرؓ وصدق ابوبکرؓ انه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ما من عبد یذنب ذنبا فیحسن الطهور ثم یقول فیصلی رکعتین ثم یستغفر الله الا غفر الله له ثم قرأ هذه الآیة وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ الخ رواه ابوداؤد وسکت عنه (ص ۲۲۰ ج ۱) ولذا قال صاحب الحصن الحصین من آداب الدعاء استقبال القبلة والصلوٰة والجثو علی الرکب وبسط الیدین ورفعهما (ص ۲۲ و ۲۳) وحدیث رفع الیدین فی الدعاء متواتر کذا فی تدریب الراوی (ص ۱۹۱)

پس عیدین کی نماز کے بعد مناجات و دعاء کرنا عموماتِ حدیث سے مستحب ہے، بلکہ ہر نماز کے بعد دعاء کرنا مستحب ہے، واللہ اعلم، ۲۱ ر رمضان ۱۳۴۱ھ

بعد تحریر جواب ہذا خاص مناجات بعد صلوٰۃ العید کے بارے میں روایات دستیاب ہوگئیں، وہی ہذہ عن أم عطیة قالت کنا نؤمر ان نخرج یوم العید حتی تخرج البکر من خدرها حتی تخرج الحیض فیکن خلف الناس فیکبرن بتکبیرهم ویدعون بدعائهم یرجون برکة ذلک الیوم وطهرته اهـ اخرجه البخاری فی صحیحه کذا فی فتح الباری، ص ۳۸۶ ج ۲ واخرج الترمذی عن أم عطیة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یخرج الابکار والعواتق وذوات الخدور والحیض فی العیدین فاما الحیض فیعتزلن المصلی ویشهدن دعوة المسلمین الحدیث، من



قال الترمذی حدیث ام عطیة حدیث حسن صحیح، اس حدیث میں دعاء سے دعاء خطبہ مراد نہیں ہوسکتی، کیونکہ خطبہ میں صرف امام دعاء کرتا ہے، سامعین دعاء نہیں کرسکتے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حائض عورتیں عیدین میں مردوں کے پیچھے کھڑی رہتیں، اور مردوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتیں، اور انکی دعاء کے ساتھ دعاء کرتیں، اور اس سے مردوں اور عورتوں سب کا دعاء کرنا ثابت ہوتا ہے، اور یقیناً نماز سے پہلے تکبیر و دعاء کا وقت نہیں، یقیناً نماز کے بعد ہی دعاء کی جاتی تھی، اور ترمذی میں اسی حدیث کے اندر یہ الفاظ ہیں ویشهدن دعوة المسلمین کہ عورتیں مسلمانوں کی دعاء میں شریک ہوتی تھیں، اس لئے عیدین کی نماز کے بعد دعاء کرنا جائز و مستحب یقیناً ہے، استحباب و جواز کا انکار نہیں ہوسکتا، لیکن اگر کوئی شخص جائز و مستحب فعل کو ترک کردے، تو اس پر ملامت و طعن اور اس سے ترکِ موالات ہرگز جائز نہیں کیونکہ یہ شان ترک فرائض و واجبات کی ہے نہ کہ مستحبات کی، اور اگر کسی وقت کسی مستحب و سنت کے ترک پر ملامت و طعن ہونے لگے، اور اس مستحب و سنت کے ساتھ واجب و فرض کا معاملہ ہونے لگے تو اس وقت اصلاح عقیدۂ عوام کے لئے اس مستحب کا ترک کردینا ضروری ہوجاتا ہے، تو جو لوگ بعد صلوٰۃ عیدین کے دعاء کو مستحب سمجھتے ہیں وہ تارکین پر ملامت و طعن کرنے کی وجہ سے خود ہی اس مستحب کو ممنوع بنانا چاہتے ہیں، قال فی البحر لو قرأ فی الاولیٰ بسورة الجمعة وفی الثانیة بسورة المنافقین فحسن تبرکا بفعله صلی الله علیه وسلم ولکن لا یواظب علیٰ ذلک بل یقرأ غیرها فی بعض الاوقات لا یؤدی الی هجر الباقی ولا یظنه العامة حتما اهـ (ص ۱۵۰ ج ۲) والله اعلم

**ایک عیدگاہ میں عید کی دو جماعت کرنا،**

**سوال (۱۵)** ........................ ایک عیدگاہ کے اندر دو نمازیں عید کی یکے بعد دیگرے شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا؟

**الجواب:** قال فی الخلاصة والسنة ان یخرج الامام الی الجبانة ویستخلف غیره لیصلی فی المصر بالضعفاء والمرضیٰ، بناء علیٰ ان صلوٰة العید فی موضعین جائزة بالاتفاق فی وان لم یستخلف له ذلک اهـ ص ۲۱۳ ج ۱، وفی الدر ولا یصلیها وحده ان فاتت مع الامام ولو امکنه الذهاب الی امام آخر فعل لانها تؤدی بمصر واحد بمواضع کثیرة اتفاقا اهـ ص ۸۰۵ ج ۱ (مع الشامیة) قلت قوله لو امکنه

الذهاب الى امام آخر يشير الى انه لا يصلى فى موضع واحد مرتين وكذا اقتصار الفقهاء على بيان الجواز فى مواضع عديدة وسكوتهم عن ادائها فى موضع واحد مرتين يدل على ذلك فافهم ،

ان عباراتِ فقہیہ سے یہ معلوم ہوا کہ نمازِ عید ایک موضع میں مکرر پڑھنا درست نہیں ہاں چند مواضع میں جائز ہے، جیساکہ جمعہ چند مسجدوں میں جائز ہے، ایک موضع میں دو مرتبہ نمازِ عید ادا کرنے کی شریعت میں کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گذری، لہٰذا اس ابتداع سے بچنا چاہئے، خصوصاً جبکہ اس کا منشاء محض نزع وخلاف وتفریق ہو، واللہ اعلم، ۸ شوال

نمازِ عید ایسی جگہ ادا کرنا جہاں سامنے قبرستان ہو،

**سوال** (۱۶) ہمارے دیار میں ایک عیدگاہ ہے، اس کے مغرب میں ایک قبرستان ہے، جہاں امام کھڑا ہوتا ہے اس کے دو تین ہاتھ کے فاصلہ پر، بیچ میں کوئی آڑ نہیں، اور درمیان میں ایک مزار بھی ہے، اس کے گرداگرد آدمی نماز پڑھتے ہیں، اس میں نمازِ عیدین جائز ہوگا یا نہ؟ اگر بیچ میں کوئی آڑ نہ ہو تو قبر سے کتنے فاصلہ پر نماز جائز ہے، اور اگر آڑ ہو تو ایسا ہونا چاہئے کہ قبر بالکل نہ دکھائی دے یا کیسا، بعض آدمی مسجد کے مغرب جانب تبرکاً قبر بناتے ہیں وہ کیسا ہے؟

**الجواب**؛ قال فى مراقى الفلاح وتكره الصلوٰة فى المقبرة اه قال الطحطاوى وفى زاد الفقير وتكره الصلوٰة فى المقبرة الا ان يكون فيها موضع اعد للصلوٰة لا نجاسة فيه ولا قذر فيه اه قال الحلبى لان الكراهة معللة بالتشبيه وهو منتف حينئذ وفى القهستانى عن جنائز المضمرات لا تكره الصلوٰة الى جهة القبر الا اذا كان بين يديه بحيث لو صلى صلوٰة الخاشعين وقع بصره عليه اه ص ۲۰۵ مراقى الفلاح

صورتِ مسئولہ میں اگر قبر نمازیوں کے اتنے نزدیک نہیں ہوتی کہ خشوع کے ساتھ موضع سجدہ پر نظر رکھنے سے قبر پر نظر پڑتی ہو تو نماز جائز ہے، اور اس سے زیادہ نزدیک ہو تو مکروہ ہے، اور جس مزار کے گرداگرد لوگ نماز پڑھتے ہیں، اگر قبر کے گرد اتنی اونچی عمارت ہو جس سے قبر پوشیدہ ہوگئی ہو نظر نہ آتی ہو، تو نماز درست ہے ورنہ مکروہ ہے، اور ہر حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ عیدگاہ کی مغربی جانب میں ایک دیوار بنادیں، جس سے قبروں اور نمازیوں میں آڑ ہوجائے مسجد کی مغربی جانب کو تبرک سمجھنا اور وہاں قبریں بنانا بے اصل بات ہے، اس سے احتراز چاہئے، واللہ اعلم، ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ



امام کا لوگوں کے بیچ میں کھڑے ہوکر خطبہ دینے کا حکم

**سوال** (۱۷)......................... بڑی عیدگاہ میں چونکہ امام کی آواز سارے مقتدیوں کو نہیں پہونچ سکتی، اس لئے بعض جگہ آٹھ آٹھ دس دس صفوں کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بآواز بلند تکبیر کہنے کے واسطے پختہ یا لکڑی کے اونچے اونچے مکبرے بنادیئے جاتے ہیں، پس اگر امام اپنی امامت کے پاس والی جگہ یعنی ممبر کو چھوڑ کر حاضرین کی زیادہ تعداد کو خطبہ سنائی دینے کے خیال سے عیدین کا خطبہ وسط حاضرین میں کسی درمیانی اونچے مکبرہ پر کھڑے ہوکر پڑھے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا یا ناجائز، اور اگر جائز ہوگا تو بکراہت یا بے کراہت؟

**الجواب**؛ امام کا وسط قوم میں کھڑے ہوکر خطبہ پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اگر ایسا کیا تو خطبہ صحیح ہوجائے گا، گو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کراہت ہوگی، قال فى مراقى الفلاح وليسن استقبال القوم بوجهه كما استقبل الصحابة النبى صلى الله عليه وسلم اه قال الطحطاوى فان ولاهم ظهره كره قال شمس الائمة من كان امام الامام استقبل بوجهه ومن كان عن يمين الامام او يساره انحرف اليه اه (ص ۲۹۹) قلت ولا يخفى ان فى قيامه على المكبرة يلزم تولية الظهر الى بعض السامعين فيكره، ۲ ذی الحجہ سنہ ۴۲ھ

عید الفطر میں تکبیر تشریق جہراً کہنے کا حکم،

**سوال** (۱۸) بعض عیدگاہوں میں دستور یہ ہے کہ بروز عید الفطر پہلے ایک شخص بآواز بلند تکبیر کہہ کر خاموش ہوجاتا ہے، اس کے بعد سب حاضرین متفقہ طور پر بآواز بلند تکبیر کہتے ہیں، ان سب کے خاموش ہوجانے کے بعد پھر وہی پہلا شخص تنہا بآواز بلند مثل سابق تکبیر کہتا ہے، اور اس کے خاموش ہونے پر جملہ حاضرین مثل سابق آواز ملاکر تکبیر کہتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح نمازِ عید شروع ہونے تک جاری رہتا ہے پس ارشاد ہو کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک عید الفطر میں بآواز بلند تکبیر کہنا اور اس کے ساتھ ہی ہیئتِ متعارفہ مذکورہ کو اختیار کرنا کیسا ہے، آیا مباح ہے یا مستحب یا سنت یا واجب یا مکروہ یا حرام، ......؟ امام اعظمؒ کے علاوہ ائمہ مجتہدینؒ میں سے کسی کے نزدیک اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ تکبیر یہ ہے، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ،

**الجواب**: قال فی مراقی الفلاح ثم یتوجه الی المصلیٰ ماشیاً مکبراً سراً قال علیه السلام خیر الذکر الخفی وعندهما جهراً وهو روایة عن الامام وکان ابن عمرؓ یرفع صوته بالتکبیر ویقطعه ای التکبیر اذا انتهیٰ الی المصلیٰ فی روایة جزم بها فی الدرایة وفی روایة اذا افتتح الصلوٰۃ کذا فی الکافی وعلیه عمل الناس قال ابو جعفر وبه اخذ اھ قال الطحطاوی فی حاشیته قال الطحاوی ذکر ابن ابی عمران عن اصحابنا جمیعاً ان السنة عندهم یوم الفطر ان یکبر فی طریق المصلیٰ وهو الصحیح اھ (۳۰۸) وفی رد المحتار وجزم فی البدائع بالاولیٰ وعمل الناس فی المساجد علی الروایة الثانیة اھ (ص ۸۷۵ ج ۱) قال الطحطاوی فی حاشیة مراقی الفلاح قوله وعندهما جهراً قال الحلبی الذی ینبغی ان یکون الخلاف فی استحباب الجهر وعدمه لا فی کراهته وعدمها فعندهما یستحب الجهر وعنده الاخفاء افضل و ذلك لان الجهر قد نقل عن کثیر من السلف اھ قوله وکان ابن عمر یرفع صوته بالتکبیر اجیب عنه من طرف الامام بانه قول صحابی فلا یعارض به عموم الاٰیة القطعیة اعنی قوله واذکر ربك فی نفسك الی قوله دون الجهر اھ (ص ۳۰۹) اصل مذہب امام ابو حنیفہؒ کا یہ ہے کہ عید الفطر میں تکبیر آہستہ کہی جائے اور عیدگاہ میں پہونچکر ختم کر دی جائے، ظاہر روایت راجح یہی ہے، اب اگر کوئی شخص تکبیر جہر سے کہے اور عیدگاہ پہونچکر شروع صلوٰۃ تک اس کو مستمر رکھے تو بعض روایات پر اس کی گنجائش تو ہے، مگر آواز ملا کر تکبیر کہنا جس سے عادۃً غیر معمولی شور پیدا ہوجاتا ہے خلاف سنت ہے اور بدعت ہے، اور قابلِ ترک ہے، قال صلی اللہ علیه وسلم اربعوا علیٰ انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا، اگر جہر ہی کرنا ہو اور نماز تک تکبیر کو مستمر رکھنا ہو تو ہر شخص کیف ما اتفق الگ الگ تکبیر کہتا رہے، اور اتنا جہر کرے کہ دو تین آدمی آس پاس والے سُن لیں، نہ زیادہ جہر کرے نہ آواز ملانے کا اہتمام کرے، واللہ اعلم، ۲ ر ذی الحجہ ۴۰ھ

نماز عیدین کے بعد دعاء مانگنے کا حکم

**سوال** (۱۹) صلوٰۃ عیدین اور ان کے خطبہ کے بعد دعاء مانگنا بہتر ہے یا نہ مانگنا، سلف کا کیا معمول ہے؟

**الجواب**: احادیث سے دعاء کا ثبوت ہوتا ہے، مگر ضروری نہیں، بہتر یہ ہے کہ



دعاء کرلیا کریں، اجتماع مسلمین کے وقت دعاء قبول ہوتی ہے، ۴ ر ذی الحجہ ۴۱ھ

نماز جمعہ اور تعددِ جمعہ کی تحقیق

**سوال** (۲۰) ......................... ایک چھوٹے گاؤں میں تقریباً ۵۰۰ گھر ہیں، اور اس گاؤں میں چار مسجدیں ہیں اور چاروں مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے جس کو عرصہ پانچ چھ سال کے قریب ہوگیا ہے، اور اس سے پیشتر دو جمعہ ہوتے تھے، اب یہ جو کہ ۲ دو جمعہ ہوتے ہیں، یہ جائز ہیں یا کہ نہیں، اور اس گاؤں میں احتیاط ظہر پڑھنا چاہئے یا کہ نہیں؟

**الجواب**: جس جگہ شرعی قاعدہ سے جمعہ جائز ہے وہاں دو چار جگہ بلکہ دس پانچ جگہ بھی جائز ہے، اب دیکھ لیا جائے کہ اس گاؤں میں صحتِ جمعہ کے شرائط موجود ہیں یا نہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق عالم کو یہ گاؤں دکھلا کر پھر مسئلہ دریافت کیا جاوے اور جب تک صحتِ جمعہ کا یقین نہ ہوجائے اس وقت تک وہاں جمعہ نہ پڑھا جائے، صرف ظہر پڑھنی چاہئے، ۱۹ ر رمضان ۴۲ھ

گاؤں میں جمعہ کا حکم

**سوال** (۲۱) ایک چھوٹا سا گاؤں تقریباً ۲۰۰ گھروں کی آبادی کا اور اس گاؤں کی جو مسجد ہے اس کے اندر جمعہ کے روز اس قدر آدمی آتے ہیں کہ تمام مسجد بھر کر اور آدمی باہر باقی رہ جاتے ہیں، آیا اس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر جمعہ ہوجاتا ہے تو پھر احتیاط الظہر کو پڑھنا چاہئے یا نہیں، اور اسی طرح ایک گاؤں کل ۱۵ گھروں کی آبادی ہے، اس میں بھی جمعہ ہوگا یا نہیں، بینوا توجروا،

**الجواب**: دوسرے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں معلوم ہوتا، صرف ظہر پڑھنی چاہئے، اور پوری تحقیق کسی محقق عالم کو گاؤں دکھلانے سے ہوسکتی ہے، ۱۹ ر رمضان ۴۲ھ

اس جزیرہ میں جمعہ کا حکم جو متعدد مواضع پر مشتمل ہو

**سوال** (۲۲) اس احقر کا وطن ایک جزیرہ میں ہے، جس کا نام ہاتنیہ ہے، اور اس کے چاروں طرف دریا ہے، موسم سرما میں وہ جزیرہ خشک رہتا ہے، اور برسات میں دریا اور بارش کے پانی سے اکثر جزیرہ غرقاب ہوجاتا ہے، اس میں ایک سرکاری رستہ ہے، جو جانبِ شمال میں لبِ دریا سے جنوب کی طرف قریب بیس میل تک گیا ہے، جو برسات میں اکثر وہ رستہ کیچڑ اور پانی سے بھرا رہتا ہے، لوگوں کی آمد و رفت برسات اسی رستہ پر سے ہوتی ہے، اس میں لوگوں کے مکانات علیحدہ علیحدہ ہیں، بعض جگہ دو تین مکانات ایک دوسرے سے متصل ہیں اور

متصل بھی اس طرح پر کہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک باغیچہ کا فاصلہ ہوتا ہے، ہندوستان کے قصبہ اور گاؤں کے گھر جو ایک دوسرے سے متصل ہیں ایسا نہیں ہے، ہاں ایک جگہ کے دو تین گھر البتہ ایک دوسرے کے متصل ہیں، اور بعض جگہ ایک مکان سے دوسرے مکان تک ایک کانی سے دو تین چار دس پندرہ کانی تک کا فاصلہ ہوتا ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ اس جزیرہ کی آبادی طولاً قریب پچیس میل اور عرضاً قریب پندرہ میل کے ہوگی، اور بعض نہریں اس طرح پر ہیں کہ دریا کے ایک طرف سے نکال کر دوسری طرف پہنچایا ہے، اور ان نہروں کے ایک طرف سے دوسری طرف پار ہونے کے لئے پل موجود ہیں، اور یہ بھی واضح ہو کہ اس جزیرہ میں مختلف مواضع ہیں، ان مواضع میں متعدد مسجدیں ہیں، مجموعہ مسجدیں اس جزیرہ کے قریب تین سو کے ہوں گی، اس میں لوگ جمعہ پڑھتے ہیں' اور بعض مسجد میں مصلی تیس' بعض میں پچاس اور بعض میں ایک سو ...... ہوتے ہیں، اور بعض مسجد میں جانے کے لئے برسات میں کپڑے بھیگنے کی نوبت پہنچتی ہے، اور ایک مسجد کا فاصلہ دوسری مسجد سے اس قدر ہو کہ اگر ایک مسجد میں اذان دی جاتی ہے تو دوسری مسجد تک بخوبی سُنی جاتی ہے، اور یہ بھی واضح ہو کہ ان مسجدوں میں فقط جمعہ کے دن گرام کے لوگ جمع ہوتے ہیں، اور پنجگانہ نماز کی جماعت بعض مسجد میں ہوتی ہی نہیں، اور بعض مسجد میں ہوتی بھی ہے، تو جس جس دروازے پر مسجد ہے اس مکان کے چار پانچ آدمی حاضر ہوتے ہیں اور بس،

اور یہ بھی معلوم رہے کہ اس جزیرہ میں ہندو مسلمان، عورت مرد لڑکا قریب ایک لاکھ کے رہتے ہیں، اس میں ایک آفس ہے، جس میں دیوانِ عدالت اور فوجداری موجود ہے، اور گرامیں اس آفس سے بہت دُور دُور ہیں، اب دریافت طلب حضور معدن النور سے یہ ہے کہ آیا اس جزیرہ میں حنفی مذہب کے موافق جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں، جو لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں احتیاط ظہر اُن پر پڑھنا لازم ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس میں جمعہ نہ پڑھے تو موافق مذہب حنفی کے عند اللہ اس کا مواخذہ ہوگا یا نہیں، اور اس جگہ میں جو شخص جمعہ نہیں پڑھتا ہے اس کو سب وشتم کرنا اور اس پر لعن طعن کرنا اور مواکلت ومجالست اس سے نہ کرنا اور اس کو جہنمی وغیرہ کہنا شرعاً کیسا ہے، احقر مدت سے اس مسئلہ میں متردد ہے حضور از روئے مہربانی جو کچھ رائے عالی اس باب میں ہو تحریر فرما کر کمترین کو سرفراز فرمائیں اور عند اللہ ماجور رہوں،



**تنقیح؛** ہر ہر موضع کے جدا جدا حالات نہیں لکھے کہ آبادی کتنی ہے اور بازار مستقل ہے یا نہیں؟

**جوابِ تنقیح،** واضح رہے کہ بعض موضع کی آبادی قریب ایک میل اور بعض قریب نصف میل کے ہوتی ہے، اور یہ مواضع ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں، حدِ فاصل بعض جگہ راستے ہوتے ہیں اور بعض جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہوتی ہیں، اور موسم سرما میں وہ نہریں خشک رہتی ہیں، اور برسات میں پانی رہتا ہے، ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے پُل ہوتے ہیں، اور چھوٹی کشتیوں کی آمد ورفت بھی ہوتی ہے، اور بعض موضع میں مکانات تیس چالیس پچاس سو تک یا اس سے کچھ کم وبیش ہوتے ہیں، اور مکانات اُن مواضع کے فرادٰی فرادٰی ہوتے ہیں، اور ان مواضع میں بعض جگہ ایک بازار ہوتا ہے، ہفتہ میں اُن مواضع کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں، تین چار بجے سے لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے، اور رات کے آٹھ سات بجے تک رہتے ہیں، اور ہر ہر موضع میں دو تین مسجدیں ہوتی ہیں، کہ لوگ اس میں جمعہ پڑھتے ہیں، ایسی جگہوں میں جمعہ پڑھنا موافق مذہب حنفی کے کیسا ہے، اور نہ پڑھنے والے کے لئے کیا حکم ہو سکتا ہے، اس احقر کو فقط رائے عالی معلوم کرنا مقصود ہے، کسی سے لڑنا جھگڑنا ہرگز مقصود نہیں، جو کچھ رائے عالی ہو تحریر فرما کر اپنے خاص دستخط سے سرفراز فرمائیں، اور یہ بھی واضح رہے کہ دو مکانوں کے درمیان جو زمین ہوتی ہے اس میں زراعت کرتے ہیں،

**الجواب؛** سارے جزیرے کو تو ایک شہر نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک پرگنہ ہے، جو متعدد مواضع پر مشتمل ہے، پس ان مواضع میں سے جس موضع کی شان یہ ہو کہ اس میں تین چار ہزار یا اس سے زیادہ کی آبادی ہو اور بازار بھی روزانہ لگتا ہو جس میں ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہوں جیسا کپڑا، جوتا، غلہ، گوشت، ترکاری، دوا، دودھ وغیرہ اس میں تو جمعہ جائز ہے اور جس کی آبادی تو اس مقدار کو پہنچتی ہو مگر ضروریات سب وہاں نہ ملتی ہوں نہ بازار روزانہ لگتا ہو وہاں جمعہ جائز نہیں، اور جس جگہ جوازِ جمعہ میں تردد ہو وہاں جمعہ نہ پڑھیں صرف ظہر پڑھیں، واللہ اعلم، ۴ر ذی الحجہ ۴۲ھ

**اس شخص کے ثواب کے بارے میں جو اذان کے بعد مسجد سے باہر رہے اور بوقت خطبہ مسجد میں آئے،**

**سوال (۲۳)** جمعہ کے دن بعد اذان کے باہر بیٹھ رہنا اور جب خطبہ شروع ہو جاوے،

تب آنا کیسا ہے، اور کتنے ثواب کا مستحق ہوگا؟

**الجواب**: باہر بیٹھنے سے کیا مراد ہے، آیا مسجد کی فناء سے بھی باہر یا مسجد کی حد سے باہر اور فناءِ مسجد کے اندر، جزئیہ صریح تو نہیں ملا، البتہ فقہاء نے فناءِ مسجد کو بحکم مسجد فرمایا ہے، اس کا مقتضایہ ہے کہ جو شخص فناءِ مسجد میں بہ نیت صلوٰۃِ جمعہ سویرے داخل ہو جائے گا وہ بھی سویرے آنے والوں میں شمار ہوگا، گو مسجد کی حد میں دیر سے آئے، اور فناءِ مسجد وہ احاطہ ہے جو مسجد کے متعلق ہے اور داخل بابِ مسجد ہے، جیسے حوض و حجرات وغیرہ، قلت و فی الحدیث الصحیح تقعد الملائکۃ علی ابواب المسجد فیکتبون الاول فالاول الحدیث وھذا یفید ان من دخل من باب المسجد فی السابقین یکتب فی السابقین وان لم یدخل فی المسجد بل بقی جالسا فی الاحاطۃ المتعلقۃ بہ واللہ تعالیٰ اعلم، اور اگر مسجد کے احاطہ سے بھی باہر رہا یعنی دروازۂ مسجد میں بھی داخل نہیں ہوا وہ دیر سے آنے والوں میں شمار ہوگا، پس جو شخص عین خطبہ کے وقت آئے گا اس کو حدیث کے موافق تصدقِ بیضہ کا ثواب ملے گا، اور جو خطبہ شروع ہونے کے بعد آئے گا وہ جمعہ میں سویرے آنے والوں کے اندر لکھا ہی نہیں جائے گا، لما فی الحدیث فاذا خرج الامام طووا الصحف وجاءوا یستمعون الذکر واللہ اعلم، ۳۰ محرم ۴۵ھ

**سوال** (۲۴) | سرکاری قلعہ میں نماز جمعہ کا حکم | جمعہ کی بابت جو لکھا ہے قلعہ کی تفصیل یہ ہے قلعہ کے اندر کوئی غیر آدمی کسی وجہ سے بھی نہیں آسکتا، نہ جمعہ کے واسطے آسکے نہ اور کسی کام کے واسطے، اگر کسی کو کوئی ضرورت ہوتی ہے تو اجازت سے کمان افسر صاحب کی آسکتا ہے، اور ہمارے پیش امام صاحب نے تو نماز عید بھی اسی جگہ پڑھائی تھی حضرت اس مسئلہ کو صاف صاف لکھیں، اگر نماز کے واسطے ممانعت ہو تو کیا حکم ہے، اگر بالکل اجازت نہ ہو تو کیا حکم ہے، اکثر کھلی ہوئی چھاونی میں بھی آنے کی ممانعت ہوتی ہے چاروں طرف سنتری لگ جاتے ہیں، وہاں کی بابت بھی تحریر کر دیں تو عین مہربانی کا باعث ہوگا، کیونکہ ایسا موقع ہمارے ساتھ اکثر گذرتا ہے تو فرض نماز نہ رہ جاوے، اور اب ٹریننگ (تعلیم فوج) بھی شروع ہے، جنگل میں جمعہ ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہاں بھی غیر آدمیوں کے آنے جانے کی ممانعت ہوتی ہے،

**الجواب**: قال فی الدر والاذن العام من الامام وھو یحصل بفتح



ابواب الجامع للواردین کافی فلا یضر غلق باب القلعۃ لعدو او لعادۃ قدیمۃ لان الاذن العام مقرر لاھلہ وغلقہ لمنع العدو لا المصلی نعم لو لم یغلق لکان احسن اھ (ص ۷۵۵ ج ۱ مع الشامی)، اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر میں جامع مسجد وغیرہ نماز جمعہ کے لئے موجود ہو اور ان میں نمازیوں میں رکاوٹ نہ ہو، وہاں اگر چھاؤنی یا قلعہ میں جمعہ ادا کیا جائے تو جائز ہے، گو چھاؤنی اور قلعے میں دوسرے لوگ نہ آسکتے ہوں، کیونکہ مقصود نماز سے روکنا نہیں ہے، بلکہ انتظام مقصود ہے، پس قلعہ اور چھاؤنی والے اس حالت میں جمعہ و عید کر سکتے ہیں بشرطیکہ چھاؤنی یا قلعہ شہر میں یا فناءِ شہر میں اس کے متصل ہو، باقی جنگل میں جمعہ جائز نہیں، جبکہ وہ جنگل فناءِ شہر میں داخل نہیں، اور فناءِ شہر وہ ہے جس سے شہر کا تعلق ہو، خواہ قبرستان ہو یا گھوڑ دوڑ کا میدان ہو یا عیدگاہ کا موقع ہو وغیرہ واللہ اعلم، ۱۲ صفر ۴۵ھ

**سوال** (۲۵) | خطبۂ جمعہ میں غیر عربی میں مسائل کی تعلیم درست ہے | درمیان خطبۂ جمعہ بزبان بنگلہ یا اردو وعظ و تعلیم امورِ دین درست است یا نہ؟

**الجواب**: درمیان خطبۂ عربیہ بزبانِ دیگر قدرے تعلیم مسائل روا است،

**الدلیل**: قال فی الدر ویکرہ تکلمہ فیہا ای فی الخطبۃ الا لامر بمعروف لانہ منہا اھ (ص ۸۴۸ ج ۱، مع الشامی) یکم ربیع الاول ۴۵ھ

**سوال** (۲۶) | نثر یا نظم میں ترجمہ خطبہ سنانے کے بعد عربی میں خطبہ پڑھنا | جمعہ کے پہلے خطبہ میں ترجمہ نثر ہو یا نظم، پہلے پڑھ کر بعدہٗ عربی میں خطبہ پڑھنا کیسا ہے؟

**الجواب**: خطبہ میں عربی کے ساتھ اگر کسی وقت کسی خاص ضرورت سے نصیحت کے طور پر اردو میں بھی کچھ بیان کر دیا جائے تو جائز ہے، لیکن اردو یا فارسی یا عربی نظم پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ سلف سے خطبہ میں نظم کا پڑھنا منقول نہیں، پس یہ بدعت ہے، اسی طرح سارا خطبہ اردو میں ہونا یعنی عربی بالکل نہ ہو، یہ بھی بدعت ہے، واللہ اعلم ۱۲ ربیع ۲ ۴۵ھ

قال العلامۃ عبد الحی فی فتاوی لکن بجہت آنکہ مخالف سنت متوارثہ است (خطبہ بنظم خواندن) خالی از کراہت تنزیہی نیست وصاحب نصاب الاحتساب بحرمتہ اور فتہ (ص ۱۴۱ ج ۱ مع الخلاصۃ) وقال شیخنا فی امداد الفتاوی فقط خطبہ عربی پر اکتفاء کرنا چاہئے، ترجمہ وغیرہ کرنا بہتر نہیں ہے، ہاں اگر کوئی نصیحت مناسب وقت

کسی واقعہ میں کردی جائے تو جائز ہے، یکرہ للخطیب ان یتکلم فی حال الخطبۃ الا ان یکون امرا بمعروف کذا فی الفتح عالمگیری (ص ۱۴۵ ج ۱) ویروی رجوعہ فی اصل المسئلۃ الی قولہما وعلیہ الاعتماد والخطبۃ والتشہد علی ھذا الاختلاف ۱۲ ھدایۃ، قال الشیخ فلما ثبت الرجوع عنہ فی القراءۃ ثبت فی الخطبۃ بالفارسیۃ ایضا (ص ۱۰۳ ج ۱) فقط،

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا خلاف سنت نہیں،

**سوال** (۲۷) عصا گرفتن در خطبۂ جمعہ مستحب است، یانہ، آنچہ در بحر الرائق وعالمگیری آوردہ کہ ہر شہر کہ فتح آں بغلبہ شدہ باشد دراں شہر سیف گرفتہ خطبہ گوید و ہر شہر کہ برضاء ورغبت اسلام آوردہ باشد بلا سیف خطبہ گوید، ایں فرق صحیح است یانہ، بینوا وتوجروا؟

**الجواب**: اخذ عصا در خطبۂ خلاف سنت نیست، وآنچہ در کتب حنفیہ قول بکراہت وعدم سنیت مذکور است، مراد بآں کراہت اعتقاد سنت مقصودہ است، واما نفس ایں فعل بدونِ اعتقاد مذکور خلاف سنت نیست صرح بہ فی رد المحتار، وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۲۹۹ ج ۱) ودر بحر الرائق وعالمگیریہ فرقیکہ میان بلد مفتوح بالغلبہ وبغیر غلبہ نوشتہ اند صحیح است، واللہ اعلم، ۵ رج ۲ ۱۳۴۳ھ،

مسجد واحد میں تعددِ جمعہ جائز نہیں،

**سوال** (۲۸)........................ شہر مولمین کے اطراف میں ایک جگہ کے لوگوں میں کسی وجہ سے تفرقہ پیدا ہوا، ایک فریق کے لوگ بروز جمعہ مسجد کے امام کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرتے وقت دوسرے فریق کے لوگ اقتداء نہ کرکے الگ رہتے ہیں، فریق اوّل کے لوگ نمازِ جمعہ ہونے کے بعد فوراً دوسرے فریق کے لوگ دوسرا ایک امام کھڑا کرکے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ اس طور سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نمازِ جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں، اور فریق اوّل کی نماز جمعہ صحیح ہے یا نہیں، اور فریق ثانی کی نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہے، بینوا بالدلیل توجروا بالاجر الجزیل،

**الجواب**: تعددِ جمعہ مسجدِ واحد میں جائز نہیں، اور اسی صورت میں جماعتِ اُولیٰ کی نماز تو صحیح ہوجائے گی، دوسری جماعت کی صحیح نہ ہوگی، قال فی الدر وتؤدی فی مصر واحد بمواضع کثیرۃ مطلقاً علی المذہب اھ قال الشامی فقد ذکر السرخسی ان الصحیح من مذہب ابی حنیفۃ جواز اقامتہا فی مصر واحد فی مسجدین واکثر



وبہ ناخذ اھ (ص ۸۴۳ ج ۱) قلت وقیودا لفقہ احترازیۃ وقد قید جوازہا بمواضع کثیرۃ وبمسجدین فصاعدا فمفادہ عدم جواز التعدد فی مسجد واحد کیف لا وجواز التعدد فی مسجدین مختلف فیہ ایضا وعدم الجواز ھو الظاہر، ولکنہم جوزوہ للضرورۃ ففی رد المحتار بل قال السبکی من الشافعیۃ انہ (ای عدم جواز التعدد) قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددہا اھ الی ان قال ولذا قال فی شرح المنیۃ الاولی ہو الاحتیاط لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمہ قوی وکون الصحیح الجواز للضرورۃ للفتوی لا یمنع شرعیۃ الاحتیاط للتقوی اھ (ص ۸۴۴ ج ۱) قلت فلما کان ھذا حال التعدد فی موضعین فکیف بہ فی موضع واحد لعدم الضرورۃ فیہ اصلا وعدم تجویزہ عن احد من الائمۃ فیمنع کل المنع واللہ اعلم، ۱۲ رجب ۱۳۴۳ھ

احکام خطبۂ عید

**سوال** (۲۹) مسئلہ: عیدین کی نماز کے بعد خطبہ پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، (شامی، ص ۸۶۵ ج ۱)

مسئلہ: جب تک امام خطبہ پڑھے اس وقت تک سب نمازیوں کا بیٹھا رہنا بھی سنت ہے، امام کی فراغت سے پہلے مقتدیوں کا چلا جانا مکروہ ہے جس سے گناہ ہوتا ہے، (درمختار مع الشامی، ص ۸۴۷ ج ۱) اور اس کراہت پر مالکیہ وشافعیہ کا بھی اتفاق ہے (المدونۃ لمالک، ص ۱۵۵ ج ۱ وکتاب الامّ للشافعی، ص ۲۱۲ ج ۱)

مسئلہ: اور جو لوگ خطبہ کے وقت عیدگاہ میں موجود ہوں، ان کو خطبہ ہوتے ہوئے بات چیت کرنا جائز نہیں، خطبہ چھوڑ کر چلا جانا تو مکروہ ہی ہے، اور خطبہ ہوتے ہوئے عیدگاہ میں رہ کر بات چیت کرنا حرام ہے (شامی ودرمختار، ص ۸۵۸ ج ۱) پس یہ جو دستور ہے کہ لوگ نمازِ عید کے ختم ہوتے عیدگاہ ہی میں بات چیت کرنے اور معانقہ وغیرہ کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس وقت امام خطبہ پڑھنے میں مشغول ہوتا ہے، یہ فعل ناجائز ہے،

مسئلہ: خطبۂ عیدین میں امام کو پہلے خطبہ میں کھڑے ہوتے ہی اوّل نو دفعہ تکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر خطبہ شروع کرنا چاہئے، اور دوسرے خطبہ میں اوّل سات تکبیریں کہہ کر خطبہ شروع کرنا چاہئے، یہ سنت ہے، اکثر لوگ اس سنت پر عمل نہیں کرتے، اس کو زندہ کرنا چاہئے، (شامی ۸۴۷ ج ۱) اس سنت کی دلیل حدیث سے کتاب الامّ للشافعی (ص ۲۱۱ ج ۱)

میں موجود ہے، واللہ اعلم، ۲ ذی الحجہ ۴۳ھ

**اختتامِ خطبہ کے بعد متصل اقامت شروع ہو تو امام سامع اقامت کے لئے بیٹھے یا نہیں**

**سوال** (۳۰) جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد امام منبر سے اتر کر حسبِ معمول مع مقتدی تکبیر بیٹھ کر سنے، یا حیّ علی الصلوٰۃ پر مع مقتدی کھڑے ہوں یا شروع تکبیر اُولیٰ اللہ اکبر پر مع مقتدی کھڑے ہو کر سنے،

**الجواب**: جمعہ کے دونوں خطبوں کے بعد بالاتفاق تکبیر کے شروع ہی سے کھڑے ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ سے کہیں سے ثابت نہیں، کہ وہ خطبہ پڑھ کر بیٹھے ہوں، وفی باب الجمعة واذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل اھ، قال الشامی بحیث یتصل اول الاقامة بآخر الخطبة وینتھی الاقامة بقیام الخطیب مقام الصلوٰۃ اھ (ص ۸۶۱ ج ۱) فیہ دلالة علی ان الخطیب لا یجلس بعد الخطبة بل یقوم فی موضع الصلوٰۃ فلوکان القیام عند حیّ علی الصلوٰۃ مندوبًا فی الجمعة لندب للخطیب ایضا لکون الامام والمقتدی فی ھذا الحکم سواء ولان الجماعة کثیرة یتعسر بھا تسویة الصفوف بالعجلة فینبغی لھم القیام بعد الخطبة مع الاقامة کما قالوا ان التحلیق ھو الافضل لسماع الخطبة ولکن الرسم الاٰن انھم یستقبلون القبلة للحرج فی تسویة الصّف لکثرة الزحام کذا فی شرح الھدایة للسروجی قال فی شرح المنیة واذا فرغ من الخطبة اقاموا الصلوٰۃ اھ (ص ۵۲۰) واقاموا امر للکل، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ رجب ۴۴ھ

**حکم نمازِ جمعہ بر کاشتکارانِ بادیہ نشین**

**سوال** (۳۱) جو لوگ جنگل میں کھیت وغیرہ پر رہتے ہیں، اور بعض کے وہاں سے آنے میں نقصانِ مال کا خوف ہے، اور بعض کے آنے میں کچھ نقصان بھی نہیں، تو ان میں سے ترکِ جمعہ سے کون فریق گنہگار اور کون نہیں، اور جبکہ اذانِ جمعہ کی آواز بعض کو آتی ہے اور بعض کو نہیں آتی، فقط والسلام

**الجواب**: جس کو جمعہ اور جماعت کی نماز میں شریک ہونے سے کھیت یا مال کے نقصان کا خوف ہو مثلاً غلّہ کاٹ کر کھلیان میں ڈال رکھا ہے، اور چوری ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں جمعہ وجماعت کے ترک سے گناہ نہ ہوگا، قال فی الدر او خوف علی مالہ قال الشامی ای من لص ونحوہ اذا لم یمکنہ غلق الدکان او البیت





مثلا ومنہ خوفہ علی تلف طعام فی قدر او خبز فی تنور تأمل اھ (ص ۵۸۱ ج ۱)

اور جس کو کھیت سے مسجد تک آنے میں نقصان کا اندیشہ نہیں اس کو جمعہ کا ترک کرنا جائز نہیں، گناہ ہوگا، باقی اوقات کی جماعت کا ترک کھیت پر رہنے والوں کو اس وقت ناجائز ہے جبکہ کھیت آبادی سے متصل ہو، اور جو آبادی سے اتنا دور ہو کہ اذان کی آواز وہاں تک نہ پہونچتی ہو، نیز وہاں سے آبادی میں آنا اور واپس جانا موجبِ کلفت و حرج ہو تو اس صورت میں کھیت والوں پر مسجد میں آنا واجب نہیں، کھیت ہی پر جماعت کرلیں، اور جماعت نہ کرسکیں تو تنہا پڑھ لینا ہی جائز ہے، عن ابی ھریرۃ مرفوعًا لینتھین الرجال ممن حول المسجد لا یشھدون العشاء الاٰخرۃ فی الجمیع اولاحرقن بیوتھم رواہ احمد ورجالہ موثقون (مجمع الزوائد ص ۱۵۸ ج ۱) وعن صفوان بن امیة قال کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقام عرفطة بن نھیك فقال یارسول اللہ انی واھل بیتی مرزوقون من ھذا الصّید وھو مشغلة عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فی جماعة وبنا الیہ حاجة افتحلہ ام تحرمہ قال احلہ لان اللہ عزوجل قد احلہ ویکفیك من الصّلوٰۃ فی جماعة اذ رغبت عنھا فی طلب الرزق حبك للجماعة واھلھا وحبك لذکر اللہ واھلہ۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ بشر بن نمیر متروك اھ (ص ۱۶۱ ج ۱) قلت ولکنہ مؤید بالنصوص المصرحة بنفی الحرج عن الامّة، واللہ اعلم، ۱۵ شعبان ۴۴ھ

**چرواہے پر نمازِ جمعہ فرض ہے یا نہیں**

**سوال** (۳۲) ایک شخص اپنا ریوڑ بھیڑ بکری چرا رہا ہے، اور جمعہ کا روز ہے تو فرمائیے کہ اس پر نمازِ جمعہ کی فرض ہے یا کہ ظہر کی؟

**الجواب**: اگر یہ شخص فناءِ مصر میں بکریاں چرا رہا ہے تو اس پر جمعہ میں آنا واجب ہے، اور بکریوں کو اپنے ساتھ واپس لے آئے، بعد جمعہ کے پھر لے جائے، اور اگر فناءِ مصر سے اتنا دور ہے کہ شہر سے میل بھر کا فاصلہ ہو جائے تو اس صورت میں اس سے جمعہ ساقط ہے، ظہر کی نماز پڑھ لے، بشرطیکہ وہ شہر سے قبل زوال کے نکل گیا ہو قیاسًا علی التیمم قال فی نور الایضاح او الاقامة فیما ای فی ھو داخل فی حد الاقامة بھا ای بالمصر فی الاصح کربض المصر وفنائہ

الذی لم ینفصل عنه بغلوة ولا یجب علی من کان خارجه ولو سمع النداء من المصر اھ (ص ۲۹۲) واللہ اعلم، ۲۷ر شوال ۴۳ھ

**گاؤں اور قصبہ کی تعریف**

**سوال (۳۳)** ............ حنفیہ کے نزدیک ایسے گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں جس کی تعریف حسب ذیل ہے۔

آبادی ۱۹۴۸ ہے، جس میں مسلمان مختلف قومیں آباد ہیں، شیخ، مغل، پٹھان، زمیندار راجپوت نومسلم، لوہار، بڑھئی، نائی، دھوبی، قصائی تیلی، منہیار، درزی، تیرگر، ڈوم، خرادی نداف، جولاہا، سقہ، عطار، پنساری، بزاز وغیرہ وغیرہ، وسط گاؤں میں مسلسل دو طرفہ تقریباً چالیس دکانیں، ایک ڈاک خانہ ہے، ایک ہی مسجد ہے، مع حوض نہایت عالیشان ہے پہلے سے جمعہ ہوتا آیا ہے، اب اختلاف ہوا ہے،

**الجواب**: اصل یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں اور شہر و قصبات میں صحیح ہے قصبہ کی تعریف ہمارے عرف میں یہ ہے کہ جہاں آبادی چار ہزار کے قریب یا اس سے زیادہ ہو، اور ایسا بازار موجود ہو جس میں دکانیں چالیس پچاس متصل ہوں، اور بازار روزانہ لگتا ہو اور اس بازار میں ضروریات روزمرہ کی ملتی ہوں، مثلاً جوتہ کی دوکان بھی ہو، اور کپڑے کی بھی، عطار کی بھی ہو بزاز کی بھی، غلہ کی بھی اور دودھ گھی کی بھی، اور وہاں ڈاکٹر یا حکیم بھی ہوں معمار و مستری بھی ہوں وغیرہ وغیرہ اور وہاں ڈاکخانہ بھی ہو، اور پولیس کا تھانہ یا چوکی بھی ہو، اور اس میں مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم ہوں،

پس جس بستی میں یہ شرائط موجود ہوں گے وہاں جمعہ صحیح ہوگا، ورنہ صحیح نہ ہوگا، قال فی رد المحتار عن ابی حنیفة انه بلدة کبیرة فیها سکک واسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح اھ (ص ۸۳۵ ج ۱) قلت اقمنا البولیس وقیامه مقام الوالی لرجوع الناس الیه فی الحوادث والرساتیق المحلات والقری التابعة لها، وقال فی الغنیة المستملی والفصل فی ذلك ان مکة والمدینة مصران تقام بها الجمعة من زمنه علیه الصلوٰة والسلام الی الیوم فکل موضع کان مثل احدهما فهو مصر فکل تفسیر لا یصدق علی احدهما فهو غیر معتبر ثم صح الروایة التی ذکرناها عن الامام وقال قال قاضی خان



والاعتماد علی ما روی عن ابی حنیفة کل موضع بلغت ابنیته ابنیة منی وفیه مفتی وقاضی فهو مصر جامع وعن محمد ان کل موضع مصره الامام فهو مصر حتی انه لو بعث الی قریة نائبا لاقامة الحدود والقیاس تصیر مصراً فاذا عزله تلحق بالقری ووجه ذلك ما صح انه کان لعثمان عبد اسود امیرا علی الربذة یصلی خلفه ابو ذر وعشرة من الصحابة الجمعة وغیرها، ذکره ابن حزم فی المحلی اھ (ص ۵۱۱ و ۵۱۲)

وفی الخلاصة الامام اذا منع اهل المصر ان یجمعوا لم یجمعوا کما ان له ان یمصر موضعا کان له ان ینهاهم رای اذا لم یکن منعه تعنتا واضرارا بل اراد ان یخرج ذلك الموضع من ان یکون مصراً قاله الفقیه ابو جعفر ۱۲) ولو ان اماما مصر مصرا ثم نفر الناس عنه لخوف عدو او ما اشبه ذلك ثم عادوا الیه فانهم لا یجمعون الا باذن مستانف من الامام اھ (۲۰۸ ج ۱)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مصر مصر ہونے کے بعد جب تک کہ امام اس کو مصریت سے نہ نکالے، مصر باقی رہتا ہے، مگر یہ کہ اس کے کل باشندے وہاں سے بھاگ جائیں تو ازسرنو اذن امام کی ضرورت ہے، اور جہاں امام نہ ہو وہاں عامة الناس بجائے........ امام کے ہیں، پس جو بستی ایک دفعہ قصبہ ہو چکی اور وہاں جمعہ قائم ہو چکا، تو جب تک ... وہاں پر آثار قصبہ کے مثلاً بازار اور عمارات کی ہیئت باقی ہوگی وہ قصبہ رہے گا جب تک کہ عرف عام اس کو قصبہ ہونے سے نہ نکالے،

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قصبہ ہونے کے لئے ابنیہ و عمارات کی خاص ہیئت کو بھی دخل ہے، واللہ اعلم، ۲۶ر ذیقعدہ ۴۳ھ

**جیل میں نماز جمعہ کا حکم**

**سوال (۳۴)** اگر کسی شہر کے جیل خانے میں کثرت سے مسلمان قیدی ہوں، اور گورنمنٹ کی طرف سے جیل کے اندر کسی مقرر جگہ میں نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے، اور باہر کے کسی مولوی صاحب کو جمعہ پڑھانے کی اجازت ملے تو اس صورت میں قیدخانہ میں جمعہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

**الجواب**: صحت صلوٰة جمعہ کے شرائط میں سے اذن عام بھی ہے، اور صورت مذکورہ فی السوال میں وہ مفقود ہے، لہذا جمعہ صحیح نہ ہوگا، فی الدر المختار فلا یضر غلق باب

القلعۃ لعدو او لعادۃ قدیمۃ لان الاذن العام مقرر لاھلہ وغلقہ لمنع العدو لا المصلی نعم لو لم یغلق لکان احسن کما فی مجمع الانھر معزیا شرح عیون المذاھب قال وھذا اولیٰ مما فی البحر والمنح فلیحفظ وقال الشامی (قولہ لان الاذن العام مقرر لاھلہ) ای لاھل القلعۃ لانھا فی معنی الحصن والاحسن عود الضمیر الی المضمر المفھوم عن المقام لانہ لا یکفی الاذن لاھل الحصن فقط بل الشرط الاذن للجماعات کلھا کما مر عن البدائع (قولہ وغلقہ لمنع العدو الخ) ای ان الاذن ھنا موجود قبل غلق الباب لکل من اراد الصلوٰۃ والذی یضر انما ھو منع المصلین لا منع العدو (قولہ لکان احسن) لانہ ابعد عن الشبھۃ لان الظاھر اشتراط الاذان وقت الصلوٰۃ لا قبلھا لان النداء للاشتھار کما مر وھم یغلقون الباب وقت النداء او قبیلہ الخ (ص ۸۵۱ ج ۱)

اور شامی میں کافی کی عبارت ہے (لان اشتراط السلطان للتحرز عن تفویتہا علی الناس وذا لا یحصل الا باذن العام) کے بعد جو کہا ہے، قلت وینبغی ان یکون محل النزاع ما اذا کان لا تقام الا فی محل واحد اما لو تعددت فلا لانہ لا یتحقق التفویت کما افادہ التعلیل تأمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کے نزدیک جیل خانہ میں جمعہ جائز ہے، جب کہ اس شہر میں دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو، لیکن تحریر مختار میں قول مذکور پر لکھتے ہیں لا یلزم من انتفاء العلۃ انتفاء المعلول فالحق ابقاء الکلام علی عمومہ وان انتفت ھذہ العلۃ التی ذکرھا الاحتمال علۃ اخریٰ اقتضت العموم علیٰ ان ما تقدم عن البدائع من التعلیل یقتضی عموم الحکم وقد قالوا لا یلزم من بطلان الدلیل المعین بطلان المدلول (ص ۱۱۲ ج ۱)

ونیز بحر الرائق (ص ۱۵۱ ج ۲) میں ہے فلو امر انسانا یجمع بھم فی الجامع وھو فی مسجد اخر جاز لاھل الجامع دون اھل المسجد الا اذا علم الناس بذلک اھ اس سے بھی ظاہراً یہی معلوم ہوا کہ بدون اذنِ عام کسی حال میں جمعہ صحیح نہیں، پس جیلخانہ میں جمعہ نہ پڑھنا چاہئے، اور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی چونکہ نمازیوں کو عام اجازت نہیں، اس لئے اسٹیشن پر بھی باوجود مصر یا فناءِ مصر ہونے کے جمعہ صحیح نہ ہوگا، واللہ اعلم،
احقر عبد الکریم عفی عنہ ، الجواب صحیح ، انشاء اللہ تعالیٰ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۱ ر ذیقعدہ ۴۳ھ



مصر کی تعریف

**سوال** (۳۵) قریۂ کبیرہ کی کیا تحدید ہے، کہ وہاں صلوٰۃ جمعہ واجب ہے، قریۂ صغیرہ وکبیرہ میں نہایت اشتباہ ہے، تشفی بخشئے ؟

**الجواب**: مصر کی علامات ہر زمانہ میں مختلف ہوئی ہیں، آجکل علامات یہ ہیں کہ تین چار ہزار کی آبادی ہو، بازار ہو، جس میں سب ضروریات ملتی ہوں اور وہ بازار مستقل ہو، ہفتہ وار بازار لگنا کافی نہیں، اور ڈاک خانہ وغیرہ ہو، ۸ ر ربیع الثانی ۴۴ھ

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا

**سوال** (۳۶) جمعہ کو خطبہ سے قبل خادمِ مسجد آن کر منبر پر جانماز بچھا جاتا ہے، اور کتابِ خطبہ رکھ جاتا ہے، اور ایک چھڑی پتلی سی بانس کی جو نہایت صاف ستھری ہوتی ہے منبر پر رکھ جاتا ہے، چنانچہ جب امام صاحب منبر پر خطبہ سنانے کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اسی چھڑی کو ہاتھ میں لیلیتے ہیں اس بارے میں ناواقف لوگوں نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ جناب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ پڑھتے تھے تو کسی وقت آپ نے ہاتھ میں تلوار لی ہے اور کبھی کمان اور کبھی نیزہ اور لکڑی، چنانچہ بطریق سنت ایسا کیا جاتا ہے، اور مشکوٰۃ شریف میں لکھا ہے، چنانچہ جناب سے دریافت طلب ہے کہ اس کی کیا صورت ہے ؟ امید ہے کہ جواب سے آگاہی فرمائی جائے گی ؟

**الجواب**: عصا لینا مستحب ہے، لیکن اگر اس کو ضروری سمجھا جاوے اور تارک پر ملامت کی جائے تو التزام مالا یلزم کی وجہ سے منع کیا جائے گا، فی الدر ویکرہ ان یتکی علی قوس او عصاء وفی الشامی نقل القھستانی عن عین المحیط ان اخذ عصا سنۃ کالقیام (ص ۸۶۲ ج ۱) وقال شیخنا مد ظلھم العالی ان الکراھۃ محمولۃ علی مقصودہ، واللہ اعلم
کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۸ ر ربیع الثانی ۴۴ھ ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ

جمعہ کی دونوں اذانوں کے درمیان کھانا پینا اور خطبہ کے بعد نیت باندھنے سے قبل باتیں کرنے کا حکم ،

**سوال** (۳۷) جمعہ کی اول اذان سے لے کر خطبہ کی اذان تک اور ایسے ہی خطبہ کی اذان سے نماز کے ختم تک کھانا پینا کیسا ہے، کیونکہ اکثر لوگ مسجد میں آکر خطبہ شروع ہونے سے پہلے بھی اور پیچھے بھی پانی پیتے رہتے ہیں، خطبہ ختم ہونے کے بعد نیت باندھنے تک بول چال کرنی مثلاً نمازیوں کو پیچھے سے

آگے بلانا یا صف سیدھی کرنے کے لئے بول چال کرنا کیسا ہے؟

**الجواب**، دونوں اذانوں کے درمیان کھانا جائز ہے، بشرطیکہ جمعہ فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اگر فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو کھانا جائز نہیں فی الدر المختار مع الدر المنتقى (۱) وهو يأكل تركه ان خاف فوت جمعة او مكتوبة لا جماعة (شامی، ص ۸۶۲ ج ۱) اور خطبہ کے وقت کھانا پینا کلام کرنا حرام ہے، کما فی الدر المختار وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیها ای فی الخطبة خلاصة وغیرها فیحرم اکل وشرب وکلام الخ ص ۸۵۸ اور خطبہ واقامت کے درمیان بھی امام صاحب کے نزدیک کسی قسم کا کلام جائز نہیں، البتہ صاحبین کے قول پر فقط دنیوی کلام ناجائز ہے، اور تسویہ صفوف کے لئے کلام کی گنجائش ہے، کما فی الدر المختار وقالا لا باس بالکلام قبل الخطبة وبعدها واذا جلس عند الثانی والخلاف فی کلام یتعلق بالآخرة اما غیره فیکره اجماعاً،

کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

کیا نابینا پر نماز جمعہ واجب ہے

**سوال** (۳۸) ایسے اندھے پر جمعہ واجب ہے یا نہیں کہ جو شہر کے اندر رہتا ہو، مکان متصل جامع مسجد ہو اور اندھا آسانی مسجد میں یا اس سے بھی دو چند چہار چند فاصلہ کے سفر کو روزانہ طے کیا کرتا ہو، اور بلا کسی دوسرے آدمی کے مدد کے سارے شہر میں گھوم آتا ہے، لیکن سڑکوں اور جامع مسجد لب سڑک ہے، اور پانی کنویں میں سے خود کھینچ کر بھر لیتا ہے، کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، کبھی کبھی خفیف سی چوٹ دیوار وغیرہ کے ٹکرا جانے سے آجاتی ہے،

**الجواب**، جو نابینا بدون دوسرے شخص کے ہمراہ ہوئے بھی پھرتا ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس کے ذمہ جمعہ واجب ہے کما فی الشامی (ص ۸۵۴ ج ۱) واقول بل یظهر لی وجوبها علی بعض العمیان الذی یمشی فی الاسواق ویعرف الطرق بلا قائد ولا کلفة ویعرف ای مسجد اراده بلا سوال احد لانه حینئذ کالمریض القادر علی الخروج بنفسه بل ربما یلحقه مشقة اکثر من هذا فتامل، فقط، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ، یکم محرم الحرام یوم شنبہ ۱۳۴۵ھ، الجواب صحیح ظفر احمد عفا عنہ

شہر یا قصبہ میں نماز جمعہ پڑھ کر شام تک گاؤں واپس آسکتے ہوں تو ایسے گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہے یا نہیں

**سوال** (۳۹) جو دیہات شہر یا قصبہ سے اتنی دور ہوں کہ اہل دیہات جمعہ کی نماز پڑھ کر



شہر یا قصبہ سے اپنے مکان پر شام تک واپس چلے جاویں تو ان اہل دیہات پر جمعہ فرض ہے یا نہیں؟

**الجواب**، اس قصبہ اور گاؤں میں کھیتوں وغیرہ کا فصل ہو اور وہ قصبہ سے جدا سمجھا جاتا ہو، تو اس گاؤں کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں، گو ایک دو ہی میل کا فصل ہو، اور اگر فصل درمیان میں نہیں بلکہ قصبہ کی آبادی گاؤں تک متصل چلی گئی ہے تو گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہوگا، ۲۳ رجب ۱۳۴۵ھ

حضرت تھانویؒ کے قول اور احسن القریٰ کی عبارت دربارۂ تعریف مصر میں رفع اختلاف کے متعلق ایک سوال کا جواب

**سوال** (۴۰) جناب کی اکثر تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف میں جو اقوال منقول ہیں وہ تحدید حقیقی کے لئے نہیں بلکہ رسم ناقص ہیں، اور احسن القریٰ ص ۶۳ و ۲۰۷ میں اس کے خلاف مصرح ہے؛ نیز اگر درحقیقت یہ رسوم ہوئیں تو فقہاء کے بعض تعریفوں کو مزیف اور بعض کو صحیح و مرجح قرار دینے کا کیا مطلب ہوگا؟ مثلاً علامہ حلبی کبیری ص ۵۰۷ پر ما لا یسع اکبر مساجده الخ کو غیر صحیح فرماتے ہیں، لعدم صدقه علی الحرمین، اگر رسم مراد ہوتی تو اس تعلیل کی کیا توجیہ، طحاوی ص ۲۳۹ میں اس تعریف کو غیر صحیح کہا ہے، در مختار و شرح وقایہ میں اسی تعریف کو مفتی بہ ٹھیرایا ہے، لظهور التوانی، اور شامی میں اس کی تائید میں چند اقوال نقل کئے ہیں، ہدایہ میں امام صاحب سے مصر کی تعریف فیه سکک واسواق ووال الخ منقول ہے، اور یہی ظاہر المذہب ہے، کبیری ص ۵۰۷ میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور ظاہر الروایت کہا ہے، اور شامی ص ۵۳ میں بھی ظاہر الروایت کو ترجیح دی ہے، نیز اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ تعریف ما لا یسع الخ اکثر قریٰ پر بھی صادق آجاتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں تعریفوں کا مآل ایک نہیں، ورنہ اس تعریف کے صدق کی تخصیص چہ معنی؟

(۲) والی جس قریہ میں چلا جائے وہ مصر ہو جاتا ہے، کما ہو مصرح فی الفقہ، یہ قریہ کس تعریف کے بموجب مصر کہلائے گی؟

(۳) اگر سب تعریفیں عرفی ہیں تو موجودہ عرف میں مصر کی جامع مانع تعریف کیا ہوگی، بعض اطراف میں تو چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی شہر کہتے ہیں، ان کا عرف معتبر ہوگا یا نہیں، ایسی تحدید فرمائیں کہ محل تجمیع و تقیید عند الاختلاف صاحب مختار ہو جائے،

**الجواب:** (۱) مولانا دام مجدہم کا مطلب اس سے یہ ہے کہ جمعہ کی حدِ حقیقی موافق اصطلاح میزانیین مراد فقہاء نہیں، بلکہ وہ جو کچھ بیان فرمارہے ہیں رسوم ہیں، جن کا مبنیٰ یہ ہے کہ وہ اس موضع میں جمعہ کی اجازت دینا چاہتے ہیں، جو مکہ اور مدینہ کی اُس حالت کے موافق ہو جس حالت پر یہ دونوں بلدان مکرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اور ظاہر ہے کہ اس معیار کو حدِ حقیقی کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہے، کیونکہ اختلافِ امصار سے اس معیار کا مصداق مختلف ہوتا رہتا ہے، دوسرے یہ مفہوم بھی فی نفسہ کلی نہیں جس کو حد کلی سے بیان کر دیا جائے، بلکہ جُزئی ہے، اور مفہوم جُزئی کو جب کلی کیا جائے گا تو لامحالہ وہ رسم ہی ہو گی، لیکن رسم سے رسم فقہی مراد ہے، نہ کہ رسم عرفی محض، پس اب مولانا کے ارشاد اور احسن القریٰ کی عبارت میں کوئی تخالف نہیں، قال ابن الحلبی فی شرح المنیۃ والفصل فی ذلک ان مکۃ والمدینۃ مصران تقام بہما الجمعۃ من زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیوم فکل موضع کان مثل احدہما فہو مصر، فکل تفسیر لا یصدق علی احدہما فہو غیر معتبر اھ (ص ۵۱۱) اور فقہاء کا بعض رسوم کو مزیف و مرجح کرنا اسی پر مبنی ہے کہ بعض اس معیار میں جامع اور مانع ہیں اور بعض نہیں،

(۲) یہ قریہ بموجب تعریف منقول از امام ابو حنیفہؒ مصر ہو جائے گا، عن ابی حنیفۃؒ انہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک واسواق واساتیق وفیہا وال یقدر علی الانصاف الخ کیونکہ جب وہاں والی ہو گا تو اس کا عملہ و محکمہ و عدالت و فوج بھی ساتھ ہو گا جس سے اسواق و اساتیق کا تحقق خود بخود ہو جائے گا، اور ان کا تحقق نہ بھی ہو گا تو یقیناً اس وقت امصارِ کبیرہ قریبہ اس قریہ کے تابع ہو جائیں گے جہاں والی موجود ہے، کہ اوامر و نواہی میں اہلِ امصار اُس قریہ کی طرف رجوع کریں گے، اور جب چند قریٰ کی تبعیت سے مصر مصر ہو جاتا ہے، تو امصار کی تبعیت سے قریہ مصر کیوں نہ ہو گا، اس صورت میں اس گاؤں کو اقرب مصر الیہا کا جزو اعظم اور اس مصر کو اس کے تابع ماننے کی وجہ سے مصر کہا جائے گا، اور نزول والی فی القریہ کے وقت اقرب مصر کا اس قریہ کا تابع ہو جانا مشاہد ہے بشرطیکہ والی من حیث الولایہ نزول کرلے، کہ یہی مراد فقہاء ہے، خفیہ گشت و جاسوسی کے طور پر نزول کرے،



یہ تو اوپر معلوم ہو چکا کہ فقہاء کا یہ مطلب نہیں کہ مصریت و قرویت کا مدار محض عرف عام و رائے اہلِ عرف پر ہے، بلکہ اس کے لئے اُن کے نزدیک معیار شرعی ضرور ہے، جس کو وہ مختلف عبارات سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اختلافِ زمان سے اس معیار کا مصداق مختلف ہو جاتا ہے،

پس اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ اصل معیارِ مصر تو مکہ و مدینہ کی حالت موجودہ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور اس معیار کی احسن تفسیر وہ ہے جو امام صاحبؒ سے خود منقول ہے، اور آجکل اس تعریف کا مصداق ہندوستان میں ہمارے نزدیک ہر وہ موضع ہے جس کی آبادی قریب چار ہزار کے ہو یا اس سے زیادہ اور وہاں ایسا بازار موجود ہو جس میں تیس چالیس دُوکانیں متصل یک جا ہوں (کہ بازار اسی کا نام ہے، متفرق دُکانوں کو جن میں فصل کثیر ہو بازار نہیں کہا جاتا) اور اس بازار میں ضروریاتِ روزمرہ دستیاب ہوتی ہوں کہ پارچہ کی دُکان بھی ہو، جوتہ کی بھی، عطارہ کی بھی، دودھ، گھی، غلہ وغیرہ کی بھی اور وہاں ڈاکٹر یا حکیم بھی ہو، معمار و مستری بھی ہو اور وہاں ڈاک خانہ بھی ہو اور پولیس کا تھانہ یا چوکی بھی ہو اور اس میں مختلف محلّے مختلف ناموں سے موسوم ہوں، جس میں یہ شرائط موجود ہوں وہاں جمعہ صحیح ہو گا ورنہ نہیں، قلت اقمت البولیس مقام الوالی لرجوع الناس الیہ فی الحوادث، واللہ اعلم، ۸ رمضان ۴۵ھ

## سوال (۴۱)

تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہے، مفتیٰ بہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

...........تکبیرات ایام تشریق کن پر واجب ہیں، چونکہ امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان خلاف ہے، امام صاحبؒ نے جماعتِ مستحبہ و مصر و رجال وغیرہ کو شرط قرار دیا، اور صاحبینؒ فرماتے ہیں مطلقاً جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیراتِ تشریق بھی واجب ہیں، اب سوال یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحبؒ یا صاحبینؒ کے قول پر ہے، بحوالہ کتب مستندہ و معتبرہ مع صفحہ واضح طور پر بیان فرماویں عند اللہ ماجور ہوں گے،

**الجواب:** قالا یجب التکبیر فور کل فرض علیٰ من صلاہ ولو کان منفرداً او مسافراً او قرویاً لانہ تبع للمکتوبات وبہ ای بقولہما یعمل وعلیہ الفتویٰ طحطاوی ص ۳۱۴، مولانا عبدالشکور صاحب اپنے علم الفقہ کے حاشیہ پر

تحریر فرماتے ہیں کہ صاحبینؒ کے نزدیک یہ کوئی شرط نہیں، عورت و مسافر اور منفرد اور قریہ میں تکبیر واجب ہے، صاحبِ بحر الرائق نے سراج وہاج وغیرہ سے نقل کیا ہے، کہ فتوی صاحبین کے قول پر ہے، جلد دوم علم الفقہ، ص ۱۱۲،

وقالا هو علی کل من صلی المکتوبة مصرا او قرویا او مسافرا او منفردا او امرأة لانه شرع تبعا للمکتوبة فیؤدیه کل من یؤدیها والفتوی علی قولهما (کنز الدقائق، ص ۴۰، کا حاشیہ) ؛ سوال؛ تکبیراتِ تشریق کن پر واجب ہے؛ جواب؛ جن پر نماز فرض ہے انہی پر تکبیر بھی واجب ہے، بموجب مذہب صاحبینؒ کے، اور اسی قول پر فتوی ہے، تو اب مسافر اور تنہا پڑھنے والے پر بھی تکبیر واجب ہوئی، رکن دین ص ۲۵ اور مختار کبیری وعندهما یجب علی کل من یصلی المکتوبة وابتداءه من فجر عرفة عندنا الخ والعمل علی قولهما، صغیری ص ۲۸۵ وقال هو علی کل من یصلی المکتوبة لانه تبع المکتوبة ہدایہ، ص ۱۵۵ ج ۱، درحاشیہ مالابد منہ فارسی ونزد صاحبین جماعت شرط نیست پس واجب است بر منفرد وزن ومسافر، درمختار، صفحہ ۶۵ میں مذکور ہے وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ علی کل من یؤدی المکتوبة فی هذه الایام علی ای وصف کان فی ای مکان کان وهو قول ابراهیم النخعی، بدائع الصنائع جلد اول صفحہ ۱۹۷، ونزد صاحبینؒ بر منفرد وزن ومسافر ہم واجب است، مفتاح الصلوٰۃ صفحہ ۱۴۲ نیز صفحہ ۱۴۲ کے حاشیہ میں مرقوم ہے کہ گفت در بحر الرائق وغیرہ والعمل وفتوی بر قول صاحبین ست در ہمہ شہر ہا وزمانہا قال فی بحر الرائق وغیرہ والعمل والفتوی علی قولهما فی عامة الامصار وکافة الاعصار، وبقول ابو یوسفؒ ومحمدؒ تکبیراتِ تشریق واجب است بر ہر کہ فرض بگذارد وختم تکبیرات بر قولِ ایشاں عصر آخر ایام تشریق است وآں بست وسہ نماز است وعلیہ الفتوی، در کنز فارسی صفحہ ۲۷ ونزدیک صاحبینؒ اقامت وذکورۃ وصحت ومنفرد جماعت شرط نہ پس واجب باشد بر ہر مصلی بعد فرض ایں ایام از فجر عرفہ تا عصر پس ایام تشریق هو المعمول وعلیه الفتوی، فتوی برہانیہ کما فی الترغیب وقالا بوجوبه فور کل فرض مطلقا ولو کان منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمکتوبة الی عصر الیوم الخامس آخر ایام التشریق وعلیه الاعتماد والعمل والفتوی فی عامة الامصار وکافة الاعصار، درمختار، قال ابو یوسفؒ ومحمدؒ التکبیر



تبع الفریضه فکل من ادی فریضة فعلیه التکبیر والفتوی علی قولهما من تکبیر المسافر واهل القری جوهرة النیرة، ص ۹۲ ونزدیک ابو یوسفؒ ومحمدؒ ہر کہ نماز بکنید بروے واجب آید کہ تکبیر گوید (قدوری فارسی، ص ۲۸) وعندهما یجب التکبیر علی کل من یصلی المکتوبة (کنز الدقائق نولکشوری، ص ۲۴ کے حاشیہ نمبر ۶ میں مذکور ہے، لیکن اگر منفرد اور عورت اور مسافر بھی کہہ لے تو بہتر ہے، کہ صاحبین کے نزدیک ان سب پر واجب ہے، بہشتی گوہر صفحہ ۹۹ حوالہ درمختار، وعندهما کل من صلی المکتوبة فی هذه الایام فعلیه التکبیر مقیما کان مسافرا رجلا کان امرأة فی المصر او فی غیره فی الجماعة او وحده، خلاصة الفتوی، ص ۲۱۶ ج ۱،

المستفتی بندہ ادریس سلہٹی

صحیح

عبد اللطیف عفا اللہ عنہ، مدرسہ مظاہر علوم

الجواب صحیح

بندہ منظور احمد، عفی عنہ

الجواب صحیح

محمد زکریا، قدوسی، مدرس مدرسہ مظاہر علوم،

جواب صحیح ہے

صدیق احمد عفا اللہ عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم ۱۸ صفر ۱۳۴۶ھ

صحیح ہے

بندہ عبد الرحمٰن غفر لہ مدرس

الجواب صحیح

بندہ محمد ظہور الحق عفی عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

ان کان کذلک فکذلک

عبد القیوم عفی عنہ

جواب صحیح ہے

بندہ ارشد علی عفی عنہ

جواب صحیح ہے

بندہ عبد القیوم

جواب درست ہے

بندہ اخلاق احمد مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

الجوابُ الجوابُ

محمد امیر سلہٹی عفا اللہ عنہ

چہ می فرمایند علمائے دین وشرع متین در بارۂ جواب سوال مرقوم الصدر صحیح است یا غلط، بر تقدیر ثانی عبارتہائے کہ علیه الفتوی والعمل بقولهما فی الامصار وغیرہ را چہ جواب است بینوا بالتفصیل وتوجروا باجر الجزیل،

**الجواب،** سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم،

جواب سوال مرقوم الصدر از تتبع کتب فقہاءِ حنفیہ غلط معلوم می شود علی الاطلاق بر ہر کس واجب نیست بلکہ بر ہر مقیمیکہ نماز با جماعت مستحبہ گزاردہ باشد، چنانکہ در فتوی عالمگیری مرقوم است، اما شرطه فاقامة ومصر ومکتوبة وجماعة مستحبة هکذا

فی التبیین، وایضا در ہدایہ متنا عقیب الصلوات المفروضات علی مقیمین فی الامصار فی الجماعة المستحبة عند ابی حنیفة ولیس علی جماعات النساء اذا لم یکن معهن رجل ولا علی جماعة المسافرین اذا لم یکن معهن مقیم وشرحا والشرع ورد عند استجماع هذه الشرائط الا انه یجب علی النساء اذا اقتدین بالرجال وعلی المسافرین عند اقتدائهم بالمقیم بطریق التبعیة آمدہ است وایں قول نیز در مختصر الوقایة آمدہ است من فجر عرفة عقیب کل فرض ادی بجماعة مستحبة علی المقیم بالمصر ومقتدیه برجل ومسافر مقتد بمقیم الی عصر العید وقالا عصر آخر ایام التشریق وبه یعمل، وہکذا در مالابد منہ مسطور است تکبیرات تشریق بعد ہر نماز کہ بجماعت گذاردہ برمقیم بمصر واجب است از صبح روز عرفہ تا عصر روز عید نزد امام اعظمؒ وتا عصر تاریخ سیزدہم نزد صاحبین وفتوی برآن ست واگر مسافر اقتدا بمقیم کند برآنہا نیز تکبیر واجب شود۔" ہرکس وناکس غبی وذکی اظہر من الشمس ظاہر ست کہ مختار قول ابی حنیفہ است، در مذہب احناف اکنوں باقی ماند جواب علیه الفتوی والعمل بقولهما فی الامصار، جوابش آنست کہ مرجع ضمیر علیہ فقط قول صاحبین کہ تا عصر روز سیزدہم ہست، ومراد از قولہما قول تا روز سیزدہم ہست دراں شکے نیست کہ مختار ومعمول بہ در مذہب احناف فی عامة الامصار وکافة الاعصار ہمین است، چنانکہ در عالمگیری منقوش است واما وقته فاوله عقیب صلوٰة الفجر من یوم عرفة وآخره فی قول الصاحبین عقیب صلوٰة العصر الی آخر ایام التشریق هکذا فی التبیین الفتوی فی عامة الامصار وکافة الاعصار علی قولهما کذا فی الزاهدی و هکذا در مختصر الوقایة وقالا الی عصر آخر ایام التشریق وبه یعمل و ایضا در مالابد منہ تا روز عصر روز عید نزد امام اعظمؒ وتا روز عصر تاریخ سیزدہم نزد صاحبین وفتوی بران ست۔" ہرکہ برعبارت مرقومة الصدر بارے نظر سطحی می اندازد ہرگز فتوی ندہد کہ فتوی برآنست کہ برہر دو مرد وزن خواہ مسافر باشد خواہ مقیم بمصر یا قریہ منفرد باشد یا بجماعت گزاردن تکبیر تشریق واجب است حاشا وکلا ہرگز ایں خیال صحیح نیست وعبارتہائے کہ مفتی صاحب نقل فرمودہ اند ہرہمہ را نقل کردن وتطبیق دادن بہ نہایت مشکل است وچنداں ضرورت ہم نیست لیکن عبارتے کہ دراں مدار فتوی است



وبارہا بزبان فارسی وعربی واردو نقل کردہ اند آں عبارت درمختار است وعلی مقتد مسافر او قروی او امرأة بالتبعیة لکن المرأة تخافت ویجب علی مقیم اقتدی بمسافر وقالا لوجوبه فور کل فرض مطلقا ولو منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمکتوبة الی عصر الیوم الخامس آخر ایام التشریق وعلیه الاعتماد والعمل والفتوی فی العامة الامصار وکافة الاعصار، عبارت عالمگیری ومختصر الوقایة ومالابد منہ را اگر بدیں عبارت ملاحظہ کردہ شود معلوم گردد کہ علیه الاعتماد والعمل والفتوی الخ را تعلق فقط الی آخر ایام التشریق است چونکہ در اکثر جا عبارت فقہاء مختلط بودہ است بناءً علیہ صاحب ہدایہ بوقت شرح علیحدہ بیان فرمودہ وصاحب عالمگیری علیحدہ باچناں وضاحت بیان فرمودہ اند کہ دراں ہیچ خفا نماندہ کہ علیہ را تعلق الی آخر ایام التشریق ست، نا کہ با قول مفتی صاحب، کما لا یخفی علی المتامل، نیز سخن تعجب خیز است کہ جنابِ مفتی صاحب عبارتیکہ نقل فرمودہ اند بہرچہ کہ از ان حق ظاہر گردد نقل نہ فرمودہ اند، چنانکہ در عبارت بہشتی گوہر نظر فرمائید ہمہ عبارتش اینست "تکبیر تشریق یعنی ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اللہ اکبر الخ کہنا واجب ہے، بشرطیکہ وہ فرض جماعت سے پڑھا گیا ہو اور وہ مقیم مصر ہو، یہ تکبیر عورت اور مسافر پر واجب نہیں، اگر یہ لوگ کسی ایسے شخص کے مقتدی ہوں جس پر تکبیر واجب ہے، تو اُن پر بھی تکبیر واجب ہو جائے گی، (درمختار) لیکن اگر مسافر اور عورت بھی کہہ لے تو بہتر ہے کہ صاحبین کے نزدیک ان سب پر واجب ہے"، ہر کہ عبارت گوہر را ملاحظہ نمایند، ہرگز نمی گوید کہ فتوی بر قول صاحبین ست کہ بر ہر مصلی مکتوبات تکبیر واجب است معہذا بندہ می گوید کہ از لفظ بہتر واجب چگونہ ثابت گردد ہرگز نہ بل استحباب مستفاد گردد ہمیں عرض است کجا کہ فقہاء نقل قول صاحبین کردہ اند، لا یخفی ہذا من طالع کتب الفقهیه وہر گاہ ثابت شد عمل در امصار حسب قول امام ابو حنیفہؒ ست، ہر چند کہ جناب مفتی صاحب قول صاحبینؒ کہ مثبت وجوب است نقل کردہ اند اثر فائدہ نمی بخشد زیرا کہ قول صاحبین را کسے منکر نیست لیکن عمل بداں ومفتی بہ نیست، کما علمت بل در مذہب ما از اں استحباب ثابت کردہ شود کما لا یخفی علی المتدبر،

حررہ احقر الناس محمد مظہر علی غفر اللہ عنہ

الجواب صحیح، محی الدین احمد عفی اللہ الصمد مدرس مدرسہ احمدیہ باغبانپورہ، الجواب صحیح محمد غلام غفر لہ ولوالدیہ

محمد محی الدین عفی عنہ مدرس مدرسہ باغبانپورہ، الجواب ہو الجواب کہ بر منفرد و مسافر تکبیر تشریق بمذہب امام ابو حنیفہ واجب نیست، کما فی الصغیری تکبیر التشریق عقیب الصلوٰۃ فریضۃ بجماعۃ مستحبۃ فلا یجب علی المسافر ولا علی المنفرد، انتہی وفی فتاوی السراجیۃ لا تکبیر علی المنفرد عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ انتہی،

## الجواب من جامع امداد الاحکام

اقول وباللہ التوفیق الصحیح عندنا الجوابُ الثانی دون الاوّل ودلیلہ ما فی رد المحتار تحت قول الدر وعلیہ الاعتماد والعمل والفتوٰی فی عامۃ الامصار ونصّہ ہذا بناء علی انہ اذا اختلف الامام وصاحباہ فالعبرۃ لقوۃ الدلیل وھو الاصح کما فی اٰخر الحاوی القدسی او علی ان قولہما فی کل مسئلۃ مروی عنہ ایضًا الی انہ قال وبہ اندفع ما فی الفتح من ترجیح قولہ ھنا ورد فتوی المشائخ بقولہما بحرام (ص ۷۰۸ ج ۱) فھذا یدل علی ان ابن الھمام قد رد فتوی المشائخ فی ھذہ المسئلۃ التی اعتمدوا فیھا علی قول الصاحبین وافتوا بہ فلو نظر المجیب الاوّل فتح القدیر وراجع کلام المحقق لعلم ان المسئلۃ التی رجحت المشائخ فیھا قول الصاحبین انما ھی مسئلۃ انتہاء وقت التکبیر لاغیر وفیھا بسط المحقق الکلام ورد علی المشائخ الاعلام کما ذکر فی (ص ۴۹ ج ۲) واما مسئلۃ من یجب علیہ التکبیر فلم یرجح المشائخ فیھا قولہما علی قولہ ولم یرد المحقق فیھا علی احد من المشائخ فظہر من مجموع الکلام الشامی وکلام المحقق ان الذی علیہ الاعتماد والعمل والفتوی ھو الذی رد فیہ المحقق علی المشائخ ورجح فیہ قول الامام ولیس ذلک الا مسئلۃ انتہاء وقت التکبیر ھذا وقد علم من عادۃ صاحب الھدایۃ انہ یؤخر دلیل المذھب الذی ھو المختار عندہ وفی نتائج الافکار من عادۃ المصنف المستمرۃ ان یؤخر القوی عند ذکر الادلۃ علی الاقوال المختلفۃ لیقع المؤخر بمنزلۃ الجواب عن المقدم وان کان قدم القوی فی الاکثر عند نقل الاقوال اھ من مقدمۃ الھدایۃ (ص ۳ ج ۲) و فی مسئلۃ من یجب علیہ التکبیر قدم صاحب الھدایہ قول الامام عند نقل الاقوال واخر دلیلہ عن دلیلہما وھذا یدل علی ان قول



الامام ھو الراجح فیھا عندہ، وفی الخلاصۃ فی تکبیرات ایام التشریق ما نصہ کبار الصحابۃ رضی اللہ عنہم یقولون بانہ یبدأ بالتکبیر من صلوٰۃ الغداۃ یوم عرفۃ وبہ اخذ علمائنا رحمہم اللہ واختلفوا فی القطع قال ابن مسعود یکبر الی صلوٰۃ العصر من اوّل یوم النحر وھو ثمانی تکبیرات وبہ اخذ ابو حنیفۃ وقال علی الی صلوٰۃ العصر من اٰخر ایام التشریق وھو ثلث وعشرون تکبیرۃ وبہ اخذ ابو یوسف ومحمد رحمہما اللہ وعلیہ الفتوٰی وعلیہ عمل الناس الیوم، ثم ھذا التکبیر علی اھل الامصار فی الصلوات المکتوبات المؤدیات فی جماعۃ مستحبۃ حتی لا یجب علی النسوان وان صلّین بجماعۃ وعندھما کل من صلی المکتوبۃ فی ھذہ الایام فعلیہ التکبیر مقیما کان او مسافرا رجلا کان او امرأۃ فی المصر او فی غیر المصر فی الجماعات او وحدہ ومن دخل فی الجماعۃ من المسافرین والنساء فعلیہم التکبیر تبعا للرجال کما فی الجماعۃ المسلمون اذا صلوا جماعۃ فی المصر فیہ روایتان والاصح انہ لیس علیہم التکبیر اھ (ص ۲۱۵ و ۲۱۶ ج ۱) وھذا صریح فی ان الفتوٰی علی قولہما انما ھو فی وقت قطع التکبیر واما فی حکم من یجب علیہ فالراجح قول الامام لان صاحب الخلاصۃ انما ذکر الفتوی علی قولہما فی الاول دون الثانی بل صرح فی حکم المسافرین اذا صلوا جماعۃ فی المصر بان الاصح انہ لیس علیہم التکبیر مع انہما قائلان بوجوب التکبیر علی المسافر المنفرد ایضا ولو کان فی قریۃ فعلی المسافرین اذا صلوا جماعۃ فی المصر اولی ولکن صاحب الخلاصۃ صرح بتصحیح ما یخالف قولہما ثم راجعت البدائع فرأیتہ قد رجح قول الامام علی قولیہما فی الفصلین واجاب عن کل ما استدلا بہ (ص ۱۹۸ ج ۱) و کذا رجح ابن امیر حاج فی شرح المنیۃ قول الامام علی قولیہما فی الفصلین ایضا (ص ۵۳۱) نعم ذکر فی البحر عن السراج الوھاج والجوھرۃ والفتوی علی قولہما فی ھذا ایضا ای فی وجوب التکبیر علی کل من صلی المکتوبۃ فی ھذہ الایام) فالحاصل ان الفتوی علی قولہما فی اٰخر وقتہ وفیمن یجب علیہ اھ (ص ۱۶۶ ج ۲) ولکن ھذا معارض لترجیح صاحب الھدایۃ وتصحیح

صاحب الخلاصة وتحقیق صاحب البدائع وتصویب ابن امیر حاج وبعارض الحدیث الذی استدل به الحنفیة علی اختصاص الجمعة والعیدین بالمصر وهو ما رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه حدثنا عباد بن العوام عن حجاج عن ابی اسحٰق عن الحارث عن علی رضی قال لا جمعة ولا تشریق ولا صلوٰة فطر والاضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة کذا فی نصب الرایه (ص ۲۱۲ ج ۱) وسنده حسن کما ذکرته فی اعلاء السنن وبه احتج ابو حنیفة علی اختصاص وجوب التکبیر باهل المصر دون القریٰ کما صرح به فی البحر والبدائع والتشریق رفع الصوت بالتکبیر قاله النضر بن شمیل وهو من أئمة اللغة قاله صاحب البدائع فقول ابو حنیفة قوی روایة ودرایة واکثر المصنفین علی توجیه قوله علی قولهما فی من یجب علیه التکبیر فلا عبرة بنقل السراج الوهاج والجوهرة، واللّٰہ اعلم، حررہ ظفر احمد عفا اللّٰہ عنہ ۲۲ رجب سنہ ۴۶ھ

تعریفِ مصر

**سوال** (۴۲) آجکل کے زمانہ میں، کس قسم کی جگہ شرعاً شہر کہلائے گی؟

**الجواب**: جہاں تین چار ہزار کی آبادی ہو، اور بازار متصل ہو، جس میں ضروریات روزمرہ سب دستیاب ہوتی ہوں، اور اس آبادی کے متعلق اس کے توابع میں کچھ دیہات بھی ہوں،

۱۰ رشوال سنہ ۴۶ھ

صحرا، جہاں عیدین کی نماز پڑھنا سنت ہے، شرعاً کس کو کہتے ہیں، اور اس کے متعلق متعدد سوالا[ت]

**سوال** (۴۳) شرعاً صحرا، کس کو کہتے ہیں؟ جہاں عیدین کی نمازیں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے؟

**الجواب**: جہاں مکانات نہ بنے ہوئے ہوں، مکاناتِ آبادی سے باہر جو میدان ہو وہ عیدگاہ کا محل مسنون ہے،

سوال: کس قسم کے میدان میں عیدین کی نمازیں پڑھنا چاہئے؟ کیا عیدگاہ کا شہر سے باہر ہونا شرط ہے؟ اگر شرط ہے تو یہاں شہر سے کیا میونسپلٹی حدود مراد ہے یا بازار اور بستی وغیرہ؟

جواب: حدودِ میونسپلٹی سے باہر ہونا مراد نہیں، بلکہ مکانات وآبادی سے باہر ہونا مراد ہے

سوال: شہر کی میونسپلٹی کے اندر مگر بازار وغیرہ کے باہر کوئی کھلی ہوئی جگہ



۲۵

(میدان) ملے تو اسی کو عیدگاہ بنانے میں شرعاً کوئی مضائقہ ہے یا نہیں؟

الجواب: اوپر کے جواب سے معلوم ہو چکا،

سوال: میونسپلٹی کی حدود کے اندر عیدگاہ ہونے سے اگر تین ہزار لوگ جمع ہوں اور باہر ہونے سے تین سو ہوں تو کہاں عیدگاہ بنانا افضل ہوگا؟

الجواب، اوپر گذر چکا کہ حدود میونسپلٹی سے باہر ہونا عیدگاہ کا ضروری نہیں، صرف آبادی سے باہر ہونا چاہئے، اور زیادہ دور بھی ہونا ضروری نہیں،

سوال، اگر شہر کے لئے اندر یا باہر کوئی عیدگاہ نہ ہو، مگر شہر کے اندر سرکاری یا غیر سرکاری ایسے وسیع میدان ہوں (مدرسہ، اسکول، کالج کے میدان) جہاں باجازت مالک شہر کے لوگ ایک جا ہو کر بہت بڑی جماعت کے ساتھ عیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں وہاں عیدین کی نمازیں میدان میں پڑھنا بہتر ہوگا یا مختلف مساجد میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ادا کرنا بہتر ہوگا؟

الجواب: نمازِ عید تو اس صورت میں صحیح ہو جائے گی مگر سنت ادا نہ ہوگی سنت یہی ہے کہ شہر کی آبادی سے باہر عیدگاہ ہو،

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ شہر کے چاروں طرف شہر پناہ دیوار تھی یا نہیں؟ بر تقدیر اول آپ کی عیدگاہ اندر تھی یا باہر؟

الجواب: ہاں مدینہ کی شہر پناہ تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیدگاہ شہر پناہ سے باہر تھی، مگر ظاہر یہ ہے کہ شہر پناہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد بنائی گئی ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں بنائی گئی، حضور ﷺ کے زمانے میں مدینہ کی تین جانب تو کھجور کے درختوں اور عمارتوں سے محفوظ تھیں، اور ایک جانب کھلی ہوئی تھی، اُدھر غزوۂ احزاب میں خندق بنائی گئی، اور عیدگاہ خندق سے باہر فاصلہ پر تھی یا خندق کے اندر تھی اس کی تحقیق نہیں ہو سکی، ہاں خلاصة الوفاء میں امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ مسجد نبوی ﷺ اور عیدگاہ میں ہزار ذراع کا فاصلہ تھا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی شہر پناہ جو حضور ﷺ کے بعد بنی ہے عیدگاہ اس شہر پناہ کے باہر تھی، (۱۷۷ و ۱۷۸) واللہ اعلم،

سوال: روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیدگاہ شہر کے باہر تھی، یہاں شہر سے کیا مراد ہے، اور شہر کے باہر عیدگاہ ہونے میں کیا حکمت ہے، خاصکر

اس طرف عیدگاہ کرنے کی کوئی وجہ ترجیح بھی تھی یا یہ ایک اتفاقی بات تھی،

الجواب: شہر سے مراد مکانات آبادی ہے، اور شہر کے باہر عیدگاہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا حکمت مسلمان کو چاہئے کہ حضور ﷺ نے شہر کے باہر عیدین کی نماز پڑھی ہے،

سوال: شہر کے اندر عیدگاہ بنانے میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں؟

الجواب: ہاں مضائقہ نہیں مگر سنت کے خلاف ہے، واللہ اعلم ۱۰ ارشوال سنہ ۴۶ھ

**سوال (۴۴)** ........ خطبہ سے پہلے وعظ کہنے کا حکم

...... ضلع ہردوئی میں "انجمن تبلیغ وحفاظتِ اسلام" قائم ہے، اور فی زمانہ اس کام کی جس قدر اہمیت ہے ظاہر ہے، مسلمانوں کی بے حسی بھی واقع ہے، چنانچہ مسلمانوں کو حالتِ حاضرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اور انجمن کی مالی کے واسطے زید ہر جمعہ کو خطبہ سے قبل کچھ وعظ کہہ کر چندہ طلب کیا کرتا تھا، عمر جو مسجد کا امام ہے اس بات سے مانع ہوا کہ وعظ کہنے اور چندہ طلب کرنے میں ان لوگوں کی سنتوں میں خلل پڑتا ہے، جو خطبہ سے پہلے سنتیں پڑھتے ہیں اور اس نے یہ بھی کہا کہ خطبہ سے پہلے مسجد میں کسی قسم کا بھی وعظ ہو ممنوع ہے، اس لئے زید اپنے فعل سے باز رہا، اور اس سلسلہ میں شعبہ تبلیغ کو جو کچھ چندہ مل جایا کرتا تھا وہ بند ہوگیا نماز جمعہ کے بعد لوگ منتشر ہو جاتے ہیں، اس لئے پھر اس کا موقع نہیں ملتا، کہ وعظ کہا جائے یا چندہ فراہم کیا جائے، لہذا جبکہ شعبۂ تبلیغ کی اس قدر اہمیت ہے، اور اس کے لئے نمازِ جمعہ سے پہلے چندہ فراہم کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں شرع کا کیا مسئلہ ہے، آیا قبل خطبہ کوئی وعظ کہا جاسکتا ہے یا نہیں، اور امامِ مسجد کا اس میں مانع ہونا کہاں تک بجا ہے، بینوا توجروا؟

الجواب: خطبہ سے پہلے وعظ کہنا جائز ہے، البتہ اس میں یہ رعایت کی جاوے کہ جو وقت خطبہ شروع ہونے کے لئے مقرر ہے اس وقت وعظ شروع کیا جاوے تاکہ لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں، اور جو شخص اس وقت تک بھی سنتوں سے فارغ نہ ہوگا وہ خود کوتاہی کرتا ہے، کیونکہ اب اس کی سنتوں میں خطبہ سے خلل پڑتا جبکہ خطبہ کا وقت آگیا، البتہ اس صورت میں نماز دیر سے ختم ہوگی، جس میں نمازیوں پر گرانی ہونا محتمل ہے، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی جمعہ میں عام نمازیوں سے اس کی اجازت لی جائے کہ اگر آپ صاحبوں پر گرانی نہ ہو تو خطبہ سے پہلے خطبہ کے وقت تھوڑی



دیر اس کام کے لئے آپ کا وقت لے لیا جائے، اگر سب یا اکثر اس پر راضی ہوں تو پھر مضائقہ نہیں، حاصل یہ ہے کہ خطبہ سے پہلے وعظ کہنا فی نفسہٖ ممنوع نہیں، اگر کوئی مانع خارجی پیش آجائے اس کا انسداد کردے خواہ اس طریق سے جو اس جواب میں مذکور ہے خواہ کسی دوسری طریق سے، واللہ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۱۱ ارشوال سنہ ۴۶ھ اشرف علی

**سوال (۴۵)** المنبر اذا بنى فى المحراب هل يجوز الخطبة عليه ام لا،

ذکر فی الجلد الخامس من العالمگیریة المصری فی صفحه ۳۵۵ دخل المحراب له حکم المسجد فلو بنى المنبر فى المحراب ويخطب عليه يوم الجمعة هل يجوز ذلك ام لا، بينوا توجروا؟

الجواب: نعم يجوز فان المنبر للخطبة وهى كالصلوٰة فليس فى بنائه شغل البقعة بغير الصلوٰة وقد وضع منبر المسجد النبوى فى المسجد بعد ما بنى المسجد بتمامه وقد كان موضعه قبل موضع الصلوٰة وصار مشغولا بالمنبر بعد وضعه فيه ولكنه جاز لكون الخطبة من الصلوٰة، قال الشامى المنبر بكسر الميم من النبر وهو الارتفاع ومن السنة ان يخطب عليه اقتداء به صلى الله عليه وسلم بحر وان يكون على يسار المحراب قهستانى اه (ص ۸۶۰ ج ۱) قلت ويسار المحراب اعم من ان يكون داخله اوخارجه فافهم، والله تعالى اعلم، ۲۹ شوال سنہ ۴۶ھ

**سوال (۴۶)** ........ خطیبِ خطبۂ جمعہ شروع کرنے سے قبل اعوذ باللہ بسم اللہ جہراً پڑھے یا آہستہ

........ جمعہ کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے خطیب کو بسم اللہ اور اعوذ باللہ بلند آواز سے پڑھنا چاہئے یا آہستہ سے پڑھنا چاہئے، بینوا توجروا؟

الجواب: پہلا خطبہ شروع کرنے سے صرف اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم آہستہ پڑھ لے، جہر نہ کرے، اور بسم اللہ کا پڑھنا منقول نہیں، قال فی الدر ويبدأ بالتعوذ سرا اه قال الشامى ويبدأ قبل الخطبة الاولى بالتعوذ سرا ثم بحمد الله تعالى والثناء عليه والشهادتين والصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم والتذكير العظة والقراءة قال فى التجنيس والثانية كالاولى الا انه

ین عوللمسلمین مکان الوعظ قال فی البحر وظاہرہ انہ یسن قراءۃ آیۃ فیہا کالاولیٰ اھ قلت وکن الظاہر ان یبدأ بالتعوذ قبل الثانیۃ ایضاً سرًّا بعدم استثنائہ سوی الوعظ واللہ اعلم،

اس عبارت کے اخیر جزء سے قیاساً حیث قال والثانیۃ کالاولیٰ، معلوم ہوا کہ دوسرے خطبہ کو بھی اعوذ باللہ الخ آہستہ پڑھکر شروع کیا جائے، باقی اعوذ باللہ یا بسم اللہ قبل خطبہ کے یا قبل اذان واقامت کے نماز کے زور سے پڑھنا جیسا کہ آجکل بعض مقامات میں رواج ہے بدعت ہے، واللہ اعلم، ۱۶ ذیقعدہ سنہ ۴۶ھ

**جمعہ کے دن آخر ظہر پڑھنے کا حکم**

**سوال** (۴۷) اس ملک سندھ میں جو جو بڑے شہر ہیں ان شہروں میں آخر ظہر پڑھی جائے یا نہ؟ بینوا توجروا اجراً عظیما،

**الجواب**: بڑے شہروں اور قصبات میں آخر ظہر پڑھنا مکروہ ہے، اور جس جگہ جمعہ کی صحت میں شبہ ہو وہاں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ ظہر ہی پڑھنا چاہئے، واللہ اعلم ۲ صفر سنہ ۴۷ھ؛

**اذانِ جمعہ سے قبل وعظ کی ایک صورت کا حکم،**

**سوال** (۴۸) ایک مسئلہ میں اور مولانا کی ڈھیل معلوم ہوئی، وہ مسئلہ یہ ہے جو آجکل تمام عالمِ اسلام ترکی افغانستان وغیرہ میں معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے، یعنی خطبۂ جمعہ زبان مادری میں ہونا چاہئے، اسی تبلیغی کانفرنس میں علیگڈھ کالج کے تین طلبہ آئے ہوئے تھے، انھوں نے ایک روز جس دن مولانا حسین احمد صاحبؒ دہلی گئے ہوئے تھے، ایک سبجیکٹ کمیٹی (باصطلاحِ جدید یعنی وہ اشخاص نامزد شدہ جو تجاویز اول تیار کرتے ہیں میں پیش کی، یہ کہتے ہوئے کہ مولانا حسین احمد صاحبؒ نے اس کو منظور کر لیا ہے، تجویز کے الفاظ یہ تھے کہ امامِ مساجد کو ضروری ہے کہ خطبۂ اول حالاتِ حاضرہ پر مادری زبان میں پڑھے، اور بعدہ اسی کا ترجمہ عربی زبان میں پڑھے، مگر اس کو مولوی عبد الرحمٰن خانصاحب نے نامنظور کیا کہ یہ ناجائز ہے، طالب علم مولانا حسین احمد صاحبؒ کا حوالہ دیتے رہے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس مسئلہ کو مولانا آجائیں تو کل پیش کرنا، دوسرے روز مولانا کے روبرو تجویز پیش ہوئی، مولانا نے اس کو منظور کر لیا اس پر مولوی صاحب بولے کہ حضرت یہ تو ناجائز ہے، اس میں گفتگو ہوئی، مولوی صاحب نے فرمایا کہ لزوم مالیلزم کے تحت میں



آتا ہے اگر مفسدہ حال نہیں تو مفسدہ مآل ضرور ہے، جملہ بدعات اسی طرح شروع ہوئیں، اس میں ترمیم کی گئی کہ ہمیشہ نہیں بلکہ گاہ گاہ جبکہ ضرورت ہو، اس پر مولوی صاحب تو خاموش ہوئے مگر اور صاحبوں نے اعتراض کئے کہ مصلی سنتوں کی نیت کہاں باندھے، جب امام تقریر اردو میں کر رہا ہو آیا اس کو ترک کر دے، اگر ترک کرتا ہے تو اس کا جزیہ دکھایا جائے اور اگر پڑھتا ہے تو نماز پر خلل پڑتا ہے، اس کا کچھ جواب نہیں دیا گیا کہ خطبہ کے آداب وسنن ہیں مثلاً خلفاء راشدین کا ذکر وغیرہ ترک ہوں گے، اس پر ترمیم ہوئی آج چونکہ مولانا حسین احمد صاحب موجود تھے تو مولوی صاحب وغیرہ تو خاموش اور دیگر اصحاب انجمن مولانا کے مؤید سوائے عبد اللہ خان گنج والے اور عبد الرحیم خان کے یہ دو صاحب اڑے رہے، اور بہت دیر تک مولانا سے بحث کی مگر نہ چلی، اور تجویز بالفاظ ذیل منظور ہوئی، تجویز نمبر ۳ منجانب ینگ مسلم ایسوسی ایشن علیگڈھ "اس کانفرنس کی رائے میں اشد ضروری ہے کہ کسی نئی ضرورتوں کے پیش آنے پر خطبۂ جمعہ کے مواعظ ونصائح کم ازکم دس پندرہ منٹ قبل اذانِ جمعہ بپابندی احکامِ شرعی مخاطبین کی زبان میں بیان کئے جائیں، اس میں اُن مضامین کی تصریح بھی شامل ہوا کرے جو خطبۂ عربیہ میں ہوں"،

اس تجویز کو مولانا حسین احمد صاحبؒ نے کثرتِ رائے سے منظور کر لیا، اور طے ہوا کہ جلسۂ عام میں اس کو منظور کرایا جائے، چونکہ سبجکٹ کمیٹی میں بندہ کو بولنے کا حق نہ تھا، اس واسطے کہ بندہ اس کا باضابطہ ممبر نہ تھا، اس لئے وہاں سے اُٹھ کر مشورہ ہوا کہ اس تجویز کو جلسہ عام سے رَدّ کرانی چاہئے، مجبوراً ہم نے چالیس پچاس اپنے ہم خیال بنائے اور جلسۂ عام میں، ان کو مختلف جگہوں پر متعین کر دیا، کہ جس وقت یہ تجویز پیش ہو اس کی زبردست مخالفت کی جائے، غالباً ہمارے پروپیگنڈے کا پتہ ان طلباء کو ہو گیا، جو سمجھ گئے کہ ہماری تجویز کی مخالفت ہوگی اور ہم کو جلسۂ عام میں زک ملے گی، اس لئے انھوں نے تجویز واپس لے لی، اور فوراً جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہم تو مولانا حسین احمد صاحب کا نام دیکھکر آئے تھے کہ خطبہ کو اردو میں کرالیں گے، مگر ان لوگوں نے چلنے نہ دی، یہ اُن طلبہ کی نیچریت تھی، اور دیگر تاویلیں محض حیلہ حوالہ کے واسطے تھیں، ورنہ ان کا منشاء اُن نیچریوں کی اتباع کرنا تھا، کہ جنھوں نے مادری زبان میں خطبہ جاری کر دیا ہے، مگر اللہ کا شکر ہے کہ خورجہ سے منظور نہ کرا سکے،

**الجواب:** جن الفاظ سے تجویز نمبر ۳ (خط کشیدہ) کو مولانا نے منظور فرمایا ہے، فی نفسہ اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں، کیونکہ قبل اذان جمعہ کے جو بیان اردو میں ہوگا وہ خطبہ سے خارج ہے، مگر جس صورت سے اس کو منظور کیا گیا ہے اس میں ایک مباح کو اشد ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس کو پاس کر کے گویا ائمۂ مساجد کو اس پر مجبور کیا جائے گا اور مباح میں جبر غیر امام کو جائز نہیں، ولا امام لنا، اور اگر ائمۂ مساجد کو مجبور کرنا مقصود نہیں تو پھر قانون بنانے اور اس کو پاس کرنے سے کیا فائدہ، بلا جبر کے تو علماء قبل خطبہ و بعد جمعہ وعظ کہتے ہی ہیں، ۲۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۷ھ

**گاؤں میں نماز جمعہ وعیدین درست نہیں**

## سوال (۴۹) ...............

............ ہمارے علاقہ میں قدیم سے رواج چلا آتا ہے کہ عیدین کے دن ہر گاؤں میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا نماز عیدین بہ نیت نفل باجماعت ادا کرتے ہیں اور جس گاؤں میں کوئی عالم ہو تو وہاں کچھ وعظ ونصیحت و شوکتِ اسلام کی اچھی رونق ہو جاتی ہے، اب یہاں بعض علماء نے آکر عیدین فی القریٰ کو منع فرمایا ہے، اور کہا ہم تمام حنفی المذہب ہو اور عند الاحناف جہاں جمعہ ہے وہاں عید بھی ہے، اور تم جمعہ نہیں پڑھتے ہو اور عیدین (ضرور) ادا کرتے ہو یہ کیا وجہ ہے؟ جب علماء نے یوں کہا تو عوام کالانعام نے شور وغل مچا دیا، جب عید نہیں تو قربانی وفطر کیسا؟ حتیٰ کہ بعضوں نے فطرہ اور قربانی کو ترک کر دیا ہے، اسی موضع میں میرے دادا صاحب اور والد صاحب اور ماموں صاحب جو کہ اچھے عالم ہیں بحسبِ رواج قدیم کے عیدین ادا کرتے چلے آئے ہیں، اب میرے ماموں صاحب یہاں کے امامِ مسجد ہیں، اور احقر بھی انہی کے ساتھ شامل ہے، جب علماء نے جماعت نوافل وعیدین کو منع کیا، تو مجھ سے بھی مسئلہ پوچھا گیا میں نے بھی منع کیا چنانچہ کتب فقہ حنفیہ میں ہے، مگر بوجہ کمالِ خوشی اُس دن کے اُن لوگوں نے کچھ توجہ نہ کی، چونکہ میں بحمد اللہ وفضلہٖ تعالیٰ کچھ طالب علم ہوں میرا عیدین میں شامل ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور وعظ وغیرہ کا اشتیاق رکھتے ہیں، اور میری عدمِ شمولیت اُن پر سخت ناگوار گذرتی ہے، اب گذارش یہ ہے کہ اس پُر آشوب زمانہ میں اس رواج کے متعلق کیا ارشاد ہے، آیا اس کو برقرار رکھا جائے یا اس سے حتی الوسع برکنار ہوا جائے اور اس کے ادا کرنے میں عند الشرع کوئی جرم ہے یا نہیں، اب تو پنجاب کا شاید کوئی ہی موضع ایسا ہو گا کہ



عیدین اس میں نہ پڑھی جاتی ہوں، حتیٰ کہ اب جمعہ کا رواج بھی اکثر مقاموں میں بہت پھیل رہا ہے، پس اگر جمعہ کو بھی بغرض تبلیغ احکام کے پڑھا جائے تو جائز ہوگا یا نہیں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ مصفیٰ شرح مؤطائے امام مالک رحمہ اللہ میں فرماتے ہیں "پس ظاہر آنست کہ در دہ اگر دون از اربعین جمعہ خوانند نماز ایشان صحیح باشد و متخلفان آثم باشند، انتہیٰ (ص ۱۵۲)

۲: اگر نماز عیدین کو جماعت کے ساتھ نہ پڑھا جاوے تو کیا فرادیٰ فرادیٰ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ۳: نفلوں کی جماعت تو احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی شرح تیسیر القاری باب صلوٰۃ النفل بجماعۃ در جواز نفل باجماعت اور فتح الباری باب صلوٰۃ النفل جماعۃ "قیل مرادہ النفل المطلق ویحتمل ماھو اعم ......... من ذلک، اور شرح الیاس میں ہے، ویصلی التطوع بجماعۃ خارج رمضان نیز صحیح بخاری میں ہے لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھذا عیدنا یا اھل الاسلام وامر انس بن مالک بن ابی عتبۃ بالزاویۃ فجمع اھلہ وبنیہ وصلی کصلوٰۃ المصر وتکبیرھم وقال عکرمۃ اھل السواد یجتمعون فی العید ویصلون رکعتین کما یصنع الامام وقال عطاء اذا فاتہ العید صلی رکعتین" انتھی تو اب عرض ہے کہ فقہاء اس کو مکروہ کیوں لکھتے ہیں، اور اگر مکروہ ہے تو تحریمی ہے یا تنزیہی، اگر تحریمی ہو تو شرعاً اس کا کیا نتیجہ اور سزا وجزاء ہے مفصل مسجل ہو،

**الجواب:** قال علی رضی اللہ لا جمعۃ ولا تشریق ولا فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف بسند حسن کما حققتہ فی اعلاء السنن وللہ الحمد، وھو موقوف فی حکم المرفوع لکونہ وارداً علی خلاف القیاس المستمر فی الصلوات من عدم تقییدھا بمکان دون مکان قال تعالیٰ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض کلھا مسجداً طھوراً، اثر مذکور کی بنا پر حنفیہ کے نزدیک دیہات میں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں، بلکہ ان کے لئے قصبات یا شہر ہی محل ہیں، اور عوام کالانعام کی ضد سے احکام شرعیہ نہیں بدل سکتے، اور نفل نماز کی جماعت بالتداعی مکروہ تحریمی ہے،

اور جن احادیث سے جماعت نوافل ثابت ہے وہ صلوٰۃ کسوف اور استسقاء کے باب میں ہیں، یا جماعت بلاتداعی واہتمام تھی، اور حضرت انسؓ کا اثر حنفیہ کے معارض نہیں، کیونکہ حضرت انسؓ کا زاویہ بصرہ کے توابع سے تھا، یا وہاں حضرت انس رضؓ کو اقامت جمعہ وعیدین کی والی بصرہ کی طرف سے اجازت ہوگی، اور حاکم مسلم کی اجازت کے بعد دیہات میں بھی حنفیہ کے نزدیک جمعہ درست ہے، جبکہ دیہات میں حاکم کی طرف سے کوئی نائب مقدمات کے فیصلہ کے لئے متعین ہو اور احتمالات کے ہوتے ہوئے استدلال باطل ہے، جیسا کہ طلبہ کو معلوم ہے' اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے شرح مؤطا میں حنفیہ کا مذہب نہیں لکھا، بلکہ امام مالکؒ کے کلام کی شرح کی ہے، پس اس سے بھی استدلال صحیح نہیں، ۵ر شوال ۴۷ھ

خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا

**سوال** (۵۰) یہاں مدراس میں ہر جگہ عصا، ہاتھ میں لیکر خطیب خطبۂ جمعہ پڑھتا ہے، اس میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ امام کی عدم موجودگی میں لوگوں نے اصرار کیا کہ میں خطبۂ جمعہ پڑھوں اور نماز بھی پڑھاؤں، میں نے عصا لینے سے انکار کیا، اور بغیر عصا پڑھنے کو بخوشی تیار ہوں، تو یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کہتے ہیں کہ عصا، ہاتھ میں لے کر پڑھنا سنت ہے،

**الجواب**، اخذ عصا، فی الخطبہ کی مسنونیت میں حنفیہ نے اختلاف کیا ہے، خلاصہ میں مکروہ کہا ہے، اور قہستانی نے محیط سے اخذ عصا، کی مسنونیت نقل کی ہے، شامی ص ۸۶۲ ج باب الجمعہ، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ اخذ عصا، سنت مقصودہ نہیں، بلکہ سنت مقصودہ اخذ سیف ہے، اس مقام پر جو سیف سے مفتوح ہوا ہو، اور اگر سیف نہ لے تو عصا، کا لینا بالقصد مسنون نہیں، بلکہ محض اعتماد اور سہولت قیام کے لئے اخذ عصا، جائز ہے، وھو محمل ما روی ابو داؤد انہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ای فی الخطبۃ متوکئا علی عصاء او قوس اھ ای اتکاء علی احدھما الاعتماد والیسر لا تعبدا، پھر جب عوام نے اخذ عصا، کو مثل اخذ سیف کے سنت مقصودہ سمجھ لیا تو بعض فقہاء نے اس کو مکروہ کہدیا، کیونکہ مباح کو مسنون سمجھ لینا مکروہ ہے، پس اخذ عصا، فی نفسہ جائز ہے، مگر اس کا التزام نہ کیا جائے احیانا ترک بھی کردیا جائے، واللہ اعلم، ۱۳ر ذیقعدہ ۴۸ھ

عید جب جمعہ کے روز ہو تو جمعہ اور عید دونوں واجب ہیں

**سوال** (۵۱) ............................ عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں ہوجائیں تو کیا دونوں



فرض ہیں یا دونوں واجب یا دونوں سنت، یا ان میں تفصیل ہے، یعنی بعض فرض اور بعض واجب یا سنت، مدلل تحریر فرمائیں، اور دلیل اگر حدیث ہو تو بہتر ہے،

**الجواب**، قال فی الدر لو اجتمعا ای العید والجمعۃ لم یلزم الا احدھما کذا فی القہستانی عن التمرتاشی قلت وقد راجعت التمرتاشی فرأیتہ حکاہ عن مذہب الغیر وبصیغۃ التمریض فتنبہ اھ قال فی رد المحتار اما مذہبنا فلزوم کل منہما قال فی الہدایۃ ناقلا عن الجامع الصغیر عیدان اجتمعا فی یوم واحد فالاول سنۃ والثانی فریضۃ ولا یترک واحد منہما قال فی المعراج قال عبد البر سقوط الجمعۃ بالعید مھجور وعن علی ان ذلک فی اہل البادیۃ ومن لا تجب علیہم الجمعۃ اھ وسماہا فی الجامع الصغیر سنۃ لان وجوبہا ثبت بالسنۃ حلیہ قال فی البحر والظاہر انہ لا خلاف فی الحقیقۃ لان المراد من السنۃ المؤکدۃ بدلیل قولہ لا یترک واحد منہما وکما صرح بہ فی المبسوط وقد ذکرنا مرارا انہا بمنزلۃ الواجب عندنا اھ (ص ۶۸۵ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عید اور جمعہ مجتمع ہوجائیں تو پہلی نماز واجب ہے، یعنی عید کی، اور دوسری یعنی جمعہ کی نماز فرض ہے، اور شہر والوں کو کسی کا ترک بھی جائز نہیں، ہاں دیہات والوں کو جن پر جمعہ وعید واجب نہیں، گنجائش ہے کہ عید پڑھ کر اپنے گاؤں کو واپس ہوجائیں، اور جمعہ نہ پڑھیں، کیونکہ دیہاتی اگر شہر میں آجائے تو جب تک زوال کے وقت تک شہر میں نہ رہے اُس پر جمعہ فرض نہیں ہوتا، زوال سے پہلے اس کو واپس ہوجانا جائز ہے، کما فی الدر والشامی (ص ۸۶۱ ج ۱) مع ذکر الاختلاف فیہ واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ر ذی الحجہ ۴۷ھ

تکبیرات ایام تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کیساتھ خاص ہے یا یہ حکم عام ہے،

**سوال** (۵۲) تکبیر تشریق جماعت سے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ خاص ہے یا منفرد وغیرہم کے لئے بھی عام ہے؟

**الجواب**؛ بحر میں مجتبیٰ وجوہرہ سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے کہ ہر فرض نماز پڑھنے والے کے ذمہ تکبیر تشریق واجب ہے، خواہ جماعت سے ہو یا منفرد مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، اس لئے اسی پر عمل احوط ہے، قال فی

الشرنبلالیۃ والدر المختار وقالا بوجوبہ فور کل فرض مطلقا ولو منفردا او مسافرا او امرأۃ لانہ تبع للمکتوبۃ الی عصر الیوم الخامس اٰخر ایام التشریق وعلیہ الاعتماد والعمل والفتوی فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار اھ وتوھم منہ رجوع قولہ وعلیہ الاعتماد الی مجموع قولھما من بیان الوقت ومن یجب علیہ وعندی ذلک راجع الی بیان الوقت فقط بدلیل ما فی متن الوقایۃ وتجب تکبیرات التشریق من فجر عرفۃ عقیب کل فرض ادی بجماعۃ مستحبۃ علی المقیم بالمصر ومقتدیۃ برجل ومسافر مقتد بمقیم الی عصر العید وقالا الی عصر اٰخر ایام التشریق وبہ یعمل اھ (ص ۲۴۸ ج ۱) وبما فی الدر وقالا فور کل فرض مطلقا سوأ ادی بالجماعۃ اولا وسواء کان المصلی رجلا او امرأۃ مسافرا او مقیما فی المصر او فی القری الی عصر الخامس من یوم عرفۃ وبہ ای بالتکبیر الی ھذا الوقت وعدم الاقتصار الی عصر العید یعمل الاٰن احتیاطا فی باب العبادات اھ (ص ۱۴۶ ج ۱) وبما فی الخلاصۃ قال ابن مسعودؓ یکبر الی صلوٰۃ العصر من اول یوم النحر وبہ اخذ ابو حنیفۃؒ وقال علیؓ الی صلوٰۃ العصر من اٰخر ایام التشریق وھو ثلاث وعشرون تکبیرۃ وبہ اخذ ابو یوسف ومحمد وعلیہ الفتوی وعلیہ عمل الناس الیوم ثم ھذا التکبیر علی اھل الامصار فی الصلوات المکتوبات المؤدیات وبالجماعۃ مستحبۃ حتی لایجب علی النسوان وان صلین بجماعۃ وعندھما علی کل من صلی المکتوبۃ فی ھذہ الایام فعلیہ التکبیر اھ (ص ۲۱۵ ج ۱) ولم یذکر الفتوی علی قولھما فی ذلک ومثلہ فی العالمگیریۃ ایضا وصنیع صاحب الھدایۃ یدل علی ترجیح قول الامام فی بیان من یجب علیہ لانہ قدم قول الامام واخر دلیلہ واللہ تعالی اعلم واصحاب المتون کالکنز والقدوری اقتصروا علی ذکر قول الامام فی بیان من یجب علیہ فھو المذھب ولو کان الراجح قولھما فی ذلک لذکروہ کما ذکروا قولھما فی الوقت نعم نقل فی البحر عن المجتبی والجوھرۃ ان الفتوی علی قولھما فی من یجب علیہ ایضا فلیحرر وبالجملۃ الاحوط العمل بقولھما، واللہ اعلم،

۲۴ محرم ۴۸ھ



جو شخص یہ کہتا ہو کہ یہاں (ہندوستان میں) جمعہ ادا نہیں ہوتا اس لئے ہم ظہر احتیاطی ادا کرتے ہیں اسکے پیچھے نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں

**سوال** (۵۳) ایک امام صاف کھلم کھلا کہتا ہے کہ یہاں جمعہ ادا نہیں ہوتا ہے اس واسطے ہم ظہر احتیاطی بھی ادا کرتے ہیں، اس کے پیچھے جمعہ کی نماز درست ہے یا نہیں؟ **الجواب**: یہ مسئلہ اقتدا الشافعی فی الوتر کی نظیر ہے، اور اس میں اختلاف ہے، ......... قال فی الارشاد انہ لا یجوز اصلا باجماع اصحابنا لانہ اقتداء مفترض بالمتنفل ۱۲ شامی ووافقہ ابن الھمام فی الفتح، مگر راجح یہ ہے کہ اقتدا صحیح ہے بشرطیکہ امام نے صرف وتر کی نیت کی ہو، سنت وتطوع بالوتر کی نیت نہ کی ہو، صرح فی التجنیس ان الامام ان نوی الوتر وھو یراہ سنتہ جاز الاقتداء کمن صلی الظھر خلف من یری الرکوع سنۃ وان نواہ بنیۃ التطوع لایصح لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل اھ شامی ص ۶۹۹ ج ۱ وفی التنویر صح الاقتداء فیہ بشافعی لم یفصلہ بسلام علی الاصح للاتحاد وان اختلف الاعتقاد،

اس جزئیہ کا مقتضا یہ ہے کہ قول اصح پر اس شخص کے پیچھے نماز جمعہ صحیح ہے، جبکہ وہ جمعہ کی نیت کرتا ہو، نفلِ جمعہ کی نیت نہ کرتا ہو، اور ظاہر یہی ہے کہ جو امام ہندوستان میں جمعہ کو صحیح نہیں مانتا وہ نمازِ جمعہ پڑھنے کے وقت تنفل بالجمعہ کا قصد نہیں کرتا، بلکہ فرضِ جمعہ یا مطلق جمعہ کی نیت کرتا ہے، اس لئے اس کے پیچھے جو جمعہ پڑھے گئے ہوں اُن کی قضا لازم نہیں، ہاں جو تصریح کردے کہ میں تنفل بالجمعہ کی نیت کرتا ہوں اس کے پیچھے نمازِ جمعہ صحیح نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم،

۱۴ صفر ۴۸ھ

مسجد محلہ میں بانی یا کسی دوسرے شخص کا نماز جمعہ ادا کرنے سے منع کرنے کیمتعلق اذنِ عام کے فوت ہونے پر شبہ کا جواب،

**سوال** (۵۴) .................... ایک محلہ میں قریب ستر برس سے ایک پختہ مسجد واقع ہے، جس میں قریب ستر آدمی اس محلہ کے اور سات آٹھ آدمی دوسرے محلہ کے جمعہ کے دن نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں، گذشتہ رمضان شریف کے بعد ایک دن اکثر کی رائے سے کسی طالب علم کی امداد کے لئے حسبِ توفیق دو دو چار آنہ پیسے لانے کے لئے مصلیوں کو کہدیا گیا تھا، دوسرے جمعہ کو بعد ادائے نماز جمعہ کے چندہ مذکورہ وصول ہونے لگا، لیکن دوسرے محلہ کے سات آٹھ آدمیوں نے کہا کہ ہمارے گھر جانے سے ہم دیں گے، ورنہ نہیں، اس بات پر بانیٔ مسجد کے دو پوتوں

میں سے ..... صاحب نے (جو چھوٹے ہیں اور متولی مسجدِ مذکور بھی نہیں ہیں، مگر دنیوی سرداروں میں سے ایک سردار تھے) زجراً و تنبیہاً کہا، تم لوگ ہمیشہ امرِ خیر میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کرتے ہو، اس مسجد میں نماز پڑھنے مت آؤ، لیکن اس کے بعد کے جمعہ میں ان ممنوعین سے دو تین آدمی اس مسجد میں نماز پڑھنے آئے، اور بلا روک ٹوک بدستور سابق نمازِ جمعہ پڑھی، اور اس منع کا تذکرہ تک نہ ہوا، اور باقی تین چار آدمی اس مسجد میں نہ آئے، دوسری مسجد میں جاکر نمازِ جمعہ ادا کی، اور اس بات پر اڑے رہے کہ جب تک مانع ہم لوگوں کو بلا کر نہ لے جاوے ہم لوگ اس مسجد میں نہیں جاتے، اب ویسا ہی کیا گیا،

لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ گذشتہ سات آٹھ مہینہ تک جو ممنوعین اس مسجد میں نہیں آئے اس سے بوجہ فوت ہونے شرطِ اذنِ عام باقی مصلّیوں کی نماز جمعہ شرعاً درست ہوئی یا نہیں، اور اس قسم کے منع سے اذنِ عام مرتفع ہوگیا تھا یا نہیں؟ اس میں حق کیا ہے، اور اذنِ عام وقتِ جمعہ کے مشروط ہے یا قبل جمعہ کے، بینوا توجروا؟

**الجوابُ من جامع امدادالاحکام** صورتِ مسئولہ میں صرف ..... صاحب کے منع کرنے سے اذنِ عام فوت نہیں ہوا، اذنِ عام ایسے شخص کی ممانعت سے فوت ہوتا ہے، جس کی مخالفت پر عوام قادر نہ ہوں مثلاً حاکمِ وقت منع کردے، اور حاکمِ وقت کی ممانعت سے بھی اذنِ عام اس وقت فوت ہوتا ہے جبکہ کسی بستی میں مطلقاً جمعہ پڑھنے سے منع کردے، اور اگر کسی ایک جگہ سے منع کرے اور دوسری جگہ سے منع نہ کرے تو اذنِ عام فوت نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ اس بستی کی ہر مسجد میں صحیح ہوگی، اور ..... صاحب کی یہ حرکت خلافِ شرع تھی، کہ ان سے چندہ وصول کرنے پر ایسا جبر کیا، اور نمازیوں کو نماز سے روکا، اس کو علانیہ اپنی حرکت سے توبہ کرنی چاہئے، اور خدا تعالیٰ سے استغفار کرے، واللہ اعلم بالصواب، ظفر احمد عفا عنہ

**الجوابُ من جامع تتمۂ امدادالاحکام** ظاہر یہی ہے کہ صرف زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے اذنِ عام مرتفع نہیں ہوتا، الا آنکہ کہنے والا صاحبِ حکومت ہو، اور فعلاً منع کرنا حاکم وغیر حاکم ہر دو کی جانب سے ہوسکتا ہے، یعنی اگر غیر حاکم بھی مسجد کا دروازہ بند کردے، یا پہرہ زبردست دروازہ پر لگادے تو اذنِ عام فوت ہوجاوے گا، اور یہ سب تفصیل جب ہی جبکہ وہاں



ایک ہی جمعہ ہوتا ہو، اور اگر دوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو تو بہرحال جمعہ جائز ہوجاوے گا، فی الشامی قلت وینبغی ان یکون محل النزاع ما اذا کانت لا تقام الا فی محل واحد اما لو تعددت فلا لانہ لا یتحقق التفویت کما افادہ التعلیل تأمل پس صورتِ مسئولہ میں جمعہ صحیح ہوتا رہا، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۱۰ رج ۲ ۳۴۹ھ

**جہاں ایک ہی جگہ نمازِ جمعہ ہوتی ہو وہاں بعض افراد سے نمازِ جمعہ فوت ہوجاوے تو ان کو کیا کرنا چاہئے؟؟**

**سوال** (۵۵) یہاں جمعہ کی نماز ایک ہی جامع مسجد میں ہوتی ہے، گاہ گاہ بعض بعض نمازیوں کے پہونچنے سے قبل ہی نمازِ جمعہ ختم ہوجاتی ہے، اب وہ لوگ دوسری مسجد میں جاکر اذان و اقامت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کرسکتے ہیں یا نہیں، یا جمعہ کی نماز ادا کریں یا فرادیٰ فرادیٰ ظہر کی نماز پڑھیں، جو کچھ شریعت کا حکم ہو اس سے اطلاع دیجئے،

**الجواب**: فی الدر المختار (وکذا اھل مصر فاتتھم الجمعۃ) فانھم یصلون الظھر بغیر اذان ولا اقامۃ ولا جماعۃ وقال الشامی الظاھر ان الکراھۃ ھنا تنزیھیۃ لعدم التقلیل والمعارضۃ المذکورین ویؤیدہ ما فی القھستانی عن المضمرات یصلون وحدانا استحبابا اھ ص ۸۵۶ ج ۱ و فی البحر الرائق (ص ۱۵۴ ج ۲) قال فی الظھیریۃ جماعۃ فاتتھم الجمعۃ فی المصر فانھم یصلون الظھر بغیر اذان ولا اقامۃ ولا جماعۃ اھ وھکذا فی الخلاصۃ، ص ۲۱۱ ج ۱)

قواعد سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مصر میں کم از کم چار شخص جمعہ سے رہ جاویں تو وہ جمعہ کی نماز دوسری مسجد میں پڑھ لیں اور ان سب میں وجوبِ جمعہ کی شرطیں پائی جاتی ہوں تو جمعہ واجب ہو، اور اگر فقط صحت کی شرطیں ہوں تو واجب نہ کہا جاوے، لیکن پڑھیں تو صحیح ہو، مگر جزئیہ کوئی نہیں ملا، بلکہ روایاتِ مذکورہ بالا سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں تنہا تنہا ظہر پڑھیں، لیکن خلاف قواعد ہونے کی وجہ سے ان روایتوں میں تاویل کی جاوے گی، اور میرے نزدیک ان روایتوں میں کئی تاویلیں ہوسکتی ہیں اوّل تو یہ کہ ان روایتوں کو مبنی کہا جاوے تعددِ جمعہ کے عدمِ جواز پر اور جب مفتی بہ جواز تعدد ہے تو یہ روایت بھی مفتی بہ نہ رہی گی، وھذا ما قالہ سیدی وھو وجہ وجیہ، دوسرے یہ کہ جماعت کے لفظ کو محمول کیا جاوے چار سے کم پر، یعنی دو یا تین آدمی رہ جاویں تو وہ جمعہ نہیں

پڑھ سکتے بوجہ فوت ہونے شرطِ جماعت کے بلکہ تنہا تنہا ظہر پڑھیں، کیونکہ جمعہ کے دن مصر میں ظہر کی جماعت مکروہ ہے، اور یہ تاویل گو خلافِ ظاہر ہے لیکن زیادہ بعید بھی نہیں، تطبیق روایات میں اس سے زیادہ بعید کا تحمل کر لیا جاتا ہے، اوّل یہ دو تاویلیں لکھنے کا ارادہ تھا، کیونکہ اور کوئی تاویل ذہن میں نہ تھی، لیکن عین لکھنے کے وقت ایک تیسری تاویل سمجھ میں آئی، احقر کے نزدیک وہ تنہا کافی وافی ہے، اس لئے اسی پر اکتفاء کا ارادہ ہوا تھا، لیکن تتمیمِ فائدے کے واسطے یہ دونوں بھی درج کر دیں، ممکن ہے کسی اہلِ علم کے نزدیک ان میں سے کسی کو ترجیح ہو، وہ یہ ہے کہ یہ روایت محمول ہے اس جگہ پر جہاں حکومتِ اسلامیہ کی طرف سے قاضی وغیرہ مقرر ہو اگر وہاں جمعہ فوت ہو جاوے تو بدون اذنِ حاکم دوسرا جمعہ نہیں ہو سکتا، باقی ہمارے ملک میں چونکہ تقررِ امام کا مدار تراضیٔ مسلمین پر ہے، اس لئے یہ باقی ماندہ لوگ کسی کو امام بنا سکتے ہیں، اور جمعہ پڑھ سکتے ہیں، کما قال صاحب الخلاصہ (ص ۲۰۸) ولو اجتمعت العامة علی تقدیم رجل لم یأمرہ القاضی لم یجز ولم یکن جمعة وان لم یکن ثمہ قاضی ولا خلیفة المیت فاجتمعت العامة علی تقدیم رجل للضرورة وفی الدر المختار (ونصب العامة) الخطیب (غیر معتبر مع وجود من ذکر) اما مع عدمھم فیجوز للضرورة وفیہ ایضا وفی النعجة فی تعداد الجمعة لابن جرباش انما یشترط الاذن لاقامتہا عند بناء المسجد ثم لا یشترط بعد ذلک، غرضیکہ اہلِ مصر کو تنہا تنہا ظہر کا حکم جب ہے کہ جمعہ سے کوئی مانع ہو، ویؤید ہذا ما فی العالمگیریة ونصہ وکرہ جماعة الظہر لاہل المصر اذا لم یجمعوا المانع (ص ۹۵ ج ۱) اب اس بحر وغیرہ کی روایت متقدمہ کی وجہ سے تو کوئی خلجان نہیں، والحمد للہ علیٰ ذلک، الآن وجوب الجمعة فی ہذا الصورة فی دیارنا، یقتضی وجوب طلب الاذن فی دار الاسلام وہو غیر منصوص فی کتب الفقہ ایضا ویمکن الفرق بالتعذر فی طلب الاذن من السلطان وغیرہ دون نصب امام الجمعة فلیتامل، لیکن حالتِ مسئولہ کے متعلق جزئیہ نہ ملنے کے باعث بہتر ہے کہ دوسری جگہ بھی تحقیق کر لیا جاوے اور اس جواب کو بھی وہاں بھیج دیں تاکہ کسی قدر سہولت کا باعث ہو سکے، یہ دوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا تو جب کہ چار آدمی جمعہ سے رہ جاویں، اور اگر چار سے کم یعنی دو تین آدمی رہ جاویں تو وہ ظہر پڑھیں اور الگ الگ پڑھیں جماعت نہ کریں، اس کے بعد مجموعة الفتاویٰ میں مولانا عبدالحی صاحب



کا فتویٰ بھی اس تحریر مذکور کے مطابق پایا، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ، خانقاہِ امدادیہ ۹ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

## فناءِ مصر میں نمازِ جمعہ کی ایک صورت کا حکم

### سوال (۵۶):- . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

(الف) سلیم سرائے ایک بستی ہے کہ جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، اس سے متصل اور بھی بستیاں ہیں منجملہ ان کے میرا موضع بھی ہے (موضع ہرواره) مگر اور بستیوں میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ بالکل ہی متصل ہیں، ایک مکان کا بھی فصل نہیں، اور میرا موضع قریباً دو بیگہ کے فصل سے ہے، یا زیادہ سے زیادہ اتنا جیسا کہ خانقاہ شریف تھانہ بھون سے عیدگاہ ہے، لیکن یہ موضع حقیقتاً گاؤں ہے اس میں کوئی علامتِ مصر کی یا کثرتِ آبادی نہیں، تقریباً پانچسو کی آبادی ہے، پس اس صورت میں اس موضع میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

(ب) شہر سے جو سڑک بیرونِ شہر کو جاتی ہے، اس پر اکثر اینٹوں کے بھٹے اور چونہ کی بھٹیاں سڑک کے کنارہ آبادیٔ شہر سے تین چار میل تک برابر ہوتے ہیں تو جہاں تک یہ بھٹے ہیں، یہ فناءِ مصر میں داخل ہے یا نہیں؟

(ج) اگر یہ فناءِ مصر میں داخل ہے تو وہ مواضعات جو بالکل ان بھٹوں سے متصل اور محاذی ہیں، کیا ان میں بھی جمعہ ہو سکتا ہے؟

**الجواب:** (۱) اگر ایسا اتصال ہو کہ دیکھنے والا اس گاؤں کو سلیم سرائے کا ایک محلہ سمجھے اور عام لوگ بستی سلیم سرائے کو اور ان سب بستیوں کو ایک ہی بستی سمجھتے ہوں، تو ہرواره میں صحیح ہے ورنہ نہیں، اور پورا فیصلہ کسی مفتی کو موقع کا معائنہ کرا کر ہو سکتا ہے۔

(۲) فقہاء نے فناءِ بلد کو بحکم بلد اس لئے فرمایا ہے کہ اس سے مصالحِ اہلِ بلد کے متعلق ہوتی ہیں، اور اہلِ بلد سے مراد عام اہلِ بلد ہیں، نہ خاص، اور فناءِ بلد کی مثال میں میدان گھوڑ دوڑ اور غلہ گاہنے کے میدان، قبرستان، عیدگاہ، موضع تربیض وغیرہ کو بیان کیا ہے، جس میں قبرستان، عیدگاہ موضع تربیض تو ایسے ہیں جن سے عام اہلِ بلد کا تعلق ظاہر ہے، مگر گھوڑ دوڑ کے میدان اور غلہ گاہنے کے میدان سے عام اہل بلد کا تعلق نہیں، صرف گھوڑے سواروں اور کاشتکاروں کو تعلق ہے، مگر اس لحاظ سے کہ دیکھنے والے

گھوڑے والوں کے سوا بھی ہوتے ہیں، اسی طرح غلہ کاٹنے کے وقت کاشتکاروں زمینداروں کو مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور مزدوری پیشہ لوگ ہر شہر میں زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی فقہاء نے مصالح عامہ میں داخل کرلیا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اینٹوں اور چونہ کے بھٹوں کو بھی مصالح اہل بلد میں داخل سمجھنا چاہئے، گو بظاہر ان سے تعلق بھٹہ لگانیوالوں ہی کو ہے، مگر درحقیقت مزدوری پیشہ لوگوں کو بھی تعلق ہے، اس لئے میں اس کو بھی فناء مصر کے حکم میں سمجھتا ہوں، مگر چونکہ یہ میرا قیاس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ میں تحقیق تھانہ بھون سے بھی کرلی جائے،

(۳) ہاں، المجیب ظفر احمد عفا اللہ عنہ از رنگون، ۱۵ جمادی الاول ۵۱ھ

## الجواب من الخانقاہ الامدادیۃ

(۱) جواب سوال اوّل صحیح ہے، کما ہو المصرح فی البحر حیث قال واختلفوا فیما یکون من توابع المصر فی حق وجوب الجمعۃ علی اہلہ فاختار فی الخلاصۃ والخانیۃ انہ الموضع المعدّ لمصالح المصر متصل بہ ومن کان مقیما فی عمران المصر واطرافہ ولیس بین ذلک الموضع وبین عمران المصر فرجۃ فعلیہ الجمعۃ ولو کان بین ذلک الموضع وبین عمران المصر فرجۃ من مزارع او مراع کالقلع ببخاری لاجمعۃ علی اہل ذلک الموضع وان سمعوا النداء ص ۱۴۲ ج ۲

(۲) سوال دوم کے جواب میں غور کیا گیا اور حضرت مدظلہ العالی سے بھی دریافت کیا یہی طے ہوا کہ محض بھٹوں کی وجہ سے کوئی جگہ فناء مصر نہیں بن سکتی، بھٹے زائد سے نظیر ہیں کھیتی کی اور کھیتی فناء میں داخل نہیں، جیسا کہ روایت مذکورہ بالا سے واضح ہے،

ونیز علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے (تحت قول الدر والمختار للفتویٰ تقدیرہ بفرسخ) اقول وبہ ظہر صحتہا فی تکیۃ السلطان سلیم بمرجۃ دمشق وکذا فی مسجدہ بصالحیۃ دمشق فانہا من فناء دمشق بما فیہا من التربۃ بسفح الجبل وان انفصلت عن دمشق بمزارع لکنہا قریبۃ لانہا علی ثلث فرسخ من البلدۃ (ص ۸۲۷ ج ۱)

اور کما حررہ ابن الکمال کے تحت میں تحریر فرمایا ہے؛ حیث قال واعتبر بعضہم فیہ الاتصال وقد خطأہ صاحب الذخیرۃ قائلاً نعلی قول ہذا القائل لا تجوز اقامۃ الجمعۃ ببخاری فی مصلی العید لان بین المصلی وبین المصر



مزارع وقد وقعت ہذہ المسئلۃ مرۃ وافتی بعض مشائخ زماننا بعدم الجواز ولکن ہذا لیس بصواب فان احدا لم ینکر جواز الصلوٰۃ العید فی مصلی العید ببخاری لا من المتقدمین ولا من المتأخرین وکما ان المصر او فناءہ شرط جواز الجمعۃ فہو شرط جواز صلوٰۃ العید اھ (صفحہ مذکورہ بالا) ان دونوں عبارتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی فناء میں داخل نہیں، کما لایخفی، دراصل فناء وہ ہے جو آبادی یعنی سکونت کی ضروریات سے ہو، کیونکہ کچھ ضروریات اہل بلد کی بلد میں پوری نہیں ہوسکتیں وسعت نہ ہونے وغیرہ کی وجہ سے، اس لئے آبادی سے باہر ان ضروریات کے لئے جگہ مقرر کی جاتی ہے اور اس جگہ کو ایک قسم کی آبادی سمجھا جاتا ہے، لہٰذا وہ ملحق بالبلد ہوکر اقامت جمعہ کا محل ہوجاتی ہے، پس ضروریات سے خاص وہ ضروریات مراد ہیں جو متعلق بالسکنی ہوں سب ضروریات مراد نہیں؛ ورنہ تمام کھیت، باغات اور لکڑیوں کے جنگل وغیرہ کا فناء میں داخل ہونا لازم آتا ہے، ولا قائل بہ،

(۳) تیسرا نمبر متفرع ہے، نمبر دوم پر اس لئے اس میں بھی ہمیں اختلاف ہے، واللہ اعلم بالصواب، کتبہ الاحقر عبد الکریم عفی عنہ تھانہ بھون ۵ ارجمادی الاخری ۵۱ھ

## سوال (۵۷)

آبادی سے باہر عیدگاہ تعمیر کی گئی، پھر وسعت آبادی کے سبب آبادی میں آجائے تو اسکی صحرائیت باطل ہوگئی یا نہیں

عرصہ چالیس پچاس سال کا گزرا کہ مسلمانوں نے قصبہ کے باہر ایک عیدگاہ تعمیر کی اور چہار دیواری تعمیر کرکے محفوظ کردی، اور آج تک تمام مسلمان اس میں بلا اختلاف نماز عیدین ادا کرتے رہے، کچھ عرصہ سے اس کے تین اطراف میں مکانات تعمیر ہوگئے، (جس میں بعض ابھی احاطہ ہی ہیں اور بعض مکانات ہیں، اب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز عیدین صحراء میں پڑھنی افضل ہے، اور مکانات تعمیر ہونے سے صحرائیت باطل ہوگئی، لہٰذا اس عیدگاہ کو چھوڑ کر صحراء میں نماز پڑھنی چاہیے، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب یہ عیدگاہ تعمیر ہوئی تھی تو اس وقت صحراء میں تھی وہی حکم باقی رہے گا اور تعمیر مکان کی وجہ سے اس عیدگاہ کو معطل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ مصلیٰ نبوی کے پاس کثیر بن الصلتؓ کا مکان اور حضرت معاویہ رضؓ کا مکان تعمیر ہوگیا تھا، لیکن صحابہ کرام اس میں نماز عیدین برابر ادا کرتے رہے، نیز مکہ معظمہ میں باوجود بستی ہوجانے اب تک نماز

مسجد ہی میں ہوتی ہے، بواد غیر ذی ذرع کا حکم اب تک باقی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

تنقیحات: (۱) کیا صحراء میں جانے کا حکم ہر حال میں ہے، (۲) اس عیدگاہ موجودہ کو کس کام میں لانا چاہتے ہیں، (۳) کیونکہ مصلّٰے نبوی کے پاس الخ کا حوالہ مع عبارت کتاب درج کیا جاوے؟

جواب تنقیحات: (۱) کہتے ہیں کہ اگر عذر شرعی (بارش وغیرہ) نہ ہو تو صحراء میں جانا چاہئے، (۲) عید کی نماز صحراء میں پڑھی جائے، اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی تو مجبور یا بیمار لوگ اس میں نماز پڑھیں گے یا جو مصرف نکل آوے، (۳) کتاب الاُم میں امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ مکہ والے برابر اسی مسجد میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، اور صحراء کے بعد بستی کا ہونا آیت سے معلوم ہوتا ہے، دیز شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مدارج النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں "واہلِ مکہ کہ ہم از زمن اوّل عادت بریں دارند کہ در مسجد گذارند و بصحراء بیروں نروند الآن خود اہلِ مدینہ نیز در مسجد میگذارند و در مفارقت از شرف و برکت راضی نمیشوند و وسعت مسجد شریف الآن بروجہ کفایت است با آبادانیِ ایں بلدۂ شریفہ بخلاف زمان مبارک وے صلی اللہ علیہ وسلم کہ وسعت مسجد کمتر بود و آبادانی شہر بیشتر" انتہیٰ، مدارج النبوۃ جلد اوّل، صفحہ ۴۴۸،

الجواب: اس کے متعلق کہیں تصریح تو ملی نہیں، مگر قواعد کا مقتضا یہ ہے کہ اگر نماز عید کسی ایسے میدان میں ہوتی ہو جو بالخصوص نماز عید کے لئے وقف نہ ہو، بلکہ مصالح عامہ کے واسطے ہو، اور وہ آبادی میں شامل ہو جاوے، تب تو اس جگہ کو ترک کر کے کسی دوسرے میدان میں جو آبادی سے خارج ہو، نماز عیدین ادا کرنا سنت ہے، اور اگر خاص نماز عید کے لئے کوئی جگہ وقف ہو، جیسا کہ سوال میں درج ہے، اور اکثر شہروں میں دستور ہے تو عیدگاہ آبادی میں آجانے سے ترک نہ کی جاوے گی، کیونکہ مصالح وقف کی رعایت ضروری ہے گو اس کو صحراء نہیں کہہ سکتے، مگر سنتِ اصلیہ کو حفاظتِ وقف کی وجہ سے ترک کیا جاوے گا لان تحفظ الوقف واجب و ایتان الواجب اہم من فعل السنۃ، واللہ اعلم،

اور سوال میں جو دو دلیلیں لکھی ہیں ان میں سے دلیل اوّل تو ناکافی ہے، اور دلیل دوم بالکل ہی ناقابلِ ذکر ہے، دلیل اوّل اس واسطے ناکافی ہے کہ کثیر بن الصلت[عہ] اور حضرت معاویہؓ

عہ سائل نے جو حوالہ دریافت کیا گیا تھا جواب تنقیح میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا، مگر فتح الباری میں ہم نے دیکھا تو کثیر بن صلت کا مکان ہونا تو مذکور ہے مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مکان کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ۱۲ منہ



کے ایک دو مکان بن جانے سے اُس جگہ کو آبادی قرار نہیں دے سکتے، بلکہ چند مکان بننے کو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مکان جنگل میں ہیں، آبادی اُس وقت ہوتی ہے جبکہ تمام اطراف میں مکانات ہو جائیں کما لا یخفی، اور مدارج النبوۃ کی عبارت کو صورت مبحوث عنہا سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف اہلِ مدینہ کے فعل کی ایک تاویل ہے، ورنہ اس سے ایک سطر قبل شیخ خود مدارج النبوۃ میں تحریر فرما چکے ہیں "و در بعضے امصار کہ در مساجد میگذارند خلاف سنت است مگر آنکہ عذرے باشد" علاوہ ازیں یہ خرابی ہے کہ اگر شیخ کی توجیہ مذکور فی السوال کو تسلیم کیا جاوے تو سنیتِ صحراء بالکل اُڑ جاتی ہے، ولا قائل بہ من الفریقین بلکہ صحراء میں نماز عید کی سنیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اختلاف ہے کہ صورت مسئولہ میں یہ جگہ صحراء کے حکم میں ہے یا نہیں، ونیز یہ کہ اگر صحراء نہیں تو قابلِ ترک ہے یا نہیں، خلاصۂ جواب کا یہ ہوا کہ حالت موجودہ میں عیدگاہ کو ترک کرنے کی ہمارے نزدیک گنجائش نہیں ہے، فقط کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ

۲ ذوی الحجہ ۱۳۵۱ھ

الجواب صحیح اشرف علی ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

## جمعہ فی القریٰ کے متعلق مذہب امام اعظم کی تحقیق: از جبیب احمد کیرانوی

سوال (۵۸) نافہم غیر مقلدین اور انکے متبعین نے جمعہ فی القریٰ کے باب میں امام المجتہدین کو نشانۂ ملامت بنا رکھا ہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں امام صاحب کے اجتہاد کی حقیقت اغیار تو کیا خود ان کے اتباع بھی کما حقہ نہیں سمجھے، سو ان کے اجتہاد کی حقیقت جہاں تک میں سمجھا ہوں اور انشاء اللہ صحیح بھی ہوگی یہ ہے: "کہ جمعہ کے روز اصالۃً ظہر فرض ہے، اور جمعہ اس کا قائم بس جس صورت میں جمعہ کی صحت یقینی ہے اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر ہو کر مسقطِ فرض ظہر ہو کر یقیناً ہو سکے گا، اور جس صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہے اس صورت میں وہ قائم مقام ظہر اور مسقطِ فرض ظہر نہ ہوگا" اب امام صاحبؒ نے دیکھا کہ صحت جمعہ فی المدن مع وجود الامام او نائبہ مجمع علیہ ہے، اس لئے یہ جمعہ ضرور قائم مقام فرض ظہر اور مسقطِ ظہر ہے اور صحتِ جمعہ فی القریٰ یا فی المدن بلا امام یا نائبِ امام مشتبہ ہے، اس لئے انھوں نے فرمایا کہ یہ جمعہ مسقطِ فرضِ ظہر نہیں ہے، اور جب وہ مسقطِ فرضِ ظہر نہیں تو جائز بھی نہیں، لان الجمعۃ الغیر المسقطۃ للظہر لم یعرف مشروعیتہا، پس یہ مبنیٰ ہے ان کے اس حکم کا کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، اور نہ اُن شہروں میں جن میں امام یا نائبِ امام نہ ہو، سو یہ بات ایسی نہ تھی کہ امام الائمہ کو نشانۂ ملامت بنایا جاتا، بلکہ درحقیقت اپنی اس وقت فہم اور کمال توسع

واحتیاط پر آفرین کے مستحق تھے، مگر خدا برا کرے جہالت اور تعصب کا کہ انھوں نے امام صاحبؒ کے کمالات کو عیوب بنادیا، لیکن اگر ہم اس وقت فہم سے بھی قطع نظر کریں اور صرف آثار ہی کو پیش نظر رکھیں تب بھی امام صاحب ہی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، کیونکہ حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ کی روایات سے بہایت صحت اور صفائی کے ساتھ اشتراطِ امصار و مُدن ظاہر ہے، برخلاف اس کے جو آثار انکے مقابلہ میں پیش کئے جاتے ہیں، ان سے عدمِ اشتراط اس صفائی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً وہ جواثی والی روایت سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں قریہ کا لفظ محلِ کلام ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد گاؤں ہے ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد مطلق بستی ہے چنانچہ تمام قرآن میں یہ لفظ مطلق بستی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، لہذا یہ روایت وضاحت میں حضرت علیؓ وحذیفہؓ کے برابر نہیں،

اسی طرح وہ الجمعۃ واجب علی کل مسلم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کے معنی واجبہ بشرائطہ ہیں، لہذا یہ روایت بھی مفید مدعا نہیں، نیز وہ حضرت عمرؓ کے قول جمعوا حیثما کنتم سے استدلال کرتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ اس میں خطاب ولاۃ کو ہے نہ کہ عوام کو، نیز اس میں اتنا عموم مراد نہیں جتنا کہ وہ مراد لیتے ہیں، کیونکہ مجتہدین کے نزدیک صحاری وبحار وغیرہ مستثنیٰ ہیں اور غیر مقلدین کے نزدیک اراضی مغصوبہ ومقامات نجسہ وغیرہ مستثنیٰ ہیں، پس جبکہ یہ لفظ اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، تو اس کے عموم سے استدلال صحیح نہیں، پس جبکہ یہ اور اسی قسم کی روایات وضاحت میں حضرت علیؓ وحذیفہؓ کی روایات کو ترجیح ہوگی، کیونکہ جو لوگ اشتراطِ مصر کے قائل ہیں اُن کے قول کا مبنیٰ علم بالدلیل ہے، اور جو لوگ اشتراط کے قائل نہیں ان کے قول کا مبنیٰ عدم علم بالدلیل ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون، اور اگر ترجیح بھی ثابت نہ ہو تو غایت درجہ مساوی ہوں گی، اور مساوات کی صورت میں صحت وعدمِ صحتِ جمعہ مشکوک ہوجائے گی، اور اس سے فرضِ ظہر ساقط نہ ہوگا، اور جب فرضِ ظہر ساقط نہ ہوا تو یہ جمعہ مشروع نہ ہوگا، لان الجمعۃ ما شرعت الا مسقطۃ لفرض الظہر، وہذہ لیست بمسقطۃ فلا تکون مشروطۃ، اور اگر بالفرض مخالفین ہی کے دلائل کو ترجیح ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے تو غایت ما فی الباب یہ کہ گاؤں میں جمعہ فرض ظنی ہوگا اور اس لئے وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہوسکے گا، وہو المدعی،

پس اس مقدمہ میں تو فیصلہ امام صاحب کے موافق رہا، اب رہا دوسرا مقدمہ یعنی



اشتراطِ امام یا نائبِ امام کا مسئلہ، سو ابوسعید خدریؓ کی حدیث مرفوع اور ابوہریرہؓ وجعفرؓ عمرؓ کا سوال وجواب اور مولیٰ سعید بن العاصؓ اور ابن عمرؓ کے سوال وجواب اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا عدی بن عدی کو حکم یہ تمام امور دلیلِ اشتراط ہیں، اور نافینِ اشتراط کے پاس کوئی دلیلِ نفیِ اشتراط پر نہیں، اور اگر ہو بھی تو پھر اس میں یہی بحث ہے کہ اشتراط مبنیٰ ہے علم بدلیل الاشتراط پر اور نفی کا مبنیٰ عدم علم بالاشتراط ہے، وہل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون اور اگر ہم تعارض بھی مان لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ عدم امام یا نائب کی صورت میں صحتِ جمعہ مشکوک ہوگی اور بصورتِ رجحان دلائل مخالفین جمعہ بدونِ امام فرض ظنی ہوگا، جس کو واجب کہتے ہیں، اور واجب فرضِ قطعی کے قائم مقام نہ ہوسکے گا، پس یہ مقدمہ بھی امام صاحبؒ کے موافق طے ہوا اور ثابت ہوا کہ امام صاحبؒ کا مسلک ہر طرح صحیح ہے، اور ہرگز قابلِ اعتراض نہیں،

یہ گفتگو تو اغیار سے متعلق تھی، اب ہم کچھ اتباعِ امام صاحبؒ کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں، اچھا سنئے، امام صاحبؒ نے دلائل کے ذریعہ سے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا صحتِ جمعہ کے لئے دو۲ شرطیں لگائی تھیں؛ اوّل مصر، اور دوسری امام یا نائبِ امام، اور یہ دونوں مستقل اور علیحدہ شرطیں تھیں، لیکن مقلدین نے اپنے اجتہاد سے دونوں شرطوں کو حذف کر دیا، کیونکہ انھوں نے کہا کہ امام یا نائبِ امام کی شرط محض انتظامی ہے، اور یہ شرط صرف اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ تقدیم وتقدم میں تنازع نہ ہو، اب اگر یہ مقصد کسی اور طریق سے پورا ہوجائے تو پھر امام یا نائبِ امام کی ضرورت نہیں،

نیز انھوں نے کہا کہ اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہاں وہ اقامتِ جمعہ کرسکتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مصر کی شرط فی نفسہ ضروری نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ عادتاً امام یا نائبِ امام شہر ہی میں موجود ہوتا ہے، پس اگر امام کسی گاؤں میں موجود ہو تو وہ بھی حکماً شہر ہے، پس جبکہ نہ مصر مقصود بالذات ہوا اور نہ امام یا نائبِ امام، بلکہ شہر مطلوب ہوا امام یا نائبِ امام کے لئے اور امام مطلوب ہوا انتظام کے لئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر گاؤں میں تنازع کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ آجکل ہے تو اس میں جمعہ جائز ہے، اور اگر کسی شہر میں اندیشۂ فساد ہو جیسا کہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ شہروں میں ہندو مسلم فساد یا کوئی دوسرا ہڑبونگ ہو تو وہاں جمعہ جائز نہیں، لفواتِ الشرط وہو الانتظام، لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر امام کا یہی مطلب

ہوتا جو یہ مقلدین بیان کرتے ہیں تو ان کو مصر اور امام یا نائب امام کی علٰحدہ علٰحدہ شرطیں لگانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف شرطِ امن عن التنازع کافی تھی، اور جبکہ انھوں نے یہ شرط نہیں کی بلکہ مصر کو علٰحدہ شرط کیا اور امام یا نائبِ امام کو الگ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں شرطیں فی نفسہ مطلوب ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر شہر میں امام یا نائبِ امام نہ ہو جیسا کہ ہندوستان میں تو جمعہ جائز نہیں، لفوات الشرط الثانی، اور اگر گاؤں میں امام ہو تو وہاں بھی جمعہ جائز نہیں لفوات شرط الاول، اور اگر گاؤں میں امام یا نائبِ امام نہ ہو تب بھی جمعہ جائز نہیں لفوات الشرطین، پس ثابت ہوا کہ امام صاحبؒ کے مذہب کو غیر مقلدین تو کیا خود مقلدین بھی نہیں سمجھے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کے مذہب کے موافق ہندوستان میں شہروں میں جمعہ صحیح ہے اور نہ گاؤں میں، اور دوسرے ائمہ کے نزدیک شہروں میں بھی صحیح ہے، اور گاؤں میں بھی، اور چونکہ اس وقت رواج عام کی وجہ سے امام صاحبؒ کے مذہب پر عمل ناممکن ہے اور اس کی دعوت دینے میں شدید فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے موجودہ رواج کو جائز قرار دیا جاویگا اور یوں کہا جاویگا کہ ہم بضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذہب پر جمعہ پڑھتے ہیں، اور جبکہ مقلدین خود دوسرے ائمہ کے مذہب پر عمل کر رہے ہیں، تو جو لوگ دوسرے ائمہ کے مذہب کے موافق گاؤں میں جمعہ پڑھتے ہیں اُن پر تشدد نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر کوئی امام صاحب پر طعن کرے اس کا جواب ضرور دیا جاوے،

نیز چونکہ موجودہ جمعے دوسرے ائمہ کے مذہب پر صحیح ہیں، اس لئے ظہر احتیاطی کی ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی امام صاحبؒ کے خلاف سے بچنے کے لئے پڑھ لے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں، اور غیر مقلدین کا فرض ہے کہ وہ امام صاحبؒ کے مقلدوں کو اپنے مسلک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں، کیونکہ اگر اُن کے حقِ اجتہاد تسلیم کر لیا جاوے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اُن کو کسی امام کی تقلید کے لئے مجبور نہ کیا جاسکے گا، لیکن اُن کو یہ حق کسی طرح نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنی تقلید پر مجبور کریں، سلف کا طریقہ یہ تھا کہ فتنہ کے موقع پر خود اپنے اجتہاد کو چھوڑ دیتے تھے نہ یہ کہ وہ اپنے اجتہاد کی اس طرح تبلیغ کریں جس سے شدید سے شدید فتن کا صرف خطرہ ہی نہ ہو، بلکہ ان کا مشاہدہ ہو رہا ہو، خدا کے لئے اُمتِ مرحومہ پر رحم کرو اور اپنے اجتہادات کو (بشرطیکہ ان کو اجتہادات کہا جاسکے) اجتہادات ہی کی حد میں رکھو اور ان کو وحی قطعی کا مرتبہ نہ دو، امید ہے کہ آپ میرے



مخلصانہ مشورہ پر غور کر کے اس کی قدر کریں گے، وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ،

## جوابِ از خانقاہ امدادیہ ملاحظہ فرمودہ حضرت اقدس دام مجدہم،

اقول وباللہ التوفیق، اشتراط مصر وسلطان پر جو استدلال کیا ہے وہ بظاہر بہت عمدہ ہے اور احقر نے بہت روز ہوئے کسی کے کلام میں دیکھا بھی ہے، مگر غور کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے دونوں مقدموں پر کلام ہو سکتا ہے، پہلا مقدمہ یعنی جمعہ کے روز اصالۃً ظہر فرض ہے، اور جمعہ اس کا قائم مقام، یہ امام صاحبؒ اور امام ابی یوسفؒ کے قول پر تو صحیح ہے، مگر امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جمعہ اصل ہے، اور ظہر بدل، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے، لا ادری ما اصل فرض الوقت فی ہذا الیوم ولکن یسقط الفرض عنہ باداء الظہر والجمعۃ قال شمس الائمۃ فی المبسوط یرید بہ ان اصل الفرض احدہما لا بعینہ یتعین بفعلہ (ص ۳۳ ج ۲) اور مختلف فیہ مقدمہ سے خصم پر حجت قائم نہیں ہو سکتی، البتہ فی نفسہ اثباتِ مذہب کے لئے یہ مقدمہ کار آمد تھا، اگر دوسرا مقدمہ مخدوش نہ ہوتا، لیکن دوسرے مقدمہ میں یہ شبہ ہے کہ کچھ شرائطِ جمعہ ایسے بھی ہیں جو دیگر ائمہ نے لئے ہیں، مگر امام صاحبؒ نے نہیں لئے، مثلاً تعدادِ جماعت میں اختلاف ہے، امام صاحبؒ نے تین مقتدی ہونا کافی سمجھا ہے، حالانکہ دوسرے ائمہ اس پر متفق نہیں، پس اس تقریر سے لازم آتا ہے کہ امام صاحبؒ کا قول تعدادِ جماعت کے بارے میں معتبر نہ ہو، کیونکہ وہ مجمع علیہ نہیں، اسی طرح تعددِ جمعہ مختلف فیہ ہے، اس تقریر پر تعددِ جمعہ کو شرط کہنا ضروری ہے، حالانکہ امام صاحب علیہ الرحمۃ کا مذہب صحیح جو متونِ معتبرہ میں موجود ہے، اس کی بناء پر تعددِ جمعہ علی الاطلاق درست ہے،

اس کے بعد آثار میں سے اثر علی وحذیفہ رضی اللہ عنہما کو ترجیح کی وجہ جو بیان کی ہے وہ بالکل صحیح ہے، مگر معارضہ تسلیم کرنے کی صورت میں جو یہ لکھا ہے "جو لوگ اشتراط کے قائل ہیں اُن کے قول کا مبنیٰ علم بالدلیل ہے اور جو لوگ قائل نہیں ان کے قول کا مبنیٰ عدم علم بالدلیل ہے"، یہ محل تامل ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مسئلہ میں مثبت شرطیت وقائل فرضیت کا قول معتبر ہو، حالانکہ ایسا نہیں، مثلاً فاتحہ خلف الامام کو جو حضرات فرض کہتے ہیں اس تقریر پر ان کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے، درحقیقت ہر دو فریق علم رکھتے ہیں تمام دلائل کا مگر ایک فریق اس دلیل کو کافی خیال کرتا ہے دوسرا کسی وجہ

سے اس کو ناکافی قرار دیتا ہے، واللہ اعلم،

اور بعد ازاں جمعہ ظنی الثبوت کو اس بنا پر جو رد کیا ہے کہ وہ فرض قطعی یعنی ظہر کے قائم مقام نہ ہو سکے گا اس میں بھی کلام ہے، اول تو اس لئے کہ یوم جمعہ میں ظہر کا اصل ہونا قطعی نہیں کیونکہ مختلف فیہ، دوسرے اس لئے کہ امام صاحبؒ کے قول پر بھی تو بعض جگہ ظنی جمعہ جائز ہے جس کی دو مثالیں اوپر گذر چکیں، پھر وہ مسقط وقائم مقام ظہر کیسے ہو جاتا ہے،

یہ گفتگو تو تقریر استدلال کے متعلق تھی، اب دوسرے جزو کی بابت عرض ہے وہ یہ کہ وہ فقہاء متقدمین پر جو ترکِ تقلید کا شبہ کیا گیا ہے وہ مبنی ہے اس پر کہ تمصر قریہ بوجود الامام او نائبہ اور نیز نصب الخطیب من العامہ للضرورۃ کو تخریج فقہاء سمجھا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ پہلا مسئلہ خود جامع صغیر میں موجود ہے، ونصہ ہذا فی الجمعۃ بمنیٰ ان کان الامام امیر الحجاز او کان الخلیفۃ مسافرا جمع وان کان غیر الخلیفۃ وغیر امیر الحجاز وہو مسافر فلا جمعۃ فیہا وقال محمدؒ لا جمعۃ بمنا ولا جمعۃ بعرفات فی قولہم جمیعًا اھ

اور دوسرا مسئلہ امام محمدؒ سے منقول ہے کما صرح بہ فی المبسوط (ص ۳۴ ج ۲) اور شیخینؒ کا اس میں کسی نے اختلاف بیان نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اتفاق ہوگا یا کم از کم اختلاف کی نوبت نہ آئی ہوگی، یعنی امام صاحب کے وقت میں یہ مسئلہ مسکوت عنہ رہا ہو، بعد میں بوقت ضرورت امام محمد رحمہ اللہ نے ظاہر فرمایا ہوگا، اور شیخینؒ سے جو امام یا اس کے نائب کی ضرورت اقامتِ جمعہ کے لئے اطلاق کے ساتھ مروی ہے وہ اطلاق اس روایتِ محمدؒ کے معارض نہیں، کیونکہ اطلاق کو "بلا ضرورت" کے ساتھ مقید کر سکتے ہیں، اور جہاں کوئی والی نہیں وہاں ضرورت ہے اس لئے اس کا حکم جدا ہو جانا بعید نہیں، اسی واسطے درمختار نے کہا ہے نصب العامۃ الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر اما مع عدمہم فیجوز للضرورۃ، اس میں دونوں روایتوں کی رعایت موجود ہے، اور یہی تفصیل قرینِ قیاس ہے، کیونکہ حکام وولاۃ کی موجودگی میں عوام کو اس قسم کا اختیار دینا بالکل نامناسب ہے، اور جب حکام نہیں تو ان کو خود اپنا انتظام کرنا لابدی ہے، کما لایخفی بعد ادنیٰ تأمل،

بہرحال یہ مسئلہ بھی مشائخ وفقہائے متاخرین کی تخریج نہیں پس ان پر اجتہاد و ترکِ تقلید کا الزام نہیں ہو سکتا، البتہ نفسِ مسئلہ پر اشکال متوجہ رہا جو باعث ہوا تھا الزام کا



سو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے مسئلہ کو یعنی تمصر قریہ بالامام کو عام سمجھ کر یہ اشکال پیش آیا، حالانکہ فقہاء کرام کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ ہر قریہ اس حکم میں نہیں بلکہ وہی قریہ ہے جس میں دوسری اوصافِ شہریت بھی موجود ہوں، چنانچہ درمختار میں ہے وجازت الجمعۃ بمنیٰ فی الموسم فقط لوجود الخلیفۃ او امیر الحجاز او العراق او مکۃ ووجود الاسواق والسکک وکذا کل ابنیۃ نزل بہا الخلیفۃ، اس میں صرف خلیفہ وغیرہ کے وجود کو کافی نہیں کہا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وجود اسواق وسکک کو بھی اس میں دخل ہے، اور اس سے زیادہ صریح فتح القدیر میں ہے ثبوت ولایۃ الاقامۃ للجمعۃ ہو المصحح بعد کون المحل صالحًا للتمصیر (الی قولہ) بخلاف ما اذا کان المحل غیر صالح للتمصیر فلذا قالوا اذا سافر الخلیفۃ فلیس لہ ان یجمع فی القریٰ کالبراری اھ (ص ۲۶ ج ۲)

اور تمصر قریہ کے لئے وجود سلطان کے ساتھ قابلِ تمصیر کی قید معلوم ہونے کے بعد وہ اشکال کسی طرح واقع نہیں ہو سکتا جو اس تحقیق میں فاضل محقق دام فضلہم نے وارد کیا ہے،

اس مختصر عرض سے واضح ہو گیا کہ بلادِ ہند وغیرہ کے شہروں میں جمعہ پڑھنا عین مذہب احناف کے مطابق ہے، اس میں دوسرے ائمہ کا مذہب حنفیہ نے ہرگز اختیار نہیں کیا، ورنہ دوسرے شرائطِ ضروریہ کی رعایت کا حکم بھی دیا جاتا، مثلاً چالیس مقتدی کا قابلِ امامت ہونا، کیونکہ مذہبِ غیر اختیار کرنے کے واسطے استجماع شرائط لازم ہے، اور جب یہ واضح ہو گیا تو معلوم ہو گیا کہ جمعہ فی القریٰ کی ممانعت میں ڈھیلا ہونے کا مشورہ قابلِ قبول نہیں،

ایک بات قابلِ گذارش یہ بھی ہے کہ ترکِ جمعہ میں کوئی تکلیف اور حرج پیش نہیں آتا جو مسوغ ہے خروج عن المذہب کا، اس لئے اگر مذہب حنفیہ میں امصارِ ہند محلِ جمعہ نہ ہوتے تو اس باب میں دیگر ائمہ کا مذہب اختیار کرنے کی گنجائش ہوتی، پس اس کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ گو امصارِ ہند میں مذہب غیر لینے کی نوبت نہ آئی ہو مگر جمعہ فی القریٰ میں لیلیا جاوے، واللہ اعلم، احقر عبدالکریم از خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون ۱۰ ربیع الثانی ۵۳ھ

آبادی متفرقہ منفصلہ کے مجموعہ میں وجوب جمعہ کی ایک صورت کا حکم

## سوال (۵۶)

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . موضع بسی ایسی بستی ہے کہ جو قریبًا ساڑھے تین سو برس سے آباد ہے، اور پٹھانوں کی آبادی ہے، بفضلہ اس بستی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کے اندر سے گیارہ موضع اور جداگانہ پٹھانوں نے آباد کئے، جسکو قریبًا تین سو برس کا زمانہ ہو چکا ہے، اور ان مواضعات کے اسماء جداگانہ کاغذات سرکاری میں درج ہیں اور

عوام الناس میں مشہور ہیں، اور موضع بسی سے مواضعات بلڑہ و بلڑی قریب قریب ایک ایک فرلانگ کے فاصلہ پر آباد ہیں، اور یہ ہر دو مواضعات بسی ہی میں سے جدا ہو کر آباد ہوئے ہیں، بلکہ بلڑی میں دو ہزار کی مردم شماری خود ہے، اور اس میں سے ایک اور گاؤں تھوڑی عرصہ سے جدا ہو کر آباد ہوا ہے، جو نیا گاؤں کے نام سے مشہور ہے، جس کی مردم شماری پانچسو کی ہے، و نیز دیگر مواضعات آدم پور و کمال پور قریب ایک ایک میل کے فاصلہ سے موضع بسی کے آباد ہیں، اور یہ بھی ۳ و ۴ اسی موضع بسی کے اندر سے نکل کر آباد ہوئے ہیں، موضع بسی میں مستقل بازار دوکان پرچون و حلوائی و بزاز و قصائی و لوہار بھی موجود ہیں، اور جس وقت یہاں بسی میں اذان ہوتی ہے تو مواضعات بلڑہ و بلڑی میں بخوبی آواز پہونچتی ہے اور اس بسی میں ایک بازار ہفتہ وار بھی لگتا ہے، جس میں مویشیاں اور دوکان قرب و جوار کی آتی ہیں، مثلاً حلوائی، بزاز، قصاب جو لحم فروخت کرتے ہیں اور بکر قصاب و سبزی و پنساری لوہے کی چیزیں، لکڑی کی چیزیں، بساتی، جوتوں والے، تیل، غلہ، گھی، برتن، رنگی ہوئی کھالیں و بلا رنگی ہوئی، مسلمان بھٹیار کی دوکان، ہندوؤں کا کھانا، پان والوں کی دکانیں، سوت، سناروں کی دوکانیں، جن پر بنا بنایا زیور ملتا ہے، پٹوری یعنی زیور بلنے والوں کی دوکانیں اور اس موضع میں ایک سرپنچ منجانب گورنمنٹ اہلِ ہنود بھی مقرر ہے، جو مقدمہ طے کرتا ہے، اور مردم شماری اس وقت سات سو کے قریب ہے، البتہ موضع بلڑی کی مردم شماری دو ہزار ہے اور بلڑہ کی مردم شماری پانچسو ہے،

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ جیسے اس موضع بسی میں قدیم الایام سے جمعہ و نماز عیدین ہوتی چلی آرہی ہیں کیا یہ جائز ہیں؟ اور یہ بھی دریافت طلب ہے کہ قصبہ شاہ پور موضع بسی سے ایک میل کے فاصلہ پر آباد ہے اور وہاں جمعہ ہوتا ہے، مردم شماری قصبہ قریباً چار ہزار کی ہے، بمقابلہ قصبہ مذکور موضع بسی میں نماز عیدین و جمعہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ۱۸ر شوال ۴۸ھ

**تنقیح**: (۱) مجھ سے جس وقت میں بسی گیا تھا، زبانی یہ بھی کہا گیا تھا کہ موضع بسی کے حدود میں بلڑی کے مکانات کا سلسلہ آگیا ہے، اسی طرح بسی کے مکانات سے ایک جانب میں بلڑہ کے مکانات کا سلسلہ مل گیا ہے، سوال میں یہ بات ظاہر نہیں کی گئی، اگر یہ صحیح ہے تو اس کو ظاہر کرنا چاہئے؟

(۲) مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ جس جگہ بسی کا مدرسہ ہے وہ موضع ہے بلڑی کا حصہ ہے؟



اور اس کو بھی عرفاً بلڑی میں شمار کیا جاتا ہے، اور سرکاری کاغذات میں مدرسہ بسی کا کہلاتا ہے، اس کو بھی سوال میں ظاہر نہیں کیا گیا، فقط ظفر احمد عفا عنہ ۲۴ر شوال ۴۸ھ۔

**جواب تنقیح**: حضرت مفتی دین شرع متین گزارش بابت تنقیح یہ ہے کہ فی الواقع موضع بسی کے حدود میں بلڑی کی آبادی کئی بیگہ بڑھ گئی ہے، اور اب بوجہ اس کے بڑھنی بند ہو گئی ہے کہ بسی کی جانب اب تالاب ہے، اور وہ رکاوٹ تعمیرِ مکانات پیدا کر رہا ہے، یہ تالاب بسی کی آبادی کے پچاس قدم فاصلہ پر بلڑی کی جانب واقع ہے اور بلڑہ کی آبادی بسی سے نہیں ملی، بلکہ خود بسی کی آبادی بلڑہ کے گوڑہ سے اور کچھ صحرا بلڑا سے مل گئی ہے، اور گوڑہ کا بھی آبادی کے کاغذات سے تعلق ہوتا ہے،

(۲)، موضع بسی میں کوئی مدرسہ سرکاری اسلامیہ نہیں ہے، البتہ پہلے جس کو عرصہ پانچ ماہ کا ہوا، اسلامی تعلیم ایک معلم بچوں کو ...... دیا کرتے تھے، باقی موضع بلڑہ میں مدرسہ سرکاری درجۂ تین تک مقرر ہے، اور موضع بلڑی میں سے جو مزرعہ نکل کر آباد ہوا ہے جس کا نام نیا گاؤں عرف گوکل گڈھ ہے اس میں ایک مدرسہ میڈل جماعت تک سرکاری کھلا ہوا ہے، اور خود بلڑی میں مدرسہ امدادی قائم تھا، مگر اب نہیں ہے، اور نیا گاؤں بلڑی ہی کا مزرعہ ہے، باقی نئے گاؤں کے نام کوئی صحرائی نہیں ہے، نیا گاؤں جو ہے اس میں ایک کارخانہ کو لھو ایکھ پیڑنے کا بھی ہے، جہاں پر چرخیاں کثرت سے ملتی ہیں اور دیگر حلوائی اور پنساری و لوہے کی دوکان بھی ہے، بلڑے میں بھی مستقل بازار ہے، پنساری، بزازہ و پرچون و لوہار اناج و غلہ و جولاہے کی دوکان جو کہ کپڑا بنتا ہے موجود ہیں،

**الجواب**: میرے نزدیک بسی اور بلڑہ بلڑی کا مجموعہ ایک ہی بستی ہے بوجہ اتصال حسی کے، گو کسی وجہ سے نام الگ الگ ہوں، اس لئے میں ان تینوں کو ایک گاؤں قرار دے کر ان میں جمعہ جائز سمجھتا ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم، ۵ر ذیقعدہ ۴۸ھ

گاؤں میں جمعہ کا حکم

**سوال (۵۷)** زید ایک گاؤں کا باشندہ ہے، گاؤں کے دیگر مسلمان اس کی دینی معلومات اور علمی قابلیت کی وجہ سے اس کو اپنے مقابلہ میں بمنزلہ عالم کے سمجھتے ہیں اور وہ حضرت والا کا معتقد ہے، اس کے گاؤں میں نمازِ جمعہ و عیدین ہوا کرتی ہے، زید کبھی گاؤں میں حاضر رہتا تو وہی نمازِ جمعہ و عیدین پڑھایا کرتا تھا، کچھ عرصہ سے زید نے حضرت والا کا یہ فتویٰ دیکھ کر کہ گاؤں میں نمازِ جمعہ و عیدین درست نہیں، نمازِ جمعہ و عیدین پڑھنا پڑھانا

چھوڑ دیا ہے، مگر بخیالِ فتنہ دوسروں کو پڑھنے سے منع نہیں کرتا ہے، اور وہ لوگ برابر پڑھا کرتے ہیں، مگران کو یہ امر ناگوار گذرتا ہے کہ زید سا شخص جو علمِ دین سے نسبتۃً زیادہ واقفیت رکھتا ہے نمازِ جمعہ وعیدین کیوں نہیں پڑھتا و پڑھاتا ہے، بعض لوگ زید کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نماز پڑھائے، کیونکہ قرب وجوار کے دیہات کے لوگ بھی نماز عیدین کو اس کے گاؤں میں آیا کرتے ہیں، ورنہ یہ لوگ آنا بند کر دیں گے، اور دوسرے بھی جو کم از کم جمعہ یا عیدین کی نماز پڑھا کرتے ہیں وہ بھی چھوڑ دیں گے، پس ایسی صورت میں نمازِ جمعہ یا عیدین زید کا نہ پڑھنا اور نہ پڑھانا شرعاً کیسا ہے، کیونکہ زید اپنے پیشوا (یعنی حضرت والا کے) کے فتوے کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا ہے،

(۲) یا لوگوں کے اصرار یا انتشار کے خیال سے زید کو بھی نمازِ جمعہ وعیدین پڑھنا و پڑھانا چاہیے؟

**الجواب:** اگر اس گاؤں کی آبادی تین چار ہزار سے کم ہے اور وہاں تمام ضروریات معاش نہیں ملتیں تو وہاں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں، پس اس صورت میں زید کو وہاں جمعہ وعیدین نہ پڑھنا چاہیے، اور جو لوگ پڑھتے ہیں اُن سے منازعت اور جھگڑا بھی نہ کرنا چاہیے، ہاں نرمی سے عقلاء کو سمجھا دیا جائے کہ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں جمعہ وعیدین کی نماز درست نہیں اس لئے میں نہیں پڑھ سکتا، اور میری خواہش یہ ہے کہ آپ لوگ بھی نہ پڑھیں، تاکہ گناہ سے بچ جائیں، آئندہ تم کو اپنے فعل کا اختیار ہے اور اگر نرمی سے کہنے میں بھی فتنہ کا اندیشہ ہو، تو اُس سے بھی احتراز کیا جائے، صرف اپنے عمل کو درست کر لیا جائے، واللہ اعلم، ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ

| حضرت نانوتوی رح کے ایک فتوے سے جوازِ جمعہ فی القریٰ کے شبہ کا ازالہ اور شہروں میں احتیاطِ ظہر کا حکم |
|---|

**سوال** (۵۸) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ فیوضِ قاسمی میں درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جمعہ حتی الوسع شہروں میں قائم کرنا چاہئے، اور ظہر بھی ضرور پڑھنا چاہئے، اور اگر کوئی شخص گاؤں میں جمعہ قائم کرے اس سے دست و گریبان نہ ہونا چاہئے، اس سے جواز جمعۃ فی القریٰ ثابت ہوتا ہے، احناف کو اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں، علماءِ احناف کی جواز جمعہ فی القریٰ مع التزام احتیاطِ ظہر کیا رائے ہے؟

**الجواب:** حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا



حاصل صرف یہ ہے کہ چونکہ دیہات میں جمعہ کا صحیح ہونا نہ ہونا ائمہ میں مختلف فیہ ہے، اس لئے حنفیہ کو اس میں دوسرے مذہب کے لوگوں سے جھگڑنا نہ چاہئے، اور واقعی مسائل مجتہد فیہا میں جھگڑنا مناسب نہیں، مگر مولانا کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حنفیہ کو دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز ہے، کیونکہ جب اُن کے مذہب میں جمعہ فی القریٰ صحیح نہیں تو اُن کو ایسا کرنا کب جائز ہے،

رہا شہروں میں جمعہ کے ساتھ ظہر پڑھنے کا حکم یہ اس وقت کا ہے جبکہ ہندوستان میں شرطِ سلطان فوت ہونے کی وجہ سے صحتِ جمعہ میں علماء کو اختلاف تھا، کہ یہاں کے شہروں میں بھی جمعہ صحیح ہے یا نہیں، بعض لوگ اس وجہ سے شہر میں بھی جمعہ کو صحیح نہ مانتے تھے، اور بعض شہر میں بھی جمعہ کے ساتھ احتیاطِ ظہر پڑھتے تھے، ہمارے اکابر نے اس کو رد کیا، اور عام اہلِ اسلام کو قائم مقام سلطان کے فرمایا، مگر مولانا محمد قاسم صاحب رح جمعہ کے ساتھ احتیاطِ ظہر کو بہتر سمجھتے تھے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فسادِ عقیدہ عوام کی وجہ سے اس کو منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب امصار میں جمعہ دلیل سے صحیح ہے تو ہندوستان کے شہروں میں جمعہ وعیدین درست ہیں احتیاطِ ظہر کی ضرورت نہیں، بلکہ فسادِ عقیدۂ عوام کے انسداد کے لئے احتیاط ظہر سے شہروں میں اور جمعہ قائم کرنے سے دیہات میں سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح کی یہ تحریر بطور فتوے کے نہیں، بلکہ علل احکام سے بحث کے طور پر ہے، جیسا کہ اس کے مطالعہ سے واضح ہے، اور عالم کا فتویٰ تو عوام کے حق میں حجت ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کی بحث اور تدقیق ردّ المحتار میں تصریح ہے کہ ابن الہمام کی ابحاث حجت نہیں، کیونکہ وہ عالمانہ گفتگو ہوتی ہے، نہ کہ فتویٰ اور فیصلہ محرم

| اذن الحاکم بالجمعۃ یبقی بعد موتہ او عزلہ ام لا |
|---|

**سوال** (۵۹) ایک موضع میں صحتِ جمعہ کے متعلق اختلاف ہو رہا ہے، مگر اس موضع میں قدیم زمانہ کی شاہی جامع مسجد موجود ہے، جس کے لئے شاہی فرمان سے خطیب و امام کا تقرر بھی ہوا ہے، اس صورت میں یہ موضع جمعہ کے لئے صالح ہے یا نہیں؟ اس جگہ جمعہ اب تک ہو رہا ہے، کبھی منقطع نہیں ہوا، آبادی دو ہزار سے زیادہ ہے، بازار باقاعدہ متصل نہیں؟

**الجواب:** فی الدر عن القہستانی اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعۃ اتفاقا علی ما قالہ السرخسی واذا اتصل بہ الحکم صار مجمعا علیہ فلیحفظ اھ قال الشامی عن فتاوی الدیناری اذا بنی مسجد (ای جامع)

فی الرستاق بامر الامام فہو امر بالجمعۃ اتفاقا علی ما قال السرخسی اھ والرستاق القری کما فی القاموس وظاہر ما مر عن القہستانی ان مجرد امر السلطان او القاضی ببناء المسجد واداءھا فیہ حکم رافع للخلاف بلا دعوی وحادثۃ، وفی قضاء الاشباہ امر القاضی حکم وافتی ابن نجیم بان تزویج القاضی الصغیرۃ حکم رافع للخلاف لیس لغیرہ نقضہ اھ (ص ۸۳۶ ج ۱) قلت ومثل ھذا الحکم الذی لا یجوز لغیرہ نقضہ لا یبطل بموت الحاکم کما لا یخفی فلما کان حکم الحاکم رافعا للخلاف الذی کان بین الحنفیۃ والشافعیۃ فی صلاحیۃ الموضع للجمعۃ وصار الموضع بحکمہ صالحا للجمعۃ اتفاقا یصح اداء الجمعۃ فیہ واللہ تعالیٰ اعلم، صورتِ مسئولہ میں اس موضع میں جمعہ درست ہے، بلکہ لازم ہے۔

قلت وقد تردد سیدی حکیم الامۃ فی بقاء مثل ھذا الحکم بعد موت الحاکم فلیتأمل ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا، ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ رج ۱۳۵۵ھ

نوٹ: پھر یہ فتویٰ تحقیق کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی بھیجا گیا تو حسبِ ذیل جواب آیا اور وہی جواب صحیح ہے، میں اپنے پہلے قول سے رجوع کرتا ہوں، ظفر احمد

قال العلامۃ ابن عابدین علی قول الدر المختار "اذن عام" ای لکل خطیب ان یستنیب لا لکل شخص ان یخطب فی ای مسجد اراد (ج) اقول لکن لا یبقی الی الیوم الاذن بعد موت السلطان الاذن بذلک الا اذا اذن بہ ایضا سلطان زماننا نصرہ اللہ تعالیٰ کما بینتہ فی تنقیح الحامدیۃ وسنذکر فی باب العیدین عن شرح المنیۃ ما یدل علیہ ایضا فتنبہ رد المحتار ص ۸۴۲ ج ۱ باب الجمعۃ وقال فی باب العیدین وما ذکروا من عمل العامۃ بقول ابن عباس لامر اولادہ من الخلفاء بہ کان فی زمنہم اما فی زماننا فقد زال فالعمل بما ہو المذہب عندنا کذا فی شرح المنیۃ وذکر فی البحر ان الخلاف فی الاولویۃ ونحوہ فی الحلیۃ،

---

عہ لم اجدہ فی المبسوط فی باب الجمعۃ وقال الطحطاوی علی ھذا القول بالذی فی القہستانی ابو القاسم اھ فالظاہر انہ تصحیف من الکاتب ثم رأیت القہستانی نفسہ فی آخر عبارۃ فتاوی الدیناری علی ما قال السرخسی کما نقلہ الشامی ۱۲ سعید احمد غفرلہ



(تنبیہ) یؤخذ من قول شرح المنیۃ کان فی زمنہم الخ ان امر الخلیفۃ لا یبقی بعد موتہ او عزلہ کما صرح بہ فی الفتاوی الخیریۃ وبنی علیہ انہ لو نہی عن سماع الدعوی بعد خمس عشرۃ سنۃ لا یبقی نہیہ بعد موتہ، واللہ تعالیٰ اعلم اھ، (ص ۱۰۸۴ ج ۱ فی تنقیح الحامدیۃ ص ۲۲۶ ج ۲ و ص ۱۰۷ ج ۱)

ان عبارات اور جزئیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے امور میں حکمِ حاکم حاکم کی موت کے بعد باقی نہیں رہتا، اور حضرت اقدس کی رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے،

بقاءِ حکم کی کوئی صریح دلیل نہ آپنے لکھی اور نہ ہم کو ملی، اور آپ نے صرف اس سے استدلال کیا ہے، کہ حاکم جو حکم کرے اس کے نقض کا کسی کو حق نہیں، یہ نقض نہ کرنا اس کی زندگی میں تو مسلم ہے، اور ہر حکم جو قواعدِ شرعیہ کے مطابق ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، بالخصوص مجتہد فیہ میں، الثالثۃ اذا قضی فی مجتہد فیہ مخالفا لمذہبہ فلہ نقضہ دون غیرہ اشباہ، ص ۳۲۱، لیکن جو احکام محض اطاعت خلیفہ کی وجہ سے قابلِ تسلیم ہوں، ان کا بقاء بعد الموت مسلم نہیں بلکہ حاکمِ جدید کو اس کے نقض کا حق ہے، جیسا کہ عبارتِ بالا سے ظاہر ہے، اور تنقیح حامدیہ ص ۲۲۶ ج ۲ پر اس کی مفصل بحث موجود ہے، اور خصوصیت سے جمعہ کے متعلق بھی فقہاء تصریح کرتے ہیں الامام اذا منع اہل المصر ان یجمعوا لم یجمعوا کما ان لہ ان یمصر موضعا فان لہ ان ینہاہم قال الفقیہ ابو جعفر ھذا اذا نہاہم مجتہدا بسبب من الاسباب واراد ان یخرج ذلک المصر من ان یکون مصرا اما اذا نہاہم متعنتا او اضرارا بہم فلہم ان یجمعوا علی رجل ان یصلی بہم الجمعۃ (بحر ص ۱۴۶ ج ۲ خلاصہ ص ۲۰۸ ج ۱)

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس جگہ کے لئے جب حکمِ شاہی جمعہ کے لئے ہوا تھا تو کیا اس وقت بھی یہی حالت تھی، سوال میں اس کی تصریح نہیں، اگر یہی حالت تھی تب تو حکمِ شاہی سے استدلال بصورت بقاء حکم بعد الموت صحیح ہو سکتا ہے، اور اگر اُس وقت اُس میں مصریت کی شان تھی، اس کے بعد ویران ہو گیا، تو کیا پھر بھی حکمِ شاہی سے اس جگہ جوازِ جمعہ کا حکم دیا جائے گا؟ بظاہر فقہاء کے کلام سے اس کی تردید معلوم ہوتی ہے، ولو ان اماما مصر مصرا ثم نفر الناس عنہ بخوف اعداء او ما یشبہ ذلک ثم عادوا الیہ فانہم لا یجمعون الا باذن مستانف من الامام، بحر ص ۱۴۶ ج ۲ عن الخلاصۃ ص ۲۰۸ ج ۱، واللہ اعلم

حررہ سعید احمد غفرلہٗ دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور،

صحیح، عبداللطیف، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ۹ر جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ

**نوٹ:** پھر یہ سوال دوسری صورت سے آیا تو جواب دوسرا دیا گیا، جو آئندہ فتاویٰ رمضان ۱۳۵۵ھ میں نقل ہے، دونوں سوالوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے میں آبادی کو دو ہزار اور بازار کو غیر متصل ظاہر کیا گیا، اور دوسرے سوال میں آبادی تین ہزار اور بازار کو متصل ظاہر کیا گیا، اور بازار میں ضروریات کے ملنے کی تصریح کی ہے، اور دونوں جوابوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے جواب میں صرف اذنِ حاکم بِبناء الجامع پر اس قریہ کو بحکمِ مصر مان کر جوازِ جمعہ کا فتویٰ دیا گیا تھا، مگر یہ بناء صحیح نہ تھی، اور دوسرے جواب میں قریہ کی حالتِ موجودہ کو قریۂ کبیرہ میں داخل مان کر فتویٰ دیا گیا ہے، اور یہ بناء صحیح ہے، پس دونوں میں تعارض کا شبہ نہ کیا جاوے،

جس جگہ کی آبادی تین ہزار سے زائد ہو اور ضروریاتِ زندگی اس میں دستیاب ہوں، اس میں جمعہ کا حکم،

**سوال** (۶۰) میرے موضع چائل کی مردم شماری ۲۶۹۷ آدمیوں کی ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ بازار لگتا ہے، پندرہ سولہ دوکانیں مستقل طور سے بازار میں روزمرہ رہتی ہیں، اور یہ سب ایک ہی لائن میں ہیں، دس بارہ ایک طرف جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اور پانچ چھ دوسری طرف جو ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں، بیچ میں دس بارہ قدم کا فرق اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ ایک مکان کا پچھواڑہ پڑتا ہے، اور آگے سڑک ہی ورنہ یہ سب مل جاتیں، یہ سب دوکانیں بازار کے نام سے موسوم ہیں، ضروریات کی ساری چیزیں مثل غلہ، کپڑا، جوتہ، لکڑی، تیل، تمباکو، چینی، گوشت وغیرہ بلا تکلف ملتی ہیں، حتیٰ کہ دوا وغیرہ بھی مل جاتی ہیں، دو طبیب مستقل طور سے گاؤں رہتے ہیں، ڈاک خانہ، سرکاری بڑا اسکول ہے، جس میں انگریزی وغیرہ بھی پڑھائی جاتی ہے، ہمیشہ سے جمعہ ہوتا چلا آیا ہے، شاہی زمانہ میں قلعہ بھی تھا، جس کے نشانات اب تک موجود ہیں، اور وہ زمین مع ایک تالاب کے شاہی نام سے مشہور ہے، جمعہ کے متعلق شاہی اسناد بھی ایک شخص کے پاس ہیں، انگریزوں کے شروع زمانہ میں تحصیل تھی، جب وہ الٰہ آباد چلی گئی، تو اسی عمارت میں تھانہ ہو گیا، بعد میں تھانہ اُٹھ کر دوسری جگہ چلا گیا، تو اس میں اسکول ہو گیا، گاؤں کے اندر سات مسجدیں ایک دوسرے سے فاصلہ پر مختلف محلات میں واقع ہیں، اور سبھوں میں

۲۷



نماز ہوتی ہے، گاؤں کے باہر بہت بڑی پختہ عیدگاہ ہے، اس کے علاوہ چار پورہ جات جن کی تفصیل حسب ذیل ہے، اسی موضع کی زمین میں واقع ہیں، ان سب کا نقشۂ خسرہ ایک ہی ہے، مجموعی مردم شماری موضع کی مع پورہ جات متعلقہ کے ۳۱۰۳ آدمیوں کی ہے، لہٰذا اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

تفصیل پورہ جات

| نام پورہ | مردم شماری | اصلی موضع سے ان کا فاصلہ | نوٹ |
|---|---|---|---|
| پورہ محمد نعیم | ۲۱۹ | تخمیناً ۳ فرلانگ | ۸ فرلانگ کا ایک میل ہوتا ہے، |
| دریاپور | ۳۴ | تخمیناً ۳ فرلانگ | |
| ڈیہا | ۸۳ | ۶ فرلانگ | |
| سرائے امام قلی | ۷۱ | ۱ میل | |

**الجواب:** صورتِ مسئولہ میں چائل قریۂ صغیرہ نہیں، بلکہ قریۂ کبیرہ ہے جس میں جمعہ بالاتفاق جائز بلکہ واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۰ رمضان ۱۳۵۵ھ

میری رائے میں بھی یہ موضع اقامتِ جمعہ کا محل ہے، اشرف علی، ۲۱ر رمضان ۱۳۵۵ھ

خطبۂ جمعہ میں تطویل مکروہ ہے

**سوال** (۶۱) بعض لوگ خطبہ کو نمازِ جمعہ سے طویل کرتے ہیں، اس کے متعلق شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے؟

**الجواب:** عن ابی وائل عن عمار قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان طول صلوٰۃ الرجل و قصر خطبتہ مئنۃ من فقہہ فاطیلوا الصلوٰۃ واقصروا الخطبۃ الحدیث رواہ مسلم ص ۲۸۶ ج ۱، وفی الدر ویسن خطبتان خفیفتان وتکرہ زیادتہما علی قدر سورۃ من طوال المفصل وعبارۃ القہستانی وزیادۃ التطویل مکروھۃ اھ (ص ۸۴۷ ج ۱) وفی مراقی الفلاح ویسن تخفیف الخطبتین قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ طول الصلوٰۃ وقصر الخطبۃ من فقہ الرجل (قال المحقق فی الفتح من الفقۃ والسنۃ تقصیر الخطبۃ وتطویل الصلوٰۃ) بقدر سورۃ من طوال المفصل ولکن یراعی الحال بما ھو دون ذلک ویکرہ التطویل من غیر قید بزمن ففی الشتاء

لقص الزمان وفی الصیف للضرر بالزحام والحر اھ (ص ۲۹۹) احادیثِ نبویہ اور تصریحاتِ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ خطبہ کو نماز سے طویل نہ کرنا چاہئے، اور یہ کہ خطبہ میں تطویل مکروہ ہے، پس اگر گاہے ایسا ہوجائے تو مضائقہ نہیں، مگر اس کا عادی ہونا مکروہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد ۲۳ رجب ۵۶ھ ۔ نعم الجواب وہو عین الصواب، کتبہ اشرف علی، ۲۳ رجب ۵۶ھ

**تحقیق کراہۃ الخطبۃ یوم الجمعۃ بغیر العربیۃ** ...... (۶۲) ہر چند کہ خطبہ جمعہ میں مضامینِ تذکیر کا ہونا متوارث ہے، جیسا حمد وتشہد وصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وترضی عن الخلفاء واہل البیت واستغفار للمؤمنین والمؤمنات کا اس میں ہونا متوارث ہے، مگر مقصود محض تذکیر نہیں، بلکہ خطبہ جمعہ میں شانِ تعبد غالب ہے جس کی ایک دلیل حضرت عمر وابن مسعود رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد ہے، انما جعلت الخطبۃ موضع الرکعتین من فاتتہ الخطبۃ صلی اربعًا (اعلاء السنن، ص ۷۳ ج ۸ وذکرت ہناک معنی فوت الخطبۃ فلیراجع)

دوسری یہ کہ باتفاقِ علماء آیت اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون ہ کا نزول ترکِ قرأت خلف الامام وانصات فی خطبۃ الجمعۃ کے متعلق ہوا ہے، جس سے خطبہ جمعہ کا مثل صلوٰۃ ہونا ظاہر ہے،

اگر خطبہ جمعہ سے مقصود تذکیر محض ہوتی تو بحالت خطبہ کسی کو بات کرنے سے روکنا اور "انصت" کہنا ممنوع نہ ہوتا، کیونکہ یہ بھی تذکیر ہی کی تکمیل تھی، مگر بخاری ومسلم وغیرہما نے حدیث صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعًا روایت کیا ہے، اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت، امام طحاویؒ نے اس حدیث کو متواتر کہا ہے، (اعلاء السنن، ص ۶۰ ج ۲)

اور نماز میں غیر عربی میں ذکر ودعاء مکروہ ہے ممنوع ہے، درمختار میں ہے ودعاء بالعجمیۃ وحرم بغیرہا (نہر، ص ۳۴۳ ج ۱) یعنی درود شریف کے بعد نماز میں جو دعاء کی جائے، وہ عربی میں کی جائے غیر عربی میں دعاء (نماز کے اندر) حرام ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے کہ منقول مذہب میں کراہت ہے، پھر کراہت میں تفصیل کی ہے، مگر تحقیق یہ ہے کہ نماز کے اندر تو غیر عربی میں دعاء مکروہ تحریمی ہے اور نماز کے علاوہ مکروہ تنزیہی بمعنی خلاف اولیٰ ہے"۔

اور جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول جواز قرأت بالفارسیہ سے جواز خطبہ بالعجمیۃ پر استدلال کیا ہے، ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ امام صاحبؒ اس قول سے رجوع فرماچکے ہیں



اور قول مرجوع عنہ بحکم منسوخ ہوتا ہے، جس سے استدلال باطل ہے، ملاحظہ ہو شامی جلد ۱ ص ۴۲۵ (اعلاء السنن، ص ۱۳۷ ج ۴)

بہرحال خطبہ جمعہ عربی زبان میں ہونا چاہئے، مقامی زبان میں ہرگز نہ ہونا چاہئے، رہا یہ کہ جب سامعین نہیں سمجھتے تو فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب دینے کی ہم کو ضرورت نہیں، اگر سمجھنا ضروری ہے تو چاہئے کہ جب تک نماز کے اذکار وادعیہ کا مطلب معلوم نہ ہو اس وقت تک نماز بھی لغو ہو، کیونکہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ خطبہ جمعہ مثل نماز کے ہے، دوسرے یہ سوال وہاں نہیں کیا جاتا، جب کوئی وائسرائے انگریزی زبان میں شاہی پیغام سناتا ہے اور سننے والوں میں ہزاروں اور لاکھوں آدمی انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں، مگر وہاں اہل دنیا کی عقل خود جواب دے لیتی ہے کہ شاہی پیغام شاہی زبان میں ہی ہونا چاہیے، رعایا کی زبان میں نہ ہونا چاہئے، یہی جواب یہاں کیوں نہیں دیا جاتا، شریعت مقدسہ نے نماز اذان اور خطبہ جمعہ کو عربی میں اس واسطے رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کو عربی زبان سیکھنے کی طرف توجہ ہو جس کا سیکھنا فرض کفایہ ہے، اور تاکہ سب مسلمانوں کو قرآن کریم سے مناسبت فی الجملہ حاصل رہے، اجنبیت محضہ نہ ہوجائے، اگر خدانخواستہ یہ شعائرِ اسلام بھی مقامی زبانوں میں ہونے لگے تو مسلمانوں کو قرآن وحدیث سے بہت بعد ہوجائے گا، جس کا دین کے لئے خطرناک ہونا ظاہر ہے، پس اس رواج کو بند کرنا چاہئے، جو بعض شہروں میں ہونے لگا ہے، کہ خطبہ جمعہ اردو میں دیا جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب ، ۳ رمضان ۵۸ھ

## فصل فی صلوٰۃ الکسوف والاستسقاء ومتعلقاتہما

**کسوف اور خسوف کے وقت کھانے پینے کا حکم،** **سوال** (۱) چاندگرہن یا سورج گرہن کے وقت کھانا کھانا یا کوئی اور کام سوائے نماز وغیرہ کے کرنا جائز ہے یا نہیں، (اذا رأیتم شیئًا من ہذہ الاہوال فافزعوا الی الصلوٰۃ) میں امر وجوب کے لئے ہے یا ندب کے واسطے، بینوا توجروا؟ ۲۵ رجب ۴۲ھ

**الجواب**؛ فافزعوا الی الصلوٰۃ میں امر ندب کے لئے ہے، اکل وشرب بحالتِ کسوف مباح ہے، البتہ بہت بھوکا نہ ہو تو ترکِ اکل اولیٰ ہے، لانہ ینافی الفزع المندوب، واللہ اعلم، فقط،

**حکم استسقاء بحالت قلت مطر**

**سوال (۲)** السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، اس وقت عریضۂ ہٰذا کے ارسال کا منشاء یہ ہے کہ عرصہ سے یہاں اور قرب وجوار میں امساکِ باراں ہے، اگرچہ خاص سہارنپور اور اس کے نواح میں اوائلِ موسم میں خاصی بارش ہوچکی تھی، مگر اب تقریبًا بائیس روز سے بارش نہیں ہوئی، علاوہ سہارنپور کے دیگر اضلاع کے قرب وجوار میں مظفر نگر، میرٹھ، دھلی، انبالہ میں یا بالکل بارش نہیں ہوئی یا بقدرِ ضرورت نہیں ہوئی، اس بناء پر دہلی میں ۲۷؍ ماہ رواں کو صلوٰۃ استسقاء پڑھی گئی ہے، اب آپ سے یہ استفسار ہے کہ سہارنپور اور تھانہ بھون کے حالات میں جزوی فرق ہے، حالاتِ موجودہ اور فقہاء کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے یہ تحریر فرمائیں کہ بحالتِ موجود صلوٰۃ استسقاء کی ضرورت ہے یا نہیں، خطبوں کے اندر یہاں دعاء ہوچکی ہے اور ہوتی رہتی ہے، حضرت سلمہٗ کی رائے اور جواب جو کچھ عنایت ہو مفصل تحریر فرمائیں، اور فقہاء جو تین دن کے خروج کو لکھتے ہیں آیا صلوٰۃِ استسقاء تین دن تک کا کسی روایت سے ثبوت ہے؟ اگر کوئی تصریح مل جاوے تو حوالہ تحریر فرمائیں، مولانا عبد اللطیف صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

**الجواب:** السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ومغفرتہٗ۔ قال الحافظ فی التلخیص الحبیر فی قول الرافعی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یصل صلوٰۃ الاستسقاء الا عند الحاجۃ ما نصہ لم اجدہ صریحا لکن بالاستقراء یتبین صحۃ ذلک اھ (ص ۱۴۹ ج ۱) نعم قد ثبت انہ صلی اللہ علیہ وسلم استسقی من غیر صلوٰۃ لقحوط المطر عن البلاد البعیدۃ ایضا کما فی حدیث ابن عباسؓ عند ابن ماجہ، قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ لقد جئتک من عند قوم ما یتزود لھم راع ولا یخطر لھم فحل فصعد المنبر فحمد المنبر ثم قال اللّٰھم اسقنا غیثا مغیثا الخ وسندہ صحیح ومن ھھنا واللہ تعالیٰ اعلم قال فقہاءنا ان صلوٰۃ الاستسقاء مسنونۃ عند الحاجۃ الیہ فی موضع لا یکون لاھلہ اودیۃ وانھار وآبار یشربون منھا ویسقون مواشیھم وزروعھم او کان ذلک لکن لا یکفیھم فان کان کانوا لا یستسقون کذا فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ۳۱۸) واما دعاء اھل الخصب لاھل الجدب فیستحب مطلقا کما فی الشامی (ص ۸۸۵) لحدیث خیر الدعاء ان تدعو لاخیک



بظھر الغیب استحب الشافعی ان یستسقی امام الناحیۃ المخصبۃ لاھل الناحیۃ المجدبۃ ولجماعۃ المسلمین ویسأل اللہ الزیادۃ لمن اخصب مع استسقائہ لمن اجدب کما فی الام (ص ۱۸ ج ۱) وعزاہ الشعرانی فی کشف الغمۃ الی الصحابۃ انھم کانوا یستسقون لنواحی الارض واطراف المدائن اذا بلغھم قحط بلادھم اھ (ص ۱۳۸ ج ۱) ولعل ذلک محمول عند علمائنا علی الاستسقاء بالدعاء فقط بدون الصلوٰۃ، وتفسیر الحاجۃ عندی ان یخاف من قلۃ المطر غلاء السعر بحیث یضطرب بہ فقراء الناس وعامتھم ولا عبرۃ بامرائھم وظنی ان مثل تلک الحاجۃ قد تحققت فی بلادنا ھذہ فقد تشوشت العباد واضطربت الزراع وبلغت قلوب الفقراء الحناجر من مخافۃ الغلاء الشدید ان لم یمطروا فی المدۃ القریبۃ واللہ المستعان فقد ھلکت الزروع او کادت تھلک لقلۃ المطر وھبوب الصبا فیستحب لائمۃ البلاد ان یستسقوا ولا شک فی الجواز واللہ تعالیٰ اعلم (تتمۃ) واما انھم یخرجون ثلاثا متتابعات فقد صرح الشافعی باستحبابہ فی الام وقال الشرنبلالی فی نور الایضاح وشرحہ ان اکثر من ذلک لم ینقلؑ ولم یرد ذلک فی الحدیث لانہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا استسقی سقی اولا وکذا الصحابۃ ایضا واللہ اعلم، حررہ ظفر احمد عفی عنہ ۲۹؍ صفر ۴۷ھ

الجواب صحیح، اشرف علی ۲۹؍ صفر ۴۷ھ

## مسائل متفرقہ کتاب الصلوٰۃ

**نمازی کے آگے سے گذرنا**

**سوال (۱)** زید کو یہ معلوم نہیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذرنے والے کو عذاب ہوگا اور آگے زید گذر گیا تو زید کو عذاب ہوگا یا نہیں ہوگا؟

---

ع اى عن السلف ولعل وجہ ذلک ان الدعاء یستحب فیہ التکریر واقلہ التثلیث کما فی الحصن الحصین وعزاہ الی ابی داؤد فلم یتجاوزوا فی الاستسقاء اقل عدد التکریر لکونہ دعاء مخصوصا علی ھیئۃ خاصۃ خلاف القیاس فلا یکرر الا بدلیل وقد ثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم تثلیث الدعاء صراحۃ فی غیر الاستسقاء فلا یزاد علیہ ۱۲ منہ

الجواب: مسئلہ کے نہ جاننے کا زید کو گناہ ہوگا، ۷ رشعبان ۴۱؁ھ

**حالتِ رکوع میں الصاقِ کعب کی تحقیق**

**سوال (۲)** الصاق کعب بالکعب فی الصلوٰۃ عند الرکوع والسجود للرجل خاصۃ سنۃ لکھتے ہیں، حاشیۂ طحطاوی (ص ۳۱۳ ج ۱) شامی (ص ۳۳۴ ج ۱) مبسوط (ص ۹، ج ۱) بحر الرائق (ص ۳۱۵ ج ۱) ملتقی الابحر مع مجمع الانہر (ص ۹۶ ج ۱) کبیری (ص ۳۰۷) در مختار (ص ۳۷) حاشیہ مالابد منہ اور جناب نے بہشتی زیور میں الصاق کو عورتوں کے لئے تحریر فرمایا ہے، اور ہمارے بزرگوں کا عملدرآمد بھی اسی پر ہے، مگر کتب مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب کی تحقیق کے خلاف ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟

الجواب: الصاق الکعب بالکعب فی الرکوع کا رجال کے لئے مسنون ہونا تو محلِ کلام ہے، یہ صرف زاہدی کی روایت ہے، اور وہ نقل میں ضعیف ہیں، بحالتِ تفرد اس کی روایت معتبر نہیں اور سب متون و شروح میں زاہدی ہی کی اتباع سے اس الصاق کو مسنون کہا گیا ہے، صرح بہ الشیخ مدظلہ فی ترجیح الراجح المطبوعہ مسلسلا فی رسالۃ النور، ص ۱۶ شعبان ۴۲؁ھ، بلکہ طحاوی کی معانی الآثار ص ۱۳۴ سے رکوع و سجود میں تجافی کا مسنون ہونا اور الصاق کا مسنون نہ ہونا مصرح ہے، باقی عورتوں کے لئے بلحاظِ ستر بہشتی زیور میں اس الصاق کو باقی رکھا گیا، و دلیلہ ما فی الاشباہ من احکام الانثی وتضم فی رکوعہا وسجودہا ولا تفرج اصابعہا فی الرکوع اھ (ص ۳۴۶) اس میں تضم رکوعہا وسجودہا، مطلق ضم کی مطلوبیت پر دال ہے، جس میں الصاق الکعب بالکعب بھی داخل ہے، واللہ اعلم، ۵ ربیع الاول ۴۵؁ھ

**اندھیرے میں تہجد پڑھنے کا حکم**

**سوال (۳)** نمازِ تہجد روشنی میں پڑھنا اولیٰ ہے، یا اندھیرے میں، دونوں میں کونسی صورت بہتر ہے؟

الجواب: جہاں قبلہ مشتبہ ہونے کا اندیشہ ہو وہاں رات کی نماز اندھیرے میں مکروہ ہے، اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو وہاں بلاکراہت جائز ہے، البتہ عدم اشتباہ کی صورت میں بھی اگر اندھیرے سے قلب کو تشویش ہوتی ہو تو روشنی میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے، ۲۳ رجمادی الثانی ۴۵؁ھ

---



**کوئی شخص بالکل نمازی کے سامنے بیٹھا ہو تو اس کو کسی طرف سرک جانا جائز ہے؟ اور نمازی کے سامنے سے کوئی چیز اٹھانے کا حکم!!!**

**سوال (۴)** احقر نے غایۃ الاوطار میں دیکھا ہے کہ کسی کے پیچھے اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو داہنی یا بائیں طرف سرک جانا جائز ہے، کیونکہ وعید جو آئی ہے تو ایک طرف سے دوسری طرف گذرنے پر آئی ہے، اور اس میں وہ صورت نہیں، یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور نمازی کے آگے سے داہنی طرف سے یا بائیں طرف سے ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: فی الشامی (ص ۶۶۵ ج ۱) اراد المرور بین یدی المصلی فان کان معہ شئ یضعہ بین یدیہ ثم یمر ویاخذہ ولو مر اثنان یقوم احدہما امامہ ویمر الآخر ویفعل الآخر ہکذا یمران وان معہ دابۃ فمر راکبا اثم وان نزل وتستر بالدابۃ ومر لم یاثم ولو مر رجلان متحاذیین فالذی یلی المصلی ہو الآثم قنیہ وایضا فی العالمگیریۃ ولو مر اثنان یقوم احدہما امامہ ویمر الآخر ویفعل الآخر ہکذا یمران کذا فی القنیۃ (ص ۶۶ ج ۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ غایۃ الاوطار کا مسئلہ صحیح ہے، اور نمازی کے سامنے سے چیز اٹھانا جائز ہے، (کما علم من قول الشامی ویاخذہ) احقر عبد الکریم عفی عنہ

الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ ۵ ر ذی الحجہ ۴۳؁ھ

**نمازی کے سامنے سے ہٹنے کا حکم**

**سوال (۵)** اگر کوئی شخص پیچھے بالکل محاذات میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں وہاں سے الگ ہو جانا مرور بین المصلی میں داخل ہے یا نہیں، ہر دو صورتوں کا مع الدلیل جواب تحریر کیا جاوے؟ ممتاز احمد گیاوی مقیم خانقاہ

الجواب: فی العالمگیریہ (ص ۶۶ ج ۱) ولو مر اثنان یقوم احدہما امامہ ویمر الآخر ویفعل الآخر ہکذا یمران کذا فی القنیۃ، اس روایتِ فقہیہ سے معلوم ہوا کہ محاذاۃ مصلی سے ہٹ جانا مرور نہیں، لیکن ایسے فعل سے عوام کو مرور کی جرأت ہو جاتی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ آگے سے نہ ہٹے بالخصوص جبکہ کوئی ضرورت ہٹنے کی نہ ہو، واللہ اعلم، احقر عبد الکریم عفی عنہ ۱۶ ر ج ۱ ۴۴؁ھ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۷ ر ج ۱ ۴۴؁ھ

**درود ابراہیمی میں کما صلیت علی ابراہیم میں تشبیہ کی تحقیق**

**سوال (۶)** قادیانی کہتے ہیں کہ کما صلیت علی ابراہیم میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم

علیہ وعلی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت میں نبوت دی گئی، اسی طرح ہمارے حضرت کی اُمت میں بھی دی جاوے، اس تشبیہ کے متعلق کیا منقول و معقول ہے؟

الجواب: قال فی الدر وخص ابراھیم ای التشبیہ بابراھیم دون غیرہ من الرسل الکرام علیھم السلام ۱۲) لسلامہ علینا ای لانہ مسلم علینا لیلۃ المعراج حیث قال ابلغ امتک السلام منی ۱۲ شامی) اولانہ سمانا المسلمین (کما اخبر عنہ تعالیٰ بقولہ ھو سماکم المسلمین من قبل ۱۲ شامی) اولان المطلوب صلوٰۃ یتخذہ بھا خلیلاً وعلی الاخیر فالتشبیہ ظاھر اھ قال الشامی واجیب (ای عن التشبیہ) باجوبۃ اخر من احسنھا ان التشبیہ فی اصل الصلوٰۃ لافی القدر کما فی قولہ تعالیٰ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح وکتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم واحسن کما احسن اللہ الیک وفائدۃ التشبیہ تاکید الطلب ای کما صلیت علی ابراھیم فصل علی محمد الذی ھو افضل منہ اھ (ص ۵۳۲، ج ۱)

اور قادیانیوں نے جو وجہ بیان کی ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں نبوت دی گئی تھی، نہ کہ امت میں، اگر اس سے بقاء امت کی طرف اشارہ ہوگا تو بہت سے بہت مثل ابراہیم علیہ السلام کے حضور کی ذریت میں اس کے بقا کی طرف اشارہ ہوگا، امت میں نبوت باقی رہنے کی طرف اشارہ کی کیا دلیل ہے؟

دوسرے اگر ابراہیم علیہ السلام کی تخصیص اس اشارہ کی وجہ سے کی گئی ہے تو نوح علیہ السلام کا نام بھی درود میں ہونا چاہئے تھا، کیونکہ بقاء نبوت فی الذریت کا شرف ان کو بھی حاصل ہے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اُن کو یہ شرف حاصل ہوا، قال تعالیٰ وان من شیعتہ (ای نوح ۱۲) لابراھیم (سورۃ الصّٰفّٰت) وقال تعالیٰ ولقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتٰب (سورۃ الحدید) پس یہ وجہ غلط ہے، اور کما صلیت علی ابراہیم میں بقاء نبوت کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اشارہ خلّت کی طرف ہے، وقد استجاب اللہ دعاء عبادہ فاتخذہ اللہ تعالیٰ خلیلا ایضًا ففی حدیث الصحیحین ولکن صاحبکم خلیل الرحمٰن اھ شامی (ص ۵۳۶ ج ۱) ای وخلۃ نبینا اکمل وافضل کما دلت علیہ الآیات والآثار، واللہ اعلم، ۱۳ر شوال سنہ ۴۶ھ



**نماز باجماعت کے لئے لوگوں کی حاضری لینے کا حکم،**

**سوال (۷)** کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک موضع کے کل لوگوں کا نام رجسٹر میں درج ہے، اور نماز کے وقت مسجد کے اندر ہر شخص کا نام بنام پکار کر حاضری لی جاتی ہے، تاکہ لوگ جماعت سے نماز پڑھیں اور سستی نہ کریں، لہٰذا از روئے شرع کے اس قسم کی حاضری مسجد کے اندر لینی جائز ہے یا نہیں، بحوالہ کتب مع عبارت کے ارقام فرمادیں، بینوا بالکتاب توجروا بالصواب۔

الجواب: اس قسم کی حاضری لینا جائز نہیں، کیونکہ جماعت کا وجوب بعض اعذار شرعیہ سے ساقط ہوجاتا ہے، اور بعض اعذار مخفی ہوتے ہیں جن کا علم بجز مبتلی بہ کے کسی کو نہیں ہوسکتا، اور نام بنام حاضری لینے میں متخلف عن الجماعۃ کی بابت لوگوں کو ناحق بدگمانی پیدا ہوگی وقد قال تعالیٰ یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا الآیۃ وھذا داخل فی التجسس المنھی عنہ وانما جاز مثل ذلک للمزکی لمصلحۃ شرعیۃ وھی تعدیل الشھود وجرحھم ولا مصلحۃ فی ذلک الآن لعدم وجود الامام والقضاۃ، نیز یہ طریقہ سلفِ صالح سے ثابت نہیں، وکانوا سابقین الی الخیرات، واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۰ر شعبان سنہ ۴۷ھ

**خانقاہ امدادیہ کے حوض پر بلاسترہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گذرنے کے متعلق حکم،**

**سوال (۸)** خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں بعض لوگ حوض کے اوپر نفلیں پڑھتے ہیں، اور سترہ سامنے نہیں ہوتا، ان نمازیوں کے سامنے سے پچدرہ میں چلنا اور گذرنا جائز ہے یا نہیں؟ صورت یہ ہے:-

پچدرہ

سائبان

صحن

حوض

حوض پٹا ہوا ہے، ایک جانب وضو کیلئے کھلی ہے، لوگ حوض کے اوپر بلاسترہ نماز پڑھتے ہیں،
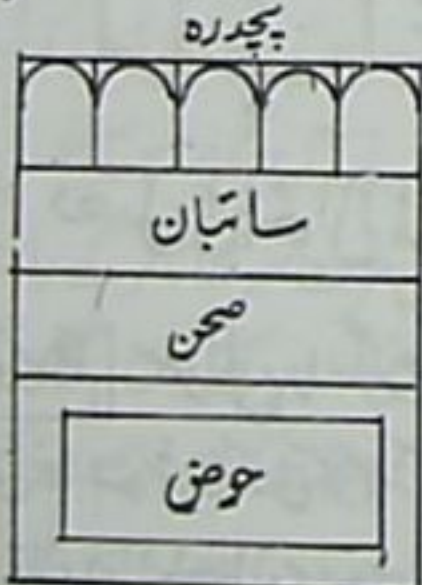
الجواب: قال فی القنیۃ شرح المنیۃ ثم انکر یکرہ المرور بین یدیہ عند عدم الحائل اذا کان فی موضع سجودہ فی الاصح قال فی الکافی، وفی النھایۃ الاصح ان کان بحال لو صلی صلوٰۃ الخاشعین بان یکون بصرہ حال قیامہ الی موضع سجودہ لا یقع بصرہ علی المار لا یکرہ ھذا اذا کان یصلی فی الصحراء اما ان صلی فی المسجد ولم یکن حائل فان کان المسجد صغیرا کرہ المرور مطلقًا

وان کان کبیرًا فقیل کالصغیر لایمر بینه وبین حائط القبلة وقیل کالصحراء ویمر فیما وراء موضع السجود وقیل یمر فیما وراء خمسین ذراعًا وقیل قدر ما بین الصف الاول وحائط القبلة قال الشیخ ابن الهمام ومنشاء هذه الاختلاف ما یفهم من لفظ بین یدی المصلی (الوارد فی الحدیث) فمن فهم ان ما بین یدیه یخص ما بینه وبین محل سجوده قال به ومن فهم انه یصدق مع اکثر من ذلک نفاه وعین ما وقع عنده والذی یظهر ترجیح ما اختاره فی النهایة من مختار فخر الاسلام وکونه من غیر تفصیل بین المسجد وغیره فان المؤتم المرور بین یدیه، وکون ذلک البیت برمته اعتبر بقعة واحدة فی حق بعض الاحکام (کصحة الاقتداء ونحوها) لایستلزم تغییر الامر الحسی من المرور من بعید فیجعل البعید قریبًا انتهی ملخصًا (ص ۳۵۴)

قلت فما ظنک بدار لم تعتبر بقعة واحدة فی حق صحة الاقتداء من غیر اتصال الصفوف فیها، صورتِ مسئولہ میں بچدرہ کے اندر سے یا مسجد کے اندر سے ہوکر اُن نمازیوں کے سامنے سے گذرنا جو حوض پر یا حوض کے متصل نماز پڑھ رہی ہیں جائز ہے، کیونکہ بچدرہ اور حوض مکان واحد نہیں اور فصل بھی زیادہ ہے کہ نمازی کی نظر گذرنے والے پر نہیں پڑسکتی، پس وہاں سے گذرنے والے کو ان نمازیوں کے سامنے سے گذرنے والا نہ کہا جاوے گا، واللہ تعالیٰ اعلم، ظفر احمد عفا عنہ ۲۳ ر ج ۱۳۵۵ھ، صح الجواب اشرف علی ۲۴ ر ج ۱۳۵۵ھ

# کتابُ الجنائز

## فصل فی احوال الموتیٰ والقبور

عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کا حکم

**سوال (۱)** اگر عورت ضعیفہ یا جوان پردہ کے ساتھ قبرستان جاوے اور اس جگہ کوئی خلافِ شرع کوئی کام نہ کرے تو اس کا جانا جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** قال فی الطحطاوی حاشیة مراقی الفلاح ص ۳۶۲ وان کان للاعتبار والترحم والتبرک بزیارة قبور الصالحین من غیر ما یخالف الشرع فلا بأس به اذا کن عجائز وکره ذلک للشابات کحضورهن فی المساجد للجماعات اھ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کام خلافِ شرع نہ کیا جاوے تو بوڑھی عورتوں کو زیارتِ قبور



جائز ہے، جوان کو نہ چاہئے کہ اس میں فتنہ ہے،

قبر پر کتبہ لگانا مکروہ ہے

**سوال (۲)** کیا قبر کا گرد اپتھر یا اینٹ سے ایک بالشت تک اونچا اس غرض سے بنانا کہ نشان قائم رہے اور اوپر سے کھلی رہے جائز ہے یا نہ، اور کتبہ کندہ شدہ نام متوفی بمعہ تاریخ وغیرہ لگانا جائز یا نہ؟

**الجواب:** علامت باقی رکھنے کے لئے گرد ابنانا یا کتبہ لگانا قبر پر مکروہ ہے قال فی العالمگیریة ویکره ان یبنی علی القبر ویعلم بعلامة من کتابة ونحوه کذا فی التبیین اھ ملخصًا (ص ۱۲۱-۱۰۷) ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

میت کی بعض رسومات کا حکم اور غسل اور کفن دفن کا طریقہ،

**سوال (۳)** .......... یہاں کی قدیمی رسم ورواج یہ ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے بعد دم نکل جانے کے لاش کو اتر سرہانے قبلہ رخ غسل دینے تک جیسے قبر میں رکھتے ہیں ویسے ہی رکھتے ہیں، اور چلیا قوم جو کہ اکثر شافعی مذہب والے اور نیشاپوری لوگ جو کہ اکثر حنفی مذہب والے ہیں، یہ لوگ دم نکلتے ہی قصدًا مُردے کو پورب سرہانا اور قبلہ رُخ پاؤں لاش اُٹھنے تک رکھتے ہیں، اور دم نکلتے ہی یکبار غسل اور کفنانے کے وقت تک غسل دلاتے ہیں اور لاش کو اونچے پلنگ یا تخت پر رکھتے ہیں، حالانکہ رنگون میں سب بھی عمارت یا تختے کے گھر ہیں، کہیں مٹی کے مکان نہیں ہیں، فی الحال آج جو تھا دن ہے، کہ ایک شخص ہمارے محلہ میں فوت ہوا، تو فرقۂ اول یعنی محلہ والوں نے جن میں دو پیش امام مسجد کے اور تین مولوی بھی ہیں اپنے قدیمی رواج کے مطابق مُردے کو اُتر سرہانے قبلہ رُخ لٹائے رکھا تھا، اتنے میں فرقۂ ثانی کے لوگ نے آکر جبرًا میت کو غسل دلایا پھر پلنگ یا تخت منگا کر اونچے پر قبلہ رُخ پاؤں اور پورب کی طرف سرہانا کرکے رات بھر لاش صبح اُٹھنے تک رکھا، اور بہت کچھ گفت وشنید ہوئی، اور کہتے ہیں اصح وصحیح طریق یہ ہے، ہزاروں دلیلیں ہم نے بتائی اور ثبوت دیا کہ میت کو اس رسم سے اُٹھنے تک رکھنا اھ اب پیش امام ومولوی لوگ فرقۂ ثانی سے عاجز ہیں کہ فضول بحث چہ کار آید، اب محلہ والے حضور سے دست بستہ خدمتِ عالی میں عرض کرتے ہیں کہ فرقۂ ثانی کی کارروائی سے فساد ہونے کا اندیشہ ہے، آپ برائے خدا ان شقوں سے نجات دلائیے:-

اول یہ کہ بلاضرورت میت کو پورب سرہانے لاش اُٹھنے تک لٹائے رکھنا،

دوسرے بلا ضرورت دم توڑتے ہی غسل دینا پھر کفنانے کے وقت بلا ضرورت غسل دینا

سوم بلا عذر میت کو اونچے تخت پر رکھنا،

چہارم، جنازہ پر لے جاتے وقت مرد میت پر پھول کا ہار چڑھاتے ہیں، میت پر نہیں جنازہ پر لیجاتے ہیں، یہ سب رسم درست ہیں یا نہیں، برائے خدا برائے کرم نوازی غریب مسلمانوں پر نظرِ شفقت ڈال کر آنجناب مہر ثبت کے ساتھ مدلل جواب ارسال فرما کر سب مسلمانوں کو مشکور و ممنون فرمائیے، یہی یہاں کے مسلمانوں کی دست بستہ عرض ہے،

پنجم، جب میت کو جنازہ پر رکھتے ہیں ایکمرتبہ فاتحہ پڑھتے ہیں، پھر قبرستان ہو کر نماز پڑھنے کے بعد ایکبار فاتحہ پڑھتے ہیں، پھر دفن کے بعد لوٹتے وقت دروازہ قبرستان پر کھڑے ہو کر ایکبار فاتحہ پڑھتے ہیں، اب عرض یہ ہے کہ آیا اتنی مرتبہ فاتحہ دینا درست ہے یا نہیں؟

الاجوبة، قال فی الدر ویوجه المحتضر لقبلة علی یمینه هو السنة وجاز الاستلقاء علی ظهره وقدماه الیها وهو المعتاد فی زماننا اھ قال الشامی ناقلا عن البحر اختاره مشائخنا بما وراء النهر لانه ایسر لخروج الروح وتعقبه فی الفتح وغیره بانه لایعرف الانقلا والله اعلم بالایسر منهما ولکنه ایسر لتغمیضه وشد لحییه وامنع من تقوس اعضائه اھ (ص ۸۸۸/۱) وفی حاشیة الطحطاوی علی المراقی الفلاح قوله وجاز الاستلقاء ویوضع هکذا فی الغسل والصلوٰة قال فی شرح الطحاوی وهو العرف بین الناس قال فی الزاد والاول افضل لانه السنة کذا فی المضمرات اھ (ص ۳۲۵)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ قبلہ کی طرف پیر کر کے میت کو لٹانا خروجِ روح سے پہلے بعض مشائخ نے مستحسن سمجھا ہے، کیونکہ اس میں اُن کے نزدیک خروجِ رُوح میں سہولت ہے، مگر زاد وغیرہ اور مضمرات میں تصریح ہے کہ افضل طریقہ موافقِ سنت یہ ہے کہ میت کو داہنی کروٹ پر قبلہ رُخ کیا جائے، اس کی یہی صورت ہے کہ سر جانبِ شمال ہو اور پیر سمت جنوب، اور داہنی کروٹ دے کر قبلہ رُخ کر دیا جائے، پھر یہ اختلاف تو خروجِ رُوح کے وقت ہے، اور خروجِ رُوح کے بعد قبلہ رُخ پیر کر کے لٹانا یہ تو محض لغو حرکت ہے، کیونکہ اب اس میں کوئی بھی فائدہ نہیں اور جب وقتِ فائدہ کے بھی یہ صورت خلافِ سنت اور غیر افضل تھی، تو اب بدرجۂ اولیٰ خلافِ سنت وغیر افضل ہو گی، فافہم،

(۲) قال فی مراقی الفلاح واذا تیقن بموته یعجل بتجهیزه اکراماله لما فی



الحدیث وعجلوا به لانه لاینبغی لجیفة مسلم ان تحبس بین ظهرانی اهله والصارف عن الوجوب الاحتیاط قال بعض الاطباء ان کثیرین ممن یموت بالسکتة ظاهرا ایدفنون احیاء لانه یعسر ادراك الموت الحقیقی بها الاعلی افضل الاطباء فیتعین التاخیر فیها الی ظهور الیقین بنحو من التغیر وقد مات النبی صلی الله علیه وسلم یوم الاثنین ضحوة ودفن فی جوف اللیل من لیلة الاربعاء اھ قال الطحطاوی وظاهر کلامهم ان التاخیر مطلوب مطلقا لما رواه من الحدیث رای ماروا من التاخیر فی دفنه علیه افضل الصلوٰة والسلام) والمراد التاخیر الی تیقن الموت فانه ربما عرض علیه هذه الداء اھ (ص ۳۲۹) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ مُردہ کے غسل وغیرہ میں دم توڑتے ہی جلدی نہ کی جائے بلکہ کسیقدر تاخیر اتنی دیر تک کی جائے کہ موت کا یقین پختہ ہو جائے، اور سکتہ وغیرہ کا وہم نہ رہے، اور یقینِ موت کے بعد پھر دیر نہ کی جائے، پس دم ٹوٹتے ہی فوراً میت کو غسل دینا اور کفن کے وقت دوبارہ غسل دینا لغو حرکت ہے، بلکہ محض کفنانے کے وقت غسل دینا چاہئے، اور بعض متون میں جو یہ الفاظ ہیں فیوضع کما مات علی سریر مجمر الخ جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ بس مرتے ہی فوراً تختے پر رکھ دیا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں بلکہ مطلب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ تیقنِ موت کے بعد جب غسل وکفن کا ارادہ کریں تب تختہ پر رکھیں، صرح فی مراقی الفلاح وحاشیته للطحطاوی (ص ۳۳۰) وفیه لاباس بالتاخیر لعارض کما فی ابن امیر حاج،

(۳) قال الطحاوی فی حاشیة علی مراقی الفلاح روی انه صلی الله علیه علیه وسلم لما غسل وکفن ووضع علی السریر دخل ابوبکرؓ وعمرؓ وهما فی الصف حیال رسول الله صلی الله علیه وسلم اھ (ص ۳۴۰) اس سے معلوم ہوا کہ میت کو غسل وکفن کے بعد تخت یا پلنگ پر رکھنا سنت ہے، حضرات صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل وکفن کے بعد تخت پر رکھا تھا، اور بظاہر اس میں اکرامِ میت بھی ہے اس فعل میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضرور نہیں کہ پلنگ اور تخت معمولِ معتاد سے اونچا ہو، تھوڑی سی بلندی سطحِ ارض سے کافی ہے، واللہ اعلم

قال فی الهندیة اذا حملوا علی سریر اخذوه بقوائمه الاربع به وردت

السنة (ص ۱۰۳ ج ۱)

(۴) جنازہ پر پھول چڑھا مکروہ ہے قال فی الهندیه ویکرہ عند القبر ما لم یعهد من السنة اھ (ص ۱۰ ج ۱) قلت والکفن والدفن کذلك فیکرہ فیهما ما لم یعهد من السنة ووضع الریاحین علی الکفن لم یعهد منها، علاوہ ازیں یہ ہندوؤں کا طریقہ ہے، اس لئے تشبہ میں داخل ہے،

(۵) یہ تین بار میت پر فاتحہ پڑھنا خلاف سنت ہے، سنت یہ ہے کہ وقت نزع روح کے سورہ یٰس پڑھیں، اور بعد موت کے اس کے پاس قرآن پڑھنا بعض علماء کے نزدیک مستحب ہے، اور بعض نے غسل سے پہلے منع کیا ہے، بعد غسل کے ہر شخص آہستہ آہستہ جو توفیق ہو قرآن پڑھکر میت کو بخش دے، اور بعد دفن کے تھوڑی دیر قبر پر ٹھہر کر کچھ قرآن پڑھکر بخش دیں اور میت کے لئے دعاء کریں، باقی جس صورت سے بمبئی وغیرہ میں فاتحہ دیجاتی ہے یہ صورت بدعت ہے، ۹ر جمادی الاخری سنہ ۴۲ھ

**زوج کے لئے مردہ بیوی کو بلاحائل ہاتھ لگانا جائز نہیں،**

**سوال** (۴) هل یحل للزوج ان یقبل امرأته التی ماتت وکفنت بلا واسطة الثوب وغیرہ وهو لیس من قرابتها ایضا؟

**الجواب:** لایجوز له مسها بغیر حائل ولو کان من قرابتها لعدم المحرمیة وبطلان النکاح بالموت قال فی الدر ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الاصح قال الشامی عن الخانیة اذا کان للمرأة محرم یممها بیدہ واما الاجنبی فبخرقة علی یدہ ویغض بصرہ عن ذراعها وکذا الرجل فی امرأته الا فی غض البصر اھ قال ولعل وجهه ان النظر اخف من المس فجاز لشبهة الخلاف اھ (ص ۸۹۷ ج ۱) قلت وجواز تیممه ایاها بخرقة یدل علی جواز مسه ایاها بحائل ولکنه مقید ایضا بالضرورة فلاینبغی المس بدونها ولو بحائل هذا واللہ تعالیٰ اعلم، ۲۷ر صفر سنہ ۴۵ھ

**ایام مخصوصہ میں ارواح کا گھروں میں آنا اور مقر ارواح کی تحقیق**

**سوال** (۵) یہاں ہمارے علاقہ میں اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح جمعرات یا جمعہ کو مکانوں میں آتی ہیں، اور شب برأت میں تمام مردوں کی روحیں ضرور اپنے قرابت داروں کے یہاں



آیا کرتی ہیں، چونکہ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، اس لئے ان کا عقیدہ راسخ ہے، مگر آپ نے بہشتی زیور وغیرہ دیگر رسالوں میں لکھا ہے کہ روحیں مقید ہیں گھروں میں نہیں آتیں، اس لئے گذارش ہے کہ برائے مہربانی مطلع کریں، کہ آیا ارواح گھروں میں آتی ہیں یا نہیں، اور ایسا عقیدہ رکھنا از روئے شرع شریف کیسا ہے؟ برائے مہربانی کتابوں کا حوالہ بھی دیں،

**الجواب:** مقر ارواح کے متعلق علماء میں بہت اختلاف ہے، انبیاء اور شہداء کے متعلق تو اتفاق ہے کہ وہ بعد وفات کے جنت میں رہتے ہیں، اور جسد عنصری سے بھی اُن کو تعلق قوی رہتا ہے، اور غیر شہداء یعنی عامۂ مؤمنین کے متعلق اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں وہ بھی جنت میں رہتے ہیں، بعض کہتے ہیں جنت سے باہر رہتے ہیں، بعض کا قول ہے کہ قبر کے پاس رہتی ہیں اور جہاں چاہیں چلتی پھرتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواح مؤمنین بئر زمزم یا جابیہ میں رہتی ہیں (جو شام کا ایک شہر ہے) اور ارواح کفار حضرموت میں ایک کنواں برہوت ہے ان میں رہتی ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ ارواح مؤمنین علیین میں رہتی ہیں اور ارواح کفار سجین میں رہتی ہیں، اور قبر و جسد عنصری سے بھی ان کو تعلق رہتا ہے، اور ممکن ہے کہ جابیہ و زمزم سے بھی کچھ تعلق ارواح مؤمنین کو اور بئر برہوت سے ارواح کفار کو بعد نوت کا ہوتا ہو، ذکر کل ذلك السیوطی فی شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور (ص ۹۱ تا ص ۱۰۲) وفیه ایضا قال الحافظ ابن حجر فی فتاواہ ارواح المؤمنین فی علیین وارواح الکفار فی سجین ولکل روح بجسدها اتصال معنوی لایشبه الاتصال فی الحیوۃ الدنیا بل اشبه شیء به حال النائم اتصالا قال ولهذا یجمع بین ما ورد ان مقرها فی علیین وسجین وبین ما نقله ابن عبد البر عن الجمهور ایضا انها عند افنیة القبور قال ومع ذلك فهی ماذون لها فی التصرف وتاوی الی محلها من علیین او سجین اھ ثم اوردہ السیوطی بما اخرجه الحاکم عن ابن عباس قال بینما النبی صلی اللہ علیه وسلم جالسا و اسماء بنت عمیس قریبا منه اذ رد السلام وقال یا اسماء هذا جعفر ابن ابی طالب مع جبرئیل ومیکائیل مروا فسلموا علینا واخبرنی

انہ لقی المشرکین یوم کذا وکذا الخ (ص ۹۶)

اور نصوصِ صحیحہ قرآنیہ وحدیثیہ سے حافظ ابن حجر کا قول زیادہ قوی ہے کہ مقر ارواح مؤمنین علیین ہے جو ایک مقام سما سابع میں ہے، اور مقر ارواح کفار سجین ہے، جو ارض سابعہ کے نیچے ہے، لیکن ان مقامات میں ارواح مقید نہیں ہیں، بلکہ ان کو اپنے جسد اول سے اور قبر سے بھی تعلق رہتا ہے، اور بعض کو زمین میں تصرف وسیر کا بھی اختیار دیا جاتا ہے، جس کے بعد وہ پھر اپنی مقر پر پہونچ جاتی ہیں،

باقی اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ سب ارواح جمعرات یا جمعہ کو یا پندرہ شعبان کو اپنے گھر آتی ہیں، کیونکہ اول تو زمین میں تصرف کی سب ارواح کو نہیں ہوتی، بلکہ خاص خاص کو ہوتی ہے، دوسرے جن کو تصرف وسیر فی الارض کا اختیار بھی دیا جاتا ہے یہ ضرور نہیں کہ وہ جمعرات یا جمعہ ہی کو زمین میں تصرف وسیر کریں، اور تصرف وسیر میں اپنے گھر بھی ضرور آئیں، پس یہ عقیدہ بلا دلیل ہو جس سے احتراز لازم ہے، حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہم

اشرف علی عرض کرتا ہے کہ جب اس عقیدہ کا بے دلیل ہونا ثابت ہو گیا، اور عقیدۂ بے دلیل کے باب میں حکم شرع ہے لا تقف ما لیس لک بہ علم، پس بنا، بر اس آیت کے ایسا عقیدہ رکھنے سے عاصی ومبتدع ہوگا، اس سے توبہ واجب ہے، اور کسی کتاب میں کوئی مضمون ہونا حجۃ شرعیہ نہیں تاوقتیکہ اس پر کوئی دلیل نہ ہو، اور یہ چونکہ یہ امر متعلق نقل کے ہے اس لئے دلیلِ نقلی ہونا شرط ہے، جو اصولِ شرعیہ کی رُو سے قابلِ استدلال ہو اور ایسی دلیل مفقود ہے، اس لئے ایسی کتاب کافی نہیں،

اشرف علی ، یکم ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

**حالتِ نزع میں محتضر کو پانی پلانا مستحب ہے**

**سوال (۶)** .......... بعض جگہ دستور ہے کہ بحالتِ نزع اس کے حلق میں شہد پانی میں ملا کر پلایا جاتا ہے، کیا اس کا شرعاً ثبوت ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا پلانا مفید ہے یا مضر؟

**الجواب؛** حالتِ نزع میں محتضر کو پانی پلانا مستحب ہے، فقہاء حنفیہ نے اس کا استحباب ذکر کیا ہے، کیونکہ نزع کے وقت پیاس کا غلبہ اور شدت ہوتی ہے، اور حضرات صحابہ سے بھی ثابت ہے کہ وہ معرکۂ قتال میں محتضرین کو پانی پلایا کرتے تھے،



۲۸

قال فی نور الایضاح وشرحہ ویستحب لاقرباء المحتضر واصدقائہ وجیرانہ الدخول علیہ للقیام بحقہ وتکثیرہ تجریعہ وسقیہ الماء لان العطش یغلب لشدۃ النزع ولذلک یاتی الشیطان کما ورد بماء زلال (ای بارد) ویقول قل لا الہ غیری حتی اسقیک نعوذ باللہ منہ اھ (ص ۳۲۷) پس یہ دستور خلافِ شرع نہیں، بلکہ مستحسن ہے، ۱۹ رجب ۱۳۴۵ھ

**حکم تحویل عظام میت**

**سوال (۷)** یہاں پر ایک قبر ایک شخص کے مکان میں برآمد ہوئی جو بہت سی صدیوں کی معلوم ہوتی ہے، اور ہڈیاں اُن صاحب کی بدستور باقی تھیں، فتویٰ دیا گیا کہ اگر ان کو دوسرے قبرستان میں دفن کردیں تو جائز ہے، بندہ عرض رساں ہے کہ یہ فعل مطابق شرع شریف کے ہوا یا کیا؟ آیا اسی جگہ رہنا چاہئے تھا، یا ہٹانے کے سبب کچھ گناہ ہوا اور خلافِ شرع ہوا دوسری جگہ جو دفن ہوئے تو کفن نیا دینا چاہئے تھا یا نہیں اور ان کے نمازِ جنازہ پڑھنی چاہئے تھی یا نہیں، اب یہ ہوا کہ وہ مکان جو بنایا گیا گر گیا، اور فتویٰ دہندگان کے لڑکے کا انتقال ہو گیا،

**الجواب؛** مسلمان کی لاش اگر کسی جگہ زمین کھودنے سے نکل آوے تو اس کو اسی جگہ دفن کردینا لازم ہے وہاں سے منتقل کرنا اور دوسرے قبرستان میں یا کسی اور جگہ دفن کرنا جائز نہیں، فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، اور اس میں مسلمان میت کی بے حرمتی بھی ہے، جس شخص نے جواز نقل کا فتویٰ دیا اس نے بہت بُرا کیا، کہ قولِ فقہاء کو دیکھ کر فتویٰ نہ دیا، لیکن اگر وہ مفتی اپنی غلطی کا اقرار کرلیں اور آئندہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دینے کا وعدہ کرلیں تو پھر اُن پر ملامت کرنا ایذاء پہونچانا جائز نہیں، اور اس صورت میں نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جاسکتی، کیونکہ نماز جنازہ کی صحت کے لئے جسم شرط ہے، اور ڈھانچ جسم نہیں، نیز تکرارِ صلوۃ جنازہ غیر مشروع ہے، الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم حین فانہ صلوا علیہ مرۃ واخری فرادی وکان ذلک خاصا بہ، اور ظاہر یہ ہے کہ جس مسلمان کی لاش نکلتی ہے وہ نماز پڑھ کر دفن کیا گیا، قال فی مراقی الفلاح ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ ولا یجوز کسر عظامہ ولا تحویلہا ولو کان ذمیاً[1] ولا ینبش وان طال الزمان اھ وذکر الطحطاوی فی حاشیتہ نحوہ وانکر علی فعل لحفارین

[1] لہ دنی حکم الذمی کما سیأتی ۱۲ منہ

من نقل عظام الموتی او طمسها او جمعها فی حفیرة فلا یقال تضم او تجمع عظام الاول فی موضع دفعا للضرر عن موتی المسلمین وقال قبله ان ضم عظام المسلم یحصل به اخلال ولا تخلو به عن کسر بسبب التحویل رد لوشیٔ ۱ھ (ص ۳۵۰) واللہ اعلم

**قبرستان میں لوبان سلگانا جائز ہے یا نہیں؟**

**سوال** (۸) خیالِ ناقص خاکسار میں لوبان وخوشبو وغیرہ قبرستان میں سلگانا ناجائز معلوم ہوتا ہے، اکثر لوگ یہاں پر اس وجہ سے کہ آگ دوزخ کی ہوتی ہے منع کرتے ہیں لہٰذا جو حکم ہو، زیادہ حدِ ادب،

**الجواب**: عن عمرو بن العاص رض قال لابنه وهو فی سیاق الموت اذا انا مت فلا تصحبنی نائحة ولا نار الحدیث قال فی المرقاة ای للمباهاة والریاء کما کان عادة الجاهلیة قال ابن حجر ولانها من التفاؤل القبیح وفیه انما سبب التفاؤل القبیح لانها بعضه کما هو ظاهر ۱ھ (ص ۳۸۱ ج۲) وفی حاشیة العلامة الطحطاوی علی المراقی فی علة کراهة الآجر فی القبر ما نصه وبان الآجر به اثر النار فیکره فی القبر للتشاؤم بخلاف الغسل بالماء الحار فانه یقع فی البیت فلا یکره الاحجار فیه بخلاف القبر ۱ھ (ص ۳۵۶)

اگر قبرستان میں خوشبو، لوبان وغیرہ سلگانا بغرض فخر وریاء ہے تب تو کراہت ظاہر ہے، اور اگر یہ غرض نہیں جب بھی یہ فعل اچھا نہیں، کیونکہ اس میں قبر کے پاس آگ جلانا ہے، جو تفاؤلِ قبیح کا سبب ہے، اور گھر میں گرم پانی سے غسل دینا اور تختہ کو اور کفن کو دھونی دینا بضرورت ہے، نیز وہ گھر میں ہوتا ہے اس میں یہ محذور نہیں اس لئے اس کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے، فقط　۱۹ شعبان ۴۶ھ

**محتضر کے لٹانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟**

**سوال** (۹) ..................... جب کوئی مرنے لگتا ہے یا مرگیا، تو یہاں یعنی دکن میں سر اس کا مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی طرف کردیا جاتا ہے، اور سر تھوڑا اٹھا دیا جاتا ہے، تاکہ قبلہ کی طرف منہ اچھی طرح ہوجاوے، ممالکِ شمالی میں اس کے برعکس سر اس کا بجانب شمال اور پاؤں بجانب جنوب کرکے پہلوئے راست پر رو بقبلہ لٹا دیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں مشروع ومسنون طریقہ کون سا ہے، نیز



اس کے متعلق علماء ایں طرف نے مختلف رائے قائم کی ہے، جس سے از روئے شرع و احادیث معتبرہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون طریقہ معتبر ہے، لہٰذا آنجناب معلی القاب سے التجا ہے کہ براہ کرم متنازعہ فیہ مسئلہ پر اپنی خاصی رائے نیز بحوالہ کتبِ معتبرہ حنفیہ مدلل مبرہن ثبوتِ سنیت کس طریقہ میں ہے، تحریر جواب سے ہم راہ روانِ دین کی رہبری فرمادیں، مکرر آنکہ مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب مرحوم کا جواب مندرجہ ذیل تھا، مگر اس پر یہاں کے لوگ حوالہ کتب نہ ہونے سے معترض ہیں،

**الجواب من المولوی المفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی،**

پہلا طریقہ سر بجانب شمال اور پیر بجانب جنوب اور منہ قبلہ کی طرف کردینا یہی مسنون ہے

کتبہ عزیز الرحمن مفتی مدرسہ دیوبند،　۲۶ جمادی الاولی ۳۴ھ

**الجواب صحیح**، قال فی مراقی الفلاح لیسن توجیه المحتضر ای من قرب من الموت علی یمینه لانه السنة وجاز الاستلقاء علی ظهره الخ قال الطحطاوی یوضع هکذا فی الغسل والصلوة قال فی شرح الطحاوی وهو العرف بین الناس قال فی الزاد والاول افضل لانه السنة کذا فی المضمرات ۱ھ ص ۳۶۵،

حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ　از تھانہ بھون　۱۶ شعبان ۴۶ھ

**کیا باپ کی موجودگی میں شوہر میت کا ولی ہوسکتا ہے؟**

**سوال** (۱۰) میت کے باپ کی موجودگی میں شوہر اس کا ولی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا،

**الجواب**: زوج کو ولایت حاصل نہیں، ولایت عصبات کے لئے ہے، البتہ اگر میت کا کوئی ولی موجود نہ ہو تو زوج لوگوں سے مقدم ہے، پس صورتِ مسئولہ میں ولایت باپ کو حاصل ہے، اور اس باب میں وہ سب سے مقدم ہے، کما فی العالمگیریة (ص ۱۰۴ ج ۱) والاولیاء علی ترتیب عصبات الاقرب فالاقرب الا الاب فانه یقدم علی الابن کذا فی خزانة المفتیین قیل هو قول محمد وعندهما الابن اولی والصحیح انه قول الکل کذا فی التبیین وهکذا فی العنایة وفتح القدیر وفی الصفحة الآتیة ولا ولایة للزوج عندنا لانقطاع الوصلة بالموت کذا فی الجامع الصغیر لقاضی خاں فان لم یکن للمیت ولی فالزوج اولی ثم الجیران من الاجنبی، کذا فی التبیین،　الاحقر عبد الکریم عفی عنہ ۲۸ صفر ۴۵ھ

مرنے کے بعد بیوی کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا

**سوال (۱۱)** درمسئلہ مرقومہ علماء محققین چہ می فرمایند، بعد مرگ زوجہ ... باشوہر تعلق باقی ماندیا نہ ونیز دیدن وبدست گرفتن برائے شوہر جائز است یا نہ؟

**الجواب:** اگر عورت کا انتقال ہوجاوے تو شوہر کو اس کی طرف دیکھنا تو جائز ہے لیکن اس کو چھونا جائز نہیں، اور اس کو غسل بھی نہ دیوے، اور اگر مرد مرجاوے تو بیوی کو چھونا اور غسل دینا بھی جائز ہے، کذا فی الدر وغیرہ

## فصل فی الغسل والکفن

میت کو غسل دیتے وقت کس طرح لٹایا جائے

**سوال (۱۲)** ...................میت کو اُتر دکھن لٹا کے غسل دینا چاہیئے یا کہ پورب پچھم، کسی کتاب میں بلکہ بہشتی زیور میں بھی اس کی تصریح نہیں ملی، امید کہ جواب باصواب مع حوالۂ کتب تحریر فرمایا جاوے، فقط

**الجواب:** فی مراقی الفلاح فیوضع کماما ت علی سریر مجمر وترا ووضع المیت کیف اتفق علی الاصح) قالہ شمس الائمۃ السرخسی وقیل عرضا وقیل الی القبلۃ اھ وفی الطحطاوی (قولہ وقیل عرضا) ای کما یوضع فی القبر (قولہ وقیل الی القبلۃ) فتکون رجلاہ الیہا کالمریض اذا اراد الصلوٰۃ بایماء وفی القہستانی عن المحیط وغیرہ انہ السنۃ اھ ص ۳۳۰، خلاصہ یہ کہ غسل کے وقت جس طرح چاہیں میت کو لٹا دیں یہ اصح ہے، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قبلہ کی طرف مُنہ کرکے عرضاً لٹا دیں، جیسا کہ قبر میں رکھا جاتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قبلہ کی طرف طولاً لٹا دیں، اس صورت میں پیر اور مُنہ دونوں قبلہ کی طرف ہوں گے، محیط وغیرہ میں اس طریقہ کو سنت بتلایا ہے، والامر اوسع، واللہ اعلم، احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
ماشاء اللہ شفیت واشتفیت، اشرف علی

جنازے کا کپڑا پھاڑ دینے سے متعلق فتاویٰ عالمگیری کی ایک عبارت کا صحیح مطلب

**سوال (۱)** فتاویٰ ہندیہ ترجمۂ عالمگیریہ کتاب الکراہۃ باب شانزدہم زیارتِ قبور کے بالکل آخر میں ہے، جنازے کا کپڑا پھاڑ دیا جاوے اس طرح کہ جس کام میں پہلے استعمال کیا جاتا تھا اس کام میں مستعمل نہ ہوسکے، اور متولی کو اس کا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے



لیکن اس کو فروخت کرکے اس کے داموں میں کچھ مال زیادہ ملا کر دوسرا کپڑا خرید ے، کذا فی جوہر الفتاویٰ، حضرتا: اس کا کیا مطلب ہے؟ پورا پورا مطلب ومفہومات ارقام فرماویں، جنازے کے کونسے کپڑے پھاڑ دیئے جاویں، یعنی پیراہن پائجامہ پگڑی وغیرہ یا فقط پیراہن، ہمارے یہاں تو فقط پیراہن پھاڑ کر اُتارتے ہیں، کیونکہ میت کے عضو تنگ ہوجاتے ہیں، اس لئے پیراہن اتارنا مشکل ہوجاتا ہے، اس لئے پھاڑ دیا جاتا ہے، باقی یہ قید کہ اس طرح پھاڑیں کہ پہلی طرح استعمال نہ آسکے اس کی کیا وجہ، غرضکہ بخوبی ارقام فرماویں، اور اصل کپڑا پھاڑ کر بیچنا اور نیا کپڑا خرید کرنا کیا ضروری ہے، سمجھ میں نہیں آتا؟

**الجواب:** فتاویٰ ہندیہ میں عالمگیریہ کی عبارت کا ترجمہ اس جگہ بالکل غلط کیا ہے، عبارت عالمگیریہ یہ ہے ثوب الجنازۃ تخرق بحیث لایستعمل فیما کان یستعمل فیہ لا یجوز للمتولی ان یتصدق بہ ولکن یبیعہ بثمن ویشتری بہ وبزیادۃ مال ثوبا اٰخر کذا فی جوھر الفتاویٰ واللہ اعلم،

(ترجمہ) جنازہ کا کپڑا پھٹ گیا، اس طرح کہ اب اس کام میں نہیں آسکتا جس میں استعمال کیا جاتا ہے تو متولی (وقف) کو یہ جائز نہیں کہ اس کو صدقہ کردے (کیونکہ اس میں وقف کو غیر مصرف میں صرف کرنا لازم آتا ہے) اور لیکن اس کو کسی قیمت پر فروخت کردے، اور اس قیمت میں کچھ اور ملا کر اس سے دوسرا کپڑا خرید لے الخ" اور جنازہ کے کپڑے سے مراد اس عبارت میں وہ کپڑا ہے، جو کفن کے اوپر چادرہ کے طور پر ڈالا جاتا ہے، بعض لوگ جنازہ کی چارپائی اور اس کے اوپر کی چادر عام مسلمانوں کے لئے وقف کردیا کرتے ہیں، تاکہ ہر میت کے اوپر وہ چادر ڈالی جاوے، پس وہ چادر اگر پھٹ جاوے اور کام میں نہ آسکے تو اس کا حکم اس عبارت میں مذکور ہے، واللہ اعلم
۱۱ رمضان ۱۳۴۰ھ

کیا شوہر بیوی کے مرنے کے بعد غسل دے سکتا ہے؟

**سوال (۳)** اگر عورت مرجاوے تو اس کا خاوند اس کے جنازہ کا پایا پکڑ سکتا ہے یا نہیں، اور وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتار بھی سکتا ہے یا نہیں، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو وہ اپنی بیوی کو اپنے ہاتھ سے نہلا سکتا ہے یا نہیں، اور اگر خاوند مرجاوے تو وہ عورت اپنے

خاوند کو نہلا سکتی ہی یا نہیں؟ اور اگر کوئی مسلمان کا مُردہ مرجاوے تو اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہیے یا نہیں، جس نے کبھی نماز نہ پڑھی ہو، اس کے واسطے کیا حکم ہے؟

**الجواب**: مرد اپنی بیوی کے جنازہ کو ہاتھ لگا سکتا ہے لیکن اگر اس کے محرم موجود ہوں تو قبر میں نہ اُتارے، اور جو سب غیر محرم ہی ہوں تو شوہر بھی اس کو قبر میں اُتار سکتا ہے، اور اگر کوئی عورت نہلانے والی موجود نہ ہو تو عورت کو مرد غسل نہیں دے سکتا، نہ شوہر اور نہ محارم بلکہ شوہر اس کو تیمم کرادے، اور شوہر کو تیمم کرانے کے لئے اس کے ہاتھ کو اور مُنہ کو دیکھنا جائز ہے، مگر چھوئے نہیں، بلکہ ہاتھ کو کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے، اور بیوی اپنے مرد کو غسل دے سکتی ہے، جبکہ کوئی مرد غسل دینے والا موجود نہ ہو،

مسلمان بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا بھی ضروری ہے، بدون نماز کے دفن نہیں ہو سکتا، اگر بدون نماز کے دفن کیا گیا سب گنہگار ہوں گے، قال فی مراقی الفلاح والمرأۃ تغسل زوجها بخلافه ای الرجل فانه لا یغسل زوجته لانقطاع النکاح واذا لم توجد امرأۃ یغسلها تیممها ای زوجها (ط) ولیس علیه غض بصرہ عن ذراعیها بخلاف الاجنبی اھ فانه یلف یدہ بخرقة وتیممها مع غض بصرہ عن ذراعیها الا ان تکون امة فلا تحتاج الی حائل اھ، (ص ۳۳۳)

واللہ اعلم، ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۴۴ھ،

| کوئی عورت غاسلہ موجود نہ ہو تو بیٹا میت کو بہ نیت غسل تیمم کرادے بیٹے کو غسل دینا جائز نہیں |
|---|

**سوال** (۴)۔ ........................ ایک عورت کا انتقال ایسی جگہ ہو کہ جہاں اس کا خاوند اور اس کا لڑکا دونوں موجود ہوں، اب میت کے غسل کے لئے کوئی عورت نہیں ملتی ہے، اور عنقریب دس میل یا پندرہ میل کے فاصلے پر نہ کوئی شہر ایسا ہے کہ جہاں مسلمانوں کے گھر ہوں، میت والوں کا شہر تین سو میل کے فاصلہ پر ہو اور میت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، حالانکہ جس جگہ میت ہے وہاں نمازی موجود ہیں، لیکن غسلِ میت کے واسطے تلاش کرنے سے بھی عورتیں نہیں ملتیں یہ حادثہ دھرم پور میں فی الحال درپیش ہوا ہے، اس لئے آپ کو تکلیف دی جاتی ہے،

**الجواب**: ایسی حالت میں میت عورت کا محرم یعنی لڑکا میت کو بہ نیت غسل کے تیمم کرادے، یعنی دو مرتبہ مٹی پاک پر ہاتھ مار کر ایک بار تو میت کے مُنہ کو مل دے،



اور اس کے بعد ایک بار مٹی پر ہاتھ مار کر ہاتھوں کو کہنیوں تک مل دے، غسل نہ دیا جائے، کیونکہ اس میں بدن کھولنا اور جسم مستور کو ہاتھ لگانا پڑے گا، ولا یجوز ذلك للرجال مع النساء قال فی مراقی الفلاح ولو ماتت امرأۃ مع الرجال المحارم وغیرهم یمموها کعکسه وهو موت رجل بین النساء وکن محارمة یممنه بخرقة تلف علی ید المیمم الاجنبی حتی لا یمس الجسد یغض بصرہ عن ذراعی المرأۃ ولو عجوزا وان وجد ذو رحم محرم یمم المیت ذکرا کان او انثی بلا خرقة لجواز مس اعضاء التیمم للمحرم بلا شهوۃ کالنظر الیها منها له اھ، ص ۳۳۳ مع الطحاوی واللہ تعالیٰ اعلم

۳ ربیع الاول سنہ ۴۶ھ

| غسلِ میت کے متعلق بہشتی زیور کی ایک عبارت پر شبہ کا جواب |
|---|

**سوال** (۵) بہشتی زیور مدلل مکمل طبع ثانی اشرف المطابع حصہ دوم، ص ۷۷، میں اوّل مسئلہ یہ درج ہے "مسئلہ: اگر کوئی مرد مرگیا اور مردوں میں سے کوئی نہلانے والا نہیں ہے تو جو عورت اس کی محرم ہو وہی نہلاوے غیر محرم کو ہاتھ لگانا درست نہیں، اور اگر کوئی محرم عورت نہ ہو تو اس کو تیمم کرادو" الخ اس کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ کہاں سے اخذ کیا گیا ہے، بظاہر جہاں تک کتب فقہیہ کو دیکھا گیا، اس کے خلاف ہی ملا، فی البدائع وان لم یکن معهن ذلك فانهن لا یغسلنه سواء کن ذوات رحم محرم اولا لان المحرم فی حکم النظر الی العورۃ والاجنبیة سواء فلما لا تغسله الاجنبیة فکذا ذوات محارمه ولکن تیممنه (ص ۳۰۵ ج ۱) وفی العالمگیریة (ص ۱۰۲ ج ۱) والاصل فیه ان کل من یحل له وطئها لو کان حیا بالنکاح یحل لها ان تغتسله والا فلا ومثله فی نور الایضاح، امید کہ حضرت اپنی رائے عالی سے مطلع فرما کر اس اشتباہ کو دور فرمائیں گے،

**الجواب**: عباراتِ فقہ تمام کتابوں[عہ] میں قریبا وہی ہیں جو بدائع وعالمگیری میں ہیں جن کو آپ نے نقل کیا ہے، اس لحاظ سے نقلاً بہشتی زیور کا مسئلہ واقعی مخدوش ہے، مگر درایۃً اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ دو قاعدے کتاب الکراہۃ درمختار میں مصرح ہیں، تنظر المرأۃ من الرجل کنظر الرجل علیه وما جاز النظر الیه جاز لمسه ........ اس مجموعہ کا حاصل یہ ہے کہ ماسوی السرۃ الی الرکبة کا تو عورت محرم مس بھی

عہ البتہ طحطاوی کتاب الرضاع میں ہے وقیل تغسل فی ثیابها ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ

سکتی ہے، اور ماتحت السرۃ الی الرکبۃ کا عدم مس جیسا عورت محرم کے لئے ممنوع ہے رجل کے لئے بھی ممنوع ہے، اور جس حیلہ خرقہ سے مرد غسل دیتا ہے عورت بھی غسل دے سکتی ہے، اللّٰھم ان یقال ان حکم غسل المیت مفترق[ع] عن حکم النظر والمس[1] فی الحیاۃ کما یدل علیہ قول البدائع الجنس یغسل الجنس ولا یغسل الجنس خلاف الجنس اھ واللہ اعلم، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً، ۲۰ر صفر ۱۳۴۰ھ

| | |
|---|---|
| میت پھول جائے اور ہاتھ لگانے کے قابل نہ ہو تو اس کو کس طرح غسل دیا جائے؟ | **سوال (۶)** بحوالہ کشف الغطاء ایک کتاب میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ اگر مردہ پھول گیا ہو اور اس کو |

غسل نہ دے سکیں تو پیٹ پر مسح کرنا کفایت کرتا ہے، انتہیٰ، مگر اس میں مسح کا کوئی طریقہ تحریر نہیں ہے، اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو طریقہ مسح تحریر فرمائیے، اور مقدار بھی واضح ہو،

**الجواب:** فی العالمگیریۃ ولو کانت المیت متفسخا یتعذر مسحہ کفی صب الماء علیہ کذا فی التاتارخانیۃ ناقلاً عن العتابیۃ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میت پھولنے کی وجہ سے ہاتھ لگانے کے قابل نہ ہو یعنی ہاتھ لگانے سے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو صرف پانی بہا دینا کافی ہے، کیونکہ ملنا وغیرہ ضروری نہیں، یہ روایت تو قواعد کے موافق ہے باقی جو روایت سوال میں درج ہے، اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ پیٹ اتنا پھول گیا ہے کہ اس پر پانی بہانا بھی ممکن نہیں تو باقی بدن کو دھو کر یعنی اس پر پانی بہا کر پیٹ پر صرف مسح کر دیا جاوے جیسا کہ زندہ کے لئے غسل و وضو میں حکم ہے تب تو صحیح ہے اور اگر یہ مطلب لیا جاوے کہ غسل کی جگہ صرف پیٹ پر مسح کافی ہے تو بالکل غلط ہے، ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

## فصل فی الصلوٰۃ علی المیّت

| | |
|---|---|
| نماز جنازہ کے اندر ثناء درود اور دعا میں تقدیم و تاخیر کرنا | **سوال (۱)** نماز جنازہ میں قصداً یا سہواً آگے درود پیچھے ثنا یا اول دعا، تب درود پڑھے، غرض ایسی کچھ تقدیم یا |

ع اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مظنۂ شہوت کو بمنزلہ شہوت قرار دیا گیا، اور ضرورت شدید نہیں ہے، کیونکہ غسل کا خلیفہ تیمم موجود ہے، ۱۲ عبد الکریم عفا عنہ

[1] فیان المس یجوز للضرورۃ فی الحیاۃ فباقی وجہ لا یجوز بعد الموت ۱۲ عبد الکریم عفی عنہ



تاخیر سے نماز درست ہوتی ہے یا نہیں؟

**الجواب،** نماز درست ہے، ۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ

| | |
|---|---|
| نماز جنازہ کو نماز جمعہ سے مقدم کرنے کا حکم، | **سوال (۲)** .................. اگر جمعہ کی نماز کے کچھ قبل مسجد میں جنازہ آ گیا، لوگ زیادہ ہونے |

کے واسطے اور ستو آدمی لے کر جنازہ پڑھنے کے واسطے بعد نماز جمعہ کے جنازہ پڑھنا کیسا ہے، اگر امام کسی مصلحت سے جمعہ کی نماز کو مع سنت پڑھ کر بعد اس کے نماز جنازہ پڑھے تو درست ہے یا نہیں، بینوا توجروا؟

**الجواب:** قال فی رد المحتار وتقدم صلوٰۃ العید علی صلوٰۃ الجنازۃ والجنازۃ علی الخطبۃ والقیاس تقدیمہا علی العید لکنہ قدم مخافۃ التشویش کی لا یظنہا من فی اخریات الصفوف انہا صلوٰۃ العید، بحر، ومفادہ تقدیم الجمعۃ علی الجنازۃ للعلۃ المذکورۃ ولانہا فرض عین بل الفتوی علی تقدیم سنتہا علیہا و مر تمامہ فی اول باب صلوٰۃ العید اھ (ص ۱ ج ۹۳۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ نماز جنازہ کو نماز جمعہ اور اس کی سنتوں کے بعد پڑھا جائے، البتہ اگر جنازہ خطبہ سے پہلے آ جائے، اور خطبہ سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھنے میں نمازیوں کو انتشار و تشویش نہ ہو تو پہلے جنازہ کی نماز پڑھ دی جائے، اور اگر انتشار و تشویش کا احتمال ہو تو جنازہ کو نماز جمعہ اور سنت جمعہ کے بعد پڑھا جائے، واللہ اعلم، ۱۰ر رجب ۱۳۴۲ھ

| | |
|---|---|
| نماز جنازہ کی تکرار بدعت اور مکروہ تحریمی ہے، | **سوال (۳)** .................. معروض اینکہ مسئلہ تکرار جنازہ میان علماء ایں دیار اختلاف عظیم واقع |

گشتہ، فلہذا امید تام از تلطف عام ہمی دارد کہ مجرد وصول نیاز نامہ ہذا تحقیق تکرار جنازہ اگرچہ چار دفعہ باشد جائز و رواست یا چہ، بر تقدیر اول بلا کراہت است یا با کراہت، و اگر کراہت باشد تحریمہ بود یا تنزیہہ بزیر قلم فیض رقم مع حوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمایند،

**الجواب،** نماز جنازہ مکرر نہیں ہو سکتی، اس کا تکرار بدعت ہے، اور مکروہ تحریمی ہے، قال فی مراقی الفلاح فان صلی غیرہ ای غیر من لہ حق التقدم بلا اذن ولم یقتد اعادہا ہو ان شاء لعدم سقوطہ حقہ وان تأدی الفرض بہا ولا یعید معہ ای مع من لہ حق التقدم من صلی مع غیرہ لان التنفل بہا غیر مشروع کما

لا یصلی احد علیہا بعدہ وان صلی وحدہ اھ قال الطحطاوی اما اذا اذن اولم یأذن ولکن صلی خلفہ فلیس لہ ان یعید لانہ سقط حقہ بالاذن او بالصلوٰۃ مرۃ وھی لاتتکرر ولو صلی علیہ ولی وللمیت اولیاء آخرون بمنزلتہ لیس لھم ان یعیدوا لان ولایۃ الذی صلی متکاملۃ اھ (ص ۳۴۴) البتہ ایک صورت میں تکرار نماز جنازہ جائز ہے، جبکہ اس شخص کے جو احق بالتقدم ہو بلا اذن کوئی دوسرا نماز پڑھاوے، اور احق بالتقدم نے اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی ہو تو یہ احق بالتقدم اعادہ نماز کرسکتا ہے، واللہ اعلم، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

نماز جنازہ میں سلام کے بعد ہاتھ چھوڑے یا پہلے،

**سوال (۴)** احقر کی نظر میں حضرت کے تتمہ فتاوی امدادیہ ..... گذرا کہ صلوٰۃ جنازہ میں سلام پھیرنے سے آگے ہاتھ چھوڑنا، احقر کو خلجان ہوا کہ علماء دیوبند وغیرہ کے عمل اس کے خلاف دیکھا گیا، اور یہ مسئلہ لے کر اس دیار میں بہت ہی بحث وتکرار شروع ہوگیا، اور عوام میں فتنہ جگہ جگہ برپا ہو رہا ہے، اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں عمل کس پر ہونا چاہئے، للہ رفع خلجان فرماویں زیادہ والسلام مع الاکرام،

**الجواب**، اس مسئلہ میں اس سے زیادہ کچھ تحقیق نہیں ہوسکا جو تتمہ امداد الفتاوی میں ہے کہ یہ قول صحیح ہے، کہ دعائیں پڑھ کر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، اور سلام بعد ہاتھ چھوڑنے کے کیا جائے، کیونکہ وقت سلام کے نہ کوئی دعاء ہے نہ تحریمہ کا بقاء ہے، بلکہ سلام خروج من الصلوٰۃ کے لئے ہے، پس اس وقت نہ قیام لہ قرار فیہ ذکر مسنون کا تحقق ہے نہ حرمت صلوٰۃ باقی ہے، پھر ہاتھ باندھ کر سلام پھیرنے کی کیا وجہ ہے، مگر اس وقت تک علماء دیار کا معمول یہی دیکھا ہے کہ بعد تسلیم کے ہاتھ چھوڑتے ہیں، اور اس میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ سلام تکبیر رابع کے بعد مثل ہوتا ہے، اور سلام بھی دعاء ہے، اس لئے سلام کے وقت بھی وضع یدین بھی باقی رکھا گیا، لیکن ابھی تک شرح صدر نہیں ہوا، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا، واللہ اعلم، بہرحال یہ امر ایسا نہیں ہے جس میں نزاع وتکرار کیا جاوے کہ کلام محض اولویت میں ہے نہ کہ اباحت وحرمت میں، فقط ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ

حکم نماز جنازہ برفرقہ قرآنیہ

**سوال (۵)** محلہ میں گاہ گاہ اموات ہوجاتی ہیں جن کا جنازہ مجھے پڑھنا ہوتا ہے، ان دنوں میں ایک شخص عبدالرحیم نامی اہل قرآن (فرقہ معروفہ



زمانہ حال جس کا بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی ہوئے ہیں) کا انتقال ہوا، یہ شخص مجمع احباب میں یہ الفاظ کہتا تھا کہ صحاح ستہ محض خرافات ہیں، قرآن کے بعد کسی دوسری وحی کو ماننا صریح شرک ہے، اور ان احادیث کے ماننے والے اکفر ہیں، عوام میں تقیہ کرتا تھا، احقر نے مندرجہ بالا الفاظ چار پانچ مرتبہ اس کی زبان سے سنا تھا، چونکہ میرے محلہ کا تھا لوگوں نے نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مجھ سے کہا، میں کنارہ کش ہوگیا، کیونکہ مجھ میں مخالفت کی جرأت نہ تھی، اب دریافت طلب یہ ہے کہ میں گنہگار تو نہیں ہوا؟ کیا مجھے جنازہ پڑھنا چاہئے تھا، لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس نے توبہ کرلی ہو، تم نے اچھا نہیں کیا، آخر جماعت مسلمین میں شامل تھا؟

**الجواب**: قرآن کی طرح حدیث کا حجت شرعیہ ہونا اجماعی اور قطعی مسئلہ ہے، اور یہ فرقہ حجیت حدیث کا منکر ہے، خصوصاً جو شخص حدیث کو خرافات کہے اور قرآن کے بعد وحی حدیث کے ماننے کو شرک کہے وہ تو قطعاً کافر ہے، ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا آپ کو جائز نہیں تھا، اچھا کیا کہ ٹل گئے، فی العالمگیریۃ عن صدر الاسلام سئل عن من قرأ حدیثا من احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجل ھمہ روز خلشہا خواند قال ان اضاف ذلک الی القاری دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم ینظر ان کان حدیثا یتعلق بالدین واحکام الشرع یکفر وان کان حدیثا لایتعلق بہ لایکفر ویحمل مقالتہ علی ان ارادتہ قراءتہ غیرہ اولی اھ (ص ۱۶۱ ج ۳) ومثلہ فی (ص ۱۶۳ ج ۳) والصحاح شاملۃ علی الاحکام وغیرھا فقط، ۱۶ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ

متعدد جنازوں پر ایک نماز بھی کافی ہے

**سوال (۶)** اگر چند جنازے موجود ہوں تو نماز ایک ہی کافی ہے یا متعدد؟ امید ہے مدلل ومشرح صاف صاف بیان فرماکر مشکور فرمائیں گے

**الجواب**: چند جنازوں کی نماز ایک ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اگر مردوں اور عورتوں کے جنازے مختلط ہوں تو امام کے قریب مردوں کے جنازے ہوں اور عورتوں کے ان کے پیچھے ہوں اور بچوں کے عورتوں اور مردوں کے بیچ میں ہوں، اور دیندار کو غیر دیندار سے مقدم کیا جاوے، واللہ اعلم، ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ

**دریا میں غرق ہوکر ایسی حالت میں لاش برآمد ہوئی کہ جسم کی صرف ہڈیاں باقی ہوں تو ایپر نماز جنازہ پڑھی جاے یا نہیں**

سوال (۷) ایک دن دو عورتیں دریا میں ڈوب گئیں اور دوسرے دن تھانیدار نے کانٹا ڈال کر لاشیں نکلوائیں تو صرف ہڈی نکلی، یعنی سر کر پاؤں تک کل جسم کی ہڈیاں ایک میں ایک جڑی ہوئی نکلیں، تو اب اس کا جنازہ مثل اور مُردوں کے پڑھنا چاہئے یا نہیں، یہاں تو اس کو صرف ایک کپڑے میں لپیٹ کر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کردیا گیا تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: قال الطحطاوی تحت قول مراقی الفلاح صلی علی قبرہ مالم یتفسخ مانصّہ ای تتفرق اعضاءہ فان تفسخ لایصلی علیہ مطلقا لانہا شرعت علی البدن ولا وجود لہ بعد التفسخ اھ (ص ۳۴۵) وفی مراقی الفلاح فی شرائط الصلوٰۃ علی المیت والرابع حضورہ او حضور اکثر بدنہ او نصفہ مع رأسہ اھ (ص ۲۳۹) قلت والظاہر ان البدن یطلق علی مجموع اللحم والعظام لا علی العظام وحدہا، صورتِ مسئولہ میں ان ہڈیوں پر نماز پڑھنا نہ چاہئے تھا، بلکہ ویسے ہی کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردینا چاہئے تھا، واللہ تعالیٰ اعلم، ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

**میت کا جسم پھول اور پھٹ جاے تو نمازِ جنازہ ساقط ہوجاتی ہے؟**

سوال (۸) ......................... حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کے نمازِ جنازہ میں متعلق عوام کا یہ خیال ہے کہ چھ روز کے بعد پانی میں لاش ملی، اور لاش نکالنے کے بعد پانی کے باہر اُن کا پیٹ پھوٹ گیا، آیا اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی درست ہے یا نہیں؟ اس کا خلاصہ عنایت فرمایئے، باقی والسلام

الجواب، اس حالت میں نماز ساقط ہوجاتی ہے، کما یدل علیہ قول البحر (ص ۱۸۲ ج ۲) قول الکنز صلی علی قبرہ مالم یتفسخ لان الصلوٰۃ بدون الغسل لیست بمشروعۃ ولا یؤمر بالغسل لتضمنہ امرا حراما وہو نبش القبر فسقطت الصلوٰۃ اھ وقید بعدم التفسخ لانہ لایصلی علیہ بعد التفسخ لان الصلوٰۃ شرعت علی بدن المیت فاذا تفسخ لم یبق بدنہ قائما اھ واللہ اعلم، کتبہ الاحقر عبد الکریم ۱۱ محرم ۱۳۴۴ھ یوم جمعہ الجواب صحیح ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۱۶ محرم ۱۳۴۴ھ یوم جمعہ

**اگر میت کے جسم سے نجاست نکلنا بند نہ ہو تو اُس پر نماز پڑھی جاے یا نہیں؟**

سوال (۹) ایک مُردہ کا پائخانہ بند نہیں ہوتا، آیا اس کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں؟



الجوابؔ، کفن دینے کے بعد اگر میت سے نجاست نکلے تو اس کو دھونے کی ضرورت نہیں اور اس پر اسی طرح نماز درست ہے، فی الشامی (ص ۵۷۵ ج ۱) (قولہ وماخرج منہ یغسلہ) ای تنظیفا بحر قال الرملی ای لاشرطا حتی لوصلی علیہ من غیر غسلہ جاز وہذا مما لایتوقف فیہ اھ وفی الاحکام عن المحیط یمسح ما سال ویکفن وفی کتاب الصلوٰۃ للحسن اذا سال قبل ان یکفن غسل وبعدہ لا اھ قلت وسیأتی تمامہ فی بحث الصلوٰۃ علیہ (ای ص ۹۷)

کتبہ احقر عبد الکریم عفی عنہ ۲ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ، صحیح ظفر احمد عفا عنہ ۲۰ ر ۱ ۱۳۴۴ھ

**جنازہ شرقاً و غرباً رکھ کر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے،**

سوال (۱۰) میت کا جنازہ پڑھا گیا اور اس کی چارپائی شرقاً غرباً رکھی گئی، گویا پاؤں مغرب کی طرف اور سر مشرق کی طرف تھا ایسا کرنے میں شرع محمدی مانع ہے یا نہیں؟

الجوابؔ، سنت یہ ہے کہ امام کے سامنے جنازہ اس طرح رکھا جاوے کہ میت کا سر امام کے دائیں جانب ہو اور پاؤں بائیں جانب، اس کے خلاف کرنا بُرا ہے؛ کما فی الشامی وافاد ان السنۃ وضع رأسہ مما یلی یمین الامام کما ہو المعروف الاٰن ولہذا علل فی البدائع الاساءۃ بقولہ لتغییرہم السنۃ المتوارثۃ ویوافقہ قول الحاوی القدسی (ص ۹۰۸ ج ۱) احقر عبد الکریم عفی عنہ ۵ محرم ۱۳۴۵ھ، الجواب صحیح، ظفر احمد عفا عنہ، ۶ محرم ۱۳۴۵ھ

**بے نمازی پر نمازِ جنازہ پڑھائی جاے یا نہیں،**

سوال (۱۱)..........................، غیر نمازی اشخاص کے ساتھ کیا سلوک کیا جاے، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی جاے یا نہیں، قرآن خوانی کی جاے یا نہیں، محض اُن کو خوف دلانے کے لئے ہم ایسا کرسکتے ہیں یا نہیں، قبریں دفن کردینے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن چند لوگ خفیہ طریقہ سے کسی وقت جاکر نمازِ جنازہ پڑھ لیا کریں، تاکہ غیر نمازیوں کو یہ راز نہ معلوم ہو، اور غیر نمازی سے کیا مراد ہے، بعض لوگ دو روز پڑھ کر دس روز غائب ہوجاتے ہیں، اور پھر ایک روز پڑھ کر ایک ماہ غائب ہوجاتے ہیں، اگر ایسے غائب کردہ وقت میں فوت ہوگئے تو کیا حشر کیا جاوے، کیا غیر نمازی کی میت چالیس قدم گھسیٹنے کا حکم

بھی محمد رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے، بہرکیف جو کچھ حضور تحریر فرمادیں، غلام جواب کا دل و جان سے منتظر ہے،

**الجواب:** بے نمازی جو زیادہ تر نماز نہ پڑھتا ہو اس کے جنازہ کی نماز پڑھنا عام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، بدون نماز کے دفن کرنا حرام ہے، زجر کے لئے اتنا کافی ہے کہ بستی کا عالم اس کی نماز نہ پڑھے، باقی اور لوگوں کو پڑھنا ضروری ہے ورنہ سب گنہگار ہوں گے، اور قبر پر پڑھ لینا اس گناہ سے سبکدوش نہیں کرسکتا، لانہ جوز للضرورۃ واللہ اعلم
۲۲ر شعبان ۴۵ھ

جوتوں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

**سوال (۱۲)** اکثر لوگ جنازہ کی نماز جوتہ پہنے ہوئے پڑھتے ہیں، اور امام بھی، اور کوئی اوپر جوتے کے پیر رکھ لیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، اور بارش کے موسم میں جبکہ جوتے تمام ناپاکی سے اوپر تلے سنے رہتے ہوں، اور سب مٹی سے لھسے رہتے ہوں اس امام کے پیچھے جنازہ کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے، اور اس میت کی نماز ہوگئی یا نہیں، جواز کی صورت کس طرح ہے،

**الجواب:** قال فی العالمگیریۃ ولو قام علی النجاسۃ وفی رجلیہ نعلان او جوربان لم یجز صلوتہ کذا فی المحیط السرخسی ولو خلع نعلیہ وقام علیہما جاز سواء کان مایلی الارض منہ نجسا اوطاہرا اذا کان مایلی القدم طاہرا اھ (ص ۳۸ ج ۱) وفیہ ایضا الخف اذا اصابتہ النجاسۃ ان کانت متجسدۃ کالعذرۃ والروث والمنی یطہر بالحت اذا یبست وان کانت رطبۃ فی ظاہر الروایۃ لا یطہر الا بالغسل وعند ابی یوسف اذا مسحہ علی وجہ المبالغۃ بحیث لا یبقی لہا اثر یطہر وعلیہ الفتوی لعموم البلوی کذا فی قاضی خان اھ وفیہ ایضا والارض تطہر بالجفاف وزوال الاثر للصلوۃ لا التیمم کذا فی الکافی اھ (ص ۲۷ ج ۱)

(۱) اور جوتوں میں سے پیر نکال کر اوپر رکھ لئے تو یہ ضروری ہے کہ جوتوں کا اوپر کا حصہ جو پیر سے متصل ہے پاک ہو گو نیچے کا ناپاک ہو (۲) اگر جوتے پہنے پہنے نماز پڑھے تو یہ ضروری ہے کہ زمین اور جوتے کے اندر اور نیچے کی دونوں جانبیں پاک ہوں، لیکن نیچے کی جانب کو پاک کرنے کے لئے دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ زمین سے خوب اچھی طرح



رگڑ دینا بھی کافی ہے، اور اس صورت میں زمین کا پاک ہونا بھی شرط ہے۔

(۳) اگر جوتہ نکال کر زمین پر کھڑے ہوں تو زمین کا پاک ہونا شرط ہے، اور زمین خشک ہوکر پاک ہوجاتی ہے، جبکہ ناپاکی کا اثر باقی نہ رہے، اس تفصیل سے تمام شقوق کے احکام معلوم ہوجائیں گے، واللہ اعلم ۲۳ر رمضان المبارک ۴۵ھ

نماز جنازہ نماز عیدین سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہئے

**سوال (۱۳)** ............ میت کی نماز عیدین پر مقدم ہونی چاہئے یا مؤخر

**الجواب:** قال فی الدر وتقدم صلاتہا ای العید علی صلوۃ الجنازۃ اذا اجتمعا وتقدم صلوۃ الجنازۃ علی الخطبۃ وعلی سنۃ المغرب وغیرہا (کسنۃ الظہر والجمعۃ والعشاء ۱۲ شامی) والعید علی الکسوف اھ قال الشامی الاولی التعلیل بخوف التشویش علی الجماعۃ بان یظنوہا صلوۃ العید ثم رأیتہ کذلک فی جنائز البحر عن القنیۃ اھ (ص ۸۶۵ ج ۱ باب العیدین)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کو نماز عید سے مؤخر اور خطبہ عید سے مقدم کرنا چاہئے، اور گو صاحب اشباہ نے نماز عید سے جنازہ کو مقدم کیا ہے ..... مگر راجح وہی ہے جو درمختار میں ہے، واللہ اعلم، قال فی الدر بعد العبارۃ المذکورۃ سابقا لکن فی البحر قبیل الاذان عن الحلبی الفتوی علی تاخیر الجنازۃ عن السنۃ واقرہ المصنف کانہ الحاقا لہا بالصلوۃ اھ (ص ۸۶۶ ج ۱) قلت وینبغی بناء علیہ تاخیر الجنازۃ عن خطبۃ العید لکونہا ملحقۃ بالصلوۃ العید وہو الارفق بالناس لما فی اجتماع الناس بعد الجنازۃ للخطبۃ من خشیۃ الانتشار والفرار، واللہ اعلم، اس روایت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نماز جنازہ کو خطبۂ عید سے بھی مؤخر کیا جائے، اور یہی سہل ہے ورنہ لوگ نماز جنازہ کے بعد خطبہ نہ سنیں گے، واللہ اعلم۔
۸ر شوال ۴۶ھ

جس کی ختنہ نہ ہوئی ہو... مگر دیگر دلائل اس کے مسلمان ہونے کی موجود ہوں تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟

**سوال (۱۴)** ............ ایک شخص مسمیٰ بھورے شاہ عرف موتی شاہ جو کہ مجذوب تھا اور ایک عرصۂ دراز سے منصوری میں رہتا تھا، اور وہ قوم کا مسلمان تھا، جس گاؤں میں وہ رہتا تھا، ان سے تصدیق

ہوگیا کہ وہ مسلمان تھا، اور کم عمری میں دہلی کی طرف چلا گیا تھا، اور اب ایک عرصۂ دراز سے منصوری میں رہتا تھا، اور اس کا انتقال یہاں پر ہوگیا، اس کی ہم مسلمانانِ منصوری نے تجہیز و تکفین کرنا چاہی، اور نعش کو جامع مسجد منصوری میں لائے، تو ایک شخص کابلی جو کہ منصوری میں رہتا ہے، اور دوکانداری بساطخانہ وغیرہ کرتا ہے، اس نے کچھ مسلمانان یعنی قوم قصابان کو جو کہ وہاں پر موجود تھے بہکا دیا: اور کہدیا کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہے ہندو ہے، کیونکہ اس کی ختنہ نہیں ہوئی تھی، جبکہ وہ اس مکان سے نابالغی کی حالت میں نکل گیا تھا اس وجہ سے اس کی ختنہ نہیں ہوئیں، تو کیا اس سے یہ تصور کرلیا جاوے کہ وہ ہندو تھا، جبکہ تصدیق پیشتر ہی سے ہو چکی تھی کہ وہ مسلمان ہے، خیر یہ سب قصہ اس کابلی شخص نے کیا، اور کچھ مسلمانانِ منصوری علیحدہ ہوگئے، اور شریکِ جنازہ نہ ہوئے، پھر ایک شخص مرزا صاحب جو کہ محلہ راجمنڈی کی مسجد میں پیش امام ہیں انھوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی، اور اُن کو بھی یہ کابلی شخص ہر قسم کی دھمکیاں دیتا رہا، کہ تم نے کافر کی تجہیز و تکفین کی ہے ہم تم کو جان سے مار دیں گے، اب اس قدر التجا ہے کہ اس مجذوب کی بابت جو کام ہم نے کیا وہ کس حد تک صحیح تھا؟

**الجواب**: جس شخص کے والدین مسلمان ہیں اور وہ نابالغی میں مجذوب یا مجنون ہوگیا، تو وہ مسلمان ہی مانا جاوے گا، اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھنی واجب تھی، ختنہ کے ہونے یا نہ ہونے سے اسلام و کفر کا حکم وہاں لگایا جاسکتا ہے جہاں اور کوئی صورت تحقیق اسلام و کفر کی نہ ہو، اور جہاں دوسرے دلائل موجود ہوں، وہاں صرف ختنہ کا نہ ہونے سے حکم کفر نہیں ہوسکتا، بس جن مسلمانوں نے اس میت کے جنازہ کی نماز پڑھی انھوں نے ٹھیک کیا، ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، جو لوگ اس فعل پر انکار کرتے ہیں وہ احکامِ شرعیہ سے جاہل ہیں یا متجاہل، واللہ اعلم،

۶ر رمضان ۱۳۴۵ھ

| غائبانہ نمازِ جنازہ کا حکم |
|---|

**سوال** (۱۵) میت موجود ہوتے ہوئے باوجود قدرت شرکتِ نماز ایک قصبہ میں نماز غائبانہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

**الجواب**: میت سامنے رکھے بغیر نماز جنازہ صحیح نہیں چاہے اس قصبہ وغیرہ میں پڑھی جاوے جس میں میت ہو، یا کسی دوسرے مقام میں دونوں کا ایک حکم ہے، فی العالمگیریۃ (ص ۱۰۵ ج ۱) ومن الشروط حضور المیت ووضعه وکونه امام المصلی فلا یصح



علی غائب ولا علی محمول علی دابة ولا علی موضوع خلفه هکذا فی التبیین لفائق، احقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۸ر صفر ۴۵ھ

| نمازِ جنازہ میں کون شخص ولی سے احق بالامامت ہے۔ |
|---|

**سوال** (۱۶) کدام شخص برائے نمازِ جنازہ لائق تر از ولی است بحوالہ کتب توجہ فرمایند،

**الجواب**: ولی سے مقدم سلطان و قاضی وغیرہ ولاۃ مسلمین ہیں، اور ان کی تقدیم والی پر واجب ہے اور امام محلہ و امام جمعہ کی تقدیم ولی پر مستحب ہے، فقط کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۲۹ر محرم ۱۳۴۶ھ

الجواب صحیح، ظفر احمد

| شوافع بلاعذر مسجد میں نماز جنازہ پڑھائیں تو حنفیوں کو اُن کی اتباع کرنی چاہئے یا نہیں |
|---|

**سوال** (۱۷) میت کا ولی شافعی ہے، اور امام بھی انھوں نے نمازِ جنازہ مسجد میں بلاعذر پڑھی تو حنفیوں کو بحالتِ موجودگی اتباع کرنی چاہئے یا نہیں، نیز صورتِ مذکورہ میں موجود ہوتے ہوئے نماز ترک کرنے میں گناہ گار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا عنداللہ،

**الجواب**: جب جماعت میں حنفی بھی ہوں اس وقت شافعی حضرات کو ان کی رعایت کرکے خارج مسجد انتظام کرنا چاہئے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو ایسے موقع پر مجبوراً حنفیہ کو شاملِ نماز ہوجانا چاہئے، اور عذر کی وجہ سے امید ہے کہ اُن پر مواخذہ نہ ہوگا، کما فی الفتاوی الشامیة ص ۹۲۶ ج ۱ تحت قول الدر (فلا صلوة له) تتمه انما تكره فی المسجد بلا عذر فان كان فلا ومن الاعذار المطر كما فی الخانية والاعتكاف كما فی المبسوط كذا فی الحلية وغيرها والله اعلم اور جو شخص احتیاطاً شرکت سے پرہیز کرتا ہے اس کے لئے بھی گنجائش ہے، کتبہ الاحقر عبدالکریم عفی عنہ ۵ر ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

| غیر من له حق التقدم نے نماز جنازہ پڑھائی، ولی اگر اعادہ کرے تو ولی کی نماز فرض ادا ہوگی یا نفل اور جو لوگ سابق جماعت میں شریک نہ ہوسکے تھے اس میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ |
|---|

**سوال** (۱۸) سیدی المحترم ادام اللہ ظلال فیوظکم، بعد سلام مسنون معروض خدمت عالی اینکہ مسئلہ مندرجہ ذیل میں چند اشکال درپیش ہیں، امید ہے کہ ان کو حل فرماکر تسکین فرمائیں گے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ غیر من له حق التقدم نے اگر میت کی نماز پڑھائی تو ولی اعادہ کرسکتا ہے؟ اوّل اشکال یہ ہے کہ فرض جماعتِ اولیٰ سے ساقط ہوگیا، اب ولی کی نماز فرض ادا ہوگی یا نفل، دوسرے یہ کہ ولی کے ساتھ وہ لوگ جنھوں نے اب تک نماز نہیں پڑھی شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریک نہیں ہوسکتے، اور ولی تنہا

نماز پڑھے، اس لئے کہ ولی کو اجازت اس لئے دیگئی ہے کہ اس کا حق باقی رہ گیا ہے، اور دوسرے لوگوں کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لہذا جماعت ثانیہ ولی کے ساتھ نہیں ہوسکتی، اسی کی تائید اس مسئلہ سے ہوتی ہے، جو تیمم کے باب میں ہے، کہ ولی کے علاوہ اور لوگوں کو اگر فوتِ صلوٰۃ کا خوف ہو تو تیمم کرلیں اور ولی وضو کرے، اور لوگوں کو اگر ولی کے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی تو یہ چاہئے تھا کہ اگر ولی کو وضو کرتے دیکھیں تو یہ بھی وضو کرلیں، اور ولی کے ساتھ شریک ہوجائیں اور جماعت ثانیہ کرلیں، اور تیمم نہ کریں، حالانکہ یہ کہیں نہیں ملتا، ادھر اس صلوٰۃ کا فرض کفایہ ہونا یہ بتلاتا ہے کہ فرض تو تھی ہر ایک پر مگر بعض کے ادا کرنے سے اوروں سے ساقط ہوجاتی ہے، اور اگر دوسرے بنفسہ ادا کریں تو ہر ایک سے فرض ہی ادا ہوگا، لہذا بعد میں ولی کی اور اس کے ساتھیوں کی نماز فرض ادا ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک شہر میں اگر کئی شخص اعتکاف کریں تو ہر ایک کی سنت ادا ہوگی، غرضیکہ بہت تردد ہے، بدائع و فتح القدیر و شامی وغیرہ بہت دیکھیں، جزئیہ مرقومہ کہیں نہیں ملتا، کہ تعددِ صلوٰۃ جنازہ اس طریقہ پر جائز ہے یا نہیں؟

**الجواب:** قال فی ردّ المحتار فالاحسن الجواب عما قاله المقدسی بان اعادة الولی لیست نفلا لان صلوٰة غیره وان تأدی بها الفرض وهو حق المیت لکنها ناقصة لبقاء حق الولی فیها فاذا اعادها وقعت فرضا مكملا للفرض الاول فلیس لمن صلی اولا ان یعیدها مع الولی لان اعادته تكون نفلا من كل وجه بخلاف الولی لانه صاحب الحق اھ (ص ۹۲۳ ج ۱)

اس عبارت سے امور ذیل مستفاد ہوئے:- (۱) ولی کا اعادہ بطور نفل کے نہیں (۲) جو لوگ پہلی جماعت میں شریک ہوچکے ہیں، اُن کو ولی کے ساتھ اعادہ مکروہ ہے (۳) جو لوگ پہلے شریک نہ ہوئے ہوں ان کو ولی کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے، افادہ قید لمن صلی اولا و قیود الفقہ احترازیۃ، اور تیمم کے مسئلہ پر قیاس درست نہیں، کیونکہ جو لوگ جماعت اولی کے وقت حاضر ہیں اور تیمم کرکے جماعت اُولیٰ کو پاسکتے ہیں، ان کو جماعت ثانیہ کا انتظار مکروہ ہے، اس لئے وہ مامور بالتیمم ہیں، کیونکہ انتظار جماعت ثانیہ میں جماعت ثانیہ کا گونہ اہتمام ہے، حالانکہ بعد ادائے فرض کے دوسری جماعت قابل اہتمام نہیں ہے، اور ولی کو تیمم کی اجازت اس لئے نہیں کہ وہ صرف اپنے حق کی وجہ سے



تنہا بھی نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے اس کو انتظارِ جماعت کی ضرورت نہیں،

ایک ہی مکان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو جل کر مر جائیں اور تمیز ممکن نہ ہو تو انپر نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائیگی

**سوال (۱۸)** ایک گھر کے اندر کتنے مسلمان و ہندو رہتے تھے، اتفاق سے وہ گھر مع جملہ اشخاص جل گیا، ابھی مسلمان ہندو کا تمیز کرنا دشوار ہے اس وقت میں نماز جنازہ کس طرح پڑھی جاوے؟

**الجواب:** سب پر نماز پڑھ لی جائے مگر نیت مسلمانوں پر نماز پڑھنے کی کی جائے، کذا فی الشامیة، ص ۹۰۰ ج ۱ ورجح الصلوٰة فی الاحوال الثلث سواء كان الكفار اکثر او اقل او کانوا سواء، واللہ اعلم۔ ۲۸ ذی الحجہ ۴۲ھ

# فصل فی حمل الجنازة ودفنها

تختے رکھ دینے کے بعد قبر پر مٹی ڈالنا مستحب ہے اور اس سے پہلے مکروہ ہے

**سوال (۱)** ........ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد قبر میں مٹی ڈالنا اندر کیسا ہے؟

**الجواب:** جب میت پر تختہ وغیرہ رکھ دیئے جاویں، اس کے بعد تین مٹھی سے مٹی ڈالنا ہر شخص کو مستحب ہے، قال فی المراقی الفلاح ویهال التراب ستراله ویستحب ان یحثی ثلاثا اھ، اور اگر تختے وغیرہ ابھی تک نہ رکھے گئے ہوں تو مٹی ڈالنا قبر کے اندر مکروہ ہے، کیونکہ اس میں تلویث میت ہے،

تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا حکم

**سوال (۲)** ما قولکم علماء نا رحمکم اللہ، اس مسئلہ میں کہ بعد دفنِ میت کے جو دعاء ایصالِ ثواب کے لئے پڑھنا ثابت ہے اس دعاء میں رفع یدین کو مثل اور دعاؤں کے آدابِ دعاء سمجھنا اور عوام کا اسکو مثل واجب جاننا اور تارک کو قابلِ ملامت سمجھنا، اور دعاء میں اگر رفع ید کریں تو قبولیت میں منحصر کرلینا جائز ہے یا نہیں، اور بوجہ فساد عقیدہ عوام کے اس رفع ید کو ترک کرنا ضروری ہے یا نہیں بینوا توجروا، بحوالۃ الکتب المعتبرۃ؟

**الجواب:** بعد دفنِ میت کے دعاء بدون رفع یدین کے کرنی چاہئے، میں نے فقہ کی کسی کتاب میں اس موقع پر غیر رافع یدیہ کی قید دیکھی ہے، مگر اس وقت باوجود تلاش

بسیار کے وہ عبارت نہیں ملی، مگر قیاس اس کا مؤید ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے، سوال من اہل القبور کا خصوصاً جبکہ عوام اس کو ضروری سمجھنے لگیں تو اس کا ترک کر دینا ضروری ہے،

۸ ار جمادی الاولی ۱۳۴۱ھ

میت کو قبر میں دائیں پہلو پر لٹانا چاہئے

**سوال** (۳) ہمارے اس ملک میں دستور پڑ گیا ہے کہ مردہ کو قبر میں چت لٹا کر فقط سر کو قبلہ رُخ کر دیتے ہیں، اور کتاب میں ہے دائیں کروٹ پر رکھ دینا اس میں کوئی خرابی ہے یا نہیں، اور حکم کتاب کس طریقہ پر ٹھیک رہے گا، ؟

**الجواب**؛ مُردہ کو قبر میں داہنے پہلو پر لٹانا چاہئے، اور کمر کو دیوار قبر سے سہارا دیدینا چاہئے، اور اگر لحد ہو تو کمر کے نیچے کوئی پتھر یا کچی اینٹ رکھ دینی چاہئے، تاکہ استقبال قبلہ باقی رہے، قال فی الدر ویستحب ان یدخل من قبل القبلۃ الی ان قال و یوجہ الیہا وجوبا وینبغی کونہ علی شقہ الایمن اھ وفی رد المحتار لکن صرح فی التحفۃ بانہ سنۃ اھ ص ۹۳۵ ج ۱ مصری وفی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح وفی الحلبی ویسند المیت من ایت من ورائہ بنحو تراب لئلا ینقلب اھ، ۸ ار جمادی الاولی ۱۳۴۱ھ

صندوقی قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہئے؟

**سوال** (۴) صندوقی قبر کی گہرائی زمین کی ہمواری سے میت کی نصف قد گہرائی ہو یا جہاں بانس قبر کا پاٹ بند کرنے کے لئے جس جگہ پر رکھا جاتا ہے وہاں سے میت کی نصف قد گہرائی مراد ہے؟

**الجواب**! فقہا نے جہاں گہرائی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد زمین کی ہمواری سے ہی گہرائی کا بیان کرنا ہے، لیکن گہرائی کا انحصار نصف قامت پر نہیں ہے، بعض نے نصف قامت لکھا ہے، اور بعض نے الی الصدر لکھا ہے، پس ہر جگہ کے مناسب جتنی گہرائی ہو اتنی گہرائی رکھنی چاہئے، قال فی نور الایضاح ویحفر القبر نصف قامۃ او الی الصدر وان یزد کان حسنا لانہ ابلغ فی الحفظ اھ (ص ۲۵۴) ۲ ر صفر ۱۳۴۳ھ

قبر میں فرشتے کو بٹھلائے جانے کی وجہ سے قبر گہرا کرنے کا حکم،،

**سوال** (۵) قبر میں مردہ کے پاس رومان فرشتہ آ کے مُردہ کو بٹھاتا ہے، اس بٹھانے پر گمان کر کے قبر کی پاٹ کا بانس کے نیچے دو ہاتھ یا ڈھائی ہاتھ گہرائی کھودتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مُردہ بیٹھنے میں پاٹ کے بانس سر میں نہ لگ جائے، یہ گمان گناہ میں داخل ہے یا نہیں؟

اور اگر یہ دونوں مسئلے النور میں شائع کر دیے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوں گے،



**الجواب**؛ قبر کا قاعدہ یہ ہے کہ اول تو بغلی قبر افضل ہے، اگر بغلی نہ ہو صندوقی ہو تو بانس یا تختے وغیرہ میت کے جسم سے متصل ہونے چاہئیں، اور جس حصہ میں مٹی بھری جاتی ہے وہ زیادہ گہرا ہونا چاہئے، تاکہ جانوروں سے خوب حفاظت رہے، باقی میت جو قبر میں اُٹھ کر بیٹھتی ہے تو وہ بیٹھنا برزخی ہے، جو اس جسم سے نہیں ہوتا، بلکہ جسم مثالی سے ہوتا ہے اس لئے اس بیٹھنے میں بانس وغیرہ اس کے سر میں نہیں لگتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی اس کے جسم سے قریب ہوں، باقی عذاب قبر جسم عنصری و جسم مثالی دونوں پر ہوتا ہے، اور میت کے پاس رومان فرشتہ کوئی نہیں آتا بلکہ دو فرشتے آتے ہیں، جن کو منکر نکیر کہتے ہیں ہذا واللہ اعلم بالصواب، ۲ ر صفر ۱۳۴۳ھ

میت کو قبر میں رکھنے کا مسنون طریقہ،

**سوال** (۶) کوئی کہتا ہے کہ مردہ کو قبر میں چت کر کے رکھا جاوے اور مُنہ قبلہ کی طرف، کیا معنی؟ بلکہ تمام وجود داہنی کروٹ کر کے قبلہ کی طرف کر دیا جاوے، اب کون بات صحیح ہے؟

**الجواب**؛ قال فی مراقی الفلاح ویوجہ الی القبلۃ علی جنبہ الایمن بذلک امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیاً لما مات رجل من بنی عبد المطلب فقال یا علی استقبل بالقبلۃ استقبالاً وقولوا جمیعا باسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ وضعوہ لجنبہ ولا تکبوہ علی وجہہ ولا تلقوہ علی ظہرہ کذا فی الجوہرۃ وفی الحلبی ویسند المیت من ورائہ بنحو، اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں داہنے پہلو پر قبلہ کی طرف کروٹ دے کر رکھنا چاہئے، چت نہ لٹایا جائے اور اُس کی کمر کے نیچے سہارے کے لئے مٹی یا کچی اینٹ رکھ دی جائے تاکہ چت نہ ہو جائے اور استقبال قبلہ فوت نہ ہو جائے، واللہ اعلم

۷ ر رجب ۱۳۴۵ھ،

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد سب بند کھولنے چاہئیں،

**سوال** (۷) .................. مردہ کو غسل دے کر کفن پہنا کر ایک بند پیروں پر اور ایک کمر پر اور ایک سر پر باندھ دیتے ہیں، تو قبر میں رکھ کر یہ تینوں بند کھول دیئے جائیں یا کوئی سا بند نہ کھولا جائے، بعض صاحبوں کا یہ فرمان ہے کہ کمر کا بند نہ کھولا جائے، کیونکہ جب فرشتے مُردے کو حساب کے واسطے بٹھائیں گے تو مُردہ برہنہ ہو جائے گا،

**الجواب**؛ قبر میں مُردہ کو رکھ کر سب بند کھول دیئے جائیں کمر کا بھی اور سر وغیرہ

کا بھی اور برہنگی کا شبہ غلط ہے، مُردہ کا قبر میں بیٹھنا جسمِ مثالی سے ہوتا ہے، یہ جسم تو اگر کوئی بہرہ دے برسوں تک اسی طرح پڑا رہے گا، ۲۹ ربیع الثانی ۴۸ھ

## فصل فی الشہید

جس شخص نے مرض ضیق النفس میں وفات پائی ہو وہ شہید کہلائیگا یا نہیں، وہ شہید کامل ہے یا ناقص

**سوال** (۱) کسی شخص کو مرض ربو ہو، جس کو ہندی میں دمہ کہتے ہیں، اس مرض میں اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی لیٹ نہیں سکتا، اور کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، کہ سانس کی بیماری بھی کہتے ہیں، اس بیماری میں سوائے بیٹھنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا اس مرض کی بابت کسی ماہر حکیم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری کس قدر تکلیف دہ ہے، اس کی بابت یہ دریافت کرنا ہے کہ جو شخص اس مرض میں مرجائے تو آیا شہید مرتا ہے یا نہیں، شہید ناقص ہے یا کہ شہید اصلی ہے؟ یا کہ شہید نہیں ہے؟ کیونکہ ایک کتاب رسالہ رکن الدین مولوی رکن الدین صاحب کا ہے، اس رسالہ میں بہت سی ناقص شہید کی قسمیں بیان کی ہیں، یہ قسم نہیں ہے، اس لئے دریافت کرتا ہوں کہ شاید اس مرض والا بوجہ زیادہ تکلیف ہونے کے ناقص شہید کی قسم میں نکل آوے، اس کا جواب بہت ہی غور سے مطلع فرمائیں، آیا کوئی مستند حدیث ہے یا کوئی ضعیف حدیث ہے، یا کسی حدیث سے ثابت بھی ہوتا ہے یا کسی حدیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اس کی بابت کوئی کتاب دیکھ کر پوری پوری طرح سے تحقیق فرمادیں؟

**الجواب:** علامہ سیوطیؒ نے احادیث مختلفہ کو جمع کر کے جو شہداءِ آخرت کو شمار کیا ہے تو ان میں من مات بالسّل او بالصرع او بالحمّٰی اور اس کے بعد من مات بالشرق کو بھی لیا ہے، کذا فی الطحطاوی علی المراقی، (ص ۳۶۷) تو مریضِ دمہ کی کیفیت موتِ شرق کے مشابہ ہے، بلکہ اشد ہے، اس لئے وہ بھی شہداءِ آخرت ہے انشاء اللہ تعالیٰ، ولا یصح الجزم فی مثلہ الا بنص صریح ولم یوجد، اور سوائے مقتول فی سبیل اللہ فی المعرکہ کے اور سب اموات امراض شدیدہ شہداءِ ناقص ہیں، شہید کامل صرف مقتول فی معرکۃ القتال ہے، کہ وہ شہید دنیا و آخرت ہے، اور باقی شہداء صرف شہداءِ آخرت ہیں،



احکامِ دنیا میں شہید نہیں، ۲۲ رمضان شریف ۴۵ھ

حکم حریق فی النار

**سوال** (۲) عالمگیری جلد اول، ص ۱۷۰، مطبع میمنیہ، فصل شہید: ولو کان المسلمون فی سفینۃ فرماھم العدو بالنار فاحترقوا من ذلک وتعدی الی سفینۃ اخری فیھا المسلمون فاحترقوا فھم کلھم شھداء کذا فی الخلاصۃ وحکمہ (ای الشہید ۱۲) ان لا یغسل ویصلی علیہ کذا فی المحیط السرخسی و یدفن بدمہ وثیابہ کذا فی الکافی، اس عبارت سے حریق فی النار کا حکم مثل شہید فی الدنیا والآخرۃ کے معلوم ہوتا ہے، حالانکہ حریق فی النار کو شہید فی الآخرۃ فقہاء نے قرار دیکر حکم غسل کا ثابت کیا ہے، یہ حکم صحیح ہے یا نہیں؟

**الجواب:** یہ حکم بالکل صحیح ہے، کیونکہ رماھم العدو بالنار کی قید ہے، اور دشمن خواہ کسی چیز سے مار ڈالیں، ہر حال میں شہید ہوتا ہے، اور وہ حریق جس پر حکم شہید جاری نہیں ہوتا، اس سے وہ مراد ہے جو بدون حملۂ دشمنان ویسے ہی جل کر مرگیا ہو، واللہ اعلم بالصواب، عبدالکریم عفی عنہ، از تھانہ بھون خانقاہِ امدادیہ مورخہ ۷، ذیقعدہ ۵۱ھ

## جلد تمام شد

سید ارشاد حسین تحریر نمود

# امداد الفتاویٰ مبوّب مکمّل

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ فقہ اسلامی کے ہر باب ہر کتاب اور ہرنئی پیش آنے والی ضرورت کے متعلق علمی تحقیقات کا ایک بھرپور خزانہ اور تقویٰ اور دیانت اور احتیاط کا بیش بہا نمونہ ہیں،

بلاخوف وتردید کہا جاسکتا ہے کہ کتب فتاویٰ میں "امداد الفتاویٰ" اپنی نظر آپ ہے

## امداد الفتاویٰ کی چند خصوصیات

۱۔ ایک مسئلہ کے متعلق جس قدر فتاویٰ یا تحقیقی مقالے مختلف جلدوں یا ترجیح الراجح وغیرہ میں تھے یا ان پر کوئی بحث تھی ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے،

۲۔ جن مسائل میں متعدد فتاویٰ بظاہر متعارض نظر آئے اور ترجیح الراجح میں بھی اس کے متعلق کوئی کلام نہیں ان کی تطبیق یا ترجیح کے لئے حاشیہ لکھ دیا گیا ہے

۳۔ مبہم مسائل پر مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب رح نے خود حواشی تحریر فرمائے ہیں

۴۔ اہم مسائل کو جداگانہ مستقل عنوان کے تحت ضبط کیا گیا ہے

۵۔ اس کی تبویب و ترتیب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح نے خود فرمائی ہے،

۶۔ ہر جلد کے فتاویٰ پر ترتیبی نمبر اور مسئلہ کا عنوان لکھا گیا ہے،

۷۔ آخری فتاویٰ جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے متعلقہ رسائل سے لے کر ان کو بھی شامل کتاب کر دیا گیا ہے،

امداد الفتاویٰ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل و مکمل ہے، علماء و مفتیانِ کرام کے لئے امداد الفتاویٰ بیحد ضروری اور مفید کتاب ہے،